من تفسیر آیاتِ الاحکام

تالیف
السید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ
القنوجی البخاری ۱۲۴۸ھ — ۱۳۷۵ھ

ترجمہ حافظ ابوبکر ظفر

بتقدیم، وتحقیق، وتعلیق
علی السید صبح المدنی
۱۳۸۲ھ — ۱۹۶۲م

نظرثانی وتسہیل حافظ عبدالخبیر اویسی

مکتبہ محمدیہ

www.KitaboSunnat.com

نام کتاب: نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام

باہتمام ---------------- عبدالرحمان عابد

کمپوزنگ ---------------- محمدیہ کمپوزنگ سنٹر

طبع سوم ---------------- مئی 2015ء

تعداد ---------------- 1100

قیمت ---------------- -/450

اسٹاکسٹ

طیبہ قرآن محل

مکہ سنٹر منشی محلہ گلی نمبر 6 امین پور بازار فیصل آباد

041-2629292,2624007

اسلامی کتب خانہ، ڈاک خانہ بازار، چیچہ وطنی، ضلع ساہیوال

0346-7467125,0335-6439701

- مکتبہ اہلحدیث امین پور بازار فیصل آباد ● مکتبہ عائشہ صدیقہ، اقبال مارکیٹ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
- والی کتاب گھر اُردو بازار گوجرانوالہ ● مکتبہ نعمانیہ اُردو بازار گوجرانوالہ
- قدیمی کتب خانہ آرام باغ، کراچی ● مکتبہ قرآن وحدیث، کورٹ روڈ نزد برنس چوک، کراچی
- رحمانیہ کتاب گھر، حیدر چوک کراچی ● مکتبہ محمدیہ باڑی چوک ملتان 0302-7799183

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ محمدیہ
قذافی سٹریٹ الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور

E:mail;maktabah_muhammadia@yahoo.com
&maktabah_m@hotmail.com
Ph.:042-37114650,Mob.: 0300- 4826023

مقدمة المؤلف

الحمد لله رب العالمين وصلى الله على سيدنا محمد نالنبي الامي وعلى آله الطاهرين وصحبه الراشدين ○

حمد وصلاۃ کے بعد! یہ کتاب ان آیات کا مجموعہ ہے جن کی پہچان ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو قرآن کے احکام شرعیہ کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ پانچ سو آیات ہیں لیکن یہ بات صحیح نہیں یہ تقریبا دو سو آیات ہیں۔ اگر ہم فی الوقت اس بات سے صرف نظر کریں اور ہر مفید جملہ کو آیت قرار دیں تو پہلی بات درست ہوگی جسے نحوی لوگ کلام کہتے ہیں تو پھر یہ پانچ سو سے بھی زائد ہوجائیں گی اور جسے اس قرآن میں شک ہو وہ اسے بار بار پڑھے۔ میں کسی ایسے عالم کو نہیں جانتا جو اس کے حفظ کو لازم قرار دیتا ہو بلکہ انہوں نے شرط لگائی ہے کہ انسان اس کے اہم مقامات کو جانتا ہو تاکہ بوقت ضرورت متعلقہ مسائل تک رسائی ممکن ہو اور جو ان مقامات کو الگ کاپی وغیرہ پر نقل کر لے تو یہ اسے کافی ہوگا۔ میں نے اس کتاب میں آیات احکام میں سے دو اقسام کو بیان نہیں کیا۔

① جس کا معنی اور مفہوم واضح ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔"

اس لئے کہ اس کی لاعلمی سے کوئی خطرہ نہیں، ہاں اگر اس قسم کی آیت کا معنی واضح نہ ہو بلکہ استدلال کرکے وضاحت کی جائے تو اسے استدلال کی قسم میں بیان کروں گا مثلاً وضو اور تیمم کی آیات۔

② جس میں مجتہدین کسی خاص مسئلہ پر استدلال میں اختلاف کرتے ہوں اور ان کا حکم واضح نہ ہو اور وہ قطعی الدلالۃ بھی نہ ہوں کیونکہ جو اسے قطعی الدلالت نہیں مانتا اسے ان کا جاننا ضروری بھی نہیں مزید یہ کہ اس آیت سے استدلال کو سمجھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔

یہ بات اس استدلال کی طرح ہے کہ آدمی "لتركبوها وزينة" یعنی تاکہ تم اس گھوڑے پر سواری کرو اور یہ خوبصورتی کے لئے ہے" سے گھوڑے کے گوشت کی حرمت پر استدلال کرے۔ اس کی پہچان صرف ان مجتہدین کے لئے ضروری ہے جو ان سے استدلال کرتے ہوں۔ اس صورت میں کسی ایسے شخص کے لئے ان آیات کا تعین نہیں کیا جا سکتا جو گمان کرتا ہو یا ان آیات

میں پوشیدہ معانی سے احکام نکالنے جائز سمجھتا ہو۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کی پہچان کا کوئی راستہ نہیں اور یہ علمائے برہان کے نزدیک انتہائی کمزور راستہ ہے۔

یہاں فقط ان آیات کا تذکرہ مقصود ہے جو احکام پر واضح دلالت کرتی ہیں تا کہ احکام تلاش کرنے والا بالعموم اپنا مقصد حاصل کر لے' طالب علم کے لئے یہ مناسب نہیں کہ اپنا مقصود حاصل ہونے کے بعد کتاب اللہ میں دیکھنا ترک کر دے جو کہ اپنے اندر عمدہ معانی سموئے ہوئے ہے اور جس سے ظاہر و پوشیدہ آداب واحکام نکالے جاتے ہیں' یہی گمراہی سے تحفظ کا ذریعہ ہے۔ امور میں بہت بڑا ستون' تنہائی میں محبت کا ذریعہ' سختی میں مدد دیتا' اندھیروں میں روشنی کے کام آتا' غموں سے نکلنے کی راہ' سینوں کی شفا کا باعث اور مشتبہ کاموں میں فیصلہ عطا کرتا ہے۔ یہ نامناسب ہے کہ اس سے لحہ بھر بھی غفلت برتی جائے اور اس کا کوئی ایک لفظ بھی ترک کیا جائے۔ سید امام حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر رحمہ اللہ نے "فضائل القرآن والتنبیہ علی الاعتماد علیہ" کے عنوان سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔

جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہاں میں ان آیات کی مختصر تفسیر کروں گا جو اس کے متعلقہ تمام احکام پر مشتمل ہوگی اور میں یہاں سوائے راجح ترین قول کے دوسرے مختلف اقوال ذکر نہیں کروں گا اور مختلف دلائل میں سب سے واضح اور صحیح قول ذکر کروں گا۔ مجھے اپنی زندگی بھر اس قسم کی مختصر تفسیر آج تک دیکھنے کو نہیں ملی۔

اس کی ابتدا ماہ صفر کے شروع میں ہوئی اور اس کا اختتام صفر ۱۲۸۷ ہجری میں ہوا۔ میں نے اس کا نام "نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام" رکھا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کے مقاصد بیان کرنے کے لئے "فتح البیان" کے نام سے میں نے ایک تفسیر لکھی ہے جو کہ روایت ودرایت اور استنباط واحکام کو سموئے ہوئے ہے' اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو تحقیق کے مراتب پر جانا چاہتے ہیں اور گہرائی کی مسند پر بیٹھنا چاہتے ہیں تو اس تفسیر کو ضرور پڑھیں' ممکن ہے کہ آپ اس جیسی کوئی دوسری تفسیر نہ پائیں۔ ان شاء اللہ القدیر۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے سوال ہے کہ وہ میری اس مختصر محنت کو اپنے لئے خاص کر لے اور اس کے عام لطائف سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے۔ آمین!

سورۃ البقرہ کی تفسیر

اس کی دو سو چھیاسی آیات ہیں:

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ سورۃ مدنی ہے جو مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ سورۃ مدینہ میں مندرجہ ذیل آیت ''وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ۔'' ''ڈرو اس دن سے جبکہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' ہے جو آسمان سے اترنے والی آخری آیت۔ یہ حجۃ الوداع کے دوران قربانی کے روز منیٰ کے میدان میں نازل ہوئی۔ اسی طرح حرمت سود کی آیات بھی ان آیات میں سے ہیں جو نزول قرآن کریم کے آخری دور میں نازل ہوئیں۔ اس سورۃ کی فضیلت میں کئی احادیث ہیں۔

مضمون نمبر:۱

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ۔ (البقرۃ:۲۹) ''وہ ذات جس نے تمہارے لئے پیدا کیا۔''

ابن کیسان لَکُمْ کا معنی مِنْ اَجْلِکُمْ کرتے ہیں۔(''ای لاجل انتفاعکم'' یعنی اسے تمہارے فوائد کے لیے پیدا کیا ہے)

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ ہر چیز اصل میں جائز ہے جب تک کہ کوئی دلیل اس کو اس کے اصل سے منتقل نہ کر دے۔ یہاں حیوانات وغیرہ میں کوئی فرق نہیں جن سے فائدہ لیا جاتا ہے بغیر تکلیف کے اور مَا فِی الْاَرْضِ کے جملہ سے مزید تاکید ہوتی ہے کہ تمام تر اشیاء کا استعمال جائز ہے اور یہ مذکورہ بالا مسئلہ پر سب سے مضبوط دلیل ہے۔

اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ مٹی کھانا حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے علاوہ جو کچھ زمین میں ہے وہ ہمارے لئے پیدا کیا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں ''کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس پر لفظ زمین بولا جا سکتا ہے وہ زمین میں داخل ہے' تو لفظ زمین دونوں صفات کو شامل ہے اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ معدنیات بھی زمین میں شامل ہیں' اسی طرح سرنگیں اور اس میں جو سفر وغیرہ کیا جاتا ہے' اس لئے کہ کسی خاص چیز کا ذکر اس کے علاوہ بقیہ کی نفی پر دلیل نہیں ہو سکتا۔''

صاحب کشاف نے اس سے زیادہ واضح بات ذکر کی ہے وہ کہتے ہیں: ''اگر آپ کا سوال یہ ہے کہ جو یہ گمان کرتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت کا معنی ہے ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین پیدا کی اور جو اس میں ہے'' اس کی معقول توجیہ کیا ہے؟ تو میرا جواب یہ ہے کہ اگر زمین سے مراد مٹی کے بجائے نیچے کی سمت ہو جس طرح آسمان کے ذکر میں بلندی کی سمت مراد ہوتی ہے تو یہ معنی جائز ہے کیونکہ مٹی اور جو اس میں ہے وہ تمام نیچے کی سمت میں ہے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: ''مٹی کی حرمت سنت سے ثابت ہے نیز نقصان دہ بھی ہے۔ اسے کھانے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن دوسرے فوائد کے لیے اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے خاص کھانے کا فائدہ ہی مراد نہیں بلکہ ہر وہ صورت جس سے اس کا فائدہ حاصل ہو۔''

عبد بن حمید اور ابن جریر رحمہما اللہ نے سیدنا قتادہ رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں ذکر کیا وہ فرماتے ہیں: سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ''اللہ تعالیٰ نے جو زمین میں ہے سب تمہارے لئے مسخر کر دیا۔'' یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت اور ابن آدم کے لئے نعمت ہے اور موت تک فائدہ مند ہے۔

مضمون نمبر ۲:

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرة: ۸۳) ''اور لوگوں کے لئے اچھی بات کہو۔''

یعنی ان کو ایسی بات کہو جو اچھی ہو۔ حسنا مصدر محذوف قولا کی صفت ہے یہ مصدر بشری کی طرح ہے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ نے حَسَنًا پڑھا ہے اور اسی طرح زید بن ثابت اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے بھی۔ اخفش کہتے ہیں: ''ان دونوں کا معنی ایک ہی ہے جیسے بُخل اور بَخَل، رُشد اور رَشَد کی طرح ہیں۔''

بظاہر یہ بات جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کسی خاص قسم کی بات کے لیے نہیں بلکہ شرعا [illegible] وہ کام ان تمام اچھے کاموں میں سے ہوگا جس پر یہ حکم لاگو ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد توحید کا کلمہ ہے اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد سچ ہے۔ ایک قول کے مطابق نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا ہے۔ ایک قول کے مطابق بات میں نرمی، [illegible] اور اچھا اخلاق مراد ہے وغیرہ وغیرہ۔

ابن جریر رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس بارے میں نقل کرتے ہیں: ''اس سے مراد [illegible]

لغت کا ہے۔'' اس کا معنی یہ ہے کہ وہ دونوں منع کرتے تھے اور انہیں کہتے کہ ایسا مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان مـن احـد میں مـن زائد تاکید کے لئے ہے۔ ایک قول کے مطابق ''یـعلمان'' تعلیم سے نہیں بلکہ اعلام سے ہے۔ عرب کے کلام میں تعلم اعلم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ابن انباری اور ابن اعرابی نے ذکر کیا ہے۔ یہ بات ان کے بہت سے اشعار میں ملتی ہے جس طرح کعب بن مالک کا قول ہے ع

تَعَلَّمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ مَدْرِكِيْ　　وَاَنَّ وَعِيْدًا مِنْكَ كَالْاَخْذِ بِالْيَدِ

''تم رسول اللہ ﷺ کو بتادو کہ آپ مجھے پانے والے ہیں اور آپ کی وعید گرفتاری کی طرح ہے۔''

قطامی کہتا ہے ع

تَعَلَّمْ اَنَّ بَعْدَ الْغَيِّ رُشْدًا　　وَاَنَّ لِذٰلِكَ الْغَيِّ انْقِشَاعًا

''لوگوں کو بتادو کہ گمراہی کے بعد ہدایت ہے اور یقیناً یہ گمراہی چھٹ جانے والی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''فَـلَا تَـكْفُرْ'' ڈرانے کا سب سے عمدہ طریقہ ہے اور سب سے بڑی تنبیہ ہے' یعنی یہ گناہ کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے' لہٰذا تم کفر نہ کرو۔ اس میں دلیل ہے کہ جادو سیکھنا کفر ہے۔ بظاہر اس میں یہ ہے کہ جادو پر اعتقاد کرنے اور نہ کرنے والے میں کوئی فرق نہیں' یعنی جو جادوگر بننے کے لئے سیکھتا ہے اور جو اس کے ضرر ونقصان کو دور کرنے کے لئے اسے سیکھتا ہے ان میں کوئی فرق نہیں۔ جادو کی طرف تفریق کی نسبت اور جادو کا اس کے لئے سبب ہونا یہ دلیل ہے کہ جادو میں محبت وبغض' وصال' علیحدگی اور قربت ودوری کے باہم ملنے کی تاثیر موجود ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جادوگر اکثر ان باتوں کی طاقت نہیں رکھتا کہ جو اللہ تعالیٰ نے علیحدگی کے بارے میں بیان کی ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس مذموم کام کا ذکر جادو کے لئے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جادو سیکھنے کا مقصد واضح کیا ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ طاقت رکھتا تو اسے بھی ذکر کرتے۔ ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ یہ بات عموم کو سامنے رکھ کر کی گئی حالانکہ جادوگر جو بیان کیا گیا اس سے بھی زیادہ کی قدرت رکھتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ جادو فی نفسہٖ کوئی اثر نہیں رکھتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اور وہ بغیر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے کسی کو کوئی

نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" صحیح بات یہ ہے کہ آیت کے ان دونوں حصوں فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ۔اور وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔میں کوئی فرق نہیں' کیونکہ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ جادو کی بذات خود تاثیر ہے لیکن نقصان کے لئے وہ مؤثر نہیں مگر جس اثر کی اللہ تعالیٰ اجازت دیں۔

اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے کہ جادو کی بذات خود تاثیر اور ثابت شدہ حقیقت بھی ہے اس بات کی مخالفت سوائے معتزلہ اور امام ابوحنیفہ کے کسی نے نہیں کی جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان: "وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ" میں اس بات کی وضاحت ہے کہ جادوگر کو جادو فائدہ نہیں پہنچاتا اور نہ اس کے لئے کوئی نفع کھینچ کے لاتا ہے بلکہ وہ صرف نقصان اور گھاٹے کا معاملہ ہے۔ ابوالسعود کا کہنا ہے کہ: "جس سے ہلاکت کا خطرہ ہو اس سے بچنا بہتر ہے جیسا کہ فلسفہ سیکھنا کہ اس میں گمراہی کی طرف جانے کا خدشہ ہے۔"

یہاں لینے سے مراد تبدیل کرنا ہے' یعنی جس نے کتاب اللہ سے جو شیطان پڑھتے ہیں بدل لیا۔

اہل لغت کے نزدیک خلاف کا معنیٰ "حصہ" ہے۔

مضمون نمبر:۴

وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۔(البقرۃ:۱۱۵)

"اور مشرق و مغرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے' تم جدھر بھی مونہہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے۔"

مشرق کہتے ہیں جہاں سے سورج طلوع ہو اور مغرب کہتے ہیں جہاں سورج غروب ہو جائے' یعنی وہ دونوں سمتیں اور جو ان کے درمیان مخلوقات اور جہان ہیں وہ تمام اللہ تعالیٰ کی حکومت میں ہیں تو اس لیے یہ فرمان ساری زمین کو شامل ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان "فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا" یعنی جس طرف بھی تم قبلہ رو ہو وہیں اللہ تعالیٰ کا چہرہ ہے' یعنی جس طرف تمہیں قبلہ رو ہونا پسند ہو۔ یہ اجازت اس وقت ہے جبکہ قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو سکے کہ جس کی طرف رخ کرنے کا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہمیں حکم دیا گیا: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ "آپ اپنا چہرہ مسجد

حرام کی طرف پھیر لیں اور آپ جہاں کہیں بھی ہوں اپنا چہرہ اسی طرف پھیرا کریں۔"

امام زمخشری رحمہ اللہ کشاف میں فرماتے ہیں: "اس کا معنی یہ ہے کہ تمہیں جب مسجد حرام اور بیت المقدس میں نماز پڑھنے سے روک دیا گیا تو میں نے زمین کو تمہارے لئے مسجد بنایا' پس تم جس جگہ چاہو نماز ادا کرو اور اپنا مونہہ اس طرف کرو کیونکہ قبلہ رو ہونا ہر جگہ ممکن ہے اس کے لئے ایک مسجد سے دوسری مسجد یا ایک جگہ سے دوسری جگہ خاص نہیں ہے۔"

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ "اس تخصیص کی کوئی خاص وجہ نہیں کیونکہ اس کے الفاظ زیادہ وسیع ہیں ہاں اگر سبب بیان کرنا مقصود ہو تو کوئی حرج نہیں۔"

امام ابن منذر' ابن حاتم اور امام حاکم رحمہم اللہ نے روایت کر کے صحیح کہا اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں روایت کیا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں لیکن جو ہمیں بیان کیا گیا وہ یہ ہے کہ قرآن میں سب سے پہلے قبلہ کی سمت منسوخ ہوئی۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ الآیۃ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی اور بیت العتیق کو چھوڑ دیا' پھر اللہ تعالیٰ نے بیت العتیق کی طرف پھیر دیا اور حکم وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے ساتھ پہلا حکم منسوخ کر دیا: ابن منذر ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی طرح بیان کرتے ہیں۔

ابن ابی شیبہ' عبد بن حمید' مسلم' ترمذی اور نسائی وغیرہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر نفل نماز پڑھا کرتے اس سواری کا رخ جس طرف بھی ہو جاتا' پھر ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی "فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" اور فرمایا اس مسئلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی طرح سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ابن جریر' دار قطنی اور حاکم نے روایت کی اور امام حاکم نے صحیح کہا۔

صحیح بخاری میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری کے اوپر ہی مشرق کی جانب نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور جب فرض نماز پڑھنے کا ارادہ ہوتا تو اپنی سواری سے اترتے' قبلہ رو ہوتے اور نماز کی ادائیگی فرماتے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اسی طرح ابن ابی شیبہ اور ابوداؤد نے بیان کیا۔

شان نزول

عبد بن حمید' ترمذی' ابن ماجہ اور ابن جریر وغیرہ نے [illegible]

[illegible]

دار قطنی، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اسی طرح بیان کیا ہے مگر انہوں نے ذکر کیا کہ ان لوگوں نے کچھ خط کھینچے۔

اسی طرح ابن مردویہ نے ضعیف سند کے ساتھ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ذکر کیا۔

اسی طرح سعید بن منصور اور ابن منذر نے عطاء سے بیان کیا یہ اثر مرسل ہے۔

ابن ابی حاتم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ" کا یہ معنی بیان کیا ہے:

"اللہ تعالیٰ کا قبلہ جس جانب بھی وہ رخ کرلے مشرق ہو یا مغرب۔"

ابن ابی شیبہ، دار قطنی، ترمذی اور ابن ماجہ سید نا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو مشرق و مغرب کے درمیان ہے قبلہ ہے۔ ابن ابی شیبہ دار قطنی بیہقی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح بیان کیا اور ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح بیان کیا۔

مضمون نمبر: ۵

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (البقرۃ: ۱۲۴) "میرا وعدہ ظالموں سے نہیں۔"

وعدہ کے مفہوم میں اختلاف ہے، ایک قول کے مطابق امامت ہے، ایک قول کے مطابق نبوت ہے، ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے حکم کا وعدہ ہے اور ایک قول کے مطابق آخرت کے عذاب سے امن ہے، اس قول کو امام زجاج نے ترجیح دی ہے اور سیاق کے اعتبار سے سب سے پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے۔

اہل علم کی ایک جماعت نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ عادل ہو اور شرعی احکامات پر کاربند ہو کیونکہ اگر وہ اس سے پھسل گیا تو وہ ظالم ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ جس چیز پر بھی عہد کا لفظ بولا جا سکتا ہے وہ بھی اس سے مراد ہو اور جو اس کے عموم سے فائدہ حاصل ہو۔ پس لفظ کے عام ہونے کے اعتبار سے خاص سبب اور سیاق کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ تمام کو شامل ہے پس اس سے ظلم کی صفت سے بچنے کی شرط کے ساتھ ساتھ امور سے متعلق تمام

معاملات پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔

ابن جریر یہ قول پسند کرتے ہیں کہ "یہ آیت اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے اس بات کی خبر ہے کہ میرا امامت کا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا' اس میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو یہ بتایا گیا ہے کہ اس کی اولاد میں ایسے لوگ ہوں گے جو اپنی جانوں پر ظلم کریں گے۔"

امام شوکانی' فتح القدیر میں فرماتے ہیں: "یہ بات آپ پر مخفی نہ رہے کہ اس کلام کا کوئی فائدہ نہیں۔ سب سے مناسب یہ قول ہے کہ یہ خبر اپنے بندوں کے لئے حکم کے معنی میں ہے کہ شرعی امور کا ذمہ دار کسی ظالم کو نہ بنائیں' ہم نے صرف یہ کہا کہ یہ حکم کے معنی میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خبر سے پہلوتہی کرنا جائز نہیں' ہم اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عہد امامت وغیرہ کا بہت ظالموں کو ملا ہے۔"

عبد بن حمید رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں روایت کرتے ہیں "قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" ۔لوگ تیرے دین' تیری رہنمائی اور تیری سنت کی پیروی کریں "قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ" ابراہیم علیہ السلام نے کہا میری اولاد کے علاوہ امام؟ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ کہ وہ اولاد جو ان کی سنت کی رہنمائی میں دین کی پیروی کریں۔

فریابی اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ "اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں ابراہیم علیہ السلام نے کہا اور میری اولاد سے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

عبد بن حمید' ابن جریر اور عبدالرزاق رحمہم اللہ سیدنا قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ بات قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوگی کہ اس کا وعدہ ظالموں کو نہیں ملے گا' لیکن دنیا میں وہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حاصل کریں گے' وہ مسلمانوں کے وارث ہوں گے، ان سے مل کر جنگ کریں گے' ان سے نکاح کریں گے اور جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ اور عزت صرف اپنے دوستوں کو عطا فرمائے گا۔

عبد بن حمید اور ابن جریر نے مجاہد سے اس آیت کی تفسیر میں یہ ذکر کیا کہ "میں کسی ایسے ظالم کو امام نہیں بناؤں گا کہ جس کی پیروی کی جائے۔"

ابن اسحٰق' ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کی تفسیر میں ذکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی کہ اگر ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں کوئی ظالم ہوگا تو

اسے اللہ تعالیٰ کا وعدہ نہیں ملے گا اور یہ مناسب بھی نہیں کہ اسے کسی کام پر ذمہ دار مقرر کیا جائے۔"

عبد بن حمید' ابن جریر اور ابن منذر رحمہم اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ "کسی ظالم کی بات ماننے کا ایک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں تجھ پر کوئی عہد و پابندی نہیں۔"

عبد بن حمید رحمہ اللہ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کرتے ہیں کہتے ہیں کہ "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔"

ابن جریر رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ "کسی ظالم کے لئے کوئی وعدہ نہیں اگر میں اس سے وعدہ کروں تو تم توڑ دو۔"

مضمون نمبر: ٦

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّى ۔(البقرة: ١٢٥) "تم مقام ابراہیم کو جائے نماز مقرر کرلو۔"

سیدنا نافع اور ابن عمر رضی اللہ عنہما وَاتَّخَذُوْا فعل ماضی پڑھتے ہیں اور باقی لوگ امر کا صیغہ پڑھتے ہیں اور لغت میں کھڑے ہونے کی جگہ کو مقام کہتے ہیں۔

مقام کی تعیین میں اختلاف ہے' ان میں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ وہ حجر اسود ہے جسے لوگ جانتے ہیں اور اس کے پاس طواف کی دو رکعتیں ادا کرتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق پورا حج ہے، یہ قول عطاء اور مجاہد سے مروی ہے۔ ایک قول کے مطابق عرفہ اور مزدلفہ ہے یہ بھی عطا سے مروی ہے۔ شعبی کہتے ہیں: "حرم سارا مقام ابراہیم ہے۔"

مجاہد سے مروی ہے اور امام بخاری [illegible]

خطاب [illegible]

اور [illegible]

آپ [illegible]

[illegible]

نیک [illegible]

[illegible]

[illegible]

ا[illegible] ۔ مسلم وغیرہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ا[illegible]
مسلم وغیرہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی کہ نبی ﷺ نے رمل کیا تین چکر آہستہ آہستہ دوڑ کر لگائے اور چار چکر چل کر اور جب فارغ ہوئے تو مقام ابراہیم کی طرف گئے وہاں اس کے پیچھے دو رکعات ادا کیں' پھر یہ آیت پڑھی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔

لفظ مُصَلًّى میں اختلاف ہے' جس نے مقام ابراہیم کی تفسیر حج کے ارکان اور مقامات کی ہے وہ کہتا ہے کہ مصلی سے مراد دعا ہے۔ نماز جو دعا ہو اور جس نے مقام ابراہیم کی تفسیر حجر اسود سے کی ہے وہ اس کا معنی یوں بیان کرتا ہے کہ تم مقام ابراہیم کو اپنی نماز کے لئے قبلہ بناؤ پس انہیں اس حجر اسود کے پاس نماز کا حکم دیا گیا اور یہی بات صحیح ہے۔

اس کے پاس کا معنی اس کے چاروں اطراف کی تصدیق و تائید کرتا ہے اور اس کے پیچھے نماز ادا کرنا نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے معلوم ہوتا ہے۔

مقام ابراہیم کے بارے میں احادیث کی امہات الکتب وغیرہ میں بے شمار صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام کعبۃ اللہ کی تعمیر کے لئے کھڑے ہوتے تھے جب دیوار اونچی ہوگئی تو یہ پتھر اسماعیل علیہ السلام لائے تاکہ آپ اس پر کھڑے ہوں' جیسا کہ بخاری شریف میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے' یہ وہی پتھر ہے جو کعبہ کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا سب سے پہلے اسے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے وہاں سے ہٹایا جیسا کہ عبدالرزاق اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے مختلف طرق سے بیان کیا۔

ابن ابی حاتم نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث نبی ﷺ کے حج کے طریقہ کے بارے میں بیان کی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب نبی ﷺ نے طواف کیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے پوچھا یہ مقام ابراہیم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اسی طرح ابن مردویہ نے بھی ذکر کیا۔

مضمون نمبر: ۷

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرة:۱۲۵)

"تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں کا اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھو۔"

پاک صاف رکھنے سے مراد ایک قول کے مطابق [illegible] دوسرے قول کے مطابق [illegible] اور [illegible]، تیسرے قول کے مطابق [illegible]، چوتھے قول کے مطابق [illegible] خبیث شخص سے پاک صاف رکھنا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ان تمام اقسام میں سے کوئی ایک قسم مخصوص نہیں بلکہ جس پر بھی طہارت و پاکیزگی کا لفظ بولا جائے تو وہ اس میں شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان بَیْتِیَ میں خود اللہ تعالیٰ کی جانب اضافت عزت و بزرگی کے لئے ہے۔

حسن ابن ابی اسحق مدینہ والے ہشام اور حفص رحمہم اللہ بَیْتِیَ پڑھتے ہیں اور دوسرے بَیْتِیْ پڑھتے ہیں۔ بیت سے مراد کعبہ ہے کہ طواف کرنے والا اس کا طواف کرتا اور اس کے گرد گھومتا ہے۔ ایک قول کے مطابق مسافر وہ ہے جو مکہ سے گزر جانے اور اعتکاف کرنے والا وہ ہے جو یہاں قیام پذیر ہے۔

[illegible]۔ ایک قول کے مطابق پڑوسی اور مجاور بننے کو کہتے ہیں نہ کہ وہاں رہنے کو۔

اللہ تعالیٰ کے اس قول الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں۔ ان دو رکعات کا بالخصوص ذکر کیا کیونکہ نماز کے ارکان میں سے زیادہ معزز ہیں۔

ابن ابی حاتم سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ جب بندہ کھڑا ہو تو وہ طواف کرنے والوں میں شمار ہوگا، جب بیٹھا ہو تو اعتکاف کرنے والوں میں اور جب وہ نماز پڑھ رہا ہو تو رکوع اور سجدہ کرنے والوں میں شمار ہوگا۔

عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو مسجد میں سوتے ہیں؟ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا: ''وہ اعتکاف کرنے والے ہیں۔''

مضمون نمبر: ۸

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ۔ (البقرۃ: ۱۴۴)

''آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور آپ جہاں کہیں ہوں تو اپنا چہرہ اسی

طرف پھیرا کریں۔"

شطر سے مراد جہت وطرف ہے یہ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔اسی معنی میں شاعر کا قول ہے ع

أَقُوْلُ لِأُمِّ زِنْبَاعٍ أَقِيْمِيْ صُدُوْرَ الْعِيْسِ شَطْرَ بَنِيْ تَمِيْمٍ

بعض اوقات شطر سے مراد نصف ہوتا ہے اور اسی معنی میں نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ

اَلْوُضُوْءُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ ۔یعنی وضو نصف ایمان ہے۔

اور مطلق طور پر بعض کے معنی میں بھی آتا ہے۔اس بات میں تو اختلاف نہیں کہ مسجد حرام کی جانب سے مراد کعبہ کی عمارت ہو۔قرطبی بیان کرتے ہیں کہ اس بات پر اجماع ہے کہ دیکھنے والے پر قبلہ رخ ہونا فرض ہے اور نہ دیکھنے والے کے لئے اس سمت رخ کرنا فرض ہے۔انہوں نے اس بات پر استدلال ایک ممکن الاستدلال دلیل سے کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ عبد بن حمید اور ابن جریر نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے کہ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا معنی اس کی طرف رخ کرنا ہے۔

عبد بن حمید' ابوداؤد' ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے اسی فرمان کے بارے میں ذکر کیا کہ اس جانب۔

عبد بن حمید' ابن جریر' ابن منذر' ابن ابی حاتم اور امام حاکم اور بیہقی نے اپنی سنن میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح بیان کیا۔

ابوداؤد نے اپنی کتاب ناسخ میں اور ابن جریر اور بیہقی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا' وہ فرماتے ہیں کہ "شَطْرَهٗ" سے مراد اس طرف ہے۔

ابن جریر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ بیت اللہ سارا قبلہ ہے اور بیت اللہ کا قبلہ دروازہ ہے۔

امام بیہقی نے اپنی سنن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ذکر کیا کہ "بیت اللہ مسجد والوں کا قبلہ ہے اور مسجد' حرم والوں کا قبلہ ہے اور حرم' زمین کے مشرق و مغرب میں بسنے والی میری امت کا قبلہ ہے۔"

مضمون نمبر: ۹

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ o (۱۵۸)

''صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں' اس لئے بیت اللہ کا حج وعمرہ کرنے والے پر ان کا طواف کر لینے میں بھی کوئی گناہ نہیں اور اپنی خوشی سے بھلائی کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ قدر دان ہے اور انہیں خوب جاننے والا ہے۔''

صفا: لغوی طور پر صفا کا اصل معنیٰ ملائم پتھر ہے یہ مکہ میں ایک معروف پہاڑ کا نام ہے' اسی طرح مروہ مکہ میں معروف پہاڑ کا نام ہے۔ وہ چھوٹے پتھر' جن میں نرمی ہو بعض نے کہا کہ جن چھوٹے پتھروں میں سختی ہو' بعض کے مطابق تمام پتھروں کو عام ہے اور بعض کے نزدیک سفید چمکدار پتھر ہیں اور جبکہ بعض کہتے ہیں کہ وہ سیاہ پتھر ہیں۔

[illegible] اور یہ جو حج کے ارکان کی ایک علامت ہے۔ اس سے مراد عبادت کی وہ جگہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے بطور علامت مقرر کیا ہے۔ موقف کی جگہ سعی اور قربانی کی جگہ۔ اسی سے قربانی کو نشان لگانا ہے یہ نشانی ہے لوہے کے تیز دھار آلے سے قربانی کی کوہان پر لگائی جاتی ہے۔

حج البیت [illegible] کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

الجناح: جناح کا اصل جنوح ہے اور اس کا معنیٰ میلان ہے اور اسی سے پسلیاں ہیں اپنے ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے۔

گناہ نہ ہونا دلیل ہے اس کے واجب نہ ہونے پر' یہی بات امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ان کے ساتھیوں اور امام نووی رحمہ اللہ نے کہی۔ امام زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ سعی کرنا واجب ہے مگر رکن نہیں اور اسکے چھوڑنے والے پر قربانی کرنا لازم ہوگا۔

سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابن زبیر سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور ابن سیرین اس کے واجب نہ ہونے کے قائل ہیں۔ اس آیت کے وجوب پر دلیل کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مضبوط کرتا ہے وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا جمہور کہتے ہیں کہ سعی واجب ہے اور یہ حج کے بقیہ ارکان میں سے ایک رکن ہے' یہی قول سیدنا عبداللہ بن عمر سیدنا جابر اور سیدہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے اور یہی بات حسن رحمہ اللہ نے کہی' اسی موقف کی طرف امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ گئے ہیں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی اسے پسند کیا اور یہی راجح ہے۔

شانِ نزول

ان لوگوں نے بخاری اور مسلم وغیرہ کی حدیث سے است... لیا ہے کہ ...

... چڑھاتے تھے' جو ان کا معبود تھا اور جو ایسا کرتا وہ جاہلیت میں صفا مروہ کی سعی کو گناہ سمجھتا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کے چکر لگانے کی وضاحت فرمائی لہٰذا اب کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ انہیں چھوڑے۔

امام مسلم وغیرہ نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا' وہ فرماتی ہیں میری عمر کی قسم اللہ تعالیٰ اس کے حج اور عمرہ کو مکمل نہیں کرے گا' جو صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا...... فرمایا ہے۔

امام طبرانی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کی ہے' پس تم سعی کرو۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور شافعی' ابن سعد' ابن المنذر' ابن قانع اور بیہقی نے سیدہ حبیبہ بنت ابی تجرۃ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں' وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے دیکھا' لوگ

شدت کی وجہ سے آپ کا احرام ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور آپ فرما رہے تھے دوڑو اللہ تعالیٰ نے دوڑنا تم پر فرض کیا ہے۔ یہ روایت مسند احمد میں ان کے اپنے شیخ عبداللہ بن مومل سے وہ اپنے استاد عطا بن ابی رباح سے وہ صفیہ بنت شیبہ سے وہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ روایت ہے، وہ عبدالرزاق کی سند سے بھی بیان کرتے ہیں ہمیں معمر نے خبر دی وہ واصل مولی ابن عیینہ سے وہ موسیٰ بن عبیدہ سے وہ صفیہ بنت شیبہ سے وہ کہتی ہیں کہ انہیں ایک خاتون نے خبر دی تو انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور اس بات کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے حج کا طریقہ سیکھ لو۔

مضمون نمبر: ۱۰

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (۱۷۳)

"تم پر مردہ اور (بہا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور ہر وہ چیز جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کا نام پکارا گیا ہو حرام ہے، پھر جو مجبور ہو جائے اور وہ حد سے بڑھنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ ہو تو اس پر ان کے کھانے میں کوئی گناہ نہیں۔"

ابوجعفر نے مجہول ہونے کی بنا پر "حُرِّمَ" پڑھا ہے اور انما کا کلمہ حصر کے لئے اپنے مخاطب کو پورا لیتا اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے اور یہاں حرمت نے اس کے بعد ذکر ہونے والے امور کو محصور کر لیا۔

المیتة: وہ جانور ہے جس کی روح بغیر ذبح کے پرواز کرے۔ اس عام حکم کو اس طرح کی حدیث سے خاص کیا جا سکتا ہے جس میں نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ "ہمارے لئے دو مردار اور دو خون حلال کئے گئے ہیں دو مردار ٹڈی اور مچھلی ہیں اور دو خون جگر اور تلی ہیں۔" اس حدیث کو امام احمد ابن ماجہ دارقطنی حاکم اور ابن مردویہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔

اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی طرح عنبر کے متعلق جو کہ صحیحین میں ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ موجود ہے "اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ"۔

جہاں مردار سے مراد خشکی کا ہے نہ کہ سمندر کا اکثر اہل علم سمندر کے تمام جانوروں کو کھانا جائز قرار دیتے ہیں وہ زندہ مل جائے یا مردہ اور بعض کا کہنا ہے کہ سمندر کے جانوروں میں سے وہ حرام ہیں جو خشکی کے حرام جانوروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

ابن حبیب نے پانی کے خنزیر کے بارے میں توقف اختیار کیا ہے۔

ابن قاسم کہتے ہیں میں اسے حرام نہیں سمجھتا' البتہ میں اس سے بچتا ہوں۔

علماء کا اتفاق ہے کہ خون حرام ہے۔ ایک دوسری آیت میں ذکر ہے یا بہایا ہوا خون' تو اس مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا' کیونکہ جو گوشت کے ساتھ گھل مل جائے وہ حرام نہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں اس پر اجماع ہے۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ وہ گوشت پکاتی تو خون کی رنگت ہڈی کے اوپر آ جاتی نبی ﷺ اسے کھاتے اور انکار نہ فرماتے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان "لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ" اور دوسری آیت

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ.

"آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ان میں تو میں کوئی حرام نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا کہ بہتا ہوا خون ہو یا خنزیر کا گوشت ہو۔"

ان آیات کے ظاہر سے صرف گوشت کی حرمت ثابت ہوتی ہے اور جبکہ خنزیر کی چربی کے حرام ہونے پر تمام علماء امت کا اجماع ہے' جس طرح کے امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا۔

اہل علم کی ایک جماعت نے ذکر کیا کہ چربی گوشت میں شامل ہے اور امام قرطبی نے اس بات پر بھی اجماع بیان کیا ہے کہ خنزیر کے بالوں کے سوا سارا ہی حرام ہے' اس سے جوتے کی سلائی جائز ہے اور ایک قول کے مطابق گوشت سے مراد تمام اجزاء ہیں اور صرف گوشت کو خصوصاً ذکر کیا کیونکہ کھانے کا مقصود یہی ہوا کرتا ہے۔

الاھلال: آواز بلند کرنا' کہا جاتا ہے اس نے اس طرح آواز لگائی' یعنی اس نے آواز بلند کی' اور اسی سے بچے کا آواز نکالنا ہے جو کہ وہ پیدائش کے وقت چیختا اور آواز نکالتا ہے۔ یہاں اہلال سے مراد وہ چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ لات وعزیٰ کا نام لیا جائے، جب ذبح کرنے والا بت پرست ہو اور آگ کا نام لیا جائے' جب کہ ذبح کرنے والا مجوسی ہو' تو اس کے اور اس جیسے دوسری چیزوں کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ اس کی مثال فوت شدگان سے عقیدت رکھنے

والوں کی ہے، ان کی قبروں پر جا کر ذبح کرتے ہیں، تو یہ چیز بھی اسی میں شامل ہے کہ جو غیر اللہ کے نام پر مشہور کی جائے اس کے اور کسی بت کے لئے ذبح کرنے میں کوئی فرق نہیں۔''

میں کہتا ہوں اسی طرح جو اولیاء سے عقیدت رکھنے والے ان کے لئے ذبح کرتے ہیں تو یہ بھی غیر اللہ کے نام پر دیا گیا ہے، اگرچہ ذبح کے وقت ان اولیاء کا نام نہ بھی لیا جائے اس لیے اس میں اور طواغیت کے ذبح کرنے میں کوئی فرق نہیں۔ اکثر اہل علم نے اس مسئلہ پر الگ سے کتب بھی تالیف کی ہیں، ہم طوالت کے خوف سے اس مسئلہ میں نہیں جاتے اور جو اس مسئلہ کی تفصیل چاہتا ہو تو وہ ہماری تفسیر ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' کا مطالعہ کر لے، ہم نے اسی میں نہایت عمدہ باتیں ذکر کی ہیں جو حق کے متلاشی کو اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ غنی کر دیتی ہیں۔

مضطر: [illegible]

''باغٍ'' [illegible] اور ''عادٍ'' [illegible]

[illegible]

ایک قول کے مطابق مسلمانوں پر بغاوت کرنے اور ان پر ظلم کرنے والا نہ ہو اور اس صورت میں اسلامی حکومت ہو تو یہ شخص کا باغی بھی شامل ہے اور عادی اس ڈاکو کو کہتے ہیں جو مسلم حاکم وقت پر خروج کرنے والا اور رشتہ داریوں کو توڑنے والا ہے اور اسی طرح کی دوسرے جرائم میں مبتلا شخص بھی اس میں شامل ہے۔

ایک قول کے مطابق ''غَیْرَ بَاغٍ'' سے مراد کسی دوسرے مجبور پر بغاوت نہ کرنے والا اور ''لا عادٍ'' سے مراد اس کی بھوک میں رکاوٹ پیدا کرنے والا۔

ابن ابی حاتم سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان ''غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ'' کے بارہ میں ذکر کرتے ہیں کہ جس نے ان حرام شدہ اشیاء سے مجبوری کے وقت کچھ کھایا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے بغیر مجبوری کے کھایا تو اس نے بغاوت اور سرکشی کی۔ ابن منذر اور ابن ابی حاتم سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ''غَیْرَ بَاغٍ'' کے بارے میں ذکر کرتے ہیں کہ یہ مردار میں ہے اور ''وَّ لَا عَادٍ'' کھانے میں ہے۔

سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم، مجاہد کا قول بیان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ''غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ'' کے بارے میں کہ ''مسلمانوں پر بغاوت کرنے والا نہ ہو اور نہ ان پر زیادتی کرنے والا ہو جو رشتہ داری کو توڑتے ہوئے نکلے یا ڈاکہ

ڈالے یا زمین میں فساد کرے یا جماعت اور امام کے درمیان تفریق ڈالے یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی غرض سے نکلے اور وہ مردار کھانے پر مجبور ہو جائے تو اس کے لئے مردار کھانا جائز نہیں۔

ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ ابوسعید بن جبیر سے روایت کرتے ہیں کہ عادی ڈاکو کہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان "فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ" یعنی اس کے کھانے میں اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اسے جو حرام کھائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے ساتھ کس قدر رحیم ہے کہ اس نے مجبوری کے وقت اس کے لئے حرام کو حلال کر دیا۔

مضمون نمبر: ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔ (۱۷۸)

"اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے' آزاد آزاد کے بدلہ میں' غلام غلام کے بدلہ میں' عورت' عورت کے بدلہ' ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے تو اسے بھلائی کی اتباع کرنا چاہیے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنا چاہیے۔"

كُتِبَ عَلَيْكُمْ کا معنی ہے تم پر فرض کیا اور لازم کیا گیا' اسی سے عمر بن ابی ربیعہ کا قول بھی ہے ع

كُتِبَ الْقِتَالُ وَالْقَتَالُ عَلَيْنَا وَعَلَى الْغَانِيَاتِ جَرُّ الذُّلُوْلِ

یہ اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو اطلاع دی کہ اس نے ان کے لئے یہ قانون مقرر کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق كُتِبَ سے یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوح محفوظ میں قلم کے ساتھ یہ بات لکھی گئی اور قصاص کا اصل قصص الاثر ہے یعنی اس کے پیچھے جانا' اسی سے (قاص) قصہ گو ہے' کیونکہ وہ حکایات کو بیان کرتا ہے اور "قصص الشعر" یعنی بالوں کو جڑ سے اکھاڑنا" یہ محاورہ بھی اسی سے ہے گویا کہ قاتل قتل کرنے میں پہلے کے طریقہ پر چلتا ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے "فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا" یعنی وہ وہیں سے اپنے قدموں کے نشان ڈھونڈتے ہوئے واپس لوٹے۔

ایک قول کے مطابق قصاص **قصص** ماخوذ ہے سے جس کا معنی کاٹنا ہے' کہا جاتا ہے میں نے ان دو کے درمیان سے کاٹ دیا۔ اس آیت سے علماء جمہور یہ استدلال کرتے ہیں کہ آزاد کو غلام کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے۔

امام ابوحنیفہ' ان کے ساتھ ثوری' ابن ابی لیلیٰ اور داؤد رحمہم اللہ کا یہ کہنا ہے جب کہ وہ سردار نہ ہو تو اسے قتل کیا جائے گا' ہاں اگر وہ سردار ہے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا' اس بات پر اجماع ہے' مگر امام نخعی سے یہ روایت ہے کہ یہ مذہب امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا مطلق طور پر نہیں ہے'
امام شوکانی رحمہ اللہ نے منتقی کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ بات سیدنا علی اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہی بات سعید بن مسیب' ابراہیم النخعی' قتادہ اور حکم بن عیینہ نے کہی اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اسی فرمان سے استدلال کیا "وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ "اس استدلال کی تاویل کرنے والوں نے جواباً اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذکر کیا "اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ " یہ آیت النفس بالنفس کی تفسیر ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے توراۃ میں بطور شریعت مقرر کی تھی۔

دوسرے لوگ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے استدلال کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے خون آپس میں برابر ہیں"۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ مجمل ہے اور آیت اس کی وضاحت کرتی ہے' لیکن کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ" اپنے جملہ کے اعتبار سے صرف یہ فائدہ دیتا ہے کہ غلام کو غلام کے بدلہ میں اور آزاد کو آزاد کے بدلہ میں قتل کیا جائے مفہوم کے اعتبار سے اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ آزاد کو صرف غلام کے بدلہ میں قتل کیا جا سکتا ہے اور جو یہاں سے اس قسم کا مفہوم اخذ کرے گا تو اس پر اس کے متعلق قول کو ذکر کرنا لازم ہے اور جو یہ مفہوم اخذ نہیں کرتا تو اس پر یہاں کسی قول کا ذکر کرنا لازم نہیں۔ اس کے متعلق علم الاصول میں بحث لکھی گئی ہے۔

بعض کہنے والوں نے اس آیت سے یہ استدلال کیا کہ مسلمانوں کو کافر کے بدلہ میں قتل کیا جائے یہ کہنے والے کوفی اور امام ثوری ہے کیونکہ "حر" آزادی یہ جس طرح مسلمان پر منطبق ہوتی ہے تو اسی طرح کافر پر بھی ہوتی ہے اور اسی طرح غلامی اور نسوانیت کافر اور مسلم دونوں پر منطبق ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا اس فرمان سے بھی استدلال کیا "ان النفس بالنفس"

کیونکہ نفس کا لفظ جس طرح کافر کی جان پر صادق آتا ہے اسی طرح مسلمان کی جان پر بھی صادق آتا ہے۔

جمہور کا یہ کہنا ہے کہ مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا' ان لوگوں نے نبی ﷺ سے منقول سنت سے استدلال کیا کہ ''مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے، اوران دونوں آیات کی مراد کو واضح کرنے والی ہے (اس موضوع پر بحث بہت طویل ہے)۔اوراسی آیت سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے، انہوں نے گذشتہ کی طرح دلائل پیش کئے' ہاں اگر عورت کے اولیاء عورت کی دیت مرد کی دیت سے زیادہ دیں تو یہ بھی جائز ہے۔یہی امام مالک' شافعی' احمد' اسحٰق' ثوری اورابوثور کا مذہب ہے۔اور جمہور کا یہ موقف ہے کہ آدمی کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا اور دیت میں کوئی زیادتی نہیں یہی بات (حق) سچ ہے۔امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے منتقی کی شرح میں اس بحث کو وضاحت کے بیان کیا ہے لہٰذا مزید تحقیق کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔

میں کہتا ہوں میں نے اس مسئلہ کی وضاحت ''مسلک الختام شرح بلوغ المرام'' میں کی ہے جو دیکھنا چاہے تو وہاں دیکھ لے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ''فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ'' لفظ ''من'' سے قاتل یا مجرم مراد ہے اور ''اخی'' بھائی سے مراد مقتول یا اس کے اولیاء ہے اور ''شئی'' سے مراد خون ہے۔اس کا معنی یہ ہوا کہ قاتل یا مجرم کو جب کہ مقتول یا اس کے ورثاء کی طرف سے وہ خون معاف کیا جائے جو اس قتل کی سزا کے طور پر اس شرط پر لازم ہوا تھا کہ اس سے دیت یا ارش لی جائے' تو مقتول کے ورثاء کو چاہیے کہ قاتلوں سے اس خون کا بدلہ اچھے طریقے وصول کرے اور اسی طرح مجرم پر لازم ہے کہ جو دیت اس کے ذمہ لگی ہے تو وہ متعلقہ لوگوں کو اچھے طریقہ سے ادا کرے۔(دیت قتل کے بدلہ میں جو رقم ادا کی جائے اور ارش جو عضو کے بدلہ میں ادا کیا جائے)

ایک قول یہ ہے کہ ''من'' اس سے مراد ولی ہے اور ''اخ'' سے مراد قاتل ہے اور ''شیء'' سے مراد دیت ہے تو معنی یہ ہوا کہ مقتول کے ورثاء جب قصاص میں معافی کی طرف مائل ہوں اور دیت چاہتے ہوں تو' قاتل کو اختیار ہے کہ وہ دیت ادا کردے یا خود کو قصاص کے لئے ان کے سپرد کردے' جیسا کہ امام مالک سے مروی ہے کہ آپ اس صورت میں قاتل کے لئے اختیار ثابت کرتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے علماء کے مطابق اختیار نہیں دیا جائے گا' اگر اس صورت

میں کہ جب اولیاء دیت لینے پر راضی ہوں۔ لہٰذا قاتل کو اس میں کوئی اختیار نہیں اور اسے چاہیے کہ وہ اچھے طریقے سے دیت ادا کرے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ جوان دو گرہوں میں سے جس کو دیت سے کچھ زیادہ دیا جائے جو کہ جائز ہے تو اس صورت میں "عفی" کا معنی فضل ہے، لہٰذا اس صورت میں "عفی" کا معنی فضل ہے گزشتہ تمام توجیہات کی بنا پر "شیء" کا انکار اس کی حیثیت کم کرنے کے لئے ہے پس "شئی" معافی دیت میں معمولی سی چیز پر لاگو ہوگا اور معافی ورثا میں سے کسی ایک کی طرف سے آئے گی۔ اور اس صورت حال میں قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت ہوگی۔

ابن ابی حاتم سیدنا سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عربوں کے دو قبائل نے جاہلیت میں اسلام سے پہلے تھوڑی سی جھنگ کی، ان میں کچھ قتل ہوئے کچھ زخمی ہوئے حتیٰ کہ انہوں کو عورتوں اور بچوں کو قتل کیا اور ابھی انہوں نے ایک دوسرے سے دیت نہ لی تھی کہ وہ مسلمان ہوگئے تو ان میں سے ایک قبیلہ دوسرے پر سامان جنگ اور مال کے بارے میں ظلم کر رہا تھا اور انہوں نے قسمیں اٹھا رکھی تھیں کہ ہمارے غلام کے بدلہ میں ان کا آزاد قتل کیا جائے گا اور عورت کے بدلہ میں مرد قتل کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ عبد بن حمید اور ابن جریر نے شعبی سے اسی طرح بیان کیا۔

ابن جریر ابن منذر ابن ابی حاتم اور بیہقی نے اپنی سنن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ وہ لوگ مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل نہ کرتے، لیکن مرد کو مرد کے بدلہ میں عورت کو عورت کے بدلہ میں قتل کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے "النفس بالنفس" آیت نازل فرمائی۔ تو قتل عمد میں بطور قصاص آزاد لوگ آپس میں برابر ہوگئے، ان کے مرد ان کی عورتیں کسی جان کے قتل کرنے میں یا اس سے کم تر جرم میں اور اسی طرح غلام بھی قتل عمد میں یا اس سے کم تر جرم میں ان کے مرد اور ان کی عورتیں برابر ہیں۔

ابن جریر اور ابن مردویہ نے ابو مالک سے روایت بیان کی کہ انصار کے دو قبیلوں کے مابین جنگ تھی، ان میں سے ایک دوسرے پر غالب تھا گویا کہ یہ ان سے زائد کا مطالبہ کرتے تھے اور نبی ﷺ آئے تاکہ ان کے درمیان صلح کرا دیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ "الحر بالحر" الخ

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت نے "النفس بالنس" والی آیت کو منسوخ

کر دیا۔ عبد بن حمید، ابن جریر، امام حاکم اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ" کے بارہ میں روایت بیان کی، وہ کہتے ہیں کہ اس کے گھر والوں کی طرف سے معافی کے لئے رضا مندی کا ارادہ ہے اور "فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ" یہ معافی چاہنے والوں کے لئے حکم ہے اور "وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ" یہ قاتل کی طرف سے، کہتے ہیں کہ مطلوبہ چیز اچھے طریقہ سے ادا کر دیں اور "ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ" یہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں تم پر رب تعالیٰ کی تخفیف اور رحمت ہے جو ان میں قتل کے بدلہ میں عورت قتل ہوا کرتی تھی۔

امام بخاری وغیرہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں قصاص تھا اور ان میں دیت نہیں تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس امت سے فرمایا "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ" سے "فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ" تک پس معافی یہ ہے کہ قتل عمد میں دیت کو قبول کیا جائے اور "فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ" ان چیزوں میں سے ہے جو تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے "فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ" کا معنی یہ ہے کہ جس نے دیت لینے کے بعد قتل کیا اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے معافی کو بغیر معاوضہ یا معاوضہ کے ساتھ قانون بنا دیا ہے اور ان پر کوئی تنگی نہیں کی جیسا کہ یہودیوں پر کی تھی کیونکہ ان پر قصاص واجب تھا اور معافی کی اجازت نہ تھی اور جیسا کہ عیسائیوں پر تنگی کی کہ ان پر معافی واجب تھی اور دیت نہ تھی۔

اہل علم کا اس شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ جو دیت لینے کے بعد قاتل کو قتل کرے پس ایک جماعت جن میں امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ بھی ہیں، وہ یہ کہتی ہے کہ یہ اس کی طرح ہے جس نے شروع میں قتل کیا' ورثا چاہے اسے قتل کریں اور چاہیں تو اس کو معاف کریں۔ قتادہ عکرمہ اور سدی وغیرہ کا کہنا ہے کہ اسے لازمی قتل کیا جائے گا اور حاکم وقت ورثاء سے معافی نہ دلوائے۔ حسن رحمہ اللہ کا کہنا ہے اس کی سزا یہ ہے کہ وہ صرف دیت ادا کر دے اور اس کا گناہ آخرت کے عذاب تک باقی رہے گا۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا کہنا ہے اس کا معاملہ حاکم کے سپرد ہے وہ جس طرح مناسب سمجھے کرے۔

ابن جریر قتادہ سے بیان کرتے ہیں کہ تورات والے قصاص یا معافی دیا کرتے تھے ان کے

درمیان دیت نہیں تھی اور انجیل والوں کو صرف معافی کا حکم دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے قتل، معافی اور دیت کو رکھا ہے اور ان تین چیزوں کو ان کے لئے جائز قرار دیا یہ ان سے پہلے کسی امت کے لئے نہیں تھا۔ عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ احمد ابن ابی حاتم اور بیہقی نے ابوشریح الخزاعی سے روایت بیان کی کہ نبی ﷺ نے فرمایا جسے قتل کا صدمہ پہنچے وہ تین میں سے ایک کام کا اختیار رکھتا ہے یا تو وہ قصاص لے یا معاف کر دے یا دیت لے لے، اگر وہ چوتھی کسی چیز کا ارادہ کرے تو اس کے ہاتھ پکڑ لو اور جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

اس آیت سے یہ استدلال بھی کیا جا سکتا ہے کہ کبیرہ گناہ مومن بندہ کو اس کے ایمان سے خارج نہیں کرتا کیونکہ میں کوئی شک نہیں کہ عمداً قتل کرنا اور زیادتی کرنا بالاجماع کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور اس قتل کے باوجود بھی اسے ایمان کے ساتھ مخاطب کیا گیا اور جبکہ ابھی قصاص ادا کرنا بھی باقی ہے اسے مومن کہا، اسی طرح اخوت و بھائی چارگی کو اس قاتل اور ان ورثاء کے درمیان ثابت رکھا اس سے مراد ایمانی اخوت ہے اور اسی طرح اس کے معاف کر دینے کو اچھا عمل قرار دیا اور یہ چیز سوائے مومن کے کسی کے لائق نہیں۔ (مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ) اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ پس چاہیے کہ یاد رکھو۔

مضمون نمبر: ۱۲

فَمَنْ كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ (البقرة: ۱۸۴)

"لیکن تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اس دنوں میں گنتی کو پورا کر لے اور اس کی طاقت رکھنے والے فدیہ میں ایک مسکین کو کھانا دیں پھر جو شخص نیکی میں سبقت کرے تو وہ اسی کے لئے بہتر ہے لیکن تمہارے حق میں بہتر کام روزے رکھنا ہی ہے اگر تم باعلم ہو۔"

تمام مسلمانوں کے درمیان اس بات میں اختلاف نہیں کہ رمضان کے روزے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس امت پر فرض کئے ہیں۔

صیام کے معانی لغت میں رکنے اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے سے رک جانے کے ہیں ور شریعت میں طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک نیت کر کے کھانے پینے اور جماع سے رکنے کو کہتے ہیں۔

ایک قول کے مطابق مریض کی دو حالتیں ہیں اگر وہ روزے کی طاقت نہیں رکھتا تو روزہ چھوڑنا اس کے لئے اچھا عمل ہے اگر وہ تکلیف اور مشقت کے ساتھ طاقت رکھتا ہے تو اس کے لئے رخصت ہے یہی جمہور کا قول ہے۔

اہل علم کا سفر کی مسافت میں اختلاف ہے کہ کس قدر مسافت میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ ایک قول کے مطابق قصر نماز کی مسافت (اور قصر نماز کی مسافت میں اختلاف معروف ہے) معتبر ہے اور یہی قول جمہور کا ہے ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بلا دلیل مسافت کی مقدار ذکر کی ہے اور سچ بات یہ ہے کہ جس پر سفر کا نام صادق آتا ہو اس میں روزہ چھوڑنا جائز ہے۔ نیکی اور اطاعت کے سفر میں افطار کرنے پر اجماع ثابت ہے اور جائز سفروں میں اختلاف ہے (اور حق بات یہ ہے کہ اس میں بھی رخصت ہے) اسی طرح نافرمانی کے سفر میں اختلاف ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان "فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ" سے میری ایسی کوئی مراد نہیں جو ان روزوں کی ادائیگی کو پے در پے واجب کرتی ہو۔

اہل علم نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" کیا یہ محکم ہے یا منسوخ؟ رخصت روزے فرض ہونے کی ابتدائی ایام میں تھی کیونکہ یہ بھی مسلمانوں پر بھاری تھے تو جو شخص ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا اور طاقت رکھنے کے باوجود روزہ چھوڑ دیتا پھر یہ رخصت منسوخ ہوگئی یہی جمہور کا قول ہے۔ بعض اہل علم سے مروی ہے کہ یہ رخصت منسوخ نہیں ہوئی یہ بوڑھے مرد عورتوں کے لئے خاص ہے (جب کہ یہ لوگ مشقت کے ساتھ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہو) اور یہ صورت "يُطِيْقُوْنَهٗ" کو شد کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں مناسب ہے تو معنی یہ ہوگا کہ وہ اس سے تکلیف محسوس کرتے ہوں۔

جمہور کے نزدیک اس آیت کا ناسخ اللہ تعالیٰ کا فرمان "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" علماء نے فدیہ کی مقدار میں اختلاف کیا ہے ایک قول کے مطابق گندم کے علاوہ ہر روز ایک صاع (آجکل کے حساب کے مطابق ۲ کلو اور ایک سو گرام) ہے اور گندم سے نصف صاع ہے ایک قول کے مطابق صرف ایک مد (آدھا ۵۰۰ گرام) ہے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ کے فرمان "فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا" کا معنی یہ ہے کہ جو روزہ رکھنے کے ساتھ کھانا کھلانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ مجاہد کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے کھانے میں مد سے زیادہ دیا۔ ایک قول کے مطابق جس نے ایک مسکینوں کے ساتھ دو دوسرے مسکین کو کھانا کھلایا۔ "وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ" کا معنی یہ ہے کہ فدیہ دیکر افطار کرنے سے تمہارے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے اور یہ حکم منسوخ ہونے سے پہلے تھا۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ تم سفر اور بیماری میں مشقت کے بغیر روزہ رکھو۔

مضمون نمبر: ۱۳

فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ (البقرۃ: ۱۸۵)

"تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے تو اسے چاہیے کہ وہ روزے رکھے' ہاں جو بیمار ہو یا مسافر ہو تو اسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنا چاہیے' اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں' وہ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کر لو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں بیان کرو۔"

یعنی جو اس مہینہ میں موجود ہو اور وہ سفر میں نہیں بلکہ مقیم ہو۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے سلف' خلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے جو رمضان کا مہینہ اقامت کی حال میں پا لے اور مسافر نہ ہو تو اس پر روزہ رکھنا لازم ہے۔ اس کے بعد چاہے سفر شروع کر لے یا مقیم ہی رہے۔

اور جمہور کا کہنا ہے کہ جب وہ سفر شروع کر لے تو روزہ چھوڑ دے کیونکہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب وہ مہینہ میں شروع سے آخر تک موجود رہے' نہ کہ کچھ حصہ موجود ہو اور پھر وہ سفر کے لئے نکلے تو اس پر صرف وہ روزے فرض ہیں جب تک وہ مقیم رہے' یہی بات سچ ہے اور اس پر سنت صحیحہ کے دلائل ہیں اور نبی ﷺ رمضان میں سفر کے لئے نکلتے تو روزہ نہ رکھتے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان "یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ"۔ میں یہ بات ہے کہ یہ رب تعالیٰ کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے اور تمام دین کے امور میں اللہ تعالیٰ کی مراد میں سے ایک مراد ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے "مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ

حَــرَجٍ" اور رسول اللہ ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ آسانی کی رہنمائی کرنے اور مشکل کاموں سے منع فرماتے' جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "آسانی کرو تنگی نہ کرو خوشخبری دو' متنفر نہ کرو"، یہ صحیح میں موجود ہے۔ "یسر" سے مراد آسانی ہے جس میں تنگی نہ ہو اور یہاں تکبیر سے مراد اس کہنے والے کی بات ہے جو اللہ اکبر اللہ اکبر کہتا ہے۔

جمہور کا کہنا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ رمضان کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کی رغبت ہے' اس کے وقت میں اختلاف ہے۔ بعض سلف کے متعلق یہ مروی ہے کہ وہ عید الفطر کی رات تکبیرات کہا کرتے۔ ایک قول کے مطابق جب وہ شوال کا چاند دیکھتے تو خطبہ کے اختتام تک تکبیرات کہتے ایک قول کے مطابق امام کے نکلنے تک اور ایک قول کے مطابق عید الفطر کے دن کی تکبیرات مراد ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تکبیرات گھر کے نکلنے سے لے کر امام کے نکلنے تک ہیں' یہی بات امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تکبیرات صرف عید الاضحیٰ میں کہنا چاہئیں عید الفطر میں نہیں۔ عبد بن حمید اور ابن جریر' ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ" کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں کہ اس سے مراد گھر میں چاند دیکھنا ہے۔

ابن جریر' ابن ابی حاتم اور امام بیہقی رحمہ اللہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان "يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ" کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ آسانی یہ ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھا جائے اور تنگی یہ ہے کہ سفر میں روزہ رکھا جائے اور یہ بات رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو اگر تم پر بادل کر دیئے جائیں تو پھر تیس دن کی مدت پوری کر لو۔" سعید بن منصور اور ابن ابی شیبہ نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ بیان کیا کہ وہ اور تکبیر کہتے: "اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔"

مضمون نمبر: ۱۴

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ

عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عٰكِفُونَ فِي الْمَسٰجِدِ (البقرة:۱۸۷)

"(رمضان کے) روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں سے ملنا تمہارے لئے حلال کیا گیا' وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو' تمہاری پوشیدہ خیانتوں کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے' اس نے تمہاری توبہ قبول فرما کر تم سے درگذر فرما لیا' اب تمہیں ان سے مباشرت کی اور اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی چیز کو تلاش کرنے کی اجازت ہے اور تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے' پھر رات تک روزے کو پورا کرو اور عورتوں سے اس وقت مباشرت نہ کرو جب کہ تم مساجد میں اعتکاف میں (بیٹھے ہوئے) ہو۔"

اللہ تعالیٰ کے فرمان "اُحِلَّ لَكُمْ" میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ چیز حلال کی جو ان پر اس سے پہلے حرام تھی (یہ اسی طرح ہے) جس طرح کہ آیت کے شان نزول سے یہ فائدہ ملتا ہے۔ الرفث' یہ اشارہ ہے جماع کی طرف' زجاج کہتے ہیں کہ "رفث ایک جامع کلمہ ہے اور یہ ہر اس کام پر بولا جا سکتا ہے جو مرد اپنی بیوی سے چاہے۔" رفث کے بعد "الی" شامل کیا تاکہ عورت تک پہنچنے کے معنی کو شامل ہو۔

عورتوں کو مردوں کا لباس قرار دیا اور مردوں کو عورتوں کا کیونکہ جماع کا رفث ہر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک ہو جاتا ہے' یہ اس ملنے کی طرح ہے جو کپڑا اور کپڑا پہننے والے کے درمیان ہے۔ "خان اور اختان" ایک معنی میں ہیں' ان کا نام خیانت کرنے والے رکھا کیونکہ یہ جرم ان پر عائد ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان "فَتَابَ عَلَيْكُمْ" دو معنوں میں ہے۔ (۱) جو انہوں نے اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کی اس پر ان کی توبہ کی قبولیت۔ (۲) رخصت اور جائز قرار دے کر ان حکم میں تخفیف کرنا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان "عَفَا عَنكُمْ" میں ایک احتمال یہ ہے کہ گناہ سے معافی اور دوسرا یہ کہ گنجائش اور آسانی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان "اِبْتَغُوْا" ما کتب اللہ لکم۔ سے مراد بچہ ہے یعنی اپنی بیویوں سے مباشرت کے ذریعہ تم وہ چیز تلاش کرو جو نکاح کا سب سے بڑا مقصد ہے اور نسلِ اولاد کا حصول ہے۔ ایک قول کے مطابق قرآنِ کریم میں جو کام تمہارے لئے جائز قرار دیئے گئے انہیں تلاش کرو' یہ قول زجاج وغیرہ کا ہے۔ ایک قول کے مطابق گنجائش اور رخصت ہے اور ایک قول کے مطابق لونڈیاں اور بیویاں ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اقوال ہیں جو قرآنی اسلوب کے مطابق مفید نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی دلیل ہے۔

"خیط الابیض" سفید دھاگے سے مراد آسمان کے مشرقی کنارے کی سفید روشنی ہے، یہ وہ نہیں جو لومڑی کی دم کی طرح ہوتی ہے' وہ فجر کاذب ہے جو کسی چیز کو حلال کرتی ہے اور "خیط الاسود" نہ حرام۔ اور سیاہ دھاگے سے مراد رات کی سیاہی ہے اور تبیین کا معنی یہ ہے کہ ایک دوسرے سے ممتاز و الگ ہو جائے اور یہ کام اسی وقت ہوتا ہے جبکہ فجر کا وقت شروع ہو۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان "ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ" یہ فرضی روزوں کے لئے حکم ہے اور تمام روزوں کو شامل ہے۔ شافعی مسلک کے مطابق فرض روزوں کے لئے خاص ہے کیونکہ آیت اس ضمن میں آئی ہے۔

نفلی روزہ افطار کرنے کے جواز پر ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ہے جو امام مسلم نے بیان کی وہ کہتی ہیں کہ ہمیں حلوہ تحفہ میں دیا گیا' آپ ﷺ نے فرمایا مجھے دکھاؤ میں صبح سے روزہ دار تھا چنانچہ آپ ﷺ نے وہ حلوہ لے کر کھالیا۔ مزید یہ کہ اس میں یہ بھی تصریح ہے کہ روزے کی انتہا رات تک ہے۔ پس جب رات مشرق سے طلوع ہو اور دن مغرب میں چلا جائے تو روزہ دار روزہ افطار کرلے اور اس کے لئے کھانا پینا وغیرہ تمام کام جائز و حلال ہیں۔

یہاں مباشرت سے مراد جماع ہے' ایک قول کے مطابق یہ اس بوس و کنار کو بھی شامل ہے جس میں یہ عمل شہوت کے ساتھ ہو' جب شہوت کے بغیر ہو تو جائز ہے جس طرح کہ عطا شافعی ابن منذر وغیرہ نے کہا اور اسی پر اس اجماع کو محمول کیا جائے گا جو ابن عبدالبر نے نقل کیا ہے کہ معتکف نہ جماع کرے اور نہ بوسہ دے' پس یہ اجماع کا بیان اسی صورت میں مفید و معتبر ہے جو کہ یہ کام شہوت کے ساتھ ہوں۔

اعتکاف لغت میں ٹھہرنے کو کہتے ہیں اور شرع میں مخصوص شرائط پر مخصوص طریقہ سے ٹھہرنے کا نام ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ یہ واجب نہیں اور اس پر بھی کہ یہ صرف مسجد میں ہو سکتا

ہے۔ اعتکاف کے مکمل احکام حدیث کی شروحات میں موجود ہیں ان میں سے کچھ نے میں بلوغ المرام کی شرح میں بیان کئے ہیں۔

صحابہ کی جماعت سے اس آیت کے شان نزول کے بارے احادیث مروی ہیں جنہیں امام شوکانی رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں بیان کیا ہے' شوق رکھنے والے شخص کو چاہیے کہ اس کی طرف رجوع کرے۔

مضمون نمبر: ۱۵

وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۠ (البقرة:۱۸۸)

''اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو' نہ حاکموں کو رشوت پہنچا کر کسی کا کچھ مال ظلم وستم سے اپنا کر لیا کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔''

یہ حکم تمام امت کے لئے اور ہر قسم کے مال کے لئے عام ہے' اس عام حکم سے صرف وہی مال خارج ہو سکتا ہے جو مال کسی شرعی دلیل کی بنا پر لینا جائز ہو اور وہ حق کے ذریعہ لیا جائے نہ کہ باطل طریقہ سے اور حلال و جائز کھایا جائے نہ کہ گناہ کے ذریعہ سے کمایا ہوا مال' اگرچہ صاحب طعام ناپسند کرے۔ جیسا کہ قرض کی ادائیگی ہے جبکہ قرض دار اپنے قرض کو ادا کرنے سے روکے ہوئے ہو' زکوۃ وغیرہ جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے واجب کی ہے اسے تسلیم کرنا اور وہ خرچ جسے شریعت نے واجب قرار دیا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جس مال کو اس کے مالک سے لینا شریعت نے جائز قرار نہیں دیا وہ باطل طریقہ سے کھایا گیا ہے اگرچہ مال کا مالک خوشی سے دے جس طرح بدکاری کی اجرت اور نجومی کی شیرینی ہے اور شراب کی قیمت ہے۔

لغت میں ''باطل'' جانے اور ختم ہونے والے کو کہتے ہیں' معنی یہ ہوا کہ تم باطل طریقہ سے مال کھانے اور حکام کو جھوٹے دلائل دے کر رشوت کو جمع نہ کرو۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ حاکم کے فیصلہ سے حرام' حلال نہیں ہوتا اور نہ ہی حلال حرام ہوتا ہے اور مال و دولت اور شرمگاہوں میں کوئی فرق نہیں اور جس کے لئے جج کسی چیز کا فیصلہ کر دے (جج اس فیصلہ میں جھوٹی گواہی یا جھوٹی قسم کا سہارا لے) تو یہ کھانا اس کے لئے حلال نہیں ہوگا کیونکہ یہ لوگوں کا مال باطل طریقہ سے

حاصل کیا گیا ہے۔

اسی طرح حاکم رشوت لے اور کسی کے لئے ناحق فیصلہ کر دے تو یہ بھی لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھانا ہے اور اس بات میں علماء کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ حاکم کا فیصلہ حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہیں کرتا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے خلاف قول مروی ہے' تو ایسا قول جو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو، وہ نا قابل قبول ادر جیسا کہ ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے' وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میرے پاس جھگڑے لاتے ہو ممکن ہے تم میں سے کوئی دوسرے کی نسبت اپنی دلیل زیادہ اچھی طرح بیان کر سکتا ہو تو میں وہی فیصلہ کروں جس طرح میں سنوں' تو جس کے لئے میں اس کے بھائی کے حق میں کوئی فیصلہ کر دوں تو وہ اسے نہ لے کیونکہ میں نے اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔ یہ حدیث صحیحین وغیرہ میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''فریقًا'' یعنی ایک ٹکڑا' ایک حصہ' ایک جماعت۔

ابن جریر' ابن منذر اور ابن ابی حاتم' سیدہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر بارے میں روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ: ''یہ اس کے بارے ہے جس کے ذمہ مال ہو اور اس پر کوئی ثبوت نہ ہو تو وہ مال لے کر حاکم کے پاس جھگڑا کرے جبکہ اور وہ جانتا بھی ہے کہ سچ بات اس کے برخلاف ہے۔ سعید بن منصور اور عبد بن حمید مجاہد کا قول بیان کرتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے تم جھگڑا نہ کرو جبکہ تم جانتے ہو کہ تم ہی ظالم ہو۔ ابن منذر نے قتادہ سے اسی طرح بیان کیا۔

مضمون نمبر: ۱۶

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (البقرة:۱۸۹)

''لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں' آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں (کی عبادت) کے اوقات اور حج کے موسم کے لئے ہے (احرام کی حالت میں) اور گھروں کے پیچھے سے تمہارا آنا کوئی نیکی نہیں بلکہ نیکی والا وہ ہے جو متقی ہو اور گھروں

میں تم دروازوں میں سے آیا کرو۔"

الاھلۃ جمع ہے ھلال کی' یہ جمع پورے ماہ کے چاند کے اعتبار سے ہے یا ہر رات مختلف اوقات میں مختلف مقدار میں طلوع ہونے کے اعتبار سے۔ ہلال اس چاند کو کہتے ہیں جو مہینہ کے شروع اور آخر میں ظاہر ہوتا ہے' اس میں چاند کے زیادہ اور کم ہونے کی حکمت کی وجہ بیان ہوئی ہے' یہ اس لئے ہے کہ اوقات کی وضاحت ہو جائے جنہیں لوگ اپنی عبادات اور دوسرے معاملات میں مقرر کرتے ہیں جیسا کہ روزہ رکھنا' افطار کرنا' حج کرنا' حمل کی مدۃ اور عدت کا وقت معلوم کرنا' کرایہ جات اور قسمیں وغیرہ ادا کرنا' اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان "لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ" ۔ (یونس:۵) بھی ہے" تا کہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلیا کرو۔"

المواقیت جمع ہے میقات کی اور میقات وقت سے ہے۔ بعض علمائے معانی نے اس جواب یعنی "قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ" کو انتہائی حکیمانہ انداز تخاطب قرار دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس انداز سے جواب دینا جس کا اسے اندازہ نہ تھا' کیونکہ یہی سب سے مناسب واہم مقصد ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے چاند کی ہیئت کے بارے میں پوچھا کہ وہ کبھی زیادہ ہوتا ہے کبھی کم ہوتا ہے' تو انہیں جواباً وہ حکمت بتلائی گئی کہ جس کی وجہ سے یہ کمی بیشی ہوتی ہے کیونکہ پوچھنے والے کا سب سے اہم مقصد یہی تھا اور یہ بات زیادہ مناسب ہے کہ اسے یہ بات معلوم کروائی جائے۔
انصار جب حج کے لئے جاتے تو احرام باندھ لینے کے بعد حج مکمل ہونے سے پہلے اپنے گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہوتے بلکہ مکانوں کی چھتوں سے پھلانگ کر آتے، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ محرم کے لئے جائز نہیں کہ اس کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل ہو، اس لیے وہ اپنے گھروں کے پیچھے سے آتے۔

ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ یہ ضرب المثل ہے اور معنی یہ ہے کہ یہ نیکی نہیں کہ تم جاہلوں سے سوال کرو لیکن پرہیزگاری اور نیکی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے اور تم علماء سے سوال کرو جس طرح کہ محاورۃ "اقیت ھذا الامر من بابہ" یعنی میں اس کام کو اس کے دروازے سے آیا۔ ایک قول کے مطابق یہ مثال ہے عورتوں سے جماع کرنے کی کہ لوگوں کو عورتوں کے پاس سامنے سے آنے کا حکم دیا گیا نہ کہ پیچھے سے ان کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔

مضمون نمبر: ۱۷

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ (البقرۃ: ۱۹۰)

"لڑو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔"

اہل علم کے درمیان اس بات میں اختلاف نہیں کہ ہجرت سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ان فرامین "فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ" اور "وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا" "لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ" اور "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" کی وجہ سے قتال ممنوع تھا اور اسی طرح کی دوسری آیات جو حکمہ میں نازل ہوئیں۔

جب نبی ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جنگ کا حکم دیا اور سورہ بقرہ کی یہ آیت نازل فرمائی۔ ایک قول کے مطابق سب سے پہلے قتال کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان "اِنَّ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" نازل ہوا اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو جو آپ سے جنگ کرتا آپ اس سے جنگ کرتے اور جو آپ سے ہاتھ روک لیتا' آپ اس سے ہاتھ روک لیتے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرامین "اقتلوا المشرکین' قاتلوا المشرکین کافۃ" نازل کئے اور ایک قول کے مطابق اس آیت سے ستر آیات منسوخ ہوئیں۔

سلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ "اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ" سے مراد عورتوں' بچوں اور راہب وغیرہ کے علاوہ اور انہوں نے اس آیت کو محکم قرار دیا ہے' وہ اسے منسوخ نہیں کہتے اور "اِعْتَدٰی" زیادتی سے مراد پہلے قول والوں کی یہ ہے کہ کفار کے جو گروہ لڑائی کے قائل نہ ہوں ان سے لڑنا اور دوسرے قول کے جو قائل ہیں ان کے نزدیک "اعتدی" سے مراد یہ ہے کہ جو قتل کا مستحق ہو اسے چھوڑ دیا جائے اور کسی بے گناہ کو اس جرم میں قتل کر دیا جائے۔

مضمون نمبر: ۱۸

وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رَّحِيمٌ○

''انہیں مارو جہاں بھی پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے اور (سنو) فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کرو جب تک کہ یہ خود تم سے نہ لڑیں اگر یہ تم سے لڑیں تو تم بھی انہیں اور مارو کافروں کا بدلہ یہی ہے۔ اگر یہ باز آ جائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ خطاب مہاجرین کے لئے ہے اور ضمیر ''هُمْ'' کفار قریش کی طرف جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل کی اور مکہ سے ان لوگوں کو نکال دیا جو فتح مکہ کے وقت بھی مسلمان نہ ہوئے تھے ''فتنہ'' کے معنی اور مفہوم کے بارے میں مختلف اقوال ہیں اور ظاہر بات یہ ہے کہ اس سے مراد دین میں فتنہ ہے گو کہ اس کا کچھ بھی سبب ہو اور چاہے کیسی ہی صورت ہو بیشک وہ قتل سے زیادہ سخت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان ''وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'' میں اہل علم کا اختلاف ہے ایک گروہ کے مطابق یہ آیت محکم ہے کہ حرم میں جنگ جائز نہیں مگر اس صورت میں کہ کوئی زیادتی کرنے والا جنگ کرتے ہوئے حد سے گذرے تو اس کے دفاع میں اس کے ساتھ جنگ جائز ہے اور یہی بات صحیح ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ آیت مندرجہ ذیل آیت ''فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ'' ، سے منسوخ ہے اس استدلال کا جواب یہ دیا گیا کہ یہاں عام اور خاص کی بناء پر دونوں آیات کو جمع کرنا ممکن ہے پس مشرک کو حرم کے علاوہ جہاں بھی وہ مل جائے قتل کرنا چاہیے اور اس بات کی تائید نبی ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے کہ یہ حرم مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں تھا اور میرے لئے بھی دن میں کچھ وقت کے لئے حلال کیا گیا' یہ روایت صحیح میں موجود ہے۔

کہنے والوں نے نبی ﷺ کے اس فرمان کہ ''ابن خطل کو قتل کر دو جبکہ وہ کعبہ کے پردوں کے ساتھ لٹکا ہوا تھا' سے نسخ کی دلیل لی ہے' اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لئے حرم کو حلال کیا تھا۔ اور ''فان انتهوا'' کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے باز آ جائیں اور اسلام میں داخل ہو جائیں (تو اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے)

مضمون نمبر:۱۹

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۖ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○

''ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ مٹ نہ جائے' اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہ آ جائے پس اگر یہ رک جائیں (تو تم بھی رک جاؤ) اور زیادتی تو صرف ظالموں پر ہی ہے۔''

اس آیت سے مشرکین کے ساتھ جنگ کا حکم ہے اگر چہ وہ حرم میں ہوں اور وہاں جنگ کی ابتدا نہ بھی کریں۔

اس کی انتہا یہ ہے کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ تعالیٰ کا ہو اور یہ اسلام میں داخل ہونا اور اس کے مخالف بقیہ مذاہب سے نکلنا ہے' پس جو اسلام میں داخل ہوا اور شرک سے تائب ہو گیا تو اس سے جنگ جائز نہیں۔

ایک قول کے مطابق یہاں ''فتنہ'' سے مراد شرک ہے اور ظاہری طور پر اپنے عموم کی وجہ سے دین میں فتنہ مراد ہے جس طرح کہ پہلے گذر چکا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ تم زیادتی نہ کرو سوائے اس کے جو ظلم کرے اور ظلم یہ ہے کہ وہ فتنہ سے باز نہ آئے اور اسلام میں داخل نہ ہو اور ظالموں کے بدلے کو دشمن کا نام دیا گیا' اللہ تعالیٰ کے ان فرامین ''وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا اور فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ'' کی طرح۔

مضمون نمبر:۲۰

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (البقرۃ:۱۹۴)

''حرمت والے مہینے' حرمت والے مہینوں کے بدلے ہیں اور حرمتیں ادلے بدلے کی ہیں پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی کے مثل زیادتی کرو جیسی تم پر کی گئی ہے۔''

حرمات' حرمة کی جمع ہے' جیسے ظلمات' ظلمة کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حرمتوں کو جمع کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ حرمت والے مہینہ' شہر اور احرام کی حرمت و پاسداری کرنا ہے اور مراد یہ ہے کہ جس کسی چیز کی ... دلیل ... اور قصاص میں

برابری ہے تو معنی یہ ہوا کہ جس میں قصاص کا حکم جاری ہو وہ سب حرمت ہے' تو جو تمہاری حرمت پامال کرے تو تمہارے لئے بھی جائز ہے کہ تم بدلہ کے طور پر اس کی حرمت کو پامال کرو۔

ایک قول کے مطابق یہ شروع اسلام میں تھا پھر جنگ سے منسوخ ہو گیا اور ایک یہ ہے کہ یہ حکم امت محمدیہ کے درمیان بحال ہے اور منسوخ نہیں ہوا۔ تو اس کے لئے جائز ہے جس کے مال یا بدن میں زیادتی کی جائے کہ وہ اس قدر زیادتی کر سکتا ہے یہی بات امام شافعی وغیرہ نے کہی ہے۔ دوسروں کا کہنا ہے کہ قصاص کے معاملات حکام کے ذمہ ہیں اور اسی طرح مال کا حکم ہے نبی ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ: ''امانت ادا کرو جو تمہیں امین جانے اور جو تم سے خیانت کرے اس سے خیانت نہ کرو۔'' اسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا۔ یہی قول امام ابوحنیفہ کا جمہور مالکیوں اور عطاء خراسانی کا ہے۔ اور پہلا قول زیادہ راجح ہے۔ یہی بات ابن منذر نے کہی اور اسے ابن العربی اور قرطبی نے پسند کیا اور یہ مذہب امام اوزاعی نے امام مالک سے بیان کیا اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے ابوسفیان کی بیوی کے لئے جائز قرار دیا کہ اس کے مال میں سے اس قدر لے لیا کرے جو کہ اسے اور اس کی اولاد کو کافی ہو' یہ واقعہ صحیح میں موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ''فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ'' سے زیادہ واضح اور زیادہ صریح کوئی دلیل نہیں۔ یہ جملہ پہلے جملہ ''وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ'' کی تاکید میں ہے اور برابر بدلہ کو دشمنی کا نام اسی لئے دیا گیا جیسا کہ اوپر گذر چکا۔

ابن جریر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ۶ ہجری ۲/ ذی القعدہ میں (جو کہ حرمت والا مہینہ تھا) عمرہ کے لئے روانہ ہوئے اس وقت مشرکین نے مکہ میں داخل ہونے اور بیت اللہ تک پہنچنے سے روک دیا تو آپ ﷺ نے آئندہ سال دوبارہ آنے کی شرط پر ان سے صلح کر لی آپ ﷺ اور آپ کے ساتھی رضی اللہ عنہم آئندہ سال مکہ میں عمرہ کے لیے تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کے بارے میں اس آیت میں واقعہ بیان فرمایا:

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے اسی طرح بیان کیا اور عبد بن حمید اور ابن جریر نے مجاہد سے یونہی بیان کیا' انہوں نے قتادہ سے بھی اسی طرح بیان کیا اور ابن جریر نے ابن جریج سے بھی اسی طرح بیان کیا۔

ابوداؤد اپنی کتاب ناسخ میں' ابن جریر' ابن منذر' ابن ابی حاتم اور امام بیہقی اپنی سنن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرامین "فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ' وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ' وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ' وَاِنْ عَاقَبْتُمْ" کے بارہ میں روایت کرتے ہیں کہ: "یہ اور اس قسم کی آیات مکہ میں نازل ہوئیں' مسلمان اس وقت تھوڑے تھے' ان کے پاس کوئی بادشاہ نہ تھا جو مشرکین کو اپنی طاقت سے دبا سکتا جبکہ مشرکین، مسلمانوں کو گالی گلوچ اور اذیت رسانی کی پالیسی پر عمل پیرا تھے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو ان کے ساتھ بدلہ میں ایسا کر سکتا ہے تو وہ ان کی طرح کرے یا صبر کرے یا معاف کر دے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سلطان (سردار) کو عزت عطا فرمائی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان کے مظالم اپنے سردار تک پہنچاؤ اور جاہلیت کی طرح ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا ۔(الاسراء: ۳۳) "اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں مار ڈالا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو طاقت دے رکھی ہے۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "سردار اس کی مدد کرے گا حتیٰ کہ ظالم سے اسے انصاف دلوائے گا اور جو سردار کے بغیر خود ہی اپنی مدد کرنے لگا تو وہ نافرمان اور حد سے گذرنے والا ہے' اس نے جاہلیت کی حمیت والا کام کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی نہ ہوا۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ آیت جسے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما ناسخ قرار دیتے ہیں۔ یہ تو اس معنی کی تائید کرتی ہے جو آیات بقول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما منسوخ ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے طاقت رکھی ہے' یعنی اسے ایسی طاقت عطا فرمائی ہے کہ جس سے وہ قاتل پر مسلط ہو سکتا ہے' اسی لئے فرمایا کہ قتل میں زیادتی نہ کرو۔

پھر اگر ہم سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا معنی تسلیم کر لیں تو پھر یہ مذکورہ آیات کے عموم سے قتل کے لئے خاص ہوگی نہ کہ ان کی ناسخ' کیونکہ اس آیت میں صرف قتل ہی کا حکم بیان ہوا ہے اور وہ آیات قتل وغیرہ سب کو شامل ہیں اور یہ بات عربی زبان سے معلوم ہوتی ہے جو زبان کلام اللہ کی تفسیر کے لئے مرجع اور اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مضمون نمبر:۲۱

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ○ (البقرۃ:۱۹۵)

''اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور سلوک و احسان کرو' اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اس آیت میں فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا حکم ہے اور وہ جہاد ہے' یہ لفظ ہر عمل کو شامل ہے جس پر فی سبیل اللہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ بِاَیْدِیْكُمْ کی ''ب'' زائد ہے' اس کی مثال ''اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی'' میں بھی ''ب'' ہے۔ مبرد نے کہا بِاَیْدِیْكُمْ کا معنی ہے بِاَنْفُسِكُمْ محمول کرتے ہوئے کہ بعض ذکر کر کے کل مراد لیا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ''بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ''۔ ایک قول کے مطابق یہ بطور مثال کہا گیا ہے' عربی کا ایک محاورہ ہے کہ ''فلان القی بیدہ فی امر کذا'' ہے فلاں شخص نے اس کام میں اپنا ہاتھ ڈالا۔ یہ محاورہ اس وقت قرار پاتا ہے جبکہ کوئی فرمانبرداری کرے کیونکہ جنگ میں گرفتاری دینے والا اپنا اسلحہ اپنے ہاتھ سے پھینک دیتا ہے' اسی طرح ہر عاجز کا کام ہے چاہے وہ کسی بھی عمل میں ہو۔

ایک قوم کہتی ہے اس کی تقدیر یہ ہے کہ تم اپنی جانیں اپنے ہی ہاتھوں سے نہ ڈالو۔ اور التھلکۃ مصدر ہے ھلاکا و ھلکا و تھلکۃ سے' یعنی تم نہ پکڑو ایسی چیز کو جو تمہیں ہلاک کر دے۔ اس آیت کے معنی میں سلف کے کئی اقوال ہیں۔ عنقریب ان کا اور اس آیت کے شان نزول کا بیان آئے گا۔

حق بات یہ ہے کہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ خاص سبب کا' پس ہر وہ چیز جس پر یہ بات صادق آئے کہ وہ دین و دنیا میں ہلاکت کا باعث ہے تو وہ اس میں داخل ہے' یہی بات امام ابن جریر طبری نے فرمائی۔

من جملہ اس آیت کے حکم میں جو چیزیں داخل ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ آدمی جنگ میں کود جائے اور طاقت نہ ہونے کے باوجود اکیلا ہی لشکر پر حملہ کر دے اور ایسے فائدے کے بغیر ہی جو مجاہدین کے لیے نفع بخش ہو' اور سب منکرین کا انکار اس آیت کے تحت اس واقعہ کے اندراج کے لیے رکاوٹ ہرگز نہیں ہے' ان کا گمان یہ ہے کہ آیت اسباب پر متجاوز نہیں ہو سکتی اور اس گمان

کو عربی زبان دور کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان "وَأَحْسِنُوا" یعنی اطاعت کے دائرہ میں رہ کر خرچ کرو اور اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھو کہ وہ اس خرچ کے بدلہ تمہیں اچھا دے گا۔

عبد بن حمید اور امام بخاری اور امام بیہقی اپنی سنن میں سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت خرچ کے بارے میں نازل ہوئی۔ سعید بن منصور' عبد بن حمید' ابن جریر' ابن منذر اور ابن ابی حاتم' سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ: "یہ تنگدستی کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ چھوڑنا ہے۔" عبد بن حمید اور امام بیہقی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح بیان کرتے ہیں' عبد بن حمید اور ابن جریر عکرمہ سے بھی اسی طرح بیان کرتے ہیں اور ابن جریر نے حسن سے بھی اسی طرح بیان کیا۔ ابن حمید اور بیہقی شعب الایمان میں حسن سے بیان کرتے ہیں کہ یہ بخل ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم' زید بن اسلم سے اس آیت کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ: "لوگ ان لشکروں کے ساتھ بغیر خرچ جاتے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا کرتے تو وہ لوگ اثناءِ راہ یا تو لشکر سے الگ کر دیئے جاتے یا وہ بوجھ بن جاتے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ "جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا ہے اس سے خرچ کریں اور یہ کہ خود کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔" ہلاکت یہ ہے کہ آدمی بھوک پیاس اور چلنے سے ہلاک ہو جائے' اللہ تعالیٰ نے مال داروں سے فرمایا ہے کہ "تم احسان کرو' اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

عبد بن حمید' ابو یعلیٰ' ابن جریر اور بغوی اپنی معجم میں ابن منذر' ابن ابی حاتم' ابن حبان' ابن قانع اور طبرانی' ضحاک بن جبیر سے روایت بیان کرتے ہیں کہ: "انصاری اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے' صدقہ کرتے' ایک مرتبہ انہیں قحط سالی کا سامنا کرنا پڑا جس سے ان کو خدشہ ہوا اور اس کام سے انہوں نے اپنا ہاتھ روک لیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔"

عبد بن حمید' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابو یعلیٰ' ابن جریر' ابن ابی حاتم' حاکم' طبرانی' ابن مردویہ اور امام بیہقی اپنی سنن میں اسلم بن عمر سے روایت کی کہ: "ہم قسطنطنیہ میں تھے اور اہل مصر پر سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور اہل شام پر سیدنا فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ تھے' تو رومیوں کی ایک بڑی صف نکلی' ہم نے بھی ان کے مقابلہ میں صف بندی کی' مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے رومیوں کی صف پر حملہ کر دیا حتیٰ کہ وہ ان میں داخل ہو گیا تو لوگ چیخنے لگے اور کہنے لگے سبحان اللہ اس نے خود کو

ہلاکت میں ڈال دیا' تو صحابی رسول سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اٹھے اور فرمایا کیا تم اس کی تفسیر میں تاویل کرتے ہو؟ یہ آیت تو ہم انصار کی جماعت کے بارہ میں نازل ہوئی اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو عزت عطا فرمائی اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو ہم میں سے بعض لوگ رسول اللہ ﷺ سے چھپا کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ: ''لوگوں کے مال ضائع ہو چکے اور یقیناً اللہ پاک نے اسلام کو عزت عطا فرمائی اور اس کے مددگار زیادہ ہو گئے تو کیوں نہ ہم اپنے مالوں کی طرف جائیں اور جو ضائع ہو چکے ہیں ان کی اصلاح کر لیں؟ تو اللہ عزوجل نے اپنے نبی ﷺ پر یہ آیت ہمارا رد کرتے ہوئے نازل فرمائی۔ پس ہلاکت یہ ہے کہ اموال کی دیکھ بھال کے لئے جانا اور اس جنگ و جہاد کو چھوڑ دینا ہے۔''

عبد بن حمید' ابن جریر' ابن منذر' ابن ابی حاتم اور بیہقی نے سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت بیان کی کہ: ''آدمی گناہ کرتا ہے تو اپنے ہاتھ سے خود کو ہلاکت میں ڈالتا ہے' تو وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' عبد بن حمید ابن حمید ابن منذر' ابن مردویہ' طبرانی اور بیہقی شعب الایمان میں نعمان بن بشیر سے اسی طرح بیان کرتے ہیں۔ عبد بن حمید' اور ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ یہ مایوسی ہے۔

ابن جریر' ابن منذر اور ابن ابی حاتم' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ ''ہلاکت اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔'' ابن ابی حاتم عبدالرحمٰن بن الاسود بن عبد یغوث سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے دمشق کا محاصرہ کیا ہوا تھا تو ایک آدمی اکیلا ہی دشمن کی طرف دوڑ کر گیا تو اس پر مسلمانوں نے عیب لگایا اور انہوں نے اس واقعہ کو سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی طرف بطور اطلاع کے بھیجا انہوں نے اس آدمی کی تقرری بھیجی اور فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''وَلَا تُلْقُوْا'' الآیۃ

ابن جریر ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان ''وَأَحْسِنُوْا'' کا مقصد ہے کہ: ''ذمہ داریاں ادا کرو'' عبد بن حمید ابو اسحٰق سے اسی طرح بیان کرتے ہیں' عبد بن حمید اور ابن جریر' عکرمہ سے بیان کرتے ہیں کہ: ''تم اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھو۔''

مضمون نمبر: ۲۲

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۔

''حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے پورا کرو۔''

علماء نے حج وعمرہ کو مکمل کرنے کے معنی ومراد میں اختلاف کیا ہے۔ایک قول کے مطابق ان کی ادائیگی کے لئے ایسے جانا کہ اس میں کوئی نافرمانی نہ ہو اور نہ کسی فرض یا شرط میں کمی واقع ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: "فَاَتَمَّهُنَّ" اور "ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ" ہے۔

سفیان ثوری کہتے ہیں پورا کرنے کا معنی ہے کہ "صرف اس غرض سے نکلے اور اس کے علاوہ اور کوئی غرض نہ ہو"۔ایک قول کے مطابق پورا کرنے کا معنی ہے کہ "دونوں عمل الگ الگ کئے جائیں نہ یہ تمتع ہو اور نہ قران ہو۔" یہی بات ابن حبیب نے کہی' وہ کہتے ہیں کہ ان کو پورا کرنا یہ ہے کہ "ان میں کوئی ایسا کام نہ کریں جو ان کے لئے نامناسب ہو۔" ایک قول کے مطابق ان کا پورا کرنا یہ ہے کہ "اپنے گھر سے ہی ان کا احرام باندھیں" اور ایک قول کے مطابق کہ "ان دونوں کے سفر میں حلال اور پاکیزہ مال خرچ کرے۔"

ابن ابی حاتم ابونعیم دلائل میں اور ابن عبدالبر التمہید میں یعلی بن امیہ سے روایت ذکر کرتے ہیں کہ: "ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا' اس وقت آپ جعرانہ مقام پر تھے' آنے والے پر خوشبو کے نشان تھے' اس نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے میرے عمرہ کے بارے میں کیا حکم کرتے ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے آیت "وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ"۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عمرہ کے بارے میں پوچھنے والا کہاں ہے؟ اس نے کہا میں یہ ہوں' آپ ﷺ نے فرمایا جبہ اتار دے اور خود سے خوشبو کا اثر ختم کرے' پھر جو تو اپنے حج میں کرتا ہے وہی عمرہ میں کر۔" اسے امام بخاری اور مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے' لیکن ان کی حدیث میں ہے کہ سوال کے بعد نبی ﷺ پر وحی نازل ہوئی اور وحی کیا نازل ہوئی' اس کا ذکر انہوں نے نہیں کیا۔

ابن جریر اور سیدنا ابن منذر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حج کی تکمیل قربانی کے دن ہے جبکہ جمرۂ عقبہ کو کنکر مارے جائیں اور جب بیت اللہ کی زیارت کر لی جائے تو وہ حلال ہے اور عمرہ کی تکمیل یہ ہے جبکہ بیت اللہ کا طواف کر لے صفا ومروہ کی سعی کر لے تو وہ حلال ہو گیا۔حج وعمرہ کے فضائل میں بہت احادیث وارد ہوئی ہیں یہ جگہ ان کے ذکر کی نہیں اور امت کا حج کے واجب ہونے پر اتفاق ہے کہ جو اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔

اس آیت سے عمرہ کے وجوب پر استدلال کیا گیا ہے کیونکہ مکمل کرنے کا حکم ہی اس کا حکم ہے' یہ بات علی ابن عمر' ابن عباس' عطا' طاؤس' مجاہد' حسن' ابن سیرین' شعبی' سعید بن جبیر' مسروق' عبداللہ بن شداد' شافعی' احمد' اسحق' ابوعبید اور ابن جہم مالکی نے کہی۔امام مالک' نخعی اور اصحاب

رائے نے جیسا کہ یہ بات ابن منذر نے بیان کی کہ یہ سنت ہے' امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ وہ اس کے وجوب کے قائل تھے۔

اسے سنت کہنے والوں میں سیدنا ابن مسعود اور سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور حج وعمرہ کو واجب کہنے والوں نے جس چیز سے استدلال کیا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح میں ثابت ہے کہ "آپ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ جس کے ساتھ قربانی ہے وہ حج وعمرہ کا تلبیہ کہے" اور یہ بات بھی صحیح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عمرہ حج میں قیامت کے دن تک داخل ہو گیا ہے۔" دارقطنی اور امام حاکم نے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں جس سے بھی ابتداء کرلو۔"

دوسری جماعت نے اس سے استدلال کیا جو امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں ذکر کیا ہے اور عبدالرزاق' ابن ابی شیبہ اور عبد بن حمید نے ابوصالح الحنفی سے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے۔" ابن ماجہ نے طلحہ بن عبیداللہ سے مرفوعاً اسی طرح بیان کیا۔ ابن ابی شیبہ' عبد بن حمید اور امام ترمذی نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا عمرہ کے متعلق کیا وہ واجب ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں' البتہ تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم عمرہ کرو۔ ان لوگوں نے اس آیت اور ان احادیث سے جو اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ عمرہ واجب اور فرض ہے' تو جواب یہ ہے کہ یہ صورت اس وقت ہوگی کہ جب کوئی آدمی عملاً اس عمرہ میں داخل ہو جائے تو وہ بلا اختلاف واجب ہو جائے گا۔ یہ استدلال اگرچہ کمزور اور ناقص ہے لیکن دلائل میں تطبیق کے لئے اس راستہ کو اپنانا ضروری ہے۔

خصوصاً جبکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے واجب نہ ہونے کی صراحت موجود ہے اسی پر ان دلائل کو محمول کیا جائے گا جو اس کے وجوب کے لئے وارد ہوئے ہیں۔ جیسا کہ امام شافعی نے کتاب الام میں ذکر کیا کہ وہ خط جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کے لئے لکھا تھا "عمرہ چھوٹا حج ہے" اور اس حدیث کی طرح جو امام بیہقی شعب الایمان میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا' اس نے کہا آپ مجھے وصیت کیجئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر' نماز قائم کر' زکوۃ ادا کر اور ماہ رمضان کے روزے رکھ' حج کر' عمرہ کر' سن اور اطاعت کر اور علانیہ زندگی کو اپنا اور چھپ کر زندگی گزارنے سے بچ۔

اور جن احادیث میں حج اور عمرہ کا اکٹھا ذکر ہے تو اس کے لیے یہی کہنا مناسب ہے کہ حج اور عمرہ یہ تمام اعمال سے افضل ہیں ان دونوں کے دوران ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہے اور گزشتہ تمام برائیوں کو ختم کر دینے والے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ حصر کا معنی ہے روکنا۔ ابوعبیدہ' کسائی اور خلیل کہتے ہیں کہ محاورہ اس طرح ہے "احصر بالمرض و حصر بالعدو" یعنی مرض بیماری کی وجہ سے روک دیا گیا یا دشمن نے محاصرہ کر لیا ہے۔ جبکہ ابن فارس کی مجمل میں اس کے برعکس ہے اس میں کہا گیا "احصر بالعدو حصر بالمرض"۔ دشمن کی طرف سے گھیرا کیا گیا اور بیماری سے روک لیا گیا اور ابن عربی نے پہلی بات کو ترجیح دی ہے اور وہ کہتے ہیں اکثر اہل لغت کی یہی رائے ہے۔ زجاج کہتے ہیں تمام اہل لغت سے اسی طرح مروی ہے۔ فراء کہتے ہیں یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں خواہ بیماری دشمن میں سے اس بات کی ابوعمرو الشیبانی نے موافقت کی اور کہا کہ "حصرنی الشیء و احصرنی" مجھے کسی چیز نے روکا اور اس نے میرا محاصرہ کیا' میں مستعمل ہوں' یعنی روک رکھا۔

اہل لغت کے درمیان اس اختلاف کی وجہ سے ائمہ فقہاء نے اس آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ وہ ہے اَلْمُحْصَرَ جو کہ سے احرام باندھ لینے کے بعد کسی ممنوعہ کام کو چلے' بیماری' دشمن یا کسی اور وجہ سے۔ شوافع اور مدینہ والے کہتے ہیں آیت سے مراد دشمن کا روکنا ہے۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ دشمن کا روکنا جہاں بھی یہ روک دیئے جائیں اور اگر قربانی ساتھ ہو تو قربانی ذبح کر کے سر منڈا دینا ان کے لیے حلال کر دیان ہے جس طرح کہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ کے مقام پر کیا تھا۔

امام شافعی نے کتاب الام عبدالرزاق' ابن ابی شیبہ' عبد بن حمید' ابن جریر' ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے کہ دشمن کے روکنے کے سوا کوئی حصر نہیں' ہاں جسے کوئی بیماری یا تکلیف پہنچے یا راستہ سے بھٹک جائے تو اس کے ذمہ کوئی چیز نہیں' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "فاذا امنتم" "جب تم امن میں ہو" تو یہ امن خوف کے بعد ہوا کرتا ہے۔

ابن ابی شیبہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ دشمن کے سوا کوئی روکنا نہیں۔ اور زہری سے بھی اسی طرح روایت ہے اور ابن شیبہ نے عطاء سے انہوں نے کہا کہ "رکاوٹ صرف بیماری' دشمن یا کسی ممنوعہ کام کی ہی معتبر۔" انہوں نے عروہ سے بھی نقل کیا ہے: "جو چیز بھی محروم کو روک دے۔۔۔" امام بخاری رحمہ اللہ ۔۔۔ رضی اللہ عنہ ۔۔۔ کہ رسول اللہ ﷺ

نے سر منڈانے سے پہلے قربانی کی اور اسی بات کا اپنے ساتھیوں کو بھی حکم دیا۔

ابن جریر اور ابن منذر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان "فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ" کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں کہ: "جس نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا' پھر بیت اللہ تک پہنچنے سے کسی تکلیف دہ بیماری نے یا دشمن نے اسے روک دیا تو اس پر قربانی لازم ہے جس قدر میسر ہو' چاہے بکری ہو یا اس سے اوپر' اگر وہ فرض حج کے لئے جا رہا تھا تو اس پر قضا لازم ہے اور اگر فرض ادا کرنے کے بعد کسی وقت ایسا ہوا تو پھر اس پر قضا نہیں۔"

سعید بن منصور' عبد بن حمید' ابن جریر اور ابن ابی حاتم سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان "فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ" کی تفسیر میں روایت نقل کرتے ہیں کہ: "آدمی جب حج کا تلبیہ کہے اور اسے روک دیا جائے تو اس کی جو طاقت ہو وہ قربانی بھیج دے اور اس قربانی کے اپنی جگہ پر پہنچنے سے پہلے ہی اگر وہ آدمی اپنا سر منڈا دے، یا خوشبو لگائے یا کوئی دوا استعمال کرے تو اس پر روزہ' صدقہ یا قربانی سے فدیہ ہے' روزے ہوں تو تین دن' صدقہ ہو تو تین صاع چھ مسکینوں کے لئے (ہر مسکین کے لئے آدھا صاع) ہے اور قربانی ہو تو ایک بکری۔

فَإِذَا أَمِنتُمْ کے بارے میں کہتے ہیں کہ پس جب ٹھیک ہو جائے تو اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف جائے اور حج کی جگہ عمرہ ادا کرے اور اس پر آئندہ سال کا حج ہے اور اگر وہ واپس گھر لوٹ آیا اور بیت اللہ نہ گیا تو پھر اس پر حج و عمرہ دونوں لازم ہیں اور اگر حج کے مہینوں میں فائدہ اٹھاتے ہوئے لوٹا تو اس پر طاقت قربانی بکری ہے' اگر یہ میسر نہ ہو تو تین دن حج کے ایام میں اور سات دن جب تم واپس اپنے گھروں میں آ جاؤ، تو روزے رکھو۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سعید بن جبیر سے بیان کی تو انہوں نے کہا اسی طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس حدیث میں فرمایا:

فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ' یہ وہ ہے کہ جسے بیت اللہ کی طرف چلایا جائے' وہ اونٹ یا کوئی اور جانور ہو۔ جمہور کا کہنا ہے کہ وہ بکری ہو۔ سیدنا ابن عمر' ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اونٹ یا گائے ہو۔ حسن کہتے ہیں سب سے اعلیٰ و افضل قربانی اونٹ کی ہے پھر درمیانی درجہ کی گائے ہے اور کمتر درجہ میں بکری ہے۔

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ۔ یہ خطاب تمام امت کے لئے ہے اگرچہ وہ محاصرہ میں ہوں یا نہ ہوں' یہی موقف اہل علم کی ایک جماعت کا ہے۔ ایک گروہ کا

موقف یہ ہے کہ یہ خطاب محاصرہ میں موجود لوگوں سے خاص ہے یعنی احرام سے اس وقت تک حلال نہ ہونا جب تک کہ تمہیں معلوم نہ ہو جائے کہ قربانی جسے تم نے حرم کی طرف بھیجا ہے اپنے مقام تک پہنچ چکی ہے اور یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں اسے ذبح کرنا جائز ہے۔

اس جگہ کی تعین میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ محاصرہ کی ہی جگہ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو حدیبیہ کے سال روک دیا گیا تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ حرم ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان "ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ" کی وجہ سے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ مخاطب ہے جو امن میں ہو اور اس کا بیت اللہ تک پہنچنا ممکن ہو۔ احناف' نبی ﷺ کے حدیبیہ میں نحر کرنے کا جواب دیتے ہیں کہ حدیبیہ کا وہ کنارہ جو مکہ کی نشیبی جانب ہے وہ حرم میں داخل ہے۔ اس پر احناف کا رد اسطرح کیا گیا کہ جس پر نبی ﷺ نے قربانی کی تھی وہ جگہ حرم میں سے نہیں ہے۔

"فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ" یہاں مرض سے مراد ہر وہ تکلیف ہے جس پر لغت کے اعتبار سے بیماری کا نام لیا جا سکے اور سر میں تکلیف سے مراد یہ ہے کہ اس میں جوئیں یا زخم یا اس طرح کی کوئی اور تکلیف ہو تو آیت کا معنی یہ ہوا کہ جو مریض ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور وہ سر منڈا دے تو ایسے شخص پر فدیہ ہے اور سنت ایسے موقعہ پر روزہ' صدقہ اور قربانی ثابت کرتی ہے۔

صحیح میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو احرام کی حالت میں دیکھا کہ ان کے چہرے پر جوئیں گر رہی ہیں تو آپ ﷺ نے نہیں سر منڈانے کا حکم دیا اور چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے یا بکری قربان کرنے یا تین دن روزہ رکھنے کو کہا۔ (بخاری)

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اس بات میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ وہاں قربانی بکری کی ہے۔ اور انہوں نے جمہور سے یہ نقل کیا کہ آیت میں مذکور روزہ تین دن ہے اور کھانا کھلانا چھ مسکینوں کو ہے۔ حسن' عکرمہ اور نافع سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ تکلیف کا فدیہ دس دن کے روزے ہیں اور کھانا دس مسکینوں کا ہے۔ گذشتہ صحیح حدیث ان پر رد ہے اور ان کے قول کو باطل قرار دیتی ہے۔

امام مالک' شافعی' ابوحنیفہ' ان کے ساتھی اور داؤد رحمہم اللہ کا موقف یہ ہے کہ اس صورت میں کھانا کھلانا نبی ﷺ کے مد کی طرح کے دو مد ہیں یعنی ہر مسکین کے لئے۔ ثوری کہتے ہیں کہ گندم کا

نصف صاع اگر اس کے علاوہ کوئی اور جنس ہو تو ایک صاع۔ یہ بات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، پھر کیونکہ کعب رضی اللہ عنہ کی اطلاعات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا تھا کہ کھجور کے تین صاع چھ مسکینوں پر صدقہ کرو۔ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف روایات آتی ہیں ایک قول ان سے مالک اور شافعی کی طرح مروی ہے اور ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر گندم کھلائی جائے تو ہر مسکین کے لئے ایک مد ہے اور اگر کھجور کھلائی جائے تو نصف صاع ہے۔

اس فدیہ کی ادائیگی کی جگہ میں اختلاف ہے، عطا کہتے ہیں کہ جو خون (قربانی) ہے وہ تو مکہ میں دینی چاہے اور کھانا اور روزے جہاں چاہے رکھے یہی بات اصحاب رائے کہتے ہیں۔ طاؤس اور شافعی کا کہنا ہے کہ کھانا اور قربانی مکہ کے سوا نہیں ہوسکتی اور روزے جہاں چاہے رکھے۔ مالک اور مجاہد کہتے ہیں کہ تمام کام جہاں چاہے کرے۔ امام شوکانی فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ یہ آخری بات ہی صحیح ہے کیونکہ جگہ متعین کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔

"فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ" یعنی جب تم بیماری سے صحت یاب ہو جاؤ۔ ایک قول کے مطابق دشمن کے خوف سے (گذشتہ کے برخلاف) لیکن دشمن سے بے خوفی زیادہ ظاہر ہے۔ بیماری کے اختتام پر اَمِنۡتُمۡ کے استعمال سے اس صورت میں یہ اس قول کو مضبوط کرے گا جو کہتا ہے "فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ" سے مراد دشمن کا گھیراؤ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا" ہے اور یہ اس کے قول کی تائید کرتا ہے جو یہ بات کہے کہ یہاں صرف بیماری کا عذر مذکور ہے۔

یہاں اختلاف واقع ہوا ہے کہ کیا اس سے مخاطب صرف محصورین ہیں یا تمام امت ہے؟ جیسا کہ گزر چکا ہے۔

"فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَی الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَیۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡیِ"۔ تمتع کا معنی ہے کہ آدمی عمرہ کا احرام باندھے اور عمرہ ادا کرے حلال ہو کہ مکہ میں ہی رہے یہاں تک کہ پھر وہاں سے ہی حج کا احرام باندھے، تو اس طرح عمرہ کرنے سے اس کے لیے وہ کام حلال ہے۔ جو محرم کے لئے حلال نہ تھے تو یہ معنی ہے تمتع و استمتع کا اور اہل علم کے مابین تمتع کے جائز ہونے پر کوئی اختلاف نہیں۔ امام شوکانی فتح القدیر میں فرماتے ہیں: "بلکہ میرے نزدیک حج کی اقسام میں سب سے افضل ہے جیسا کہ میں نے منتقیٰ کی شرح میں لکھا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ کی مختصر کتاب "الدرر البہیہ اور اس کی شرح "الدراری المضیة" میں بھی یہی مذکور ہے اور اس معنی میں اختلاف گذر چکا ہے۔

"فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ"

یعنی جو قربانی نہ پائے' مال نہ ہونے کی وجہ سے' یا جانور نہ ہونے کی وجہ سے تو وہ تین دن حج کے ایام میں روزہ رکھے اور یہ احرام کی ابتدا سے قربانی کے دن تک رکھ سکتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یوم الترویہ (آٹھ ذی الحجہ) سے ایک دن پہلے' یوم الترویہ اور عرفہ کے دن تھے۔ ایک قول کے مطابق حج کا احرام باندھنے سے لے کر عرفہ کے دن تک۔ ایک قول کے مطابق یہ روزے ذی الحجہ کے پہلے عشرہ سے رکھے۔ ایک قول کے مطابق جب تک کہ وہ مکہ میں رہے۔ ایک قول کے مطابق جائز ہے کہ احرام سے پہلے تینوں روزے رکھے۔ بعض اہل علم نے ایام تشریق میں اس شخص کے لیے روزے جائز قرار دیئے ہیں جو قربانی نہ کر سکے اور کچھ دوسروں نے منع کیا ہے۔

"اِذَا رَجَعْتُمْ" یہاں واپس پلٹنے سے مراد اپنے وطن کو واپس پلٹنا ہے۔ احمد اور اسحٰق کہتے ہیں کہ راستہ میں روزہ کفایت کر جائے گا اور اس پر اس کے واجب میں ایسی کوئی تنگی نہیں جب کہ وہ اپنے وطن پہنچ جائے۔ یہی بات شافعی' قتادہ' ربیع' مجاہد' عکرمہ اور حسن رحمہم اللہ وغیرہ کہتے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں جب منیٰ سے واپس پلٹے تو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں اور پہلی بات زیادہ راجح ہے۔

صحیح میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو قربانی نہ پائے وہ حج میں تین دن روزہ رکھے اور سات روزے جب گھر کو واپس پلٹ جائے (وہاں جا کر رکھے)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں رجوع کی وضاحت فرمائی کہ اس سے مراد گھر کو واپس جانا ہے۔

یہ بات بھی صحیح میں ثابت ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "اور سات روزے رکھنا جب تم اپنے شہروں کو لوٹ جاؤ" اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا یہ دس مکمل ہو گئے اس کے باوجود کہ ہر شخص جانتا ہے کہ تین اور سات دس ہوا کرتے ہیں' لیکن اس وہم کو دور کرنے کے لئے کہ کوئی اس کو اختیار نہ سمجھ بیٹھے کہ اگر حج کے دنوں میں رکھے تو تین دن اور اگر گھر لوٹ کر رکھے تو سات' یہ بات زجاج نے کہی۔ اور مبرد کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تصریح کے ساتھ اس لئے ذکر کیا کہ یہ دلیل ہے تعداد کو پورا کرنے پڑتا کہ کوئی وہم کرنے والا یہ خیال نہ کر لے کہ سات کو ذکر کر دینے کے بعد بھی کچھ باقی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ تاکید ہے عرب لوگ اس قسم کا خلاصہ ذکر کرتے ہوئے اس کے ترجمہ ... جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ثلاث واثنتان فهن خمس او سادسة تميل الى شماسی
یعنی تین اور دو پانچ ہیں اور چھٹی میرے انکار کی طرف حائل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان: كاملة یہ کل حساب ذکر کرنے کے بعد روزہ کی دوسری تاکید ہے روزوں کے حکم کی مزید پختگی کے لیے لائی گئی ہے تاکہ اس تعداد میں کمی نہ ہونے پائے۔

"ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" میں بعض لوگوں کے نزدیک حج تمتع کی طرف اشارہ ہے، تو ایسی صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ مسجد حرام کے پاس رہنے والوں کے لئے تمتع جائز نہیں' جیسا کہ ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا خیال ہے، وہ کہتے ہیں کہ جس نے ان میں سے تمتع کیا تو اس پر جرمانہ کے طور پر بکری کی قربانی لازم ہے لہٰذا یہ اس سے کھا نہیں سکتا۔

ایک قول کے مطابق یہ آیت حکم کے طرف لوٹتی ہے کہ قربانی اور روزہ واجب ہے اور یہ اس پر واجب نہیں جو کہ مسجد حرام کے قریب رہائش پذیر ہو جیسا کہ شافعی اور ان کے یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حرم کے رہائشی نہیں یا وہ لوگ مراد ہیں جو میقات کے اندر نہ ہوں۔

مضمون نمبر:۲۳

"اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ" (البقرة:۱۹۷)

"حج کے معلوم مہینے ہیں۔"

اس میں کچھ الفاظ محذوف ہیں۔ اصل عبارت یہ ہے "وقت الحج اشھر" کہ حج کرنے کا وقت چند ماہ ہے۔ ایک قول کے مطابق اصل عبارت اسطرح ہے "الحج فی اشھر" یعنی حج ان مہینوں میں ہے۔ اس عبارت سے اس پر نصب ہونا چاہیے اور حرف جر محذوف ماننے کی صورت میں نصب لازم آئے گا نہ کہ رفع۔ فراء کہتے ہیں مشہور رفع ہے کیونکہ اس کا معنی ہے حج کا وقت چند ماہ ہے۔
ایک قول کے مطابق حج چند ماہ کا حج ہے۔

معلوم مہینوں میں اختلاف ہے۔ سیدنا ابن مسعود سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم عطاء ربیع مجاہد اور ازہری رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ شوال ذوالقعدہ' ذوالحجہ کا پورا مہینہ ہے۔ یہی بات امام مالک نے کہی۔
ابن عباس' سدی' شعبی' اور نخعی کہتے ہیں کہ یہ شوال ذوالقعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔
یہی بات ابوحنیفہ شافعی اور احمد وغیرہ رحمہم اللہ نے کہی اور یہ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

قربانی کے دن کے بعد حج کے اعمال میں جو اختلاف رونما ہوا ہے اس سے ایک فائدہ ظاہر ہوتا ہے۔ جس نے کہا کہ ذوالحجہ سارا ہی وقت ہے تو اس کے مطابق تاخیر پر کوئی دم (قربانی) نہیں۔ جس نے کہا کہ اس میں سے صرف دس دن ہیں تو اس نے تاخیر پر دم (قربانی) لازم کر دی۔ اس آیت سے اس شخص نے بھی استدلال کیا جو کہتا ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں سے پہلے جائز نہیں' یہ عطاء طاوس' مجاہد اوزاعی' شافعی اور ابوثور ہیں' ان کا کہنا ہے کہ جس نے حج کا احرام حج کے مہینوں سے پہلے باندھا تو اسے چاہیے کہ عمرہ کر کے حلال ہو جائے کیونکہ یہ احرام حج کے لیے ناکافی ہے، جیسا کہ جو شخص وقت سے پہلے نماز شروع تو یہ اس کو کافی نہ ہوگی۔ احمد اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ یہ صرف مکروہ ہے، اسی طرح مالک سے مروی ہے اور امام مالک کا مشہور قول یہ ہے کہ حج کا احرام سارا سال بغیر کراہت کے جائز ہے' اسی طرح ابوحنیفہ سے بھی مروی ہے۔

اس قول کی بنا پر مناسب ہے کہ اس فائدہ کو دیکھا جائے جو اس آیت میں مذکورہ حج کے مہینوں کا وقت ذکر ہوا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس پر نص اس کی فضیلت میں اضافہ کے لیے ہے۔ سارا سال احرام باندھنے کے جواز کا قول اسحق بن راہویہ ابراہیم النخعی ثوری اور لیث بن سعد سے مروی ہے' ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ" ۔ سے دلیل لی ہے اللہ تعالیٰ نے سارے سال کے ہلال (چاند) حج کا وقت بتانے کے لئے بنائے اور تین ماہ خاص نہیں کیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ذکر خاص ہے اور یہ آیت عام ہے (اصول یہ ہے کہ) اور خاص عام پر مقدم ہوا کرتا ہے۔

حج کو عمرہ پر قیاس کرنے والوں نے دوسری دلیل یہ بتائی ہے کہ جیسے عمرہ سارا سال ہوتا ہے تو اسی طرح حج بھی پورا سال ہو سکتا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں' یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ قیاس نص قرآنی سے متصادم ہے جو کہ باطل ہے اور صحیح بات وہی ہے جو پہلے لوگوں نے کہی۔ اگر "اشہر" جو کہ "الحج اشہر معلومات" میں مذکور ہے تین ماہ کے ساتھ خاص ہو تو پھر تو ٹھیک ہے اور اگر ایسا نہیں تو "اشہر" جو "شہر" کی جمع قلت ہے جو تین سے دس تک استعمال ہوتا ہے اور تین کا عدد قابل یقین ہے تو پھر اس پر وقوف کرنا واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان "مَّعْلُوْمٰتٌ" کا معنی یہ ہے کہ حج سال بھر میں ایک مرتبہ ہے سال کے معلوم مہینوں میں یہ عمرہ کی طرح نہیں۔ یا مراد یہ ہے کہ نبی ﷺ کی وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہیں یا مخاطبین کو معلوم ہیں کہ ان سے آگے پیچھے کرنا جائز نہیں۔

"فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ" ۔لغت میں فرض کا اصل کاٹنا ہے اسی سے ہے کمان' نہر یا پہاڑ کا کنارہ' پس حج کا فریضہ آزاد بندوں پر لازم ہے جس طرح کمان کے لئے ایک دہانہ (کنارہ) لازم ہے۔

ایک قول کے مطابق فرض کا معنی علیحدہ کرنا ہے' یہ بھی قطع کی طرف لوٹتا ہے' کیونکہ جس نے کسی چیز کو کاٹا گویا اس نے اسے غیر سے جدا کر دیا۔تو آیت کا معنی یہ ہوا کہ جس نے ان مہینوں کی ابتدا ہی سے اپنے اوپر حج لازم کر لیا' نیت و باطنی ارادہ سے' ظاہری افعال میں سے احرام باندھ کر اور تلبیہ کے کلمات بول کر جو کہ سنے جاتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اس کا خود پر یہ لازم کرنا' تلبیہ یا قربانی کو نشانی لگانا اور اس راہ پر چلنا ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں حج کے احرام میں نیت ہی کافی ہے۔

"فَلَا رَفَثَ" ۔سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما' ابن جبیر' سدی' قتادہ' حسن' عکرمہ' زہری' مجاہد اور امام مالک کہتے ہیں کہ اس کا معنی جماع ہے۔ابن عمر' طاوس اور عطاء وغیرہ رحمہم اللہ کہتے ہیں رفث یہ ہے کہ کلام میں فحش گوئی کرنا۔ابوعبیدہ کہتے ہیں' رفث یہ ہے کہ کلام میں لغو باتیں کرنا۔

"وَلَا فُسُوْقَ" شریعت کی حدود سے نکلنا ہے۔ایک قول کے مطابق بتوں کے لئے ذبح کرنا ہے۔ایک قول کے مطابق برے القاب سے پکارنا ہے۔ایک قول کے مطابق گالی گلوچ کرنا ہے' یہ بات تو ظاہر ہے کہ کسی متعین نافرمانی کے ساتھ اسے مخصوص نہیں کیا جا سکتا اور جس نے بھی خاص کیا تو اس نے اس اعتبار سے کیا کہ اس گناہ پر فسق کا نام آتا ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ و تعالیٰ نے بتوں کے لئے ذبح کے متعلق فرمایا:"اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ" اور برے القاب پکارنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:"بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوْقُ" (الحجرات) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گالی گلوچ کے بارے میں فرمایا: سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ۔

عربی جاننے والے شخص پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ فسق کا نافرمانیوں میں سے کسی ایک پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔

"وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ"، یہ جدل سے مشتق ہے' اس کا معنی قتل ہے اور یہاں اس سے مراد جھگڑنا ہے۔ایک قول کے مطابق گالی گلوچ ہے جبکہ ایک قول کے مطابق اپنے آباء پر فخر کرنا ہے اور پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے۔

ان امور کی نفی کا معنی ان سے منع کرنا ہے اور بار بار نفی کرنا مبالغہ کے لئے ہے اور حج میں

خصوصاً ان تین باتوں کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ان حرکتوں سے باز رہنا لازم ہے اور اس اعتبار سے حج میں یہ اور بھی زیادہ رسوا کن عمل ہے۔

"وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ" ۔ برائی ذکر کرنے کے بعد بھلائی کی ترغیب ہے اور نافرمانی کے بعد اطاعت کی ترغیب ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ لوگ یہ کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اس سے کچھ بھی فوت نہیں ہوتا یعنی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔

"وَ تَزَوَّدُوْا"، اس میں زادِ راہ لینے کا حکم ہے کیونکہ بعض عرب کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے رب کے گھر کا حج کیسے کریں وہ ہمیں کھلاتا نہیں تو وہ بغیر زادِ راہ کے حج کے لئے چل پڑتے اور کہتے کہ ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر توکل کرتے ہیں پھر یہ لوگ وہاں پہنچ کر لوگوں سے سوال کرتے اور یہ ان لوگوں پر بوجھ بن جاتے۔ عبد بن حمید امام بخاری ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ ایک معنیٰ "وَتَزَوَّدُوْا" کا یہ ہے کہ تم اپنے ٹھکانے (آخرت) کے لئے زادِ راہ اعمال صالحہ سے حاصل کرو۔

"فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی" کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اور پہلی بات زیادہ راجح ہے جیسا کہ شان نزول اس پر دلالت کرتا ہے اور اس میں یہ خبر بھی ہے کہ بہترین زادِ راہ منع کردہ امور سے بچنا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو تمہیں زادِ راہ لے کر نکلنے کا حکم دیا گیا ہے اس کام کو کرنے میں ڈرو اللہ تعالیٰ سے کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ ایک قول کے مطابق معنیٰ یہ ہے کہ بہترین زادِ راہ یہ ہے کہ مسافر ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچے اور لوگوں سے سوال کرنے اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچے۔

مضمون نمبر: ۲۴

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ (البقرة: ۱۹۸)

"تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔

اس آیت میں حج کرنے والوں کے لئے تجارت وغیرہ کی رخصت و اجازت ہے یعنی وہ کام جن سے رزق حاصل ہو سکے یہاں فضل سے مراد یہی ہے۔ اور فضل کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (الجمعة: ۱۰) "تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔" یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم فریضہ حج کی ادائیگی کے سفر

میں اپنے رب کا فضل تلاش کرو' یہ ان لوگوں کے رد میں نازل فرمایا جو اسے ناپسند کرتے تھے۔ حق بات یہ ہے کہ اس تجارت کی اجازت رخصت کی شکل میں ہے اور اس کو چھوڑنا زیادہ اولیٰ ہے۔

"فَـاِذَآ اَفَـضْـتُـمْ" "جب تم لوٹو" یعنی تم واپس جاؤ۔ جب پانی برتن کے کناروں سے بہنا شروع ہو جائے۔ عرب کہتے ہیں کہ "فـاض الـمـاء" یعنی پانی بہنا شروع ہو گیا۔ جب پانی کناروں تک پہنچ جائے۔ فیاض آدمی اسے کہتے ہیں جو دونوں ہاتھوں سے دینے والا ہو۔ تو افضتم کا معنی یہ ہوا کہ جب تم خود واپس آؤ۔ یہاں "انفسکم" مفعول کا ذکر چھوڑ دیا جیسا کہ عربی کے اس محاورے میں ہوا" دفعوا من موضع کذا" وہ لوگ فلاں جگہ سے چلے گئے۔ (یعنی عبارت "دفعوا انفسهم من موضع کذا" یعنی ان لوگوں نے اپنے آپ کو فلاں مقام سے لوٹا لیا)

"مِّنْ عَـرَفٰـتٍ" "عرفات ایک اس جگہ کا نام ہے" یعنی ٹھہرنے کی جگہ' اس آیت سے عرفہ میں لازماً ٹھہرنے پر استدلال کیا گیا ہے' کیونکہ واپسی ٹھہرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔

"فَـاذْكُـرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ" "تو مشعر حرام کے پاس ذکر الٰہی کرو" ذکر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے تلبیہ اور تکبیرات مشعر حرام کے قریب دعا کرنا حج کے شعائر میں سے ہے۔ ایک قول کے مطابق ذکر سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازیں مزدلفہ میں جمع کر کے پڑھنا ہے اور اہل علم کا اجماع ہے کہ سنت یہی ہے کہ حج کرنے والا مزدلفہ میں ان دونوں کو جمع کرے۔

مشعر جبل قزح کو کہتے ہیں جس پر امام کھڑا ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق مزدلفہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان عرفہ کی تنگ وادی سے وادی محسّر تک ہے۔

"وَ اذْكُـرُوْهُ كَـمَـا هَدٰىكُمْ" "اور اس کا ذکر کرو جیسا کہ اس نے تمہیں ہدایت دی" کما کا کاف مصدر محذوف کی صفت ہے اور ما مصدریہ یا کافہ ہے' یعنی اسے یاد کرو اچھا یاد کرنا جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی اچھی ہدایت۔ یہاں ذکر کا دوبارہ حکم تاکید کے لئے ہے۔ ایک قول کے مطابق پہلا ذکر کا حکم مشعر حرام کے پاس ہے اور دوسرا ذکر کا حکم اخلاص کے لیے ہے۔ ایک قول کے مطابق دوسرے حکم سے مراد ان پر نعمت شمار کرنا ہے۔

"وَ اِنْ كُـنْـتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ" "حالانکہ تم اس سے پہلے" میں "ان" یہ وہی فائدہ دیتا ہے جس طرح خبر پر لام آئے تو فائدہ دیتا ہے۔ ایک قول کے مطابق ہے "قـد" کے معنی میں ہے' یعنی تحقیق تم

تھے اور "قبلہ" میں ضمیر "ہ" ہدایت کی طرف لوٹتی ہے اور ایک قول کے مطابق یہ ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے۔

"لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ"۔ "راہ بھولے ہوئے تھے" یعنی جاہل۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

"پھر تم اس جگہ سے لوٹو جس جگہ سے سب لوگ لوٹتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے طلب بخشش کرتے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔"

ایک قول کے مطابق یہ خطاب قریش کے بہادروں (سرداروں) کے لئے ہے کیونکہ یہ لوگ باقی عوام کے ساتھ عرفات میں نہیں ٹھہرتے تھے' بلکہ یہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور یہ جگہ حرم میں ہے' تو اسی وجہ سے انہیں عرفات جانے کا حکم دیا گیا۔ اس بنا پر "ثُمَّ" کے ذریعہ جملہ کا عطف کے لئے ہوگا' نہ کہ ترتیب کے لئے اور ایک قول کے مطابق تمام امت کو خطاب ہے۔

"النَّاس" سے مراد ابراہیم ہیں' یعنی پھر وہاں سے واپس آؤ جہاں سے ابراہیم علیہ السلام واپس آئے۔ اس میں احتمال ہے کہ انہیں عرفات سے لوٹنے کا حکم ہو رہا ہے اور یہ کسی احتمال بھی ہے کہ یہ دوسری جگہ سے لوٹنے کا حکم ہو یعنی مزدلفہ سے تو اس صورت میں "ثُم" اصل طریق پر استعمال ہوگا' یعنی ذکر میں ترتیب کے لئے کہ ترتیب زمانی کے لیے جس میں اعمال کیے جاتے ہیں۔ اس دوسرے احتمال کو ابن جریر الطبری نے ترجیح دی ہے اور یہی قرآن کے ظاہری معنی کا تقاضہ ہے۔

انہیں استغفار کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ لوگ نزولِ رحمت اور قبولیت واجابت کے مقام پر ہیں۔

ایک قول کے مطابق اسْتَغْفِرُوا کا حکم اس شخص کے لئے ہے جو سنت ابراہیمی کی مخالفت کرتے ہوئے عرفات سے پہلے مزدلفہ میں ٹھہرے۔ ایک قول کے مطابق اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا اور انہیں معاف فرماتا ہے۔

"فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ"۔ "پھر جب تم ارکان حج ادا کر چکو" یعنی حج کے اعمال پورے کر لو اس معنی میں نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ مجھ سے اپنے حج کے طریقے سیکھ لو یعنی جب تم حج کے اعمال سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کا ذکر کرو۔ ایک قول کے مطابق مناسک سے مراد قربانیاں ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح تم اپنے آباء کو یاد کرتے عرب جب اپنے حج سے فارغ ہوتے تو جمرات کے پاس ٹھہر کر اپنے آباء کے نام فخر سے یاد کرتے اور کس کے مناقب بیان کرتے' تو اللہ عزوجل نے اس جگہ اُن کو یاد کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا ان کو حکم

دیا کہ جس طرح تم انہیں یاد کرتے ہو اسی طرح یا اس سے زیادہ اچھی طرح اللہ تعالیٰ کو یاد کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ان پر اور ان کے آباء واجداد پر حقیقی انعامات کرنے والا ہے۔

مضمون نمبر: ۲۵

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ۔ (البقرۃ: ۲۰۳)

''اور اللہ تعالیٰ کی یاد گنتی کے ان چند دنوں (ایام تشریق) میں کرو۔''

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ اس آیت میں گنے ہوئے دنوں سے مراد منیٰ کے دن ہیں اور یہی ایام تشریق ہیں اور یہ تینوں نام ان پر ہی صادق آتے ہیں اور یہی رمی جمار کے دن ہیں۔ ثعلبی اور ابراہیم کہتے ہیں کہ گنے ہوئے دنوں سے مراد دس دن ہیں اور معلوم دنوں سے مراد قربانی کے دن ہیں' اسی طرح مکی سے مروی ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں جو ہم نے اجماع ذکر کیا یہ صحیح نہیں اس کی بنیاد یہ ہے کہ جو ابو عمر بن عبد البر وغیرہ نے نقل کیا۔

ضحاک نے ابو یوسف سے روایت کیا کہ معلوم دن قربانی کے دن ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔

''اور ان مقررہ دنوں میں اللہ تعالیٰ کا نام یاد کریں ان چوپایوں پر جو پالتو ہیں۔''

کرخی نے محمد بن الحسن سے بیان کیا کہ معلوم ایام قربانی کے تین دن ہیں یوم الاضحیٰ اور اس کے بعد کے دو دن (۱۰، ۱۱، ۱۲)۔ کیا طبرانی فرماتے ہیں۔ ابو یوسف اور محمد کے قول کے مطابق معلوم اور گنے ہوئے دنوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ قرآن میں مذکور گنے ہوئے دن بغیر اختلاف کے ایام تشریق ہیں۔

امام مالک کے متعلق مروی ہے کہ آپ معلوم اور گنے ہوئے ایام کو جمع کر کے چار دن کہتے تھے (ایک) قربانی کا دن اور تین دن بعد کے۔ قربانی کا دن معلوم ہے معدود نہیں اور اس کے بعد دو دن معلوم بھی ہیں اور معدود بھی اور چوتھا دن معدود ہے نہ کہ معلوم اور یہی بات سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ابن زید کہتے ہیں کہ معلوم دن ذی الحجہ کے دس دن اور ایام تشریق ہیں۔

آیت میں مذکور اللہ تعالیٰ کا فرمان ''فَاذْكُرُوا اللّٰهَ'' کے مخاطب حاجی وغیرہ ہیں' یہ موقف جمہور کا ہے اور ایک قول کے مطابق یہ صرف حج کرنے والوں کے ساتھ خاص ہے۔

اہل علم کا اس کے وقت میں اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق عرفہ کے دن صبح کی نماز

سے ایام تشریق کے آخری دن عصر تک ہے۔ ایک قول کے مطابق عرفہ کی صبح سے قربانی کے آخری دن کی نماز عصر تک ہے اور یہی قول ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ ایک قول کے مطابق قربانی کے دن نماز ظہر سے ایام تشریق کے آخری دن صبح کی نماز تک ہے امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

"فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ" یہ قربانی کا دوسرا اور تیسرا دن ہے۔ "فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ"۔ "دو دن کی جلدی کرنے والے پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو پیچھے رہ جائے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔" سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسن، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور نخعی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ جس نے گنتی کے دنوں میں سے دوسرے دن رمی کی تو اس پر کوئی حرج نہیں اور جس نے تیسرے دن تک مؤخر کر دی تو اس پر بھی کوئی حرج نہیں۔

تو آیت کا معنی یہ ہوا کہ یہ دونوں طرح جائز ہے' یہ انداز تقسیم یہاں اہتمام اور تاکید کے لئے اختیار کیا گیا ہے کیونکہ عرب کچھ ایسے ہیں کہ جلدی کی مذمت کرتے تھے اور کچھ تاخیر کی مذمت کرتے تھے، اس لیے یہ آیت نازل ہوئی کہ ان دونوں صورتوں پر گناہ کا کوئی تصور نہیں۔

سیدنا علی اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما اس آیت کا معنی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس نے تاخیر کی یا جلدی کی اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیں گے اور یہ آیت جلدی اور تاخیر دونوں کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان لِمَنِ اتَّقٰى "یہ پرہیزگار کے لئے ہے۔" اس کا معنی ہے کہ اختیار اور گناہ نہ ہونا اس کے لئے ہے جو ڈر گیا کیونکہ متقی پر اس چیز سے بچتا ہے جو شک میں مبتلا کر دے تو اس لیے وہ خاص طور پر اس حکم کا زیادہ حق دار ہے۔ اخفش کہتے ہیں اس کی تقدیر یہ ہے کہ "ذٰلِكَ لِمَنِ اتَّقٰى" یعنی، یہ متقی کے لئے ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ اس کیلئے ہے جو حج سے واپس پلٹنے کے بعد تمام نافرمانیوں سے بچے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد وہ شخص ہے جو شکار سے پہلے بچے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے تمام تر سلامتی اس کیلئے ہے جو متقی ہو۔ ایک قول کے مطابق یہ ذکر کے متعلق ہے یعنی ذکر اس کے لئے ہے جو اپنے حج میں ڈر گیا کیونکہ حقیقی حاجی یہی ہے۔

مضمون نمبر: ۲۶

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ (البقرة: ۲۱۵)

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟''

یہاں سوال کرنے والے مومنین ہیں انہوں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ ہم کیا چیز خرچ کریں؟ یعنی کس مقدار میں اور کس جنس کی ہو؟ تو جواباً اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اس مصرف کی وضاحت سے خبردار کرتے ہوئے انہیں جواب دیا کہ سب سے پہلے ارادہ ہے کیونکہ کسی چیز کی اہمیت اس وقت شمار کی جاتی ہے جبکہ اسے حقیقی جگہ اور صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے۔

ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ''قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ'' ۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ جو مال تم خرچ کرو'' میں خرچ کی وضاحت موجود ہے کہ وہ ساری خیر و بھلائی ہے۔ ایک قول کے مطابق لوگوں نے آپ ﷺ سے نیکی کی صورتیں پوچھیں کہ جس میں وہ خرچ کریں۔ یہ ظاہر کے خلاف ہے۔

فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ. ''وہ ماں باپ کے لئے ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔'' یہ بیان اس لئے ہے کہ ان کو مال دینے میں صدقہ ہے اور دوسرا صلہ رحمی بھی ہے جبکہ وہ محتاج ہوں۔ اسی طرح یتیم محتاج زیادہ حقدار ہیں صدقہ کے ان محتاج لوگوں سے جو یتیم نہیں ہیں کیونکہ وہ مال کمانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

''مِسْكِيْن'' وہ ہے کہ جو لوگوں کے ہاتھوں میں جو کچھ ہے اس پر رہنے والا ہو' کیونکہ اس کے پاس کچھ نہیں۔

''ابْنِ السَّبِيْلِ'' مسافر راہ گذر کو کہتے ہیں' اسے راستہ کا بیٹا اس لئے کہا گیا کہ وہ راستہ پر چلنا رہتا ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت نقل کی کہ: جس روز یہ آیت نازل ہوئی اس وقت یہ زکوٰۃ نہیں تھی' اس وقت صرف خرچ تھا کہ آدمی اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا اور اسی طرح صدقہ کیا کرتا' پس زکوٰۃ نے اسے منسوخ کر دیا۔ حسن کہتے ہیں یہ محکم ہے۔ ابن زید کہتے ہیں کہ یہ نفل ہے اور آیت کا ظاہر بھی یہی ہے۔

پس جو خرچ کرنے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قربت پسند کرے تو اس کیلئے زیادہ مناسب یہی ہے کہ وہ مذکورہ صورتوں میں سے کسی ایک پر خرچ کرے۔ ابن جریر نے روایت بیان کی اور ابن منذر ابن جریر سے بیان کرتے ہیں کہ مومنوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ ہم اپنے مال کہاں دیں؟ تو اس کے جواب میں آیت یہ نازل ہوئی یہ خرچ نفل ہے اور زکوٰۃ ان تمام میں برابر

ہے۔ ابن منذر نے روایت بیان کی کہ سیدنا عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہم اپنے اموال میں سے کیا اور کہاں خرچ کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمائی۔

مضمون نمبر: ۲۷

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ۔ (البقرة:۲۱۶)

''تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے گو وہ تمہیں دشوار معلوم ہو۔''

یعنی جن باتوں سے ان کا امتحان لیا گیا ان تمام میں سے ایک قتال یعنی جنگ کی فرضیت ہے' اس سے مراد کفار سے جنگ ہے اسی آیت سے اس کی فرضیت کا استدلال کیا گیا ہے۔ یہی زیادہ مناسب ہے۔ ایک قول کے مطابق جہاد نفل ہے اس سے مراد صرف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں' یہ بات امام ثوری اور اوزاعی کا خیال ہے۔ جمہور اسے فرض کفایہ کہتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اگر دشمن ہمارے شہروں میں آ گھسے تو جہاد فرض عین ہے اور اگر وہ اپنے شہروں میں ہو تو پھر فرض کفایہ ہے۔

''كُرْهٌ'' بمعنی مشقت کے ہے' اگر اسے ''كَرْهٌ'' پڑھیں تو معنی یہ ہوگا کہ جس کام پر مجبور کیا گیا۔ فتح کے معنی میں ضمہ پڑھنا جائز ہے۔ پس یہ دو لغتیں ہوں گی۔

جہاد کو مکروہ ناپسندیدہ اس لیے کہا ہے کہ اس مین مال خرچ ہوتا ہے' وطن اور گھر والوں سے الگ رہنا پڑتا ہے۔ اور جان چلے جانے کا خدشہ بھی رہتا ہے۔ اور مصدر پڑھنے کی صورت میں مبالغہ کا معنی ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مکروہ کے معنی میں ہو' جیسا کہ اہل عرب کا قول کا ہے ''اَلدِّرْهَمُ ضَرْبُ الْاَمِيْرِ''

ابن منذر اور ابن ابی حاتم' ابن شہاب سے اس آیت کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ جہاد ہر ایک پر فرض ہے خواہ وہ جہاد کرے یا بیٹھا رہے' بیٹھنے والے سے اگر مدد مانگی جائے تو وہ مدد کرے' اگر اس سے تعاون مانگا جائے تو وہ تعاون کرے' اگر اسے نکلنے کے لیے کہا جائے تو نکلے اور اگر اس سے لا پرواہی کی جائے تو وہ بیٹھ رہے۔ جہاد کی فرضیت اور اس کی فضیلت پر بہت سی احادیث آئی ہیں' ان کے تفصیل کی یہ جگہ نہیں ہے۔

مضمون نمبر: ۲۸

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ۔ (البقرة:۲۱۷)

''لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کے بارہ میں سوال کرتے ہیں۔''

سیبویہ کہتے ہیں کہ "قتال فیه" "شهر حرام" سے بدل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ماہ کے متعلق سوال اس لئے ہوا کہ اس میں قتال کا کیا حکم ہے۔ زجاج کہتے ہیں اصل عبارت یہ ہے کہ "یسئلونك عن القتال فی الشهر الحرام" یعنی یہ لوگ آپ سے قتال کے بارہ میں سوال کرتے ہیں حرمت والے مہینہ میں، "قل قتال فیه کبیر" آپ فرما دیجئے کہ اسمیں قتال گناہ کبیرہ ہے۔ یعنی ایسا کام ہے کہ جس سے ان کو منع کیا گیا اور "الشهر الحرام"۔ حرمت والے مہینہ سے مراد جنس ہے۔

اہلِ عرب ان مہینوں میں خون نہیں بہاتے تھے اور نہ ہی دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے۔ حرمت والے ماہ ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب ہیں، تین پے در پے اور ایک الگ ہے۔ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ۔

یعنی بڑا گناہ ہے اور حرمت والے مہینہ میں جنگ سے زیادہ سخت گناہ ہے، مبرد وغیرہ کی تحقیق کی۔

جمہور کے موقف کے مطابق اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم اے کفارِ قریش! ہم پر حرمت والے مہینہ میں قتال و جنگ کو بڑا گناہ سمجھتے ہو اور جو تم اللہ کی راہ سے روکنے والی حرکت کرتے ہو جو اسلام کا ارادہ کرے اور تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہو اور مسجد حرام سے روکتے ہو اور حرم میں رہنے والوں کو یہاں سے نکالتے ہو، یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جرم کے اعتبار سے بڑا ہے۔ اور شان نزول اس معنی کا گواہ ہے اور فائدہ یہ دیتا ہے کہ اس سے یہی مراد ہے۔

کیونکہ ان کی طرف سے اس آیت میں ان کے جس سوال کا ذکر ہے، یہ اس چیز کے انکار کا سوال ہے جو نبی ﷺ کے روانہ کیے ہوئے لشکر سے سرزد ہوا تھا

وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ، "یہ فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔" یہاں فتنہ سے مراد کفر ہے یعنی تمہارا کفر اس جنگ سے بڑا ہے جو نبی ﷺ .... کے بھیجے ہوئے لشکر سے قتل کا واقعہ پیش آیا ہے۔ ایک قول کے مطابق فتنہ سے مراد حرم والوں کو وہاں سے نکالنا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہاں فتنہ سے مراد ان کا دین سے فتنہ میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جانا ہے، یعنی کمزور مومنوں کو فتنہ میں مبتلا کرنا یا خود "فتنہ ہی ہے کہ جس پر کفار ہیں۔ یہ پہلی دو صورتوں میں سے زیادہ راجح ہے کیونکہ کفر اور حرم سے نکالنے کا ذکر گذر چکا ہے، وہ دونوں "صَدٌّ" روکنے کے ساتھ ذکر ہوئے اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرمت والے مہینہ میں قتال و جنگ سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔

پھر ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور سوائے دفاعی جنگ کے حرمت والے مہینہ میں جنگ جائز نہیں۔ ابن سیدنا عباس رضی اللہ عنہما اور سفیان ثوری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ آیت جہاد کی آیت سے منسوخ ہے اور یہی قول جمہور ائمہ کا ہے۔

مضمون نمبر: ۲۹

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ۔ (البقرة: ۲۱۹)

''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا مسئلہ پوچھتے ہیں۔''

یہاں سوال کرنے والے مومنین ہیں اور شراب کہتے ہیں انگور کے پانی کو جو جوش مارے اور گاڑھا ہو جائے اور اس سے جھاگ نکلنا شروع ہو جائے اور جو عقل پر پردہ ڈال دے وہ اس کے حکم میں شامل ہے' جیسا کہ جمہور کا موقف ہے۔

ابو حنیفہ' ثوری' ابن ابی لیلیٰ' ابن بشرمہ اور کوفی فقہاء رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ انگور کی بنی ہوئی شراب کے علاوہ جس کا زیادہ حصہ نشہ میں مبتلا کر دے وہ حلال ہے' یعنی جو مقدار نشہ میں مبتلا کرے اس سے کم تھوڑی حلال ہے۔

ابو حنیفہ اس موقف کی طرف گئے ہیں کہ جسے پکا کر تیسرا حصہ ختم کر دیا جائے وہ حلال ہے۔ اس میں اختلاف مشہور ہے۔ میں نے شراب پر بلوغ المرام کی شرح مسك الختام میں اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا ہے اور شوکانی رحمہ اللہ نے بھی منتقی میں بہت طویل کلام کی ہے اسی طرح سید علامہ محمد بن اسماعیل نے سبل السلام میں بھی بہت طویل گفتگو کی ہے۔

''میسر'' سے مراد اس آیت میں عرب کا وہ جوا ہے جو وہ تیروں سے کھیلا کرتے تھے۔ سلف کی ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کا کہنا ہے ہر وہ چیز جس میں جوا یا چوسر کا کھیل یا شطرنج وغیرہ ہو وہ ''میسر'' ہے حتیٰ کہ بچوں کا اخروٹ یا نگینہ وغیرہ سے کھیلنا بھی اس میں شامل ہے مگر وہ کھیل جو جائز ہیں' ان میں جہاد کیلئے گھوڑوں کی دوڑ میں حصہ لینا یا اپنا حق لینے میں قرعہ اندازی کرنا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جوا دو طرح کا ہے ایک کھیل اور دوسرا جس میں رقم لگائی جائے۔ جو کھیل میں جوا ''میسر'' ہے وہ نرد اور شطرنج اور ''میسر قمار'' تمام کھیلیں ہیں اور رقم لگانا وہ ہے جس سے لوگ خطرہ محسوس کریں اور ہر وہ چیز جس میں رقم لگائی جائے وہ جوا ہے۔

قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ، ''آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔'' یعنی شراب اور جوے میں، پس شراب کے گناہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے مستقل استعمال سے عقل میں خرابی شروع ہو جاتی ہے، پھر اس سے جھگڑا گالی گلوچ فحش گوئی جھوٹ، نمازیں اور تمام واجبات چھوڑ جاتے ہیں، یہ کوئی کم گناہ نہیں ہے جیسا کہ فاسد العقل آدمی سے بھی ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں، اور جوا کھیلنے کی خرابیاں یہ ہیں کہ جوا فقر و فاقہ لاتا ہے، بلا فائدہ مال کا ضیاع، عداوت و دشمنی اور سینوں میں وحشت پیدا ہونا یہ بھی بہت بڑا گناہ ہے۔

"وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" ''اور لوگوں کو اس سے دنیاوی فائدہ بھی ہوتا ہے،'' یعنی شراب کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی تجارت نفع دیتی ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے استعمال کے بعد جو خوشی چستی، دل کی قوت و مضبوطی، معدہ کی اصلاح اور قوت باہ حاصل ہوتی ہے۔ عرب کے شعراء نے ان چیزوں کی طرف ہی اشارہ کیا ہے اور اسی طرح فارسی شعراء بھی، لیکن یہ جگہ اس موضوع کے بیان کی نہیں۔

جوے کے فوائد یہ ہیں کہ کسی چیز کا انسان کو بغیر تگ و دو کے مل جانا جس کے لیے اسے کوئی مشقت نہیں کرنا پڑتی اور جب اسے اس میں سے حصہ ملتا ہے تو اسے خوشی و راحت حاصل ہوتی ہے اور جوے کے گیارہ تیر ہوتے ہیں۔ امام شوکانی نے فتح القدیر میں ان کا ذکر کیا ہے۔

وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۔ ''لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ ہے۔'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بتلایا کہ شراب اور جوے میں اگرچہ فائدہ ہے، لیکن ان کے اپنانے سے جو گناہ پہنچتا ہے وہ اس فائدہ سے زیادہ ہے کیونکہ عقل تباہ کرنے والی شراب میں کوئی خیر و بھلائی نہیں اس سے لامحدود برائیاں جنم لیتی ہیں۔ کچھ ان میں سے حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب حادی الارواح میں ذکر کیں۔ ان سے تلخیص کر کے میں نے اپنی کتاب مثیر ساکن الغرام الی روضات دار السلام میں ذکر کیں۔

اسی طرح جوے میں بھی کوئی خیر و بھلائی نہیں، اس میں مال کا خطرہ، فقر کا اندیشہ اور دشمنی پیدا کرنا جو خون بہانے اور حرمتوں کو پامال کرنے تک پہنچتا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے أَكْثَرُ پڑھا ہے اور باقی لوگوں نے أَكْبَرُ پڑھا ہے جبکہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے أَقْرَبُ پڑھا ہے۔

امام احمد، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا اور اسی طرح مختارہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے

فرمایا: اے اللہ ہمارے لئے شراب کے بارہ میں اطمینان بخش بیان نازل فرما کیونکہ یہ مال اور عقل ضائع کر دیتی ہے' تو "یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ" نازل ہوئی' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا اور انہیں یہ پڑھ کر سنائی گئی۔ پس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ شراب کے متعلق اطمینان بخش بیان اتار تو وہ آیت نازل ہوئی جو سورۂ نساء میں ہے "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰی" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کھڑی ہوتی تو اعلان فرماتے کہ نشہ کی حالت میں کوئی بھی نماز کے قریب نہ آئے' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا انہیں یہ آیت پڑھ کر سنائی گئی تو وہ کہنے لگے۔ اے اللہ ہمارے لئے شراب کے متعلق اطمینان بخش بیان نازل فرما تو سورۃ المائدہ کی آیت "یاایھاالذین امنوا الماحمدلو المیسرو الانصاب والازلا رجس من عم الشیطان" نازل ہوئی عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا انہیں فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تک پڑھ کر سنایا گیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا' ہم رک گئے' ہم رک گئے۔

مضمون نمبر:۳۰

وَ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (البقرۃ:۲۱۹)

''آپ سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں؟ تو آپ کہہ دیجئے کہ ضرورت سے زائد چیز۔''

"عــفــو" کہتے ہیں جو سہل و آسان ہو اور دل پر بوجھ نہ بنے' تو معنی یہ ہوا کہ جو تمہاری ضروریات سے زائد ہے اس میں سے کچھ خرچ کرو اور اپنی جانوں کو مشقت میں نہ ڈالو۔ ایک قول یہ ہے کہ جو گھر والوں کے خرچ سے زائد ہو وہ خرچ کرو۔ جمہور علماء کا کہنا ہے کہ یہ نفلی خرچ کے متعلق ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت زکوۃ کی فرضیت والی آیت سے منسوخ ہے اور ایک قول کے مطابق یہ محکم ہے اور مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔

مضمون نمبر:۳۱

وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی۔ (البقرۃ:۲۲۰)

''اور تجھ سے یتیموں کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں۔''

یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرامین "وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ" ''اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ'' اور "اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا" ''جو لوگ ناحق ظلم سے یتیموں کا مال کھا

جاتے ہیں۔'' کے بعد نازل ہوئی یتیموں کے سرپرستوں پر یہ حکم گراں گذرا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ "قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ" ''آپ کہہ دیجئے کہ ان کی خیر خواہی بہتر ہے۔'' یہاں اصلاح سے مراد ہے کہ ان یتیموں کا اپنے سرپرستوں کے ساتھ گھل مل جانا ان کے مال میں اصلاح کی بنا پر ہو اور یہی بات ہر لحاظ سے صحیح تر ہے۔

اس آیت میں یتیم کے سرپرستوں اور جنہیں وصیت کی جائے ان کے لئے کاروبار مضاربت اور ٹھیکہ وغیرہ میں مال استعمال کرنے کا جواز ہے۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۔ ''تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔'' مخالطہ کی تفسیر میں اختلاف ہے ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ یتیموں کے مال کو اپنے مال میں ملانا یہ ہے کہ ان یتیموں کا مال ہو اور ان کے سرپرست پر اس اکیلے کے لئے کھانا تیار کرنا باعث مشقت ہو اور اسے اپنے گھر والوں کے ساتھ ملانے کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہ ہو، تو وہ یتیم کے مال سے اس قدر لے سکتا ہے کہ جو اس کی محنت و کوشش کے لئے کافی ہو اور سرپرست اپنے گھر والوں کے خرچ کے ساتھ اس کے مال کو رکھ لے۔ اس میں زیادتی و کمی کا امکان ہے اور یہ آیت رخصت کی دلیل ہے اور اپنے ماقبل کے لئے ناسخ ہے۔

ایک قول کے مطابق "مخالطه" سے مراد یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔ ایک قول کے مطابق یتیم کو رشتہ دینا ہے اور سب سے مناسب یہ ہے کہ "مخالطه" کو کسی خاص قسم میں محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ ہر قسم کے مخالطہ شامل ہے جس طرح جملہ شرطیہ سے فائدہ لیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان "فَاِخْوَانُكُمْ"، مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ ۔ ''بدنیت کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔'' ان کے اموال کو ان کے ساتھ ملانے سے "مِنَ الْمُصْلِحِ" ''نیک نیت سے ان یتیموں کے لئے۔'' یہ سرپرستوں کے لئے دھمکی ہے یعنی اللہ تعالیٰ پر کچھ بھی پوشیدہ نہیں، وہ ہر ایک کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا، جو اچھا کرے گا وہ اپنے لئے کرے گا اور جو خراب و برباد کرے گا تو وہ اس پر بوجھ ہوگا لہٰذا اس میں وعدہ اور دھمکی دونوں ہیں مگر فسادی کا پہلے ذکر مزید دھمکی اور سزا کی تاکید کیلئے ہے۔

مضمون نمبر: ۳۲

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۔ (البقرة: ۲۲۱)

''اور شرک کرنے والی عورتوں سے تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں تم نکاح نہ کرو۔''

اس آیت میں مشرک عورتوں سے نکاح وشادی کرنے سے روکا گیا ہے۔ ایک قول کے مطابق ''مشرک'' سے مراد بت پرست عورتیں ہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ تمام اہل کتاب کو عام ہے کیونکہ اہل کتاب بھی مشرک ہیں۔ "وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ۔" ''یہود کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصرانی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔''

اہل علم نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے' ایک جماعت نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مشرکہ عورتوں اور من جملہ اہل کتاب عورتوں سے نکاح حرام قرار دیا ہے پھر مائدہ کی آیت نازل ہوئی تو اہل کتاب کو اس عام سے خاص کر دیا' یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما امام مالک' سفیان بن سعید' عبدالرحمٰن بن عمر اور اوزاعی رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے۔

ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت مائدہ کی آیت کے لئے ناسخ ہے۔ یہ اہل کتاب اور مشرکہ عورتوں سے نکاح حرام کرتی ہے، یہ امام شافعی رحمہ اللہ کے دو اقوال میں سے ایک ہے اور اہل علم کی ایک جماعت نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ ان کی یہ بات کہ یہ آیت مائدہ کی آیت کے لے ناسخ ہے' اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ سورۂ بقرہ شروع میں نازل ہوئی اور سورہ مائدہ آخر میں نازل ہوئی اس لیے پہلی بات ہی راجح ہے اور سیدنا عثمان بن عفان' سیدنا طلحہ' سیدنا جابر' سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہم' اور سعید بن مسیب' سعید بن جبیر' حسن' طاوس' عکرمہ' شعبی اور ضحاک رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے۔ جیسا کہ نحاس اور قرطبی نے بیان کیا اور ابن منذر نے ان مذکورہ لوگوں سے نقل کیا۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس میں زیادہ کرتے ہوئے کہا کہ پہلے لوگوں میں سے کسی سے یہ بات ثابت نہیں کہ یہ حرام ہے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ لفظ مشرک اہل کتاب کو اللہ تعالیٰ کے ان فرامین "مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ"۔ (نہ تو اہل کتاب کے کافر اور نہ مشرکین چاہتے ہیں کہ تم پر تمہارے رب کی کوئی بھلائی نازل ہو)۔

اور "لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ" کی وجہ سے شامل نہیں ''اہل کتاب کے کافر اور مشرک لوگ نہ تھے---'' بالفرض لفظ مشرک عام ہے تو اس عموم کو سورہ مائدہ کی آیت مخصوص کرتی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا۔

"وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ"۔ ''ایماندار لونڈی بھی شرک کرنے والی آزاد عورت

سے بہت بہتر ہے۔'' کیونکہ سارے لوگ اللہ تعالیٰ کے غلام اور لونڈیاں ہیں' یہی بات زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ لفظ سے یہی ظاہر ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ یہی زیادہ بلیغ ہے۔

کیونکہ مومنہ لونڈی کو آزاد مشرک پر فضیلت دی گئی ہے' اس سے آزاد مومنہ' آزاد مشرکہ سے برتر ثابت ہوتی ہے اور یہی سب سے مناسب ہے۔ واحدی اور ابن عساکر نے سدی کی سند سے ابومالک سے' وہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ان کی ایک سیاہ فام لونڈی کے بارے میں نازل ہوئی (الحدیث) ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حیان سے روایت نقل کی کہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک سیاہ فام لونڈی تھی انہوں نے اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کر لی۔

وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۔ یعنی اگر یہ مشرکہ خوبصورتی مال و دولت اور حسب و نسب کے اعتبار سے تمہیں اچھی لگتی ہو۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔ ''وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ'' اپنی مومنہ عورتوں کا نکاح مشرک مردوں کے ساتھ نہ کرو، یعنی ان کے ایمان دار ہونے تک ان سے مومنہ عورتوں کا نکاح نہ کرنا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ مشرک مرد مومنہ عورت سے جماع نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے اسلام پر حرف آتا ہے اور تمام قراء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تنکحوا میں تاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھنا ہے۔

وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ . ایماندار غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے' گو مشرک تمہیں اچھا لگے۔ اس پر گفتگو وَ لَاَمَةٌ پر گفتگو کی طرح ہے اور ترجیح بھی وہی ترجیح ہوگی۔

مضمون نمبر: ۳۳

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۔ (البقرۃ: ۲۲۲)

''آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔''

''حیض'' مصدر ہے اور ایک قول کے مطابق اسم ہے۔ ایک قول کے مطابق محیض وقت اور جگہ سے تعبیر ہے اور دونوں جگہ استعمال جائز ہے' لفظ ''حیض'' کا لغوی معنی بہنا اور پھوٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ ''خاص السیل و حیض'' یعنی سیلاب بہہ پڑا اور پھوٹ گیا اسی سے حوض ہے کیونکہ پانی اس کی طرف بہتا ہے۔

''قل ھو اذیً''۔ ''کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے''، یعنی ایسی چیز ہے کہ جس کی بو سے تکلیف

محسوس کی جاتی ہے' تکلیف کنایہ ہے گندگی سے جو کہ ناپسند بات پر بولا جاتا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى۔ ''اپنی خیرات کو احسان جتلا کر اور ایذا پہنچا کر برباد نہ کرو۔'' اور یہ فرمان: وَدَعْ اَذٰىهُمْ ''اور جو ایذا (ان کی طرف سے پہنچے) اس کا خیال بھی نہ کیجئے۔'' فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ۔ ''حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو' یعنی حیض کے اوقات میں ان سے اجتناب کرو' یہ معنی اس وقت ہوگا جبکہ حیض کو مصدر پر محمول کریں گے' یا حیض کی جگہ سے اجتناب کرو' یہ معنی اس صورت میں ہوگا جبکہ اسم پر محمول کیا جائے۔ اس علیحدگی سے مراد جماع نہ کرنا ہے نہ کہ اٹھنا بیٹھنا یا چھونا کیونکہ یہ تو جائز ہے بلکہ حائضہ کی شرمگاہ کے علاوہ یا تہہ کے اوپر سے فائدہ لینا جائز ہے۔

اس بات میں اختلاف موجود ہے۔ لیکن جو ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عبیدہ السلمانی سے جو مروی ہے کہ مرد پر لازم ہے کہ جب اس کی بیوی حائضہ ہو تو وہ اس کے بستر سے الگ رہے یہ صحیح نہیں اور حائضہ عورت سے جماع کے حرام ہونے پر اہل علم کے مابین کوئی اختلاف نہیں یہ دین کی ضروری باتوں میں سے ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ۔ ''اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔'' طھر کہتے ہیں حیض ختم ہونے کو اور ت''طہر'' کہتے ہیں غسل کرنے کو۔ قراء کے اختلاف کی وجہ سے اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔ جمہور کا موقف یہ ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ اس کا خاوند جماع نہیں کر سکتا حتیٰ کہ وہ پانی سے پاک نہ ہو جائے۔

محمد بن کعب القرظی اور یحییٰ بن بکیر کہتے ہیں کہ جب پانی موجود نہ ہو حائضہ عورت تیمم کر کے پاک ہو جائے تو یہ عورت اپنے خاوند کے لئے حلال ہے اگرچہ غسل نہ بھی کیا ہو۔ مجاہد اور عکرمہ کہتے ہیں کہ خون بند ہو جانے کی صورت میں وہ اپنے خاوند کے لئے حلال ہے لیکن وضو کر لے۔ ابو حنیفہ' ابو یوسف اور محمد کہتے ہیں کہ اگر دس روز گذرنے کے بعد خون بند ہوا تو پھر غسل سے پہلے اس سے جماع کرنا جائز ہے اور اگر دس روز نہ گذرے ہوں تو پھر غسل کرنے تک جائز نہیں یا اس پر ایک نماز کا وقت آ جائے۔ ابن جریر الطبری نے بالتشدید پڑھنے کو ترجیح دی ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حلال ہونے کی دو انتہائیں مقرر کی ہیں جس کا دونوں قراءتیں تقاضہ کرتی ہیں۔

(۱) خون کا رکنا۔ (۲) اس حالت سے پاک ہونا۔ دوسری انتہا پہلی انتہا پر زیادہ عمل ہے

پس اس تک پہنچنا واجب ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان جو اس حکم کے بعد ہے وہ دوسری انتہا کے معتبر ہونے کی دلیل ہے۔

"فَـاِذَا تَـطَهَّـرْنَ" ۔سے پتہ چلتا ہے کہ معتبر پاکیزگی ہے نہ کہ صرف خون کا رکنا۔ تحقیق دونوں قراءتوں کو دو آیات کے مرتبہ پر رکھیں تو جیسے ان دو آیات کو جمع کرنا واجب ہے جن میں سے ایک دوسری سے عمل کے اعتبار سے زیادہ کو شامل ہو اسی طرح دو قراءتوں کو جمع کرنا بھی واجب ہے۔

فَـاْتُـوْهُـنَّ مِـنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۔"تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں اجازت دی" اور اتیان جو "فاتوھن" میں ہے سے "کنایتاً" جماع مراد ہے یعنی لوگ اس جگہ سے جماع کریں جو اللہ تعالیٰ نے جائز رکھی ہے اور وہ ہے قبل سامنے کے راستہ سے۔ایک قول کے مطابق مِـنْ حَيْثُ میں "من" بمعنی "فی" ہے۔جیسے اِذَا نُـوْدِیَ لِـلـصَّـلٰـوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (ای فی یوم الجمعة) "جب جمعہ کے دن نماز کی اذان دی جائے۔" یعنی جمعہ کے دن میں

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان مَـاذَا خَـلَـقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (ای فی الارض) ۔مراد ہے "انہوں نے زمین کا کون سا ٹکڑا بنایا ہے۔" یعنی زمین میں۔

ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ جس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے، جماع کرو، یعنی روزہ احرام اور اعتکاف کی حالت نہ ہو۔ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ طہر کی حالت میں نہ کہ حیض میں۔ایک قول کے مطابق جائز (حلال) طریقہ سے نہ کہ زنا کے طریقہ سے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○ "اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔" ایک قول ہے کہ "تـوابـون" سے مراد توبہ کرنے والے گناہوں سے اور "مستھرون" پاکیزہ رہنے والے جنابت و بے وضو رہنے سے۔ایک قول کے مطابق حیض کی حالت میں بیوی کے پاس آنے سے۔اور پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے۔

مضمون نمبر:۳۴

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ۔ (البقرة:۲۲۳)

''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں اپنی کھیتیوں میں جس طرح چاہو آؤ۔''

لفظ ''حرث'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جواز صرف اس شرمگاہ میں ہے جو خصوصاً سامنے ہے جو کہ اولاد کا پیدائشی مقام ہے جیسا کہ کھیتی گلہ جات کی پیدائشی جگہ ہے پس اس نطفہ کو جوان کے رحموں میں جاتا ہے اور اس سے نسل انسانی پیدا ہوتی ہے اس دانے سے تشبیہ دی جو زمین میں ڈالا جاتا ہے اور اس سے نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک ایسا مادہ ہے کہ جس سے کچھ حاصل کیا جاتا ہے یہ جملہ پہلے جملے فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ۔ کی وضاحت ہے۔

''اَنّٰى شِئْتُمْ'' ''جس طرح چاہو'' یعنی جس طرف سے تم چاہو پیچھے آگے بیٹھا کر لٹا کر اور پہلو کے بل جہاں سے چاہو لیکن جماع کھیتی والی جگہ میں ہی ہو۔ ایک شاعر کہتا ہے ؏

انما الارحام ارضون لنا محترثات فعلینا الزرع فیھا وعلی اللہ النبات

بے شک ارحام (رحم) ہماری زمین ہیں کاشت کرنے کیلئے، ہمارے ذمہ اس میں بیج ڈالنا ہے اور اللہ تعالیٰ پر اس کا اگانا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ''اَنّٰى'' لائے ہیں کیونکہ یہ لغت میں ''اَيْنَ كَيْفَ مَتٰى'' سب کو شامل ہے۔ لیکن سیبویہ نے یہاں اس کی تفسیر كَيْفَ سے کی ہے۔ پہلے اور بعد والے صحابہ تابعین اور تمام ائمہ کرام کا موقف یہی ہے جو ہم نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا اور یہ کہ عورت کی دبر میں جماع حرام ہے۔ جبکہ سعید بن مسیب، نافع اور ابن عمر اور محمد بن کعب القرظی اور عبدالملک بن الماجشون سے مروی ہے کہ یہ جائز ہے۔ ان سے امام قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ امام مالک کی ایک کتاب جس کا نام کتاب السر میں منقول ہے، امام مالک کے ماہر تلامذہ اور ان کے شیوخ اس کتاب کا انکار کرتے ہیں کہ یہ امام مالک کی کتاب ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں کہ ان کی طرف کتاب السر کو منسوب کیا جائے اور یہ قول عتبیہ میں موجود ہے۔

ابن عربی نے ذکر کیا کہ ابن شعبان کہتے ہیں ایک بہت بڑی جماعت اس کے جواز کی قائل ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کئی روایات صحابہ اور تابعین کی (جماع السوان واحکام القرآن) میں موجود ہیں۔ طحاوی کہتے ہیں کہ اصبغ بن الفرج نے عبدالرحمٰن بن القاسم سے روایت کیا کہ میں نے کوئی ایسا شخص نہیں پایا جس کی میں اپنے دین میں پیروی کرتا ہوں کہ وہ اس کے حلال

ہونے میں شک کرے یعنی عورت کی دبر میں جماع کرنے کے بارے میں پھر انہوں نے
نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ پڑھا اور کہا اس سے زیادہ واضح بات کیا ہوگی؟ اور امام حاکم دارقطنی'
خطیب بغدادی نے امام مالک سے ایسے طرق سے روایت کیا جو اس کے جواز کا تقاضا کرتے ہیں'
حالانکہ ان کی اسناد میں ضعف ہے۔

امام طحاوی نے محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم سے روایت کیا کہ انہوں نے امام شافعی سے سنا وہ
فرما رہے تھے کہ نبی ﷺ سے اس کی حلت و حرمت کے بارے میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں
اور قیاس کے مطابق وہ حلال ہے' یہ روایت ابوبکر الخطیب نے بھی بیان کی۔ ابن الصباغ کہتے
ہیں ربیع قسم اٹھاتے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں یقیناً ابن عبدالحکم نے
امام شافعی رحمہ اللہ پر یہ جھوٹ بولا ہے۔ کیونکہ امام شافعی اس کی حرمت کو اپنی چھ کتابوں میں بیان
کر چکے ہیں۔

ہم نے اس مسئلہ پر بلوغ المرام کی شرح مسک الختام میں بالتفصیل بیان لکھا ہے' اس کی
طرف لوٹنا چاہیے۔ صحیح اور سچ بات یہ ہے کہ یہ حرام ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کتاب الام میں اور ابن ابی شیبہ' احمد' نسائی' ابن ماجہ' ابن منذر اور امام بیہقی
اپنی سنن میں خزیمہ بن ثابت کی سند سے بیان کرتے ہیں کہ ایک پوچھنے والے نے عورتوں کے
پشت میں جماع کرنے کے بارے میں پوچھا؟ نبی ﷺ نے فرمایا کہ حلال ہے اس میں کوئی حرج
نہیں جب وہ واپس پلٹا تو آپ نے اسے بلایا اور فرمایا تو نے کیا کہا؟ کیا پیچھے ہے آگے کی طرف
تو یہ تو ٹھیک ہے یا پیچھے سے پیچھے کی طرف تو وہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے نہیں
شرماتا تم عورتوں کی پشت میں نہ آؤ۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس آدمی کی طرف نہ
دیکھے گا جو اپنی عورت کی پشت میں جماع کرے۔ اسے ابن ابی شیبہ ترمذی' نسائی اور ابن حبان
نے روایت کیا۔ سیدنا ابن عمر کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو اپنی بیوی کی پشت میں جماع کرتا
ہے تو یہ چھوٹی لواطت ہے' اسے احمد اور بیہقی نے اپنی سنن میں روایت کیا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے
ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص ملعون ہے جو اپنی بیوی سے اس کی پشت میں جماع کرے۔
اسے احمد ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا۔

اس کے متعلق بے شمار احادیث سے منع ثابت ہے۔ اسی طرح صحابہ اور تابعین کی ایک

جماعت سے مرفوعاً اور موقوفاً ثابت ہے اور ایک جماعت سے اس کی حلت کا قول بھی مروی ہے جیسا کہ گذر چکا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ ان اقوال میں بالکل بھی دلیل نہیں ہے اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان اقوال پر عمل کرے کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جو جائز قرار دے سکے اور جو یہ گمان کرے کہ یہ اس آیت کا مفہوم ہے تو اس کے فہم و سمجھ نے غلطی کی۔ اس کی تفسیر ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہ نے بیان کی' یہ اس کے خلاف ہے جو ان غلطی کرنے والوں نے کہا' کہنے والا گو کوئی بھی ہو اور جس کا یہ گمان ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی سے پشت میں جماع کیا' تو اس میں کوئی ایسی دلیل نہیں کہ یہ آیت اسے حلال قرار دے اور جس نے یہ گمان کیا تو اس نے غلطی کی بلکہ جس چیز پر یہ آیت دلالت کرتی ہے وہ ہے کہ یہ حرام ہے۔ وہ تو ایک سبب ہو سکتا ہے جو کہ یہ لازم نہیں کرتا کہ یہ آیت اس کی حلت کے لئے نازل ہوئی اور یقیناً آیات مختلف اسباب کے لئے نازل ہوتی ہیں جو کبھی حلال کرتی اور کبھی حرام کرتی ہیں۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تم چاہو تو اس سے باز رہو اور اگر چاہو تو اس سے باز نہ آؤ۔ یہ بات ان سے ابن ابی شیبہ' عبد بن حمید' ابن جریر اور ابن منذر اور ضیاء نے مختارہ میں بیان کی اور اسی طرح سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ابن ابی شیبہ نے بیان کی اور سعید بن مسیب سے ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے بیان کیا۔

مضمون نمبر: ۳۵

وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ۔

''اور اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔''

''عــرضة'' کہتے ہیں نشانہ کو یہ بات جوہری نے کہی۔ ایک قول کے مطابق سختی اور قوۃ سے ہے اسی معنی میں عرب کا یہ جملہ ہے کہ عورت نکاح کے قابل ہے جبکہ وہ درست اور اس پر قادر ہو اور فلاں کے لئے نشانہ یعنی طاقت ہے۔ یہ ہمت پر بھی بولا جاتا ہے ایک مقولہ ہے کہ فُلَانٌ عُرْضَةٌ لِلنَّاسِ ''لوگ اس کے پیچھے آتے رہتے ہیں۔''

پہلے معنی کی بنا پر وہ اسم ہوگا کیونکہ یہ ایک کم تر چیز کے لئے رکاوٹ ہے' یعنی تم اللہ تعالیٰ کو اپنی

قسموں پر پردہ اور آڑ نہ بناؤ اپنی قسموں پر۔ یہ بات اس لئے ہے کہ آدمی بعض اچھے کاموں مثلاً صلہ رحمی یا کسی پر احسان یا لوگوں کے درمیان صلح نہ کروانے کی قسم اٹھاتا ہے، پھر وہ اس کام سے اس لئے باز رہتا کہ اس نے یہ کام نہ کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ اور یہی معنی جمہور نے اس آیت کی تفسیر کا بیان کیا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بات سے روکا ہے کہ وہ اپنی قسموں کو نشانہ یعنی آڑ اور رکاوٹ بنائیں کہ جس پر قسم اٹھائی ہے اور جس کے بارے میں قسم اٹھائی گئی اسے یمین کہا گیا تاکہ وہ قسم سے مل جائے۔ اس طرح مندرجہ ذیل آیت اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ "اَیْمَانِکُمْ" کا عطف بیان ہوگی۔

اس کا معنی یہ ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنی ان قسموں میں رکاوٹ نہ بناؤ کہ جو تمہاری نیکی پرہیزگاری اور لوگوں کے درمیان اصلاح کا باعث ہوں۔ "لِاَیْمَانِکُمْ"۔ "لَا تَجْعَلُوْا" اور اس کا تعلق "عُرْضَۃً" سے بھی جائز ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو سبب اور رکاوٹ نہ بناؤ اپنے اور نیکی وغیرہ کے درمیان۔

دوسرے معنی کے مطابق جو کہ سختی اور قوۃ ہے' آیت کا معنی ہوگا کہ نہ بناؤ اللہ کی قسم کو اپنی جانوں کے لئے قوۃ اور خیر و بھلائی کے کاموں سے رکنے کی کوشش۔ تیسرے معنی کے مطابق تفسیر صحیح نہیں وہ معنی ہے ہمت۔ چوتھا معنی یہ ہے کہ فلاں لوگوں کی ڈھال ہے تو آیت کا معنی ہوگا کہ اللہ کو اپنی قسموں کے لئے ڈھال نہ بناؤ کہ تم اس کی بہت زیادہ قسمیں اٹھانے لگو۔

اسی کے متعلق ہے وَاحْفَظُوْا یعنی اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ قسم اٹھانے والوں کی مذمت فرماتے ہوئے فرمایا: وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ○ (القلم: ۱۰) "اور تو کسی ایسے شخص کا بھی کہنا نہ ماننا جو زیادہ قسمیں کھانے والا ہو۔" عرب لوگ قسمیں تھوڑی اٹھانے کی وجہ سے قابل تعریف سمجھے جاتے تھے تو اس تفسیر سے اَنْ تَبَرُّوْا منع کی علت بنے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کے درمیان رکاوٹ نہ بناؤ اس ارادہ سے کہ تم نیکی کرو پرہیزگار بنو اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ' کیونکہ جو قسم زیادہ اٹھاتا ہے تو وہ قسم توڑنے کی جرأت بھی کرتا ہے اور اپنی قسم میں تنگی محسوس کرتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال ہیں جو اپنی وجوہات کی طرف لوٹتے ہیں جنہیں ہم نے ذکر کیا اور وہ اقوال فتح القدیر وغیرہ میں مذکور ہیں۔

مضمون نمبر:۳۶

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَ لٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ۔ (البقرۃ:۲۲۵)

''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری ان قسموں پر نہ پکڑے گا جو پختہ نہ ہوں ہاں اس کی پکڑ اس چیز پر ہے جو تمہارے دلوں کا فعل ہو۔''

''لغو'' مصدر ہے لغا' یلغوا' لغوا اور لغی' یلغوا' لغیا سے۔ جب کوئی گفتگو میں غیر ضروری بات لے آئے یا ایسی بات کرے جس میں کوئی فائدہ نہ ہو اور یہ گفتگو سے گری ہوئی بات ہوتی ہے جس کو شمار نہیں کیا جاتا۔ لغو قسم یہ ہے کہ معیار سے گری ہوئی قسم اٹھانا کہ گنتی میں نہ آ سکے۔

پس آیت کا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری ان قسموں کے بدلے جو ساقط ہیں سزا نہ دے گا' لیکن ان قسموں پر سزا دے گا جو تم دلی ارادہ سے اٹھاؤ گے' یعنی جو تم اپنے پختہ ارادہ قسم اٹھاؤ گے' وہی حقیقی قسم ہوگی' اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ لٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ۔ ہے ''لیکن مواخذہ اس پر فرماتا ہے کہ تم جن قسموں کو مضبوط کر دو۔'' اور شاعر کا قول ہے ؎

ولست بماخوذ بلغو تقوله　　　اذا لم تعمد عاقدات العزائم

ترجمہ: تیری لغوبات گرفت کے قابل نہیں، جب تک کہ تو یقین اور پختہ ارادہ نہ کرے۔

اہل علم نے لغو کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما' ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور جمہور علما کا کہنا ہے کہ آدمی یہ کہے لا واللہ' بلی واللہ۔ ''نہیں اللہ کی قسم' ہاں اللہ کی قسم۔'' یعنی اپنی ہر بات اور گفتگو میں اس کا قسم اٹھانے کا نہ ارادہ ہو اور نہ ہی عقیدہ ہو۔ مروری کہتے ہیں کہ لغو قسم کے اس معنی پر عام علماء کا اتفاق ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور سلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ آدمی ایک کام پر قسم اٹھاتا ہے کہ اس نے کیا، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا جیسا اس نے گمان کیا تھا یہ لغو قسم ہے اور اسی موقف کی جانب احناف گئے ہیں' یہی بات امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں کہی۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا لغو قسم یہ ہے تم غصہ کی حالت میں قسم اٹھاؤ' یہی بات طاؤس اور مکحول نے کہی اور امام مالک سے بھی یہی مروی ہے۔ ایک قول کے مطابق لغو یہ ہے جو فرمانی کی قسم

سعید بن مسیب' ابوبکر بن عبدالرحمن' عبداللہ بن زبیر اور سیدنا عروہ رضی اللہ عنہم کا بھائی کہتے ہیں کہ لغو قسم اٹھانے والا وہ ہے جو یہ قسم اٹھائے کہ وہ ضرور شراب پیئے گا یا ضرور رشتوں کو توڑے گا۔ ایک قول کے مطابق لغو قسم یہ ہے کہ آدمی اپنے خلاف بددعا کرے گویا کہ وہ ایسے کہے کہ اللہ اس کی آنکھوں کو اندھا کر دے' اللہ اس کا مال تلف کر دے' وہ یہودی ہو جائے' وہ مشرک ہو جائے۔ یہ بات زید بن اسلم نے کہی۔

مجاہد کہتے ہیں لغو قسم یہ ہے کہ دو آدمی سودا کریں' ایک ان میں سے کہے اللہ کی قسم میں اس طرح نہیں خریدوں گا' دوسرا کہے اللہ کی قسم میں اس طرح نہیں بیچوں گا۔ ضحاک کہتے ہیں کہ لغو قسم وہ ہے کہ جس کا کفارہ دے دیا جائے' یعنی جب اس قسم کا کفارہ ادا کر دیا جائے تو وہ ختم اور لغو ہو جائے گی۔

لغوی معنی سے مطابقت کی وجہ سے راجح قول پہلا ہی ہے اور اس لئے بھی کہ دلائل اس پر منطبق ہوتے ہیں۔

مضمون نمبر: ۳۷

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَآئِهِمْ۔ (البقرة:۲۲۶)

''جو لوگ اپنی بیویوں سے (تعلق نہ رکھنے کی) قسمیں اٹھائیں۔''

یؤلون، یحلفون کے معنی میں ہے یعنی وہ قسم اٹھاتے ہیں۔ ایلاء کے بارہ میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔ جمہور کا کہنا ہے کہ آدمی قسم اٹھائے کہ میں اپنی بیوی سے چار ماہ سے زیادہ عرصہ تک صحبت نہ کروں گا' اگر وہ چار ماہ یا اس سے کم کی قسم اٹھائے تو وہ ایلا کرنے والا نہیں۔ ان کے نزدیک یہ قسم غلطی پر محمول ہوگی۔ یہی بات امام مالک' شافعی' احمد اور ابو ثور رحمہم اللہ نے کہی۔

ثوری اور کوفیوں کا کہنا ہے ایلاء یہ ہے کہ آدمی چار ماہ یا اس سے زیادہ کی قسم اٹھائے۔ یہ عطاء کا قول ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ایلاء کرنے والا نہ ہوگا حتیٰ کہ وہ قسم اٹھائے کہ وہ اس عورت کو کبھی بھی نہیں چھوئے گا۔ ایک جماعت کا کہنا ہے جب آدمی قسم اٹھائے کہ وہ اپنی بیوی کے ایک روز یا اس سے کم وبیش قریب نہ جائے گا پھر وہ چار ماہ تک صحبت کرے تو یہ عورت ایلاء کی وجہ سے اس سے علیحدہ ہو جائے گی' یہی بات ابن مسعود' نسائی' ابن ابی لیلیٰ' حاکم' حماد بن ابی سلیمان' قتادہ اور اسحق کہتے ہیں۔ جبکہ ابن منذر کا کہنا ہے کہ اکثر اہل علم نے اس قول کا

انکار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان "مِنْ نِّسَآئِهِمْ" آزاد اور غلام سب کو شامل ہے جبکہ وہ بیویاں ہوں اسی طرح "لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ" میں غلام بھی شامل ہے جب وہ اپنی بیوی کے بارے میں قسم اٹھائے۔ یہ بات احمد' شافعی اور ابو ثور رحمہم اللہ نے بھی کہی انہوں نے مزید کہا کہ اس کا ایلاء آزاد کی طرح ہی ہے۔

امام مالک' زہری عطاء' ابوحنیفہ اور اسحاق رحمہم اللہ کہتے ہیں اس کی مدت دو ماہ ہے اور شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لونڈی سے ایلاء کی مدت آزاد کی نسبت آدھی ہے۔

تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ۔ "ان کے لئے چار مہینے کی مدت ہے۔"

مریض کا معنی انتظار اور تاخیر ہے جیسا کہ شاعر نے کہا

تربص بها ريب المنون لعلها تطلق يوما او يموت حليلها

اللہ تعالیٰ نے اس مدت کا وقت مقرر کیا بیوی سے تکلیف دور کرنے کے لئے' جاہلیت والے ایک اور دو سال تک کے لئے ایلاء کرتے اور اس سے بھی زیادہ ان کا مقصد یہ ہوتا کہ عورتوں کو تکلیف دی جائے۔ ایک قول کے مطابق چار ماہ سے زیادہ عورت اپنے خاوند سے صبر کی طاقت نہیں رکھتی۔

"فَاِنْ فَآءُوْ" ۔ "پھر اگر وہ لوٹ آئیں۔" اور لوٹ آنا اس معنی میں ہے "حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ" (الحجرات:۹) "یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔"

اسی لئے زوال کے بعد سایہ کے لئے فئی کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ وہ مشرق سے مغرب کی جانب لوٹ گیا۔

ابن منذر کہتے ہیں تمام علماء کا اجماع ہے کہ فئی سے مراد جماع ہے جسے جماع کا کوئی عذر لاحق نہ ہوا گر اسے بیماری یا قید کا عذر ہے تو وہی اس کی بیوی ہے۔ پس جب عذر ختم ہوا اور وہ جماع کرنے سے انکاری ہوا ان دونوں کے درمیان علیحدگی کر دی جائے گی اگر چہ مدت گذر چکی ہو یہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے۔

ایک جماعت کا کہنا ہے عذر کے وقت بقائم ہوش وحواس لوٹنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کی طرف سے کافی ہوگا' یہ بات حسن' عکرمہ' نخعی' اوزاعی اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کہی۔ جمہور نے ایلا کرنے والے پر لازم قرار دیا ہے کہ ... جماع

کرے۔ جبکہ حسن اور نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس پر کفارہ نہیں۔ کیونکہ جب اس نے بیوی کو تنگ کرنے سے توبہ کر لی ہے۔

"فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ"، "تو اللہ بھی بخشنے والا۔" اس خاوند کو جو اپنی بیوی کو تکلیف دینے سے توبہ کرتا ہے۔ رَّحِيمٌ "مہربان ہے۔"

"وَإِنْ عَزَمُوا"، "اور اگر قصد کر لیں۔" "اَلْعَزْمُ" کہتے ہیں کسی چیز پر گرہ باندھنا تو "عَزَمُوا الطَّلَاقَ" کا معنی یہ ہوگا کہ اگر وہ دلی طور پر طلاق دینے کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔

طلاق کہتے ہیں نکاح کی گرہ کو کھولنا' اس میں دلیل ہے کہ چار ماہ گذرنے پر طلاق واقع نہ ہوگی جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ مدت گذرنے کے بعد خود ہی طلاق واقع نہ ہوگی اور یہ بھی ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَإِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ" سماع بولنے کے بعد کسی سننے والے کا تقاضا کرتا ہے۔

ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں اس کے ایلاء کو سننے والا اور اس کے عزم کو جاننے والا ہے جو چار ماہ کے گذرنے پر دلیل ہے۔ امام شوکانی فتح القدیر میں فرماتے ہیں: جان لو کہ ہر مذہب والے نے اس آیت کی تفسیر اپنے مذہب کے مطابق کی ہے اور انہوں نے ایسا تکلف کیا کہ جس پر کوئی لفظ اور نہ کوئی دوسری دلیل منطبق ہوتی ہے' اس کا معنی ظاہر و واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے ایلاء کرنے کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے چار ماہ تک کی قسم اٹھا سکتا ہے' پھر اس کے بعد اس ایلاء کرنے والے کے حکم کی اپنے بندوں کو خبر دی جبکہ مدت گذر جائے "فَإِنْ فَاءُوا" "اگر وہ لوٹ آئیں۔" یعنی اگر وہ لوٹ آئے اپنی شادی باقی رکھنے اور نکاح قائم رکھنے کی طرف تو "فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ" "تو اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا مہربان ہے۔"

وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ۔ "اور اگر طلاق کا ہی پختہ عزم کر لیں عزم ان لوگوں کی طرف سے اس ایلا اور اس کے ارادہ پر تو اللہ تعالیٰ اس بات کو سننے والا ان کی بات کو اور جاننے والا اس عزم وارادہ کو۔" یہ آیت کا معنی ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

جس شخص نے قسم اٹھائی کہ وہ اپنی بیوی سے صحبت نہیں کرے گا اور مدت مقرر نہ کی یا چار ماہ سے زیادہ کی مدت مقرر کی تو ہم پر چار ماہ تک مہلت دینا لازم ہے' اگر یہ مدت گذر جائے تو اسے اختیار ہے یا تو اپنی بیوی کے نکاح کی طرف لوٹ آئے' تو اس صورت میں مدت گذرنے کے بعد یہ اس کی بیوی اسی طرح ہوگی جس طرح کہ مدت گذرنے سے پہلے تھی یا اسے طلاق دے تو اس

صورت میں وہ عورت اس مطلقہ کے حکم میں ہوگی جسے شروع سے طلاق دی گئی۔

لیکن اگر چار ماہ سے کم مدت مقرر کی اور اس کا ارادہ ہے کہ وہ اپنی قسم پوری کرے تو جو قسم اٹھائی ہے اس کے مطابق عورتوں سے علیحدہ ہو جائے‘ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا جبکہ ایک ماہ تک آپ نے ایلاء کیا تو پورا مہینہ گذرنے تک آپ اپنی بیویوں سے علیحدہ رہے۔

اگر مدت گزرنے سے پہلے ہی جو کہ چار ماہ سے کم ہے اپنی بیوی سے جماع کا ارادہ کرے تو قسم توڑ دے اور اس پر کفارہ لازم ہے اور یہ اس طرح ہوگا جو آپ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ: جس نے کسی چیز کے بارے میں قسم اٹھائی اور اس کے علاوہ کوئی اور بہتر چیز دیکھی تو وہ بہتر کی طرف جائے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا دے۔

فـئـی کے بارے میں اسلاف کے مختلف اقوال ہیں‘ پس مناسب ہے کہ لغوی اعتبار سے فـئـی کی طرف ہی لوٹنا چاہیے جو کہ ہم واضح کر چکے ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے اس میں مختلف اور آپس میں مخالف اقوال ہیں اور متعین بات یہی ہے کہ جو بات آیت کریمہ میں ہے اسی کی طرف لوٹنا چاہیے اور وہ ہم آپ کو بتا چکے ہیں لہٰذا اس کی دونوں ہاتھوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑ لو۔

مصنف میں عبدالرزاق نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ غلام کا ایلاء دو ماہ ہے۔ جبکہ امام مالک نے ابن شہاب سے نقل کیا کہ غلام کا ایلا آزاد کی طرح ہے۔

مضمون نمبر: ۳۸

وَ الْمُطَلَّقٰتُ۔ (البقرۃ:۲۲۸)

”اور طلاق والی عورتیں۔“

اس عام حکم کے تحت تمام مطلقہ عورتیں داخل ہیں جنہیں دخول سے پہلے ہی طلاق دے دی گئی پھر انہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ”سے خاص کر دیا گیا“ تو ان پر تمہارا کوئی حق عدت کا نہیں جسے تم شمار کرو۔“ پس خاص پر عام کو باقی رکھنا لازم ہو گیا اور اس عموم سے عورتیں نکل گئیں جنہیں دخول سے پہلے ہی طلاق دی گئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ ”اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے وضع حمل ہے“ سے حمل والی عورتیں بھی نکل گئیں اور اسی طرح اس حکم سے ”آئسہ“ جس کو حیض آنے کی امید نہ ہو) اولاد سے مایوس عورتیں بھی اس فرمان سے نکل گئیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ''تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ''وہ اپنے آپ کو روکے رکھیں۔''

''التربص'' کا معنی ہے انتظار' ایک قول ہے کہ یہ جملہ خبریہ ہے مگر امر اور حکم (لیتربصن) کے معنی میں' یعنی وہ انتظار کریں' خبر کے صیغے سے لانے کا مقصد اس کے وقوع پذیر ہونے کی تاکید ہے اور اسے مبتداء کی خبر بنا کر اس کے وقوع کو مزید مؤکد کیا۔ ابن عربی فرماتے ہیں یہ باطل اور غلط بات ہے' یہ شریعت کے حکم کی خبر ہے پس اگر کسی مطلقہ کو انتظار کرتے ہوئے نہ پایا گیا تو یہ عمل شریعت کا نہیں اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کی خبر واقعہ کے خلاف ہے۔

''ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ'' ''تین حیض تک'' اس کی جمع قُرُوْءٌ ہے' یہ بات جمہور نے کہی۔ اصمعی کہتے ہیں کہ اس کی ''مرو'' (قائمہ اور واؤ کی شد کے ساتھ) ہے ابوزید قرو پڑھتے ہیں ان کا کہنا ہے پہلے دونوں بھی صحیح ہیں اور کہتے ہیں ''اَقْرَأَتِ الْمَرْاَةُ'' کا معنی ہے عورت حائضہ ہوگئی اور پاک ہوگئی۔ اخفش کہتے ہیں ''اَقْرَأَتِ الْمَرْاَةُ'' کا معنی ہے حیض والی ہوگئی پس جب حیض والی ہو جائے تو ''قَرَأَتْ'' بغیر الف کے پڑھیں گے۔ ابوعمرو بن علاء کہتے ہیں کہ عرب کے کچھ لوگ حیض کو قرء اور کچھ طہر کو قرء کہتے ہیں کچھ ان دونوں حیض اور طہر کو قرء کہتے ہیں۔

معلوم رہے کہ قرء کسی وقت کے ہے' منقول ہے کہ ''هبت الرياح لقرئها اى لوقتها'' ہوا اس کے قرء یعنی فلاں وقت میں چلی ہیں، اس لئے حیض اور طہر کو قرء بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ حیض اور طہر کا ایک وقت معلوم و مقرر ہے اور اہل عرب کبھی اس کا اطلاق طہارت پر اور کبھی حیض پر کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ قرء کا لغت عرب میں حیض اور طہر کے لئے مشترک ہے اور اسی اشتراک کی وجہ سے اس کی تعیین کے بارے میں کہ اس آیت میں مذکور قرء سے کیا مراد ہے اہل علم میں اختلاف ہے' اہل کوفہ کا کہنا ہے اس سے مراد حیض ہے' سیدنا عمر سیدنا علی سیدنا ابن مسعود' سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہم' مجاہد' قتادہ' ضحاک' عکرمہ' سدی اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

اسی قول کو سید محمد الامیر نے سبل السلام میں ترجیح دی ہے اور ہم نے اسے مسک الختام میں ذکر کیا ہے۔ حجاز والے کہتے ہیں کہ اس سے مراد طہارت و پاکیزہ ہونا ہے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ' سیدنا ابن عمر' زید بن ثابت رضی اللہ عنہم' زہری ابان بن عثمان اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہی ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ جان لو ان تمام کے درمیان اس بات پر تو اتفاق ہے کہ قرء سے تمام کے نزدیک تو مراد ایک وقت ہے آیت کا معنی یہ ہوا کہ طلاق یافتہ عورتیں اپنی

جانوں کو تین اوقات تک روک کر رکھیں۔ اس بنا پر یہ آیت تعداد کی تفسیر و وضاحت تو کرتی ہے لیکن جس کی گنتی کی گئی اسے مجمل وغیر واضح رکھتی ہے' پس محدود کی وضاحت اس کے علاوہ کسی جگہ سے تلاش کرنا واجب ہے۔ پس پہلے قول والوں نے اپنے اس موقف کہ اس آیت سے مراد حیض ہے کے لیے آپ ﷺ کے اس فرمان سے استدلال کیا تو نماز چھوڑ دے افتراء کے دنوں میں اور آپ ﷺ کے اس فرمان سے کہ لونڈی کی طلاق دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں۔ عدت کا مقصد ہے رحم کا خالی ہونا، یہ مقصد حیض سے پورا ہوتا ہے نہ طہر سے۔

دوسرے قول والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا فطلقوھن لعدتھن۔ تو ان کی عدت میں انہیں طلاق دو۔ اس میں اختلاف نہیں کہ یہاں طلاق کا حکم طہر کے وقت میں دیا جا رہا ہے اور آپ ﷺ کے اس فرمان سے جو آپ ﷺ نے عمر سے کہا: اسے حکم دو کہ رجوع کرے پھر اسے روکے رکھے، حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائے پھر اسے حیض آئے پھر پاس ہو، یہ وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ طہر میں عورت کو طلاق دی جائے۔

ابوبکر بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں، ہم نے اپنے فقہاء میں سے کسی کو اس بات کے سوا کہتے ہوئے نہیں پایا کہ قرء سے مراد طہر ہے۔ پس جب آدمی طہر میں طلاق دے اور اس نے اس طہر میں صحبت نہیں کی تو اسے شمار کیا جائے گا، اگرچہ اس کا ایک لمحہ یا ایک گھڑی ہی باقی نہ رہ گئی ہو۔ پھر وہ عورت حیض کے بعد دوسرے طہر میں جائے گی پس جب وہ تیسرے حیض کا خون دیکھے تو یہ عورت عدت سے نکل گئی۔

میرے نزدیک دونوں قول والوں کے دلائل میں بعض ٹھوس دلیلیں نہیں، البتہ پہلے لوگوں کا قول کہ نبی ﷺ نے فرمایا تو اپنے اقراء کے دنوں میں نماز چھوڑ دے، میں کوئی جھگڑا نہیں، جس طرح ایک مشترک لفظ کی حالت ہوتی ہے کہ کبھی وہ ایک معنی میں بولا جاتا ہے اور کبھی دوسرے معنی میں، جھگڑا تو اس آیت میں مذکور اقراء میں ہے، لیکن آپ ﷺ کا فرمان لونڈی کے بارے میں کہ اس کی عدت دو حیض ہیں، یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی اور حاکم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کی اور ابن ماجہ اور البیہقی نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کی۔ اس کی دلالت پہلے لوگوں کے قول پر مضبوط ہے۔

لیکن ان کا یہ کہنا کہ عدت کا مقصد رحم مادر کا خالی ہونا ہے جو کہ حیض سے معلوم ہوتا ہے نہ کہ

طہر سے۔ اس کا جواب یہ ہے یہ مقصد تو پورا ہو جاتا ہے، اگرچہ اس عدت میں حیض نہ بھی ہو یہ اس صورت میں کہ ہم اقراء کی تفسیر طہر فرض کریں حالانکہ حقیقت یہ نہیں بلکہ اقراء جس طرح حیض پر مشتمل ہے اسی طرح طہر پر مشتمل ہے۔

دوسرے گروہ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا فطلقوھن لعدتھن۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لعدتھن کے لام میں جھگڑا ہے تو اس میں یہ احتمال پیدا ہو گیا اور احتمال والی بات سے دلیل نہیں لی جا سکتی البتہ ان کا استدلال آپ ﷺ کا عمر سے کہنا کہ اسے کہو وہ اسے لوٹائے۔ الحدیث یہ صحیح ہے اور اس کی دلالت ان کے موقف کے مطابق مضبوط ہے اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس عورت کی عدت تین طہر اور تین حیض گذرنے پر پوری ہو گی تو اس کے لئے کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو گی۔ بعض اہل علم کی ایک جماعت نے جواز پیش کیا ہے کہ مشترک کو دونوں معانی پر محمول کیا جائے اس طرح تمام دلائل جمع ہو جائیں گے' اختلاف بھی ختم ہو جائے گا اور کوئی جھگڑا بھی نہ رہے گا۔

زمخشری نے ایک اشکال اٹھایا ہے کہ "ثلاثۃ" کی تمیز قروء جو آئی ہے یہ جمع کثرۃ کا صیغہ ہے اس کی بجائے اقراُ آنا چاہیے تھا جو کہ جمع قلت کا صیغہ ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ عرب اس کے استعمال میں گنجائش رکھتے ہیں اور ہر ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں اس لئے کہ جمع میں یہ دونوں مشترک ہیں۔

وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ۔

"انہیں حلال نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو ان کے رحم میں پیدا کیا ہوا سے چھپائیں۔"

ایک قول کے مطابق اس سے مراد حیض ہے۔ ایک قول کے مطابق حمل ہے اور ایک قول کے مطابق دونوں (حیض اور حمل) ہیں۔ چھپانے سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات اس سے خاوند کو تکلیف دینا اور اس کا حق چھیننا ہے' مثلاً جب عورت کہے کہ میں حیض سے ہوں اور حقیقت میں وہ حیض سے نہ ہو تو یہ اس خاوند کا حق رجوع لے گئی اور جب وہ یہ کہے کہ میں حیض سے ہوں اور وہ حیض سے نہ ہو تو اس کے لئے خرچ لازم آئے گا جو اسے نہیں ملنا چاہیے تھا، تو اس طرح بھی اس نے اس خاوند کو تکلیف پہنچائی۔

اسی طرح حمل ہے کہ وہ عورت اسے چھپاتی ہے تا کہ اس کا حق رجوع ختم دے' بعض اوقات حمل کا دعویٰ کرتی ہے تا کہ اسے خرچ ملے اسی طرح اور بھی مقصد خاوند کو تکلیف دینے کا ہو سکتا

ہے۔اس مدت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ جو عورت کی تصدیق کرتی ہے کہ کس وقت میں اس کی عدت مکمل ہوگی، تو اس آیت میں عورت کی بات قبول کرنے کی دلیل ہے گو وہ نفی میں ہو یا اثبات میں۔

اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

''اگر انہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو۔''

اس میں چھپانے کی سخت سزا ہے اور اس بات کی وضاحت ہے کہ ان عورتوں میں سے جو بھی اپنے پیٹ کی چیز چھپائے گی تو وہ ایماندار کہلانے کی حقدار نہیں ہے۔ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ ان کے خاوند، یہ جمع ہے ''بَعْل'' کی اس کا معنی ہے خاوند، اسے بعل اس ... کی وجہ سے کہا جاتا ہے جو اسے اپنی بیوی پر حاصل ہے۔اس لئے مشرکین عرب یہ لفظ رب تعالیٰ پر بولا کرتے۔اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا ''کیا تم بعل کو پکارتے ہو۔'' یہاں بعل بمعنی رب ... سے بعول اور بعولة بھی کہا جاتا ہے جس طرح ذکر کی جمع ذکور اور ذکورة آتی ہے۔

بُعُوْلَتُهُنَّ میں تاء جمع ... کی ہے یہ شاذ ہے قیاسی نہیں بلکہ سماعی ہے اور بعولہ بھی مصدر ہے بعل یبعل بروزن ... منع یعنی وہ خاوند ہوا۔ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ انہیں لوٹانے کے پورے حق دار ہیں۔یہاں ر... رجوع ہے یعنی اسے لوٹانے کا یہاں اسم تفضیل کا صیغہ اس لئے لایا گیا کہ آدمی جب عورت کو لوٹانا چاہے اور عورت انکار کرے تو مرد کی بات کو عورت کی بات پر ترجیح دی جائے گی۔اس کا یہ معنی نہیں کہ اس عورت کو بھی لوٹنے میں کچھ حق حاصل ہے۔یہ بات ابوالسعود نے کہی۔

یہ حکم اس خاوند کے لئے ہے جسے لوٹانے کا حق ہے' پس یہ اس عام حکم سے مخصوص ہو گیا جو عام حکم اس فرمان الٰہی ''وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ'' کیونکہ یہ حکم تینوں اقسام اور ان کے علاوہ کو بھی عام ہے یعنی انتظار کی مدت' پس جب انتظار کی مدت گذر جائے تو وہ عورت اپنی جان کی زیادہ حق دار ہے اور یہ عورت اس مرد پر حلال نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ اس کا نیا نکاح ولی اور گواہوں کی موجودگی میں نئے مہر کے ساتھ ہو اور اس موقف میں کوئی اختلاف نہیں۔

اور رجوع کلام اور صحبت دونوں کے ساتھ ہو سکتا ہے اور رجوع میں احکام نکاح میں سے ... بارہ کرنا لازم نہیں۔اس بات میں کوئی اختلاف نہیں اصلاح چاہتے ہیں' یعنی مرد ... صحیح ہے اور اگر اس کو تنگ کرنے کا ارادہ ہو

تو پھر یہ حرام "ان ارادوا اصلاحًا" یعنی اگر رجوع سے اپنی اللہ تعالیٰ کے فرمان حرام ہے۔ "وَ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا" اور انہیں تکلیف پہنچانے کی غرض سے ظلم وزیادتی کے لئے نہ روکو"

ایک قول یہ ہے کہ جب رجوع کے ساتھ تکلیف دینے کا ارادہ ہوتو بھی صحیح ہے' اگرچہ وہ حرام کا ارتکاب کرے اور اپنی جان پر ظلم کرے' اس لحاظ سے آیت "ان ارادوا" میں مذکورہ شرط خاوند کو ترغیب اصلاح کے ارادہ کی دینے اور تکلیف کے ارادہ سے منع کرنے کے لئے ہے' اس سے مراد اصلاح کے ارادہ کو رجوع کے صحیح ہونے کے لئے شرط بنانا نہیں۔

مضمون نمبر: ۳۹

وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (البقرۃ: ۲۲۸)

"اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں اچھائی کے ساتھ۔"

یعنی ان عورتوں کے بحیثیت بیوی مردوں کے ذمہ حقوق اسی طرح ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمہ ہیں' لہٰذا مرد کو چاہیے کہ وہ اچھے طریقہ سے اس کے ساتھ زندگی گذارے' وہ طریقہ جو عام لوگوں کی عادت ہے کہ وہ اپنی بیویوں سے پیش آتے ہیں' اسی طرح عورتوں کو بھی چاہیے کہ وہ بھی عام عادت کے مطابق اپنے خاوندوں کے ساتھ اچھے طریقہ سے پیش آئیں جیسا کہ شریف عورتیں اپنے خاوندوں سے پیش آتی ہیں' مثلاً خاوند کی اطاعت کرنا' اس کے لئے زیب وزینت اختیار کرنا اور آپس میں محبت کرنا وغیرہ۔

وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ "ہاں مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔"

یعنی وہ ایسا مرتبہ ہے کہ جو عورتوں کے لئے نہیں اور وہ یہ کہ ان مردوں کا خرچ کا ذمہ دار ہونا اور اس لئے بھی کہ مرد محنت ومشقت کرتے ہیں' عقل مند ہیں اور قوی ہیں۔ مردوں کو وراثت میں عورتوں سے زیادہ ملتا ہے اور یہ بات کہ ان عورتوں کا کے حکم کی تعمیل کرنا اور ان کی رضامندی پر راضی ہونا اور اگر ان عورتوں پر مردوں کی کوئی دوسری فضیلت نہ بھی ہو تو یہ بھی مرد کی فضیلت کا حصہ ہے۔ سوائے اس کے کہ عورت مرد سے پیدا کی گئی جو کہ ثابت ہے کہ حواء کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔

اصحاب سنن نے عمرو بن احوص سے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بے شک

تمہارے (خاوندوں کے) تمہاری عورتوں (بیویوں) کے ذمہ حق ہیں اور تمہاری عورتوں بیویوں کے تمہارے (یعنی خاوندوں کے) ذمہ حق ہیں' تمہارا حق تمہاری عورتوں کے ذمہ یہ ہے کہ جسے تم ناپسند کرتے ہو تو تمہاری بیوی اس شخص کو تمہارے بستر پر بیٹھنے دے اور نہ ہی ایسے لوگوں کو تمہارے گھر میں آنے کی اجازت دے' خبردار ان (بیویوں) کا تمہارے ذمہ حق یہ ہے کہ ان کے کھانے اور پینے میں ان کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آؤ'' اسے امام ترمذی نے صحیح کہا۔

امام احمد' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ' جریر' حاکم اور بیہقی نے معاویہ بن حیدہ القشیری سے روایت بیان کی' انہوں نے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ عورت کا خاوند پر کیا حق ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب تو کھائے تو اسے بھی کھلا اور جب تو پہنے تو اسے بھی پہنا اور اس کے چہرے پر نہ مار اور اسے سوائے گھر کے کہیں نہ جھڑک۔''

عبد بن حمید اور ابن جریر نے مجاہد سے اللہ تعالیٰ کے فرمان ''وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ'' کے بارہ میں نقل کیا ہے کہ یہ فضیلت و برتری ہے جو اللہ پاک نے انہیں عورتوں پر دی' وہ محنت و مشقت اور زائد وراثت سے اور ہر قسم کی وہ فضیلت جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عورتوں پر عطا فرمائی۔

مضمون نمبر: ۴۰

اَلطَّلَاقُ۔ (البقرۃ:۲۲۹)

''یہ طلاقیں۔''

یعنی طلاق کی تعداد جس میں رجوع کا حق ہے۔ یہاں طلاق سے مراد طلاق رجعی ہے اس کی دلیل وہ لفظ ہیں جو پہلی آیت میں گذرے' وہ ہیں مَرَّتٰنِ ''دو مرتبہ'' یعنی پہلی اور دوسری جبکہ تیسری کے بعد رجوع نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے لفظ دو مرتبہ فرمایا نہ کہ دو طلاق کا' اور ''دو مرتبہ'' کے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ طلاق علیحدہ علیحدہ اوقات میں ایک مرتبہ کے بعد دوسری مرتبہ ہوگی' کہ نہ دونوں طلاقیں ایک ہی مرتبہ' مفسرین کی ایک جماعت کا بھی یہی خیال ہے۔

دوسری طلاق کے بعد دو باتوں میں سے کسی ایک کو اپنانا لازم ہے یا تو تیسری طلاق دے کہ اس کو زوجیت سے علیحدہ کر دے یا اسے روک کر نکاح قائم و دائم رکھے اور تیسری طلاق نہ دے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فَاِمْسَاكٌ فرمایا یعنی جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دینے کے بعد رجوع کے بعد روک لے۔ بِمَعْرُوْفٍ' یعنی جو طریقہ لوگوں میں اچھے انداز سے زندگی گذرنے کا ہے

اس کے مطابق۔ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ یعنی تیسری طلاق دے کر بغیر کسی تکلیف و مصیبت کے چھوڑنا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اچھے طریقہ سے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسری طلاق کے بعد رجوع کر لے، "اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ" یا احسان کرتے ہوئے چھوڑنا' یعنی دوسری طلاق کے بعد رجوع نہ کرنا حتیٰ کہ عدت گذر جائے۔ مگر پہلا معنی ہی صحیح ہے۔

اہل علم نے تین طلاقیں ایک مرتبہ دینے میں اختلاف کیا ہے۔ کیا تینوں واقع ہو جاتی ہیں یا ایک ہی؟ پہلا موقف جمہور کا ہے اور دوسرا ان کے علاوہ دوسروں کا اور یہی صحیح ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی تصنیفات میں اس مسئلہ کی وضاحت کر دی ہے اور اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔

(نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ) میں بھی یہی کہتا ہوں اور اسی موقف کو امام ابن تیمیہ حرانی رحمہ اللہ اور حافظ ابن قیم الجوزی رحمہ اللہ اور ان کے علاوہ پرانے اور نئے بڑے بڑے علماء کی ایک جماعت نے اختیار کیا۔ میں نے اس موضوع پر مسک الختام شرح بلوغ المرام میں بہت عمدہ بالتفصیل اور انتہائی واضح طریقہ سے لکھا ہے۔

مضمون نمبر: ۴۱

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا۔ (البقرۃ: ۲۲۹)

"اور تمہیں حلال نہیں کہ تم نے انہیں جو دے دیا ہے اس میں سے کچھ بھی لو۔"

یہ خطاب مردوں کو ہے' یعنی ان کے لئے جائز نہیں کہ جو اپنی بیویوں کو حق مہر دیا ہے انہیں تکلیف دینے کے لئے اس میں سے کچھ بھی واپس لیں "شَيْئًا" کو نکرہ اس لئے لایا گیا کہ کوئی معمولی وحقیر چیز بھی نہیں لینی کجا یہ کہ زیادہ چیز لی جائے۔ خصوصاً جو انہوں نے ان عورتوں کو دیا ہے اسے لینا جائز وحلال نہیں' مزید یہ کہ مہر کے علاوہ بھی جن اموال کی وہ مالکہ ہیں انہیں لینا مردوں کیلئے جائز وحلال نہیں' اسلئے کہ یہ ایسی چیز ہے جس پر خاوند بہت حریص ہوتا ہے' حالانکہ جو اس عورت کی ملکیت ہے یہ اسے لینے کا مجاز نہیں کیونکہ جو مال اس نے بطور حق مہر دیا ہے جب اس کا لینا اس کیلئے وہ جائز نہیں تو پھر اس کے علاوہ دوسرا مال جو کہ خالصتاً عورت کی ملکیت ہے اس مال کا لینا تو بالاولی جائز نہ ہوا۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ خطاب ائمہ اور حکام کے لئے ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "فَـاِنْ

خِفْتُمْ" سے مطابقت کرے' کیونکہ اس میں خطاب ائمہ اور حکام سے ہے' اس بنا پر اس لینے کی نسبت ان کی طرف کی جائے اس لئے کہ یہی اس کا حکم دینے والے ہیں' اگر پہلی بات مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس کے خاوند کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف یہ نسبت بہت بعید ہے اس لیے کہ ان عورتوں کو رقم دینا ائمہ و حکام کے حکم سے تو نہیں تھا۔

ایک قول کے مطابق دوسرا قول زیادہ مناسب ہے تا کہ انتظام میں تشویش وخرابی پیدا نہ ہو۔"اِلَّا اَنْ يَّخَافَا" "ہاں یہ اور بات ہے کہ دونوں کو خوف ہو۔" یعنی تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ بھی لو' مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں "اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ" کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں جو اس نے خاوند اور بیوی کے لئے مقرر کی ہیں اور حسن معاشرت کے ذریعہ اس نے ان پر ان حدود کی پابندی لازم کی ہے اطاعت و فرمانبرداری اور۔

"فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ" ۔"اس لئے اگر تمہیں ڈر ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے۔"

یعنی جب ائمہ اور حکام، خاوند یا بیوی کے درمیان انصاف کرنے والے اگرچہ وہ ائمہ و حکام میں سے نہ ہوں اس بات سے ڈریں کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے جو کہ ان دونوں پر واجب ہے تو "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ" "تو پھر عورت رہائی پانے کے لئے کچھ دے ڈالے اس میں دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔"

یعنی مرد و عورت کسی پر کوئی گناہ نہیں کہ' اس نکاح سے عورت خود اپنی جان کے بدلہ فدیہ میں اس قدر مال دے کہ آدمی اس پر راضی ہو کر طلاق دلا دے اور یہ خلع کی صورت ہے۔

جمہور کا کہنا ہے کہ یہ خاوند کے لئے جائز ہے اس کے لئے اس خوف کی وجہ سے یہ مال لینا جائز و حلال ہے اور اس بات کی قرآن کریم نے صراحت کر دی ہے۔

ابن منذر نے بعض اہل علم سے بیان کیا کہ جو وہ لے یہ اس کے لئے حلال نہیں اور اسے رد کرنے پر مجبور بھی نہ کیا جائے۔ یہ انتہائی گری ہوئی بات ہے۔ حمزہ نے "اِلَّا اَنْ يَّخَافَا" مجہول پڑھا ہے اور فاعل محذوف ہے وہ ائمہ اور حکام ہیں۔ اسے ابو عبید نے بھی پسند کیا ہے' اس نے اللہ تعالیٰ کے فرمان "فَاِنْ خِفْتُمْ" کے بارہ میں کہا ہے کہ یہ خوف خاوند و بیوی کے علاوہ

بن جبیر، حسن اور ابن سیرین کا ہے۔ نحاس نے ابوعبید کے اس اختیار کو ضعیف اور کمزور کہا۔

بکر بن عبداللہ المازنی سے منقول ہے کہ یہ آیت سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیت ''وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا'' ''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا ہی چاہو اور ان میں سے کسی کو تم نے خزانہ کا خزانہ دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو کیا تم اسے ناحق اور کھلا گناہ ہوتے ہوئے بھی لے لوگے۔''

یہ قول اجماع سے خارج ہے اور ان دونوں آیات میں کوئی تناقض بھی نہیں ہے۔

اہل علم کا اس بات میں اختلاف ہے کہ جب خاوند بیوی سے جو اس نے مہر وغیرہ دیا ہے اس سے زائد کا مطالبہ کرے اور وہ عورت اس پر راضی ہو تو کیا یہ اس کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ قرآن کریم کے ظاہری اسلوب سے تو جواز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ معین مقدار کی کوئی قید نہیں امام مالک، شافعی اور ابوثور کا یہی خیال ہے، صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی اسی کی طرح مروی ہے۔ جبکہ طاووس، عطا انصاری، احمد اور اسحٰق رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں۔

خلع کی مذمت میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔

ان میں ایک حدیث سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو عورت اپنے خاوند سے بلاوجہ طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی مہک بھی حرام ہے۔'' احمد، ابوداؤد، ترمذی، اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ ایک اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خلع مانگنے والیاں منافق ہیں۔

احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن جریر، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ نے بھی روایت کیا، عباس رضی اللہ عنہما کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو عورت اپنے خاوند سے کسی اہم بات کے بغیر طلاق کا سوال کرے تو وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گی اور بے شک اس کی خوشبو چالیس سال تک کی مسافت پر پائی جاتی ہے۔''

اہل علم نے خلع لینے والی عورت کی عدت کے بارہ میں اختلاف کیا ہے اور راجح مسلک یہ ہے کہ خلع والی عورت ایک حیض عدت گذارے اس لئے کہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی کو حکم دیا کہ وہ ایک حیض عدت گذارے۔ اس مسئلہ میں بہت سی احادیث آئی ہیں اور ایسی کوئی مرفوع روایت

نہیں آتی' جو اس کے معارض و بالمقابل ہو' بلکہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ خلع کی عدت طلاق کی عدت کی طرح ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ یہ قول صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہ میں سے اکثر اہل علم کا ہے' انہوں نے اس پر استدلال یوں کیا ہے کہ خلع والی عورت کا ان جملہ طلاق والی عورتوں میں سے ہونے کی وجہ قرآن کریم کے عمومی حکم میں داخل ہے اور حق بات وہی جو ہم نے ذکر کی ہے' کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان قرآن حکیم کے عام حکم کو خاص کرتا ہے۔ مکمل بحث مسک الختام شرح بلوغ المرام میں ہے اس کی طرف لوٹنا چاہیے۔ حلالہ کے مسئلہ کے بارہ میں کئی احادیث آئی ہیں ان کو بھی معلوم کر لیجیے۔ پس یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔

مضمون نمبر: ۴۲

فَإِنْ طَلَّقَهَا۔ (البقرۃ: ۲۳۰)

''پھر اگر اس کو (تیسری بار) طلاق دے دے۔''

یعنی تیسری طلاق جس کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ میں تذکرہ فرمایا ہے' یعنی اگر یہ تیسری طلاق واقع ہو جائے تو تین طلاقوں کی وجہ سے وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جائے گی۔ اور یہ عورت اس مرد کے لیے اس وقت تک حلال نہ ہو۔

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔

''تو اب اس کے لئے حلال نہیں جب تک کہ وہ عورت اس کے سوا دوسرے آدمی سے نکاح نہ کر لے۔'' یعنی حتیٰ کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے شادی کر لے۔

آیت کے ظاہری حکم سے سعید بن مسیب اور ان کے موافق احباب نے فرمایا ہے کہ صرف عقد نکاح ہی کافی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ''حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ'' سے مراد یہی ہے۔ جبکہ پہلے اور بعد کے جمہور کا موقف یہ ہے کہ عقد نکاح کے ساتھ صحبت بھی ضروری ہے' اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر اعتبار ثابت ہے اور یہ زیادتی قبول کرنا لازم ہے' ممکن ہے کہ سعید بن مسیب اور ان کے متبعین کو یہ روایت نہ پہنچی ہو۔

اس آیت میں یہ بھی دلیل ہے کہ اس سے شرعی نکاح مقصود ہے' نہ کہ حلالہ کی غرض سے حیلہ بہانہ کیا جائے تاکہ اس نکاح کو پہلے خاوند کی طرف لوٹانے کا ذریعہ بنایا جائے کیونکہ یہ عمل منقولہ

دلائل سے حرام اور مذموم ہے' مزید یہ کہ حلالہ کرنے والا بھی قابل مذمت ہے اور وہ ادھار لیا ہوا سانڈ ہے جس پر شارع علیہ السلام نے لعنت فرمائی ہے حلالہ کروانے والے اس پر بھی لعنت فرمائی جو اس سانڈ کو ادھار پر لیتا ہے۔

اس پر حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین اور اغاثۃ اللہفان میں بالتفصیل گفتگو فرمائی ہے۔

"فَإِنْ طَلَّقَهَا" "پھر اگر وہ بھی طلاق دے۔" یعنی دوسرا خاوند "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا" "تو ان دونوں کو میل جول کر لینے میں کوئی گناہ نہیں"، یعنی پہلے خاوند اور بیوی پر "أَنْ يَتَرَاجَعَا" یعنی ہر ایک ان میں سے دوسرے کی طرف رجوع کرے۔

ابن منذر کہتے ہیں اہل علم کا اجماع ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے پھر اس کی عدت گذر جائے تو وہ عورت دوسرے خاوند سے نکاح کر لے اور یہ دوسرا خاوند اس کے ساتھ دخول کرے پھر اسے چھوڑ دے یا اور عورت عدت پوری ہونے کے بعد پھر پہلے خاوند سے نکاح کر لے تو پھر پہلا خاوند تین طلاق کا حق رکھتا ہے۔

إِنْ ظَنَّآ أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ۔

"بشرطیکہ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔"

یعنی میاں بیوی کے لازمی حقوق جو ہر ایک کے دوسرے کے ذمہ ہیں' لیکن اگر یہ یقین پیدا نہ ہو سکے کہ وہ دونوں یا ایک ہی یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے یا وہ شک میں ہوں اور انہیں یقین نہ ہو تو اس نکاح میں دخول جائز نہیں کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا گمان ہے اور ایسے کام کے ارتکاب کا خطرہ ہے جو خاوند اور بیوی پر حرام ہے۔

مضمون نمبر: ۴۳

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ۔ (البقرۃ: ۲۳۱)

"جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت ختم کرنے پر آئیں تو اب انہیں اچھی طرح بسا دیا بھلائی کے ساتھ الگ کر دو۔"

بلوغ الی الشیٔ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز تک پہنچنا۔ اس کا حقیقی معنی یہ ہے کہ اس چیز کے ساتھ مل

جانا اور بلوغ قربت کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا مگر تعلق کے لئے مجازی طور پر قرینہ کے ساتھ جیسا کہ یہاں ہے' تو یہاں حقیقی معنی مراد لینا درست نہیں' کیونکہ عورت جب عدت کی مدت کے آخر حصہ تک پہنچ جائے گی جو کہ رجوع کیلئے آخری مقررہ وقت ہے اس وقت اس کی عدت ختم ہو جائے گی اور خاوند کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔

امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں "بلغن" کا معنی قربت ہے۔ علماء کا اجماع کے ساتھ۔ مزید فرماتے ہیں کہ یہ معنی کرنے میں مجبوری ہے' اس لئے کہ مقررہ مدت پوری ہونے کے وقت روکنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اور "امساك بمعروف" کا معنی ہے کہ زوجیت کے حقوق ادا کرنا اور اس پر ہمیشگی کرنا۔

بلکہ وہ دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کر سکتے ہیں یا تو اچھے طریقہ سے بغیر تکلیف دیئے روک لیں یا اچھے انداز سے رخصت کر دیں' یعنی انسے چھوڑ دیا جائے، رجوع نہ کیا جائے تا کہ اس کی عدت پوری ہو جائے۔

"وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا"۔ "اور انہیں تکلیف پہنچانے کی غرض سے نہ روکو۔"

جیسا کہ جاہلیت کے لوگ عورت کی طلاق کے موقع پر کیا کرتے تھے تا کہ اس کی عدت پوری ہو جائے' پھر رجوع کرتے بغیر ضرورت اور محبت کے' بلکہ ان عورتوں پر دشمنی وعداوت اور ان پر ظلم کرتے ہوئے۔ تا کہ ان کی عدت کی مدت طویل ہو اور انتظار کا عرصہ زیادہ ہو

ابن ماجہ ابن جریر اور بیہقی سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا حال ہے ان لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ کی حدود سے کھیلتے ہیں' کہتے ہیں میں نے تجھے طلاق دی پھر رجوع کیا' پھر طلاق دی' پھر رجوع کیا' یہ طلاق کا طریقہ مسلمانوں کا نہیں۔ عورت کو اس کی عدت سے پہلے طلاق دو"۔ یعنی حیض آنے سے پہلے۔

مضمون نمبر: ۴۴

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ۔ (البقرة: ۲۳۲)

"اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق رضامند

ہوں۔"

اس آیت میں وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ اور فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ کے الفاظ سے خطاب اگر خاوندوں سے ہے تو اس صورت میں ان کی طرف سے عضل کے معنی میں ہوگا کہ جو اپنی عدت گذرنے کے بعد شادی کا ارادہ رکھتی ہوں' انہیں شادی سے روکنا جاہلیت کی غیرت کی وجہ سے جیسا کہ بہت خلفاء اور سلاطین اس غیرت میں مبتلا ہوئے کہ جو عورتیں ان کے ماتحت تھیں وہ کسی دوسرے کے تحت ہوں' کیونکہ جب انہیں دنیاوی ریاست ملی اور اس میں نخوت و تکبر پیدا ہوا تو وہ یہ گمان کرنے لگے کہ وہ بنی آدم کی جنس سے نکل گئے ہیں۔ سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ خوف الٰہی اور تواضع و انکساری کے ذریعہ ایسے کاموں سے بچالے۔

یہ خطاب اولیاء ذمہ داروں سے ہے' تو اس صورت میں طلاق کی نسبت ان کی طرف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہی نکاح کا سبب ہیں کیونکہ اولیاء ہی ان مطلقات کا نکاح انہیں طلاق دینے والے خاوندوں سے کرانے کے ذمہ دار ہیں۔

یہاں "بلغن اجلهن" "مقررہ مدت تک پہنچنے" سے مراد حقیقی معنی ہے' یعنی اس کی عدت ختم ہو جائے' نہ کہ وہ معنی جو پہلی آیت میں گذرا ہے۔

"عضل" کہتے ہیں روکنے کو۔ ایک قول ہے کہ تنگ کرنا اور روکنا' یہ بھی "حبس" یعنی روکنے کے معنی میں آتا ہے اور ہر مشکل کام عرب کے نزدیک معضل ہے اور "داء عضال" کہتے ہیں لاعلاج بیماری کو۔

"اَزْوَاجَهُنَّ" سے اگر ان کے طلاق دینے والے خاوند مراد لئے جائیں تو وہ گذشتہ کے اعتبار سے مجازی ہوں گے اور اگر وہ مراد لئے جائیں جن سے نکاح ہوگا تو وہ بھی مجازی ہوں گے کہ وہ عنقریب خاوند ہوں گے۔

امام بخاری اور اصحاب سنن وغیرہ نے سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی' وہ فرماتے ہیں کہ میری ایک بہن تھی' میرے پاس میرے چچا کا بیٹا آیا' میں نے اس کے ساتھ نکاح کر دیا تو کچھ عرصہ وہ اس کے پاس رہی' پھر اس نے ایک طلاق دی اور رجوع نہ کیا حتیٰ کہ عدت گذر گئی۔ پھر ان دونوں نے ایک دوسرے کی خواہش کی' پھر اسے نکاح کا پیغام بھیجا تو میں نے اسے کہا اے لُکَعُ (چھوٹو) میں نے اس کا نکاح تیرے ساتھ کر کے تیری عزت کی تو نے اسے طلاق دی پھر دوبارہ تو نے نکاح کا پیغام بھیجا! اللہ کی قسم وہ تیری طرف کبھی بھی نہیں

لوٹے گی۔ اس آدمی میں کوئی حرج والی بات بھی نہیں تھی' وہ عورت بھی اس کی طرف لوٹنا چاہتی تھی' اور اللہ تعالیٰ اس عورت کی اپنے خاوند اور اس مرد کی اپنی اس عورت کی طرف حاجت وضرورت کو جان گیا' تو اللہ تعالیٰ نے "وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ" نازل فرمائی۔ سیدنا معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آیت میرے بارہ میں نازل ہوئی میں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور میں نے اپنی بہن کا نکاح دوبارہ اس مرد (پہلے خاوند) کے ساتھ کر دیا۔

مضمون نمبر: ۴۵

وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ۔ (البقرۃ: ۲۳۳)

"مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں۔"

جب اللہ تعالیٰ نے نکاح طلاق کا تذکرہ فرمایا تو ساتھ ہی رضاعت دودھ پلانے کے مسائل بھی ذکر دیئے کہ اگر میاں بیوی علیحدہ ہو جائیں اور ان کی اولاد ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ اس لئے ایک قول ہے کہ یہ حکم طلاق والی عورتوں کے لئے خاص ہے اور ایک قول ہے کہ یہ عام ہے۔

حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ۔ "دو سال کامل۔" یہ تاکید اس لئے ہے کہ یہ وقت کے اندازہ لئے دلیل بن سکے کہ یہ حقیقی وقت ہے نہ کہ اندازہ سے۔ اس میں ابو حنیفہ کے اس قول کا رد ہے کہ دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہے اور اس میں زفر کا بھی رد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ "جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو" میں یہ دلیل سمجھتا ہے کہ دو سال دودھ پلانا حتمی نہیں بلکہ دودھ کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ اس سے کمی کرنا جائز ہے آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ بچوں کو دودھ پلانا ان کی اپنی ماؤں پر واجب ہے اور اسے محمول کیا گیا ہے کہ جب بچہ اپنی ماں کے علاوہ کسی کو قبول نہ کرے تو پھر اس ماں پر لازم وواجب ہے۔

وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ۔

"اور جن کے بچے ہیں ان کے ذمہ ان کا روٹی کپڑا ہے۔"

یعنی اس باپ پر لازم ہے جس کی اولاد پیدا ہوئی اور یہاں لفظ والد کی بجائے باپ کے ذمہ لفظ لائے تاکہ یہ دلیل بن سکے کہ اولاد باپ کی ہوا کرتی ہے نہ کہ ماں کی' اسی لئے اولاد کی نسبت ماؤں کی بجائے باپوں کی طرف ہوتی ہے گویا کہ ان عورتوں نے صرف اسے جنا ہے اور یہ معنی

زمخشری نے کشاف میں ذکر کئے ہیں۔

یہاں رزق سے مراد وہ کافی کھانا ہے جو مقدار لوگوں کے درمیان معروف ہے اسی طرح پہننے سے مراد بھی وہی ہے جو لوگوں کے درمیان معروف ہو۔ اس میں دلیل ہے کہ یہ سب کچھ بچوں کی ان ماؤں کے لئے جو دودھ پلا رہی ہیں باپوں پر لازم ہے یہ طلاق بائنہ کی صورت میں ہے لیکن ان کے علاوہ ان کا کھانا اور پہننا خاوندوں پر واجب ہے گویا کہ اگر وہ ان کی اولاد کو دودھ نہ بھی پلا رہی ہوں' تو پھر بھی نان نفقہ ان کے خاوندوں کے ذمہ پر ہے۔

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا۔

"ہر شخص اتنی ہی تکلیف دیا جاتا ہے جتنی اس کی طاقت ہو۔"

یہ معروف کے ساتھ مقید ہے یعنی یہ خرچ اور پہناوا باپ پر اس دستور کے مطابق واجب ہے جو لوگوں میں رائج ہے اسے صرف اتنی تکلیف دی جائے گی جو اس کی طاقت و وسعت میں داخل ہو گی نہ کہ جس سے وہ مشقت میں پڑ جائے اور اسے پورا کرنے سے عاجز آ جائے۔

ایک قول یہ ہے کہ عورت کو تھوڑی اجرت پر صبر کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے اور نہ خاوند کو حد سے زائد خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ میانہ روی کا لحاظ رکھا جائے۔

مضمون نمبر:۳۶

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا۔ (البقرۃ:۲۳۳)

"ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے ضرر نہ پہنچایا جائے۔"

ایک کو فاعل اور دوسرے کو مفعول قرار دیتے ہوئے یعنی باپ کو بچے کی وجہ سے کھانے اور پینے میں تکلیف نہ دی جائے کہ اس سے اس قدر مطالبہ کیا جائے جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا یا اس بچے کی حفاظت کی غرض سے حد سے نہ گذرے جس کی اسے ضرورت نہیں یا اس عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے تکلیف نہ دی جائے کہ وہ ان چیزوں میں کمی کرے جو اس خاوند پر لازم ہیں یا وہ مرد بغیر سبب کے اس سے اس کا بچہ چھینے۔

بِوَلَدِهَا کی باء کو تُضَآرُّ کا صلہ بنانا جائز ہے اس بنا پر کہ اس سے تَضُرُّ کا معنی ادا کیا جائے' یعنی نہ تکلیف دی جائے اس کی والدہ کو اس کے بچے کے ساتھ کہ وہ اس کی بری تربیت کرے یا اس کے خورد و نوش میں کمی کر دے۔ بچہ کو کبھی باپ اور کبھی ماں کی طرف منسوب کیا گیا کیونکہ ان میں

سے ہر ایک اس نسبت کا حق دار ہے' مزید یہ کہ ان دونوں کے دلوں میں نرمی اور شفقت موجود ہے۔ یہ جملہ گذشتہ جملہ کی تفصیل ووضاحت ہے' یعنی ان میں سے ہر ایک کو طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہ دی جائے اور نہ اپنے بچے کی وجہ سے پریشان کیا جائے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۔ "وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے۔" یہ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ پر معطوف ہے اور ان دو کے درمیان جو ہے وہ معروف کی تفسیر ہے یا اس کی علت اور یہ معطوف معطوف علیہ کے درمیان زائد ہے۔ اہل علم نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قول ہے کہ بچہ کے وارث کے ذمہ اس کو دودھ پلوانا ہے' جس طرح یہ فرض اس کے باپ کے ذمہ تھا۔ یہ بات سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ' قتادہ' سدی' حسن' مجاہد' عطا' احمد' اسحٰق' ابوحنیفہ اور ابن ابی لیلی رحمہم اللہ نے آپس میں اختلاف کے ساتھ کہی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ہر اس شخص پر واجب ہے جو وراثت میں حصہ لیتا ہے یا صرف مردوں پر یا ہر رشتہ دار پر اگرچہ وہ اس کا وارث نہ بھی ہو؟ تو اس کے جواب میں کئی ایک اقوال ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ وارث سے مراد باپ کا وارث ہے اس پر دودھ پینے والے کا خرچ اور پہننا معروف طریقہ سے واجب ہے' یہ بات ضحاک نے کہی۔ امام مالک رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں ضحاک کی مثل فرماتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ منسوخ ہے اور یہ کہ کسی آدمی پر اس کے بھائی قرابت دار رشتہ دار کا خرچ لازم نہیں' ضحاک نے یہ شرط بھی رکھی ہے کہ بچہ کا کوئی مال نہ ہو' اگر اس کا مال ہے تو اس کی رضاعت کی اجرت اس کے مال سے لی جائے گی۔

ایک قول کے مطابق آیت میں مذکورہ وارث خود بچہ ہی ہے یعنی اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے مال سے خود دودھ پیئے جبکہ اس کا باپ فوت ہو جائے اور وہ اس کے مال کا وارث ہو یہ بات قبیصہ بن ذوب اور بشیر بن نصر جو عمر بن عبدالعزیز کے قاضی تھے انہوں نے کہی اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

ایک قول کے مطابق جو باقی رہ گیا ہے والد اور والدہ میں سے کسی ایک کی موت کے بعد پس جب باپ فوت ہو جائے تو ماں پر لازم ہے کہ وہ بچے کی ذمہ داری ادا کرے جبکہ اس بچے کے پاس مال بھی نہ ہو) یہ بات سفیان ثوری نے کہی۔

ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے فرمان وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کا معنی ہے دودھ

پلانے والے کا وارث پر واجب ہے کہ وہ نومولود کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اس کی ماں کیا کرتی تھی، دودھ پلانا خدمت کرنا تربیت کرنا۔

ایک قول کے مطابق عَلَی الْوَارِثِ کا معنی ہے کہ اس کے کام پر ماں کو مجبور کرنا حرام ہے جیسا کہ باپ کو مجبور کرنا حرام ہے، یہ بات اہل علم کی ایک جماعت نے کہی، انہوں نے کہا یہی اصل ہے، تو جو یہ دعویٰ کرے کہ اس میں حرف عطف تمام امور پر مشتمل ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی دلیل بھی پیش کرے۔

قرطبی فرماتے ہیں، یہی صحیح ہے اگر اس سے وہ تمام امور مراد لئے جائیں کہ دودھ پلانا خرچ کرنا اور تکلیف نہ دینا، تو وہ کہے گا کہ وارث پر بھی اسی طرح ہے، تو یہ اس بات پر دلیل ہوگی کہ تکلیف نہ دینے پر عطف ہے اس بنا پر کافی مفسرین نے تاویل کی جو قاضی عبدالوہاب کے لئے بیان ہوئی۔

ابن عطیہ، امام مالک اور ان کے تمام ساتھی شعبی زہری ضحاک اور علماء کی ایک جماعت کہتی ہے مِثْلُ ذٰلِكَ سے مراد یہ ہے کہ اسے تکلیف نہ دی جائے لیکن رزق اور پہنانا کچھ بھی واجب نہیں۔ ابن قاسم نے مالک سے بیان کیا جو ہم امام مالک سے پہلے ذکر کر آئے ہیں اور ان کے نسخ کا دعویٰ بھی۔ آپ پر وہ موقف جس کی طرف ہر جماعت گئی ہے اس کی کمزوری مخفی نہ ہوگی کیونکہ انہوں نے وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کے معنی کو اس معنی کے ساتھ مخصوص کیا ہے یعنی دودھ پلانے والی کو تکلیف نہ دی جائے۔ اس موقف کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان فائدہ دیتا ہے لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا یہ ہر اس تکلیف دینے والی پر صادق آتا ہے جسے بھی تکلیف پہنچے نومولود کی طرف سے یا اس کے علاوہ کسی اور کی طرف سے۔

لیکن قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اگر تمام امور مراد لئے جائیں تو عبارت "مثل ھؤلاء" وہ ان ہی کی طرح کہے گا پس اس کی نمایاں کمزوری مخفی نہ رہ سکے گی کیونکہ اسم اشارہ مذکورہ تاویل یا اس جیسی کوئی اور تاویل کرنے کے لئے جس طرح ایک کے لئے درست ہے تو اسی طرح متعدد کے لئے بھی درست ہے۔

لیکن پہلے قول والے جس موقف کی طرف گئے ہیں کہ وارث سے مراد بچے کا وارث ہے تو اس کے مدمقابل یہ کہا جائے گا کہ وہ بچہ کے زندہ موجود ہونے کے باوجود حقیقی وارث نہیں ہوسکتا بلکہ وہ مجازی وارث ہوگا اس بات پر اعتبار کرتے ہوئے جو اس کی طرف تاویل کی گئی۔

لیکن دوسرے قول والے جس بات کی طرف گئے' وہ یہ ہے کہ گو وارث کو حقیقی معنی پر محمول کیا جائے لیکن بچہ کے غنی ہونے کے باوجود خرچ اس پر واجب ہوگا اسی لئے یہ کہنے والے نے ساتھ قید لگائی کہ بچہ فقیر ہو۔

وارث کی تفسیر میں گذشتہ اختلاف ماں باپ بچے کے ضمن میں محمول کیا جائے گا کہ وارث کی نسبت ان میں سے ہر ایک کی طرف ہو۔

مضمون نمبر: ۴۷

فَإِنْ اَرَادَا فِصَالًا۔ (البقرۃ: ۲۳۳)

"پھر اگر دونوں اپنی رضامندی اور باہمی مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں۔"

ضمیر والدین کی طرف جاتی ہے' فصال کا معنی دودھ چھڑانا ہے یعنی بچے اور پستان کے درمیان علیحدگی کرنا' اسی معنی میں اسے فصیل کہا جاتا ہے کہ اسے اس کی ماں سے چھڑایا علیحدہ کیا جاتا ہے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا۔ "تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔" اس چھڑانے میں' جب اللہ سبحانہ وتعالی نے دودھ پلانے کی مدت دو سال مکمل بیان فرمائی تو اس فرمان کے ساتھ قید لگادی کہ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ "جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو۔" اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ باپ اکیلا اگر دو سال سے پہلے دودھ چھڑانے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے جائز ہے۔

یہاں اللہ سبحانہ وتعالی نے والدین کی رضامندی اور باہمی مشورہ کو معتبر قرار دیا ہے' تو دونوں صورتوں کو جمع کرنے کے بغیر چارہ کار نہیں' سو اس صورت میں کہا جائے گا کہ مذکورہ بالا آیت میں مذکور ارادہ دونوں کی طرف سے ہو۔ یا کہا جائے گا کہ اس ارادہ سے مراد جب بچے کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک زندہ نہ ہو اس وقت کے لئے ہے یا بچے کو اس کی ماں کے علاوہ کوئی اور دودھ پلائے۔

مضمون نمبر: ۴۸

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ (البقرۃ: ۲۳۳)

"اور اگر تمہارا ارادہ اپنی اولاد کو دودھ پلوانے کا ہو۔"

زجاج کہتے ہیں اس کی تقدیر یوں ہے کہ "ان تسترضعوا الاولاد کم غیر الوالدۃ"

یعنی تم اپنی اولادوں کو ان کی والدہ کے علاوہ دودھ پلوانا چاہو اور سیبویہ کے نزدیک تَسْتَرْضِعُوْٓا لِاَوْلَادِكُمْ میں لام کو حذف کیا جائے گا کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے اور پہلا مفعول محذوف ہے' توان تسترضعوا المرضع اولادکم ۔معنی یہ ہوا کہ تم دودھ پلواؤ دودھ پلانے والیوں سے اپنی اولادوں کو"۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ۔" تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ تم ان کو مطابق دستور کے جو دینا ہو وہ ان کے حوالے کردو"

ایک قول یہ ہے کہ تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنی اولاد کو ان کی ماؤں کے علاوہ سے دودھ پلواؤ جب تم ماؤں کو ان کا حصہ اس قدر ادا کرو جس قدر وہ تمہارے لئے دودھ پلائیں اس وقت تک جب تک کہ وہ دودھ پلائیں یہ بات سفیان ثوری' مجاہد کہتے ہیں۔

قتادہ اور زہری کہتے ہیں آیت کا معنی ہے جب تم نے دودھ پلوانے کے ارادہ سے جو دینا ہے وہ ان کے حوالہ کردو یعنی والدین راضی بخوشی حوالہ کریں اور یہ دونوں کے اتفاق اور خیر کے قصد سے ہو اور معاملہ نیکی و معرفت کے ارادہ سے ہو۔ اس بنا پر فرمان الٰہی سَلَّمْتُمْ مردوں کے لئے عام ہے اور عورتیں اس میں تغلیباً شامل ہوں گی۔ جبکہ پہلے قول کے مطابق صرف مردوں کو خطاب ہے۔

ایک قول کے مطابق اِذَا سَلَّمْتُمْ کا معنی ہے کہ جس سے تم دودھ پلوانے کا ارادہ کروانکے حوالہ اس کی اجرت کرو' تو معنی یہ ہوا کہ جب تم دودھ پلانے والیوں کو جو کچھ دینا چاہو وہ ان کو دیدو اس دستور کے مطابق بالمعروف جو عام لوگوں میں معروف ہے ان کی اجرت و مزدوری کا ان کے حق میں اضافہ بھی نہ ہو اور اس میں کمی بھی نہ کی جائے۔ کیونکہ ان کی اجرت پوری نہ دینا انہیں بچے کے معاملہ میں سستی کی طرف لے جائے گا اور اضافہ بھی اسی طرح کی صورت حال پیدا کرے گا۔

مضمون نمبر:۴۹

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ (البقرۃ:۲۳۴)

"تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں۔"

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے طلاق کی عدت بیان کی تو اس کے ساتھ ہی دودھ پلانے کا ذکر کیا'

پھر اس کے بعد فوت شدہ کی عدت کا تذکرہ کیا تا کہ کوئی وہم نہ کر سکے کہ فوت شدہ کی عدت طلاق والی کی طرح ہے۔ زجاج کہتے ہیں آیت کا معنی ہے کہ تم میں سے جو خاوند فوت ہو جائیں اور ان کی بیویاں ہوں تو وہ بیویاں انتظار کریں۔ ابوعلی الفارسی کہتے ہیں اس کی تقدیر یہ ہے کہ جو مرد تم میں سے فوت ہو جائیں اور وہ بیویاں چھوڑیں تو وہ ان کے بعد انتظار کریں۔

ایک قول کے مطابق تقدیر یوں ہوگی کہ "وازواج الــذیــن "جو خاوند فوت ہوں...... یہ صاحب کشاف زمخشری نے ذکر کیا اور اس پر اعتراض یہ ہے کہ "وازواج الذین" وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا کہنا مناسب نہیں، اس صورت میں یہ تقدیر نا مناسب نہیں کیونکہ ظاہر نکرہ غیر کی طرف لوٹتا ہے اور جب نکرہ کا تکرار کیا جائے تو قانونی طور پر وہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں...... اور اس طرح دوست نہیں بنتا۔

فوت شدہ کی عدت کی یہ مقدار متعین کرنے کی حکمت یہ ہے کہ بچہ بعض اوقات کمزور حرکت کرتا ہے تو اس کی حرکت دیر سے معلوم ہوتی ہے اور اس مدت سے زیادہ تاخیر ممکن نہیں۔ اس آیت کے عموم سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کی یہی عدت ہوگی لیکن اس عموم کو مندرجہ ذیل فرمان الٰہی خاص کرتا ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ یعنی حاملہ عورتوں کی عدت کی حد یہ ہے کہ جب ان کا حمل وضع ہو جائے۔

یہ موقف جمہور کا ہے۔ بعض صحابہ اور اہل علم کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ حاملہ دو مدتوں میں دوسری عدت گزارے عام اور خاص کو جمع کرتے اور ان دونوں پر عمل کرتے ہوئے جبکہ حق بات جمہور کی ہی ہے۔ عام اور خاص کو اس طریقہ سے جمع کرنا لغت کے قوانین اور شریعت کے قواعد وضوابط کے لحاظ سے مناسب نہیں۔

خاص کو عام سے نکالنے کا معنی اسی وقت صحیح ہوسکتا ہے جبکہ خاص کا حکم عام کے حکم کے مخالف ہو۔ آپ ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ آپ نے سبیعہ اسلمیہ کو وضع حمل کے بعد نکاح کی اجازت دی۔

تــربص کا معنی ہے انتظار اور صبر کرنا نکاح سے۔ آیت کا ظاہری حکم یہی ہے کہ چھوٹی بڑی، آزاد لونڈی، حیض والی اور حیض سے مایوس میں کوئی فرق نہیں کہ ان تمام کی عدت فوت ہونے کی صورت میں چار ماہ دس دن ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ لونڈی کی عدت آزاد کی عدت سے نصف ہے یعنی دو ماہ پانچ دن۔ ابن

عربی کہتے ہیں اس پر اجماع ہے سوائے اس کے جو اصم سے بیان ہوا کہ آزاد اور لونڈی برابر ہیں۔ باجی کہتے ہیں ہم اس میں کوئی اختلاف نہیں جانتے سوائے اس کے جو ابن سیرین سے مروی ہے کہ اس کی عدت آزاد کی عدت کی طرح ہے اور یہ ان سے ثابت نہیں۔ اصم اور ابن سیرین نے جو موقف اپنایا وہ اس آیت کے عموم سے اپنایا اور ان کے علاوہ دوسروں نے جو موقف اپنایا وہ ہے فوت شدہ کی عدت کو حد پر قیاس کرتے ہوئے کہ وہ لونڈی کے لئے نصف ہے کیونکہ فرمان الٰہی ہے **فعلیھن نصف ما علی المحصنات من العذاب** ۔یعنی ان لونڈیوں پر، شادی شدہ عورتوں کی نسبت آدھی سزا ہے۔

اور پہلے یہ حدیث بھی گذر چکی کہ "**طلاق الامۃ تطلیقتان وعدتھا حیضتان**"یعنی لونڈی کی طلاق دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں یہ دلیل کے لئے نہایت عمدہ ہے۔اس سے مراد صرف یہ ہے کہ لونڈی کی طلاق آزاد کی طلاق سے نصف ہے اور اسی طرح اس کی عدت بھی نصف ہے' لیکن یہ ممکن نہیں کہ کہا جائے کہ لونڈی کی طلاق ایک اور نصف ہے اسی طرح اس کی عدت ایک حیض اور نصف ہے کیونکہ طلاق اور عدت کی یہ مقدار معقول نہیں مذکورہ حدیث میں زبردستی وقت کو توڑتے ہوئے۔

لیکن یہاں اس قیاس کے لئے ایک امر مانع ہے جس پر جمہور عمل کر رہے ہیں' وہ یہ ہے کہ فوت شدہ کی چار ماہ دس دن عدت مقرر کرنے کی حکمت وہ ہے جو ہم نے ذکر کی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ حمل سے صاف ہے اور یہ بات اتنی مدت میں معلوم ہو سکتی ہے۔اس صورت میں آزاد اور لونڈی کے درمیان کوئی فرق' بخلاف اس کے کہ غیر فوت شدہ کی عدت دو حیض ہیں کیونکہ اس سے رحم مادر کا خالی ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔فرق نہ کرنے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو ابھی ہم ام ولد کی عدت کے بارہ میں ذکر کریں گے۔

اہل علم نے ام ولد کے بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ جس کا سردار فوت ہو جائے' سعید بن مسیب' مجاہد' سعید بن جبیر' حسن' ابن سیرین' زہری' عمر بن عبدالعزیز' اسحٰق بن راہویہ' اوزاعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ وہ چار ماہ دس دن عدت گذارے' سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے کہ: "تم ہم پر ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت خلط ملط نہ کرو' ام ولد کی عدت جبکہ اس کا سردار فوت ہو جائے چار ماہ دس دن ہے۔" اسے احمد' ابوداؤد' ابن ماجہ' حاکم نے بیان کیا اور امام حاکم نے صحیح کہا اور ابوبکر ابن العربی نے صحیح کہا ہے۔ قطنی کہتے ہیں کہ درست بات یہ ہے کہ

یہ موقوف ہے۔
طاؤس اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس کی عدت دو ماہ پانچ راتیں ہیں۔ ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب' ثوری اور حسن بن صالح کہتے ہیں وہ تین حیض تک عدت گزارے گی یہ سیدنا علی سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ' عطا اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ کا قول ہے۔
امام مالک' شافعی اور احمد رحمہم اللہ اپنے مشہور قول کے مطابق اس کی عدت ایک حیض بتاتے ہیں اور جسے حیض نہیں آتا اس کی عدت ایک ماہ ہے۔ یہی بات سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ' شعبی' مکحول' لیث' ابوعبید' ابوثور اور جمہور رحمہم اللہ نے کہی۔
علماء کا اجماع ہے کہ یہ آیت بعد والی آیت کے لئے ناسخ ہے جس میں ایک سال عدت کا ذکر ہے اگرچہ وہ تلاوت میں پہلے ہے۔
فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ۔ ''پھر جب مدت ختم کرلیں۔'' یہاں بلوغ سے مراد عدت ختم کرنا ہے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ ''تو جو اچھائی کے ساتھ وہ اپنے لئے کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔''
زیب و زینت اختیار کرنا اور پیغام نکاح کے لئے ملاقات وغیرہ کرنا۔ بِالْمَعْرُوْفِ کا معنی ہے جو شریعت اور اچھی عادت کے خلاف نہ ہو۔ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے عدت گزارنے والی پر سوگ منانا واجب قرار دیا ہے۔ یہ بات صحیحین وغیرہ میں مختلف اسناد سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کسی ایسی عورت کے لئے حلال نہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو کہ وہ تین دن سے زیادہ کسی میت پر سوگ کرے سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ چار ماہ دس دن ہیں۔ اسی طرح صحیحین وغیرہ میں نبی ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ جو فوت شدہ خاوند کی عدت گزار رہی ہے وہ سرمہ نہ لگائے۔ ''احداد'' یعنی سوگ کہتے ہیں زیب و زینت چھوڑنے کو مثلاً خوشبو' نئے کپڑے اور زیورات وغیرہ۔
بائنہ کی عدت میں اختلاف دو اقوال پر مشتمل ہے۔ ابو حنیفہ کے اصحاب اس آیت سے بغیر ولی کے نکاح جائز ہونے کی دلیل لیتے ہیں کیونکہ فعل کی فاعل کی طرف نسبت مباشرت و صحبت پر محمول کی جاتی ہے لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ اولیاء سے خطاب ہے اگر ان اولیاء کے بغیر نکاح صحیح ہے تو یہ مخاطب کیسے ہوں گے۔ دونوں موقف پر گفتگو احکام کی کتب میں ہونی چاہیے۔

مضمون نمبر: ۵۰

وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ۔ (البقرة: ۲۳۵)

"تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اشارۃً ان عورتوں سے نکاح کی بات کرو۔"

جناح کہتے ہیں گناہ کو یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں اشارہ وضاحت کی ضد ہے اور یہ لفظ کسی چیز کے کنارہ پر بولا جاتا ہے یعنی اس کی ایک طرف گویا کہ وہ اس چیز کے گرد گھوم رہا ہے مگر اس پر ظاہر نہیں کر رہا اور گفتگو میں اشارہ کرنے والا اپنے ساتھی کو ایسی بات کرتا ہے کہ وہ اس کا مفہوم سمجھ جائے۔

امام زمخشری کشاف میں فرماتے ہیں اشارہ اور کنایہ میں فرق یہ ہے کہ کنایہ اسے کہتے ہیں کہ آپ کسی چیز کا ذکر ایسے لفظ سے کریں جو اس کے لئے نہیں بنایا گیا اور اشارہ یہ ہے کہ آپ کسی چیز کا تذکرہ کریں جس سے غیر مذکورہ چیز پر دلالت ہو سکے، جس طرح ضرورت مند ضرورت پوری کرنے والے سے کہتا ہے میں تیرے پاس آیا تا کہ تجھے سلام کروں اور تیرے معزز چہرہ کی زیارت کروں اسی لئے انہوں نے کہا:

وَحَسْبُكَ بِالتَّسْلِيمِ مِنِّیْ تَقَاضِيًا۔

"یعنی مجھ سے تقاضا کرنے کے لئے تیرا سلام ہی کافی ہے۔"

اور گفتگو کو اس سمت جھکانا جو غرض وغایت پر دلالت کرے اسے تلویح کہتے ہیں۔ گویا کہ وہ مقصود کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اَلْخِطْبَةُ کہتے ہیں جو مطالبہ کرنے والا اپنے مطالبہ کے سلسلہ میں کرتا ہے قول و فعل کی نرمی سے۔ اَلْخُطْبَةُ کہتے ہیں ایسی گفتگو کو جس سے آدمی خطیب بن جائے۔

اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ۔ "یا اپنے دل میں پوشیدہ ارادہ کرو۔"

اس کا معنی ہے تم چھپاؤ اور عدت ختم ہونے کے بعد نکاح کو پوشیدہ رکھو۔ اکنان چھپانے اور پوشیدہ رکھنے کو کہتے ہیں اس معنی میں ہے "بیض مکنون" چھپائے ہوئے انڈے اور "در مکنون" چھپائے ہوئے موتی۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ "اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ تم ضرور ان کو یاد کرو گے۔" یعنی تم ان سے بولنے پر صبر نہ کرو گے اس لئے کہ جو تمہیں ان میں رغبت ہے پس تمہیں واضح بات

کرنے کی بجائے اشارہ کرنے کی اجازت دی ہے۔

وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ۔ ''لیکن تم ان سے پوشیدہ وعدہ نہ کرلو۔'' جبکہ اصل عبارت ''علی سر'' ہے۔

اہل علم نے سر کے معنی میں اختلاف کیا ہے ایک قول ہے کہ نکاح۔ یہ جمہور علماء کا مذہب ہے یعنی آدمی دوران عدت خاتون کو یہ نہ کہے کہ تم میرے ساتھ نکاح کرو بلکہ اشارۃً بات کرے۔ ایک قول کے مطابق سر کا معنی زنا ہے۔ یعنی تمہاری طرف سے زنا کا وعدہ نہ ہو دوران عدت کہ پھر نکاح ہوگا۔ یہ بات جابر بن زید' ابومجلز' حسن' قتادہ' ضحاک' نخعی نے کہی اور ابن جریر الطبری نے اسے پسند کیا۔

ایک قول کے مطابق سر کا معنی جماع ہے یعنی تم خود اپنی صفت کثرت جماع کی بیان نہ کرو تاکہ انہیں نکاح کی ترغیب ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔

ابن عطیہ کہتے ہیں امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ دوران عدت عورت سے ایسی گفتگو کرنا جس میں جماع کا تذکرہ ہو یا اس پر رغبت ہو جائز نہیں' مزید فرماتے ہیں امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عورت کا دوران عدت خود اپنے دل میں پختہ فیصلہ کرنا اسی طرح باپ کا اپنی کنواری بیٹی اور مالک کا اپنی لونڈی کے بارہ میں پختہ فیصلہ مکروہ ہے۔

اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۔ ''ہاں یہ اور بات ہے کہ تم بھلی بات بولا کرو۔''

یہ استثناء منقطع ہے جو لکن کے معنی میں ہے۔ معروف قول یہ ہے کہ اس سے مراد اس قدر اشارہ ہے جو جائز ہے۔ صاحب کشاف نے اسے منقطع قرار دینے سے منع کیا اور کہتے ہیں کہ یہ مندرجہ ذیل فرمان الٰہی سے مستثنیٰ ہے لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ یعنی کسی قسم کا عہد معاہدہ مگر ایسا وعدہ جو معروف ہو منکر نہ ہو اس بنا پر اسے استثناء مفرغ قرار دیا ہے۔

منقطع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اشارہ کو پختہ وعدہ بناتا ہے' حالانکہ ایسا نہیں کیونکہ اشارہ وعدہ کا راستہ ہے نہ کہ بذات خود وعدہ۔

مضمون نمبر:۵۱

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ ۔ (البقرۃ:۲۳۵)

''اور عقد نکاح پختہ نہ کرو۔''

یعنی عقد نکاح پر پختہ عزم نہ کرو، یہاں علی کو حذف کر دیا۔ سیبویہ کہتے ہیں اس آیت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ نحاس کہتے ہیں نہ گرہ باندھو عقد نکاح کی اسلئے کہ تَعْزِمُوْا اور تَعْقِدُوْا کا معنی ایک ہی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ عزم فعل سے پہلے ہوتا ہے پس اس نہی میں مبالغہ ہے کیونکہ جب کسی چیز کی طرف قدم بڑھانا منع ہے تو اس کام سے رکنا بالاولیٰ منع ہوا۔

حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَـهٗ ۔ ''حتیٰ کہ عدت ختم ہو جائے۔'' اس سے مراد ہے کہ عدت پوری ہو جائے' یہاں کتاب سے مراد وہ حد اور مقدار ہے جو مدت کے نام پر لکھی جاتی ہے' اور اسے کتاب اسی لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ محدود اور لازم کی گئی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ''یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ اوقات پر فرض ہے۔''

اور یہ حکم کہ دوران عدت عقد نکاح کی حرمت پر تمام وقت کا متفقہ اجماع ہے۔

مضمون نمبر: ۵۲

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۔ (البقرة: ۲۳۶)

''تم پر کوئی گناہ نہیں۔''

یہاں جناح سے مراد مہر کا جرمانہ ہے' تو جرمانہ ساقط کرنے کے لئے گناہ ساقط کیا یعنی تم پر مہر وغیرہ کی ادائیگی کوئی جرمانہ نہیں۔

اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ ۔ ''اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو۔'' مذکورہ طریقہ سے۔ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ ''بغیر ہاتھ لگائے۔'' ما مصدریہ ظرفیہ ہے مضاف کو مقدر مانتے ہوئے یعنی ایسے عرصہ میں طلاق دو جس میں تم نے ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک قول ہے کہ ما شرطیہ ہے شرط کا شرط پر اعتراض کی رو سے تاکہ دوسرا پہلے کے لئے قید ہو جائے' تو معنی یہ ہوا کہ اگر تم طلاق دو کہ تم نے انہیں چھوا نہیں۔ ایک قول ہے کہ ما موصولہ ہے یعنی اگر تم ان عورتوں کو طلاق دو جنہیں تم نے ہاتھ نہیں لگایا۔

اسی طرح اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ''یا بغیر مہر مقرر کئے۔'' ایک قول ہے کہ او بمعنی اِلَّا کے ہے، یعنی مگر یہ کہ تم نے مہر مقرر کیا۔ ایک قول ہے کہ حتیٰ کہ معنی میں ہے یعنی حتیٰ کہ تم نے مہر مقرر

کیا ہو۔ ایک قول ہے کہ ؔاو کے معنی میں ہے یعنی اور تم نے مہر مقرر کر دیا۔ میں اس طوالت کی کوئی وجہ نہیں جانتا۔

آیت کا معنی اس التباس سے زیادہ واضح ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گناہ ساقط کر دیا ان طلاق دینے والوں سے جو دو کاموں میں سے کسی ایک میں بھی واقع نہ ہوئے ہوں یعنی اس ایک کی نفی کی مدت تک۔ الگ تمیز واضح کی نفی ممکن نہیں مگر دونوں کی یکسر نفی ہوگی۔

اگر ہاتھ لگایا تو مقررہ یا مہر مثل لازم ہو گیا' اگر مہر بتایا گیا تو ہاتھ نہ لگانے کی صورت میں بھی نصف لازم آئے گا اور ان میں سے ہر ایک گنہگار ہے؟ یعنی مقررہ مہر کی صورت یا مثل مہر کی صورت یا مقررہ مہر کا نصف حصہ۔

جان لو کہ جنہیں طلاق دی جاتی ہے ان کی چار اقسام ہیں:

① ایسی مطلقہ جس کا حق مہر مقرر ہو اور اس کے ساتھ دخول بھی ہو' یہ وہی ہے جس کا اس آیت سے قبل ذکر گذر چکا ہے' اس کے متعلق خاوندوں کو منع کیا ہے کہ حق مہر سے کچھ بھی واپس لیں اور ان کی عدت تین قروء ہیں۔

② ایسی مطلقہ جس کا حق مہر مقرر نہیں کیا اور نہ ہی اس کے ساتھ دخول ہوا' یہ وہی ہے جس کا ابھی ذکر ہوا' اس کا حق مہر کوئی نہیں بلکہ متعہ ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے کہ جس مطلقہ سے دخول نہیں ہوا اس کی عدت نہیں۔

③ ایسی مطلقہ جس کا حق مہر مقرر ہو لیکن اس کے ساتھ دخول نہ ہوا۔ اس کا ذکر مندرجہ ذیل فرمان الٰہی میں ہوا ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً ''اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو اور تم نے ان کا مہر بھی مقرر کر دیا ہو۔''

④ ایسی مطلقہ جس کا مہر مقرر نہیں ہوا اور دخول ہو چکا اس کا ذکر مندرجہ ذیل آیت میں ہوا ہے: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۔ ''اس لئے جن سے تم فائدہ اٹھاؤ انہیں ان کا مقرر کیا ہوا مہر دے دو۔''

فرمان الٰہی مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ سے مراد جب تک کہ تم نے ان سے جماع نہ کیا ہو فریضۃ سے مراد یہاں مہر مقرر کرنا ہے۔

"وَ مَتِّعُوْهُنَّ" ۔ "اور اچھا فائدہ دے" یعنی انہیں ایسی چیز دو جوان کے لئے فائدہ مند ہو' اس حکم کا ظاہر تو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ یہ بات سیدنا علی' سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم' حسن بصری' سعید بن جبیر' ابوقلابہ' زہری' قتادہ اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہی۔

وجوب کے دلائل میں سے یہ فرمان الٰہی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ (الاحزاب:٤٩) "اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر ہاتھ لگانے سے پہلے ہی تم ان کو طلاق دے دو تو ان پر تمہارا کوئی عدت کا حق نہیں جسے تم شمار کرو پس تم کچھ نہ کچھ انہیں دے دو اور بھلے طریق پر انہیں رخصت کر دو۔"

امام مالک' ابوعبید اور قاضی شریح وغیرہ رحمہم اللہ کہتے ہیں مذکورہ مطلقہ کے لئے سامان (فائدہ) دینا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے مستحب ہے واجب نہیں حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ اگر واجب ہوتا تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمام لوگوں پر لاگو کرتے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ وجوب کے منافی نہیں بلکہ اس کو مزید موکد کرتا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمان الٰہی ہے: حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ یعنی اسے بجالانا اور پورا کرنا اہل تقویٰ و پرہیز گاروں کی علامت ہے۔ حالانکہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔

اس میں ایک اختلاف ہے کہ کیا جماع اور مہر مقرر کرنے سے پہلے اس مطلقہ کے علاوہ کسی دوسری کے لیے متعہ مشروع اور جائز ہے یا کہ صرف اسی کے لیے ہی مشروع ہے؟ بعض نے کہا کہ ہر مطلقہ کے لئے جائز ہے اس موقف کو سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما عطاء جابر بن زید سعید بن جبیر ابوالعالیہ' حسن بصری اور شافعی دو میں سے ایک قول کے مطابق اور احمد اور اسحٰق نے اپنایا ہے' لیکن انہوں نے اختلاف کیا کہ کیا وہ دخول اور اس کا حق مہر مقرر ہونے سے پہلے طلاق دی جائے اس کے علاوہ کے لئے واجب ہے یا صرف مستحب' تو انہوں نے مندرجہ ذیل فرامین الٰہیہ سے استدلال کیا ہے۔ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ "طلاق والیوں کو اچھی طرح فائدہ دینا پرہیز گاروں پر لازم ہے۔"

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (الاحزاب:٢٨) "اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں

سے کہہ دو کہ اگر تم زندگانی دنیا اور زینت دنیا چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا دوں اور تمہیں اچھائی کے ساتھ رخصت کر دوں۔"

پہلی آیت ہر مطلقہ کے لئے عام ہے اور دوسری نبی ﷺ کی بیویوں کے لئے ان کا مہر مقرر ہو چکا تھا اور ان سے دخول بھی ہوا تھا۔

سعید بن مسیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ الخ کی وجہ سے یہ مطلقہ کے لئے واجب ہے جبکہ اسے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی جائے اگرچہ اس کا مہر مقرر ہو چکا ہو کہتے ہیں کہ یہ احزاب کی آیت بقرہ کی آیت سے منسوخ ہو گئی ہے۔

اہل علم کی ایک جماعت کا موقف ہے کہ سامان دینا ان طلاق والیوں کے ساتھ خاص ہے جن کا مہر مقرر نہ ہوا اور جنہیں وظیفہ زوجیت سے قبل طلاق دی جائے کیونکہ جس عورت کے ساتھ دخول ہو گیا وہ تو پورے حق مہر یا مہر مثل کی حق دار ہے اور جس سے دخول نہ ہوا اور اس کے خاوند نے مہر مقرر کیا اور دخول سے قبل طلاق دی تو یہ نصف مہر کی حق دار ہوگی' یہ قول سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ اور مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔

اس بات پر اجماع ہے کہ جسے دخول سے پہلے اور مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دی جائے وہ صرف سامان (متعہ) کی حق دار ہے جبکہ وہ آزاد ہو' ہاں اگر وہ لونڈی ہے تو جمہور کا موقف ہے کہ اس کے لئے صرف (متعہ) کچھ سامان ہے۔ اوزاعی اور ثوری کہتے ہیں کہ یہ سامان اس کا نہیں کیونکہ وہ اپنے مالک کی لونڈی ہے اور مالک اس کے مال کا حقدار نہیں اس لئے کہ تکلیف لونڈی نے اٹھائی ہے مالک نے نہیں۔ اس لئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ متعہ اس طلاق یافتہ عورت کے لئے جائز قرار دیا جس کو دخول اور حق مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دی جائے کیونکہ اسے اس طلاق کی صورت میں تکلیف دی گئی۔

اس جائز متعہ کو (کچھ سامان) دینے کے بارہ میں اختلاف کیا گیا۔ کیا یہ مقررہ مقدار ہے یا نہیں؟ امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں معروف طریقہ سے دینے میں کوئی حد نہیں بلکہ جس پر متعہ (سامان) کا نام لیا جا سکے اور ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب خاوند و بیوی میں متعہ کی مقدار میں جھگڑا ہو جائے تو عورت کے لئے مہر مثل کا نصف واجب ہوگا اور یہ پانچ درہم سے کم نہیں ہو سکتا کیونکہ کم از کم مہر دس درہم ہے۔

اس بارہ میں اسلاف کے کئی اقوال ہیں۔

عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ۔ ''خوشحال اپنے انداز سے اور تنگدست اپنی طاقت کے مطابق۔'' یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس میں خاوند کی مالی حالت پر اعتبار کیا جائے گا' پس مال دار کا متعہ مزدور کے متعہ سے بڑھ کر ہوگا اور بیوی کی حالت کو نہ دیکھا جائے گا شافعی مذہب میں ایک قول ہے کہ یہ کمزور موقف ہے شافعی مذہب میں' بلکہ حاکم دونوں کی حالت دیکھ کر زیادہ واضح صورت میں اجتہاد کرے۔

مَتَاعًا ۔ ''سامان'' یعنی انہیں دستور کے مطابق سامان دو جو شرعاً معروف ہے اور اس کی عادت کے موافق ہے۔ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ''بھلائی کرنے والوں پر یہ لازم ہے۔'' یہ متاعا کی صفت ہے یا فعل محذوف کا مصدر ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے لازم قرار دیا ہے۔

مضمون نمبر: ۵۳

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ۔ (البقرۃ: ۲۳۷)

''اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو۔''

یعنی تم نے ان سے صحبت کی ہو اس میں یہ دلیل ہے کہ اس قسم کی مطلقہ عورتوں کے لئے متعہ واجب نہیں ان مطلقہ عورتوں کے بالمقابل جنہیں دخول اور مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دی جائے کہ وہ متعہ کی مستحق ہوتی ہیں۔

وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ۔ ''اور تم نے ان کا مہر بھی مقرر کر دیا ہو تو مقررہ مہر کا آدھا مہر دے دو۔'' یعنی جو تم نے مہر مقرر کیا اس کا آدھا حصہ تم پر واجب ہے اس بات پر اجماع ہے اور اس بات پر بھی اتفاق آتا ہے عورت جس کے ساتھ دخول نہ ہوا اور حق مہر مقرر ہوا اور وہ مرد فوت ہو گیا تو یہ عورت پورے مہر کی حق دار ہے اسے وراثت میں بھی حصہ ملے گا اور اسے عدت بھی گذارنی پڑے گی۔

(خلوت) تنہائی کے بارہ میں اختلاف ہے کیا تنہائی دخول کے قائم مقام ہے اور عورت اس وجہ سے پورے حق مہر کی مستحق ہے جس طرح دخول کی وجہ سے ہوتی ہے یا نہیں؟ پہلے موقف کو امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ اپنے قدیم موقف میں اور کوفی اور خلفائے راشدین اور جمہور علماء نے اپنایا ہے اور ان کے نزدیک عدت بھی واجب ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اپنے جدید موقف میں فرماتے ہیں' سوائے آدھے مہر کے کچھ واجب نہیں' یہی چیز ظاہر آیت میں ہے اس لئے کہ یہ گذر چکا کہ ہاتھ لگانا ہی جماع ہے۔ ان کے نزدیک عدت واجب نہیں اسی موقف کو سلف کی ایک جماعت نے اپنایا ہے۔

اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ "یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کر دیں۔"

یعنی وہ طلاق والی عورتیں' اس کا معنی ہے کہ وہ حق چھوڑ دیں اور درگذر کر دیں یہ سب سے زیادہ عام سے استثناء مفرغ ہے۔ ایک قول ہے کہ یہ عام ہے اور ایک قول ہے کہ یہ منقطع ہے' اس کا معنی یہ ہوا کہ وہ اس آدھے حق کو چھوڑ دیں جو خاوندوں پر اس کے لئے واجب ہے۔ ضمیر ہونے کی وجہ سے نون ساقط نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اعراب کی علامت نہیں' اسی موقف پر جمہور مفسرین ہیں جبکہ محمد بن کعب القرظی سے مروی ہے کہ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ سے مراد مرد ہیں اور یہ لفظی اور معنوی اعتبار سے کمزور ہے۔

اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ "یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔"

ایک قول کے مطابق اس سے مراد خاوند ہے۔ یہ بات جبیر بن مطعم' سعید بن مسیب' شریح' سعید بن جبیر' مجاہد' شعبی' عکرمہ' نافع' ابن سیرین' ضحاک' محمد بن کعب القرظی' جابر بن زید' ابو مجلز' ربیع بن انس' ایاس بن معاویہ' مکحول اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ نے کہی اور امام شافعی رحمہ اللہ کے دو اقوال میں سے جدید قول یہی ہے۔ یہی بات ابو حنیفہ کے اصحاب ثوری ابن شبرمہ اوزاعی نے کہی اور ابن جریر نے اسے ترجیح دی اس قول میں قوۃ اور کمزوری دونوں موجود ہیں۔

مضبوطی اس کی یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ درحقیقت خاوند ہی ہے کیونکہ اسی کی طرف طلاق کی نسبت کی جاتی ہے لیکن اس کی کمزوری یہ ہے کہ اس کی طرف سے معافی غیر معقول بات ہے اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس کے معافی یا درگذر سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے پورا مہر دے' یا پھر بات واضح نہیں کیونکہ درگذر کا اطلاق زیادتی پر نہیں ہوتا۔

ایک قول کے مطابق مذکورہ بالا فرمان الٰہی سے مراد ولی ہے' یہ بات نخعی' علقمہ' حسن' طاؤس' عطاء' ابو الزناد' زید بن اسلم' ربیعہ' زہری' اسود بن یزید' شعبی' قتادہ' مالک اور شافعی رحمہم اللہ نے اپنے قدیم قول میں کہی' اس میں بھی قوۃ اور کمزوری دونوں موجود ہیں۔

قوۃ یہ ہے کہ اس میں عفو کا معنی معقول ہے اور کمزوری یہ ہے کہ نکاح کی گرہ خاوند کے ہاتھ

میں ہے نہ کہ ولی کے اور اس قول کی کمزوری میں مزید اس بات سے اضافہ ہوتا ہے کہ ولی کے لائق ہی نہیں کہ وہ خاوند کو مہر معاف کرے جس کا وہ مالک ہی نہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ اس بات پر اجماع بیان کیا ہے کہ اس عورت کے مال کا ولی کچھ بھی مالک نہیں اور مہر اس عورت کا مال ہے' تو دو وجوہات کی بنا پر راجح بات وہ ہے جو پہلے لوگوں نے کہی۔

① خاوند کے ہاتھ میں درحقیقت نکاح کی گرہ ہے۔

② اسے پورا مہر معاف کرنا اس مالک سے وقوع پذیر ہو سکتا ہے ولی کے برعکس جو تصرف کا حق رکھتا ہے۔

ان کا عفو کا نام زیادتی رکھنا گو ظاہر کے خلاف ہے لیکن بالعموم خاوند بوقت نکاح پورا مہر ادا کر دیتے ہیں' تو اس صورت میں عفو معقول ہو گا کیونکہ اس نے یہ مال بیوی کے لئے چھوڑ دیا اور وہ اس میں سے نصف کا مطالبہ نہیں کر سکتا اس مسئلہ میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ مشکل میں ڈالنے کی صورت ہے جیسا کہ کشاف میں ہے کیونکہ یہ درگذر حقیقی ہے یعنی اس بیوی نے اس سے جو مطالبہ کا حق رکھتی تھی اسے چھوڑ دیا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مشکل اور پورا مہر حوالہ کرنے میں بوجھل ہے اس سے پہلے کہ خاوند نے مہر ادا کر دیا ہو۔

مضمون نمبر:۵۴

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ (البقرة:۲۳۸)

"نمازوں کی حفاظت کرو۔"

کسی چیز کی محافظت کرنا یہ ہے کہ اس پر ہمیشگی کرنا اور اس کی پابندی کرنا اور یہ حکم وجوب کے لئے ہے اور نمازوں سے مراد پانچ فرض نمازیں ہیں' تو معنی یہ ہوا کہ ان کی شرائط وارکان کا خیال رکھتے ہوئے ان پر پابندی سے کاربند رہو۔

وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۔ "بالخصوص درمیان والی نماز کی۔" اوسط کا معنی ہے کسی چیز کا درمیانی یعنی بہترین' اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا "ہم نے اسی طرح تم کو عادل امت بنایا ہے۔"

درمیانی نماز کو اس کی عزت وشرف کی وجہ سے اسے الگ سے ذکر کیا' حالانکہ یہ نمازوں کے عام حکم میں داخل ہے۔

اہل علم نے درمیانی نماز کی تعیین میں اختلاف کیا اور یہ اٹھارہ اقوال ہیں۔ انہیں امام شوکانی رحمہ اللہ نے منتقی الاخبار کی شرح میں ذکر کیا اور ہر ایک کی دلیل بھی ذکر کی' ان تمام میں سے سب سے راجح اور صحیح ترین قول جسے جمہور نے اپنایا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے' اس لئے کہ بخاری مسلم اور اصحاب سنن وغیرہ کے ہاں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اس سے مراد فجر کی نماز لیتے تھے حتیٰ کہ میں نے احزاب کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "ان لوگوں نے ہمیں صلاۃ وسطیٰ عصر کی نماز سے مشغول کر دیا اللہ تعالیٰ ان کی قبروں اور ان کے پیٹوں کو آگ سے بھرے۔" اسی طرح مسلم' ترمذی' ابن ماجہ وغیرہ نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا۔

اور ابن جریر' ابن منذر' طبرانی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بیان کیا اور بزار نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مرفوعاً ذکر کیا اور بزار نے بھی سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مرفوعاً ذکر کیا اور طبرانی نے ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ضعیف سند کے ساتھ مرفوعاً ذکر کیا۔ جنگ احزاب کے ذکر کے بغیر کئی ایک مرفوع احادیث صحیح سند کے ساتھ آتی ہیں جن میں یہ صراحت ہے کہ یہ عصر کی نماز ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بے شمار آثار مروی ہیں کہ یہ عصر کی نماز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تعیین ثابت ہو جانے کے بعد اس کے ساتھ کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔

لیکن جو سیدنا علی اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ یہ صبح کی نماز ہے جیسا کہ یہ بات امام مالک رحمہ اللہ نے مؤطا میں ان سے روایت کی ہے اور ابن جریر نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح دوسرے لوگوں نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا' تو یہ تمام ان کے اقوال ہیں' اس بارہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً کچھ بھی ثابت نہیں اور ایسی باتیں دلیل بھی نہیں ہو سکتیں کجا یہ کہ ایسی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ کی مخالف ہو' وہ ثبوت جس کے تواتر تک پہنچنے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال قابل حجت نہیں تو تابعین' تبع تابعین کے اقوال بالاولیٰ قابل حجت نہیں اور اسی طرح یہ دلیل بھی لائق حجت نہیں جو ابن ابی حاتم نے حسن سند کے ساتھ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا کہ اس سے مراد مغرب کی نماز ہے۔

اسی طرح ان کا بھی کوئی اعتبار نہیں جو اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں کہ یہ ظہر کی نماز یا اس کے علاوہ دوسری نمازیں ہیں لیکن اس حدیث میں گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے مرفوعاً منقول ہے اور اس میں صلاۃ الوسطی سے مراد ظہر کی نماز ہے جیسا کہ ابن جریر نے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ذکر کیا کہ یہ ظہر کی نماز ہے۔ اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں بلکہ یہ سیدنا زید (بن ثابت) رضی اللہ عنہ سے لفظ وہ کے ساتھ مروی ہے اور انہوں نے اس بات پر دلیل لی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کو نماز پڑھا کرتے اور یہ نماز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر گراں گذرتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے بطور خاص اس کا ذکر کیا۔

یہ استدلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ صحیح احادیث تک کہاں پہنچتا ہے؟ اسی طرح ان روایات کا بھی اعتبار نہیں جو سیدنا ابن عمر ام المؤمنین سیدہ عائشہ اور سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم وغیرہ کے اقوال پر مشتمل ہیں کہ یہ ظہر کی نماز ہے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی بات دلیل نہیں ہو سکتی۔

لیکن جو ام المؤمنین سیدہ حفصہ' ام المؤمنین سیدہ عائشہ اور ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہن سے مرفوعاً مروی ہے کہ قرآن میں اس طرح ہے: الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلَاةُ الْعَصْرِ۔ یہاں صلاۃ العصر کا عطف صلاۃ الوسطی پر ہے۔ یہ دلیل ہے کہ صلاۃ العصر اس کے علاوہ ہے۔ یہ استدلال از روئے ثبوت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت احادیث کے معارض و مخالف نہیں جو ثبوت اس بات کا رد نہیں کرتے کہ یہ عصر کی نماز ہے اور یہ قراءۃ جو تین امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن سے ان الفاظ کے ساتھ وَصَلَاةُ الْعَصْرِ منقول ہے' یہ اس قراءت کے مخالف ہے جو ابن جریر نے عروہ سے بیان کیا کہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے مصحف میں وَهِيَ وَصَلَاةُ الْعَصْرِ تھا اور ایک روایت کے مطابق صَلَاةُ الْعَصْرِ بغیر واؤ کے تھا۔

اسی طرح ابن جریر' طحاوی اور بیہقی نے عمر بن رافع سے یہ روایت بیان کی کہ ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے مصحف میں وَهِيَ صَلَاةُ الْعَصْرِ لکھا ہوا تھا یہ روایات ان روایات کی تلاوت اور قراءت کے اعتبار سے مخالف ہیں اور باقی وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعیین کے بارہ میں گدلا پن' ملاوٹ اور مخالف روایات سے صحیح اور صاف روایات موجود ہیں' اس لئے کہ ایسے دلائل موجود ہیں جو حفصہ' عائشہ اور ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہن کی نقل کردہ قراءت کے منسوخ ہونے کی دلیل ہے۔

جب آپ نے ہماری بیان کردہ تحقیق کو پہچان لیا کہ صلاۃ الوسطی سے مراد صلاۃ العصر ہے' تو اس کا معارض و مخالف کوئی منقول نہیں۔ ہاں بقیہ اقوال کے دلائل میں ایسی کوئی قوت نہیں کہ ہم

ان کے ذکر اور اس کے رد میں بحث کریں کیونکہ ایسی کوئی بات ثابت نبی ﷺ سے ثابت نہیں۔ بعض کہنے والوں نے اس امر پر اعتماد کیا جس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا' وہ کہتے ہیں کہ فلاں نماز ہے کیونکہ وہ درمیانی ہے اس لحاظ سے کہ اس سے پہلے فلاں نمازیں ہیں اور اسی طرح اس کے بعد بھی فلاں فلاں نمازیں ہیں۔ یہ تو صرف رائے اور بے کار اندازہ ہے اور یہ اس لائق نہیں کہ اسکی طرف شرعی احکام منسوب کیے جائیں' اس مفروضہ پر جس کا وجود ہی نہیں جو فرامین رسول اللہ ﷺ کے مخالف ہے تو اس کا ان روایات کے ساتھ جو صحت قوت اور رسول اللہ ﷺ سے ثبوت کے اعتبار سے زیادہ بلند درجہ کی ہیں مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

ہائے اللہ کی قسم! تعجب ہے اس قوم پر جو اپنے سنت کے علم میں کوتاہی کو اور بہترین نفع بخش علم سے اعراض کو کافی نہیں سمجھتے حتیٰ کہ انہوں نے خود کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر کلام کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا اور بے علمی اور بے راہ روی سے کتاب اللہ کی تفسیر کرنے کی جرأت کرتے ہیں نتیجتاً کبھی تو وہ اپنی ایسی حرکت پر خوش ہوتے ہیں اور کبھی انہیں اس پر رونا آتا ہے۔

وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ ''اور اللہ تعالیٰ کے لئے باادب کھڑے رہا کرو۔''

قنوت سے مراد اطاعت ہے' یہ قول جابر بن زید' عطاء' سعید بن جبیر' ضحاک اور شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ ایک قول ہے کہ اس سے مراد خشوع ہے یہ قول سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ اور مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔ ایک قول ہے کہ اس سے مراد دعا ہے' یہ قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ماہ تک رعل اور ذکوان نامی قبیلہ پر قنوت میں بددعا کرتے تھے۔

ایک قوم کا کہنا ہے قنوت سے مراد لمبا قیام ہے۔ ایک قول کے مطابق ''قانتین'' کا معنی ٹھہرے ہوئے' یہ سدی کا قول ہے۔ اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ صحیحین وغیرہ میں موجود ہے کہ: ''رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں لوگ اپنے دوسرے سے دوران نماز ضرورت کی گفتگو کر لیا کرتے' حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ پس ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔

ایک قول کے مطابق لغت میں قنوت کی اصل یہ ہے کہ کسی چیز پر ہیشگی کرنا پس ہر وہ معنی جو ہیشگی کے مناسب ہو اس پر قنوت کا لفظ بولنا درست ہے۔ اہل علم نے ذکر کیا کہ قنوت کے تیرہ معانی ہیں' جنھیں امام شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں ذکر کیا۔ یہاں مذکورہ حدیث کی وجہ سے قنوت کو خاموشی پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اصطلاحا جس پر قنوت کا لفظ بولا جاتا ہے اس بارہ میں احادیث مختلف آتی ہیں کیا یہ رکوع سے پہلے یا بعد؟ کیا یہ تمام نمازوں میں ہے یا بعض میں؟ کیا یہ کسی مشکل وقت کے ساتھ خاص ہے یا نہیں؟ راجح مسلک یہ ہے کہ یہ کسی مشکل کے پیش آنے پر خاص ہے اور اس کی امام شوکانی رحمہ اللہ نے منتقی الاخبار کی شرح میں وضاحت فرمائی ہے اور میں نے اس سے بہترین جملہ الروضۃ الندیہ اور مسک الختام میں ذکر کیا ہے۔

مضمون نمبر: ۵۵

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا (البقرۃ: ۲۳۹)

''اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل ہی سہی یا سوار ہی سہی۔''

خوف سے مراد گھبراہٹ ہے اور رجال جمع ہے رجل یا راجل کی۔ عرب کے اقوال میں سے ایک یہ ہے کہ رجل الانسان یرجل رجل جب سواری موجود نہ ہو اور اپنے قدموں پر چلے تو وہ رجل اور راجل کہلائے گا۔ حجازی کہتے ہیں فلاں شخص گھر کی طرف ننگے پاؤں چل کر گیا' اسے ابن جریر طبری وغیرہ نے بیان کیا۔

سو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نمازوں کی محافظت کا حکم ذکر کیا' مزید یہ کہ خوف کی حالت کا ذکر بھی کہ یہ اس صورت حال میں جو ممکن ہو وہ کریں اور اپنی طاقت کے مطابق نمازوں کو ادا کر کے محافظت کریں چلتے ہوئے یا سواری پر جیسے بھی ہوں۔ اور ان پر یہ واضح کر دیا کہ یہ عبادت ہر حال میں جگہ کی مناسبت سے لازم ہے۔ اہل علم نے خوف کی حد جس میں یہ صورت جائز ہو جائے اس میں اختلاف کیا ہے اور فروعی کتب میں اس کے متعلق پوری طرح بحث کی گئی ہے۔

فَإِذَآ أَمِنتُمْ ''ہاں جب تم امن میں ہو جاؤ'' یعنی تمہارا خوف ختم ہو جائے تو جو تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر واپس لوٹ جاؤ' یعنی قبلہ رو ہو کر کھڑے ہوئے تمام تر شروط وارکان کو بجا لاتے ہوئے۔ نماز پوری کرو فرمان الٰہی ہے: **فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ** ''تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح کہ اس نے تمہیں اس بات کی تعلیم دی'' یعنی جیسے اس نے شریعت کے مطابق تمہیں سکھایا جسے تم نہیں جانتے تھے۔

كَمَا ۔ میں کاف محذوف مصدر کی صفت ہے' یعنی ایسا ذکر جو تمہاری تعلیم کے موافق اور تمہاری تعلیم کے ہم مثل ہو اس میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کی صورت میں ہم پر

انعام فرمایا' اگر اللہ تعالیٰ ہمیں تعلیم نہ دیتے تو ہم کچھ بھی نہ معلوم کر سکتے اس لئے اللہ تعالیٰ ہی کی تمام تعریفیں ہیں جس کے وہ لائق ہے۔

مضمون نمبر:۵۶

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (البقرۃ:۲۴۱)

''طلاق والیوں کو اچھی طرح فائدہ دینا پرہیز گاروں پر لازم ہے۔''

مفسرین نے اس آیت میں اختلاف کیا ہے۔ایک قول کے مطابق اس سے مراد متعہ ہے اور یہ ہر طلاق والی کے لئے واجب ہے۔ایک قول ہے کہ یہ آیت ان ثیبہ کے ساتھ خاص ہے جن سے جماع کیا گیا کیونکہ اس آیت سے پہلے ان عورتوں کے متعہ (سامان) کا ذکر گذر چکا جن سے خاوندوں نے جماع نہیں کیا' ہم اس متعہ (سامان) پر گفتگو کر چکے اور اس اختلاف کو بھی ذکر کر آئے کہ یہ ان طلاق والیوں کے ساتھ خاص ہے جن سے صحبت نہ کی گئی ہو اور اسی طرح مہر بھی مقرر نہ کیا ہو یا یہ آیت تمام طلاق والیوں کے لئے عام ہے۔

ایک قول ہے کہ یہ آیت واجب متعہ شامل ہے کو جو کہ ایسی طلاق والی عورت کو دیا جائے جس سے صحبت نہ کی ہو اور نہ ہی مہر مقرر کیا ہو اور غیر واجبہ کو بھی شامل ہے یعنی تمام مطلقہ عورتوں کا متعہ (سامان) صرف مستحب ہے۔ایک قول کے مطابق یہاں متعہ سے مراد خرچ ہے۔

مضمون نمبر:۵۷

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ (البقرۃ:۲۶۴)

''اے ایمان والو! اپنی خیرات کو برباد نہ کرو۔''

خیرات وصدقات کو باطل کرنے کا مفہوم ہے کہ اس کا اثر زائل ہو جائے اور اس کا نفع اور اجر برباد ہو جائے۔یعنی احسان جتلا کر اور تکلیف دے کر یا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تم اپنے صدقات برباد نہ کرو۔اس کے منع کے بارہ میں صحیح احادیث مروی ہیں۔

مضمون نمبر:۵۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (البقرۃ:۲۶۷)

''اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی میں سے خرچ کرو۔''

یعنی جو تم کماتے ہو اس میں سے عمدہ اور پسندیدہ خرچ کرو۔اسی طرح جمہور کہتے ہیں۔ایک

جماعت کا کہنا ہے یہاں طیبات سے حلال مراد ہے اور دونوں معانی کو یکجا کرنے سے یہاں کوئی مانع نہیں' اس لئے کہ عمدہ اور پسندیدہ مال دین دار اہل اسلام کے نزدیک حلال پر بولا جاتا ہے اگرچہ اہل لغت کے نزدیک جو چیز فی نفسہ عمدہ ہو گو وہ حلال ہو یا حرام' اس پر بولا جاتا ہے' تو درحقیقت اہل لغت کی بات پر اہل دین کو مقدم رکھا جائے گا۔

ایک قول کے مطابق اس میں کمائی کے جواز کی دلیل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا مقدام رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کوئی اس شخص سے بہتر کھانا نہیں کھاتا جو کہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتا ہے۔"

وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ "اور زمین میں سے تمہارے لئے ہماری نکالی ہوئی چیزوں میں سے۔" یعنی ان میں سے پاکیزہ' اس سے پہلے جملہ کو جس پر یہ دلالت کرتا ہے حذف کر دیا' وہ نباتات کانیں اور دفینے ہیں۔

آیت کے ظاہری حکم سے زمین سے نکلنے والی ہر چیز پر زکوۃ واجب ہے' امام شافعی رحمہ اللہ نے اس پیداوار کو خاص کیا ہے جسے آدمی بوتے ہیں اور ایک مناسب وقت مقرر کر کے کاٹتے ہیں اور وہ نصاب کو پہنچے اور کھجور کا اور انگور کے پھل کے بارہ میں مختلف مذاہب کی تفصیل فروعی کتب میں موجود ہے۔

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ "ان میں بری چیزوں کے خرچ کرنا کا قصد نہ کرنا۔"

یعنی تم گھٹیا مال کا قصد نہ کرو۔ آیت میں پاکیزہ مال خرچ کرنے کا حکم ہے اور گندہ مال خرچ کرنے سے منع کیا گیا۔ سلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس آیت میں فرض زکوۃ کا ذکر ہے۔ دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ یہ عام ہے فرض اور نفل صدقات میں اور یہی بات زیادہ ظاہر ہے۔

فرمان الٰہی تُنْفِقُوْنَ سے پہلے ظرف منہ لائی گئی جو کہ تخصیص کا فائدہ دیتی ہیں یعنی تم ردی چیز کو خرچ کرنے کے لئے خاص نہ کرلو کہ اسی پر قائم ہو جاؤ۔ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ "جسے تم خود لینے والے نہیں ہو۔" یعنی حالت یہ ہے کہ تم ایسی چیز اپنے آپس کے معاملات میں کسی وقت نہیں لیتے۔ اسی طرح جمہور نے معنی واضح کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ کا معنی ہے کہ اگر تم ایسی چیز بازار میں دیکھو تو فوراً فروخت کر دو۔

اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ "ہاں اگر آنکھیں بند کر لو تو (اور بات ہے)۔" آدمی نے اس کام میں آنکھیں بند کر لیں جبکہ وہ سست ہو یا اور اس کے کچھ حق پر راضی ہو جائے اور تجاوز کر جائے اور

اس سے صرف نظر کر لے۔

مضمون نمبر:۵۹

وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرۃ:۲۷۵)

"حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا۔"

لغت میں ربو کہتے ہیں مطلقاً زیادتی یا زائد چیز کو۔ شرع میں ربوا کا لفظ دو چیزوں پر بولا جاتا ہے۔ (۱) اضافہ کا سود (۲) ادھار کا سود۔

اس کی تفصیل فروعی احکام کی کتب میں موجود ہے۔ اکثر و بیشتر جاہلیت والے جو کیا کرتے تھے وہ یہ تھا کہ جب قرض کا مقررہ وقت پورا ہو جاتا تو صاحب مال مقروض سے کہتا کیا تو قرض ادا کرے گا یا سود دے گا؟ تو اگر وہ قرض ادا نہ کرتا تو قرض خواہ اس مال کی مقدار کو بڑھا دیتا اور کچھ عرصہ تک کی مدت مقرر کر دیتا۔ یہ صورت بالاتفاق اور آیت کے معنی و مفہوم سے حرام ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کاروبار کو حلال رکھا اور اس کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم کو حرام قرار دیا جو کہ سود پر مشتمل ہو۔

بیع مصدر ہے باع یبیع سے یعنی بدلہ دیا اور معاوضہ لیا۔ بہت سی احادیث سود کے گناہ عظیم کے بارہ میں وارد ہیں ان میں سے امام حاکم اور بیہقی' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سود کے تہتر دروازے ہیں ان میں سے سب سے آسان یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے اور سب سے بڑا سود مسلمان آدمی کی عزت (بے عزتی کرنا) ہے۔" اس معنی کی احادیث تعداد کے اختلاف کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے سیدنا مروی ہیں ان میں سے عبداللہ بن سلام' سیدنا کعب اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ اس مقصد کی مکمل گفتگو ہماری بلوغ المرام کی شرح مسک الختام میں ہے اسے دیکھنا چاہیے۔

مضمون نمبر:۶۰

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔(البقرۃ:۲۷۹)

"ہاں اگر توبہ کر لو (سود سے) تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے (تم اسے لے سکتے ہو) نہ تم ظلم کرو (اپنے مقروضوں پر زائد مال لے کر) نہ تم پر ظلم کیا جائے۔"

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے لوگوں کے اموال کو توبہ نہ کرنے کی صورت میں حاکم وغیرہ کا قبضہ میں لینا حلال ہے۔ اس آیت کا پہلا ٹکڑا فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ

اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ''اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' اس بات پر دلیل ہے کہ سود کھانا اس کا کام کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں۔

مضمون نمبر:۶۱

وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (البقرة:۲۸۰)

''اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہیے۔''

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سود والوں کو اپنے مال لینے کی صورت میں اصل مال لینے کا حکم فرمایا تو ساتھ ہی تنگدست لوگوں کو آسانی تک مہلت دینے کا حکم بھی فرمایا۔ تنگی یہ ہے کہ مال نہ ہونے کے اعتبار سے حالات کی تنگی۔ اسی معنی میں جیش العسرۃ تنگی کا لشکر ہے۔ النظرۃ سے مراد مہلت دینا ہے اور میسرۃ مصدر ہے آسانی کے معنی میں اور کان تامہ وجد کے معنی میں ہونے کی وجہ سے ذو کو مرفوع کرتا ہے۔ یہ قول سیبویہ اور ابو علی الفارسی وغیرہ کا ہے۔

اور سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اس طرح لکھا تھا وَ اِنْ كَانَ ذَا عُسْرَةٍ اس معنی میں کہ اگر مطلوبہ چیز تنگی والی ہے۔ اس بنا پر آیت کے الفاظ سود والوں کے ساتھ مخصوص ہوں گے اور جو ذو پڑھتا ہے تو اس بنا پر یہ عام ہوگا تمام مقروض لوگوں کے بارہ میں اور اسی موقف کو جمہور نے اپنایا ہے۔

وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا اور صدقہ کرو تم۔'' تنگدست مقروضوں پر ان کے قرضوں سے بری کر دینے کی صورت میں تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس میں ان لوگوں کو ترغیب دلائی گئی کہ وہ اپنے اصل مال کا پورا یا کچھ حصہ تنگدست لوگوں پر صدقہ کر دیں اور اس عمل کو مہلت دینے سے بہتر قرار دیا۔ یہ بات سدی ابن زید اور ضحاک نے کہی۔

دوسروں نے کہا: آیت کا معنی ہے تم صدقہ کرو غنی پر اور فقیر تمہارے لئے بہتر ہے۔ جبکہ صحیح بات پہلی ہے اور آیت میں غنی کی کوئی گنجائش نہیں۔

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ''اگر تم میں علم ہو۔'' اس کا جواب محذوف ہے یعنی اگر تم جانتے ہو کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے تو تم اس پر عمل کرتے اور صحیحین وغیرہ میں بے شمار احادیث مروی ہیں جو ترغیب دلاتی ہیں کہ تنگدست مقروض کو مہلت دینی چاہیے۔

مضمون نمبر: ۶۲

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ (البقرة: ۲۸۲)

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرو۔"

یہ قرض کے لین دین کے متعلق ابتدائی بیان ہے جو کہ لوگوں کے درمیان پیش آتا ہے سود کے احکام بیان کر دینے کے بعد یعنی جب کوئی تم میں سے کسی کے ساتھ قرض کا معاملہ کرے خواہ وہ قرض لینے والا ہو یا دینے والا تو اس کا لکھنا ضروری ہے ان تمام افراد کے لئے یہ احکام بیان کئے جا رہے ہیں۔

"دَيْن" قرض ہر اس معاملہ کا مفہوم ادا کرتا ہے جس میں ایک چیز دوسرے کے عوض میں اس طرح دی جائے کہ ایک چیز نقد ہو اور دوسری ادھار ہو۔ عرب کے نزدیک جو موجود ہو اسے عین کہتے ہیں اور جو غائب ہو اسے دین کہتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ معنی اپنے اس فرمان إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى میں بیان فرمائے ہیں اسی سے یہ بھی استدلال کیا گیا کہ نامعلوم مدت جائز نہیں۔ بالخصوص اس سودے میں جس میں قیمت نقد ادا کی گئی اور مطلوبہ چیز مخصوص صفت کے ساتھ حاصل کرنا باقی ہو تو اس کی مدت مقرر نہ کرنا ناجائز ہے۔

صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو پھلوں کے تیار ہوئے بیع کرے تو وہ معلوم وزن اور مقررہ مدت تک کے لئے بیع کرے۔ یہی بات جمہور کہتے ہیں اور انہوں وقت مقرر کرنے کی شرط رکھی ہے کہ دنوں مہینوں یا سال کا وقت مقرر کیا جائے' وہ کہتے ہیں کہ اس جیسی شرط جائز نہیں کہ فصل کی کٹائی یا بوائی یا قافلہ کے واپس پلٹنے تک وغیرہ وغیرہ۔ اس کو امام مالک رحمہ اللہ نے جائز قرار دیا ہے۔

فَاكْتُبُوهُ "تو اسے لکھ لیا کرو۔" یعنی قرض کو خواہ وہ بیع کی صورت میں ہو یا قرض کی شکل میں یا قیمت کی نقد اور چیز کی ادھار ادائیگی کی صورت ہو' کیونکہ یہ لکھنا جھگڑا ختم کرنے اور اختلافات دور کرنے میں بہت معاون ہیں۔

وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ "اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمہارا آپس کا معاملہ لکھے۔" یہاں لکھنے کا وہ طریقہ بیان کیا گیا جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا۔ ظاہری حکم تو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ یہ بات عطا اور شعبی وغیرہ نے کہی۔

اور انہوں نے کاتب پر لکھنا واجب قرار دیا ہے جبکہ اسے بلایا جائے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا لکھنے والا موجود بھی نہ ہو ایک قول کے مطابق یہ حکم استحباب کے لئے ہے یہ بات جمہور نے کہی۔

بِالْعَدْلِ ''عدل کے ساتھ۔'' یہ کاتب کی صفت ہے یعنی کاتب اس کام کو عدل وانصاف کے ساتھ کرے یعنی برابر لکھے نہ زیادتی کرے اور نہ ہی کمی کرے اسی طرح دونوں میں سے کسی ایک کی طرف نہ جھکے' یہ حکم دونوں قرض لینے اور دینے والے کو ہے کہ وہ ایسا کاتب منتخب کریں جو اس صفت سے موصوف ہو' اس کے دل اور قلم میں ان میں سے کسی ایک کی پسند (خواہش) دوسرے کے خلاف موجود نہ ہو بلکہ ان کے مابین سچ کی کوشش کرے اور انصاف کرے۔

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ ''کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔'' نفی کے سیاق کی وجہ سے یہ نکرہ ہے جو عموم کا مفہوم ادا کرتا ہے' یعنی نہ رکے کوئی بھی کاتب قرض کا معاملہ لکھنے سے جیسا کہ **عَلَّمَهُ اللّٰهُ** ''اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔'' یعنی اس طریقہ کے مطابق جو اسے اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا سکھایا ہے یا جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان کے مطابق انصاف وعدل کے مطابق سکھایا ہے۔

فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ ''پس اسے لکھ دینا چاہیے اور وہ لکھوائے۔''

اِمْلَالٌ اور **اِمْلَاءٌ** یہ دو لغات ہیں۔ پہلی حجازیوں اور بنو اسد کی ہے اور دوسری بنو تمیم کی لغت ہے۔ یہ آیت پہلے لوگوں کی لغت کے مطابق آئی ہے اور دوسری کی لغت کے مطابق مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی: **فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا** (الفرقان: ۵) ''بس وہی صبح شام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔''

الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ ''یہ وہ شخص ہے جس کے ذمہ حق ہو۔'' اس سے مراد قرض دار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا لکھوانے کا کیونکہ گواہی کی صورت یہ ہے کہ وہ خود اقرار کرے کہ قرض میرے ذمہ واجب الادا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے تقویٰ و پرہیز گاری کا حکم دیا کاتب سے لکھوانے کے بارہ میں۔ اسم اور صفت کو یکجا ذکر کرنے سے فرمان الٰہی میں مبالغہ پیدا ہوا کہ **وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ** ''اور اپنے اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔''

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا کہہ کر کمی اور نقصان سے منع فرمایا' ''اور حق میں سے کچھ گھٹائے نہیں۔'' ایک قول کے مطابق یہ کاتب کو منع کیا ہے۔ جبکہ پہلی بات زیادہ بہتر ہے کیونکہ قرض دار سے نقص وکمی متوقع ہے اور اگر یہی نہی کاتب کے لئے ہو تو پھر اس میں صرف کمی سے منع مراد نہ

ہوگی کیونکہ اس سے جس طرح کمی متوقع ہے اسی طرح زیادتی کا بھی اندیشہ موجود ہے۔

مضمون نمبر:۶۳

فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ (البقرۃ:۲۸۲)

''ہاں جس شخص کے ذمہ حق ہے۔''

ضمیر کی جگہ اظہار ہے تاکہ زیادہ واضح ہو سکے۔

سَفِيهًا ''نادان۔'' اسے کہتے ہیں جو اچھی طرح معاملات چلانے میں کوئی رائے نہ رکھتا ہو تو وہ لینے اور دینے میں کوئی خوبی نہیں رکھتا۔ اس کی تشبیہ گھٹیا کپڑے سے بیان کی جو ہلکا بنا ہوا ہو۔ مختصر یہ کہ بیوقوف نادان وہ ہے جو فضول خرچ ہو یا تو خرچ کرنے کا طریقہ نہ ہو یا درست جگہ معلوم ہونے کے باوجود بے کار جگہ کھیل میں خرچ کر دے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد ایسا بچہ جو لکھنا نہیں جانتا أَوْ ضَعِيفًا یا کمزور ہو۔ اس سے مراد بوڑھا شخص یا بچہ ہے۔ اہل لغت بیان کرتے ہیں الضُعف سے مراد بدنی کمزوری اور الضعف سے مراد رائے کی کمزوری ہے۔

أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ ''یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔'' یعنی وہ گونگا ہے یا عاجز ہے یا قیدی ہے یا ایسا غائب ہے کہ جو کاتب کے پاس نہیں آ سکتا، تو اس اس مراد یہ ہوا کہ جس صورت میں لکھنا لکھوانا مناسب ہے' اس طریقہ کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔

ایک قول ہے کہ کمزور اسے کہتے ہیں جس کی عقل کمزور ہو۔ ہوشیاری میں ناقص ہو اور لکھوانے سے عاجز ہو اور وہ جو لکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا وہ بچہ ہے فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ''تو اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوا دے۔'' یہاں ضمیر قرض دار کی طرف لوٹتی ہے پس اس نادان جسے مال کے تصرف سے روکا گیا ہے کی طرف سے اس کا ولی لکھوائے اور بچے کی طرف سے اس کا وصی یا ولی لکھوائے اسی طرح ایسے عاجز کی طرف سے بھی لکھوائے جو اپنی کمزوری کی وجہ سے لکھوا نہیں سکتا۔

وَلِيُّـهُ کو اس لئے منتخب کیا گیا کہ وہ بچہ کے حکم میں ہے یا اس سے مراد حاکم یا قاضی ہے جو طاقت نہیں رکھتا اس کی طرف سے اس کا وکیل ذمہ دار لکھوائے جبکہ وہ خود صحیح العقل ہو اور اس کی زبان پر کوئی پریشانی یا مصیبت آئی ہو یا اسے ایسی کوئی مصیبت تو نہ آئی ہو لیکن وہ ایسا جاہل ہو کہ

جس طرح لکھنا مناسب ہے وہ نہ لکھ سکتا ہو۔

امام طبری فرمان الٰہی میں وَلِیُّهٗ کی ضمیر کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ حق کی طرف لوٹتی ہے یہ بات سخت کمزور ہے۔ امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: ایسا نادان جسے تصرف سے روکا گیا ہے اس کا ولی کے بغیر تصرف کرنا بالاجماع فاسد ہے۔ ہمیشہ کے لئے منسوخ ہے اسے کوئی واجب قرار نہیں دے سکتا اور نہ اس پر کوئی چیز راجح قرار دی جا سکتی ہے بیشک ایسے نادان کا تصرف جسے تصرف سے روکا نہیں گیا اس کے بارے میں اختلاف ہے۔

مضمون نمبر: ۶۴

وَاسْتَشْهِدُوْا (البقرة: ۲۸۲)

''اور گواہ رکھ لو۔''

استشہاد کہتے ہیں گواہی طلب کرنے کو اور دو کاتبوں کو دو گواہ قرار دیا گواہی کی رو سے مجازی طور پر یعنی اس اعتبار سے کہ ان دونوں کا معاملہ گواہی کی طرف لوٹتا ہے۔

مِنْ رِّجَالِكُمْ ''اپنے میں سے مرد (گواہ رکھ لو)'' یہ وَاسْتَشْهِدُوْا کے متعلق ہے یعنی مسلمانوں میں سے پس اس حکم سے کفار خارج ہیں۔ اس آیت سے غلاموں کے نکلنے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی جبکہ وہ مسلمان ہوں مسلمان مردوں میں سے ہوں۔ یہ بات شریح' عثمان البتی' احمد بن حنبل' اسحٰق بن راہویہ اور ابو ثور نے کہی۔

ابو حنیفہ' امام مالک' شافعی اور جمہور علماء فرماتے ہیں غلام کی گواہی جائز نہیں اس لئے کہ اسے آزادی کا نقص لگتا ہے۔ شعبی اور نخعی فرماتے ہیں: زیادہ کی بجائے تھوڑی معمولی چیز میں درست ہے۔ جمہور اس کے جائز نہ ہونے پر دلیل لیتے ہیں کیونکہ اس آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو قرض کے لین دین کا معاملہ کرتے ہیں اور غلام کسی ایسی چیز کے مالک نہیں ہوتے کہ جس میں یہ معاملہ کیا جا سکے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوا کرتا ہے نہ کہ خاص سبب کا اور یہ بھی کہا گیا کہ غلام سے قرض کا لین دین درست ہے اور باقی تمام معاملات بھی جبکہ اس کا مالک اس کی اجازت دے۔

لوگوں نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ کیا گواہی واجب ہے یا مستحب ہے؟ سیدنا ابو موسیٰ اشعری' سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما' ضحاک' عطاء' سعید بن مسیب' جابر بن زید' مجاہد' داؤد بن علی'

الظاہری اور ان کے بیٹے رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ واجب ہے اسے ابن جریر طبری نے راجح قرار دیا ہے۔

شعبی، حسن، مالک، شافعی، ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا موقف ہے کہ یہ مستحب ہے۔ یہ اختلاف جو ان لوگوں کے مابین ہے، وہ اس بات پر ہے کہ کاروبار میں گواہی کے واجب ہونے پر، واجب قرار دینے والوں نے اس فرمان الٰہی سے استدلال کیا وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ "خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ مقرر کر لیا کرو۔" اس حکم اور وَاسْتَشْهِدُوْا میں کوئی فرق نہیں تو کاروبار میں گواہی کو واجب قرار دینے والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ قرض کے لین دین میں بھی گواہی کو واجب قرار دیں۔

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا "اگر دو مرد نہ ہوں" یعنی دو گواہ فَرَجُلٌ وامراتان "تو ایک مرد" اور دو عورتیں" کافی ہیں۔ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ "جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کر لو" یعنی ان کے دین اور ان کی سچائی وانصاف کو۔

اس میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا کہ گواہی میں ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ہوں گی اور یہ کہ صرف اکیلی عورت کی گواہی مرد کے بغیر جائز نہیں، سوائے ان معاملات کے کہ جن کا علم انہی سے ہو سکتا ہے، اس میں اختلاف ہے کہ جس طرح ایک آدمی کی گواہی اور مدعی کے قسم اٹھانے سے فیصلہ ہو جاتا ہے تو کیا اس طرح دو عورتوں کی شہادت اور مدعی کے قسم اٹھانے سے فیصلہ ہو سکتا ہے؟

امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس آیت میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیتے ہیں اور ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا موقف ہے کہ یہ جائز نہیں۔ یہ بات اس اختلاف کی طرف جاتی ہے کہ گواہ کے ساتھ مدعی کی قسم پر فیصلہ کرنا حق بات یہ ہے کہ یہ جائز ہے اس کی دلیل موجود ہونے کی وجہ سے اور یہ زیادتی کتاب عزیز میں موجود فرامین کے مخالف بھی نہیں پس اسے قبول کرنا ہی متعین کرنا پڑے گا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس بات کی وضاحت اپنی منتقی کی شرح اور اپنی دوسری تالیفات میں کی ہے اور ہر سمجھ دار کو اس بات کا علم ہے کہ اس آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو رد کیا جا سکے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک گواہ اور قسم سے کیا ہے، اس فیصلہ کو رد کرنے کیلئے لوگوں کے پاس صرف ایک ایسا قاعدہ ہے کہ جس کی بنیاد گرنے والی وادی کے کنارہ پر ہے یعنی بے بنیاد ہے اور وہ یہ ہے کہ نص پر زیادتی نسخ ہے، ان کا

یہ دعویٰ باطل ہے بلکہ نص پر زیادتی شریعت سے ثابت ہے' یہ بھی ہمارے پاس وہی لائے جو ہمارے پاس گذشتہ نص لے کر آئے اور یہ بھی ان پر لازم ہے کہ وہ مطلوبہ بات کے الٹ فیصلہ نہ کریں اور نہ ہی اس قسم کے ساتھ جو طلب کرنے والے پر لوٹ جائے حالانکہ انہوں نے ایسا فیصلہ کیا ہے اس بات کا جواب ہی ہمارا جواب ہے۔

ہم نے نص پر زیادتی کے حکم کو حصول المأمول من علم الاصول نامی اپنے رسالہ میں خوب واضح کیا ہے اور گواہ کے ساتھ قسم کے مسئلہ کو پر مسک الختام میں بالتفصل وضاحت کی ہے۔ ان دونوں کو دیکھنا چاہیے۔

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا ''تا کہ ایک کی بھول چوک کو۔'' ابو عبید تَضِلَّ کا معنی بھول جانا کرتے ہیں یعنی کم عقل اور کم حافظہ کی وجہ سے اور پھسلنا گواہی سے یہ بھی بھول کا ایک حصہ ہے اور اس حصہ کو ذکر کیا۔ حمزہ نے اِنْ تَضِلَّ پڑھا ہے۔

فرمان الٰہی فَتُذَكِّرَ اس قراءت کی رو سے اس کا جواب ہوگا۔ جمہور کی قراءت کے مطابق تضل پر عطف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ جس نے اسے مرفوع پڑھا ہے تو اس نے اسے جملہ استثناء فیہ کی بنا پر پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمر کی قراءت میں فَتُذْكِرَ اس کا معنی یہ ہوا کہ وہ اسے مزید یاد کروا دے۔ جماعت کی قراءۃ شد کے ساتھ ہے یعنی اسے تنبیہ کر دے جب وہ غافل ہو جائے یا بھول جائے۔ یہ آیت متعدد عورتوں پر اعتبار کرنے کی علت ہے۔ یعنی ایک گواہی دے اور دو عورتیں ایک دوسرے آدمی کے بدلہ میں گواہی دیں تا کہ ان میں سے ایک دوسری کو اس کے پھسلنے پر یاد کروا دے۔

اس بنا پر گفتگو میں حذف مانا جائے گا وہ پوچھنے والے کا سوال ہے کہ ایک آدمی کے بدلے دو عورتوں پر اعتبار کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے ایک کے پھسلنے پر دوسری اسے یاد کروا دے گی۔ فی الحقیقت اس علت یاد کروانا ہے لیکن پھسلنا جب اس کا نسب ہوا تو یہ اپنے مرتبہ پر آئے گا اور تضل اور تذکر کا اسم فاعل ہوگا کیونکہ ان دونوں عورتوں میں سے ہر ایک پر اس صفت کا لگنا جائز ہے۔

پس معنی یہ ہوا کہ اگر یہ بھول جائے تو وہ یاد کروا دے اور اگر وہ بھول جائے تو یہ یاد کروا دے، یہاں تعیین نہیں کی بلکہ صرف ان دونوں میں یاد کرانے کا اعتبار کیا گیا کیونکہ مردوں کے مقابلہ عورتوں میں کمزوری پائی جاتی ہے اور بعض اوقات ابہام کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ بھولنا اور یاد

کرانا ان دونوں میں باری باری واقع ہو جائے یہاں تک کہ کبھی ایک اس وجہ سے بھول گئی اور دوسری کسی اور وجہ سے بھول گئی تو ہر ایک ان میں سے دوسری کو یاد کرا دے۔

سفیان بن عیینہ اس فرمان الٰہی فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ "تا کہ ایک کو دوسری یاد دلا دے۔" کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ ایک دوسری کو یاد دلائے۔ یعنی دو عورتوں کی اکٹھے مل کر گواہی ایک مرد کی گواہی کے ہم مثل ہے۔ اسی طرح ابو عمرو بن علاء سے مروی ہے' اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ باطل ہے اس پر شرعی دلیل کوئی نہیں اور نہ لغوی دلیل ہے اور نہ ہی عقلی دلیل ہے۔

مضمون نمبر: ۶۵

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا (البقرۃ: ۲۸۲)

"اور گواہوں کو چاہیے کہ وہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں۔"

یعنی گواہی دینے کے لئے جو انہوں نے اس سے قبل اٹھا رکھی ہے۔ ایک قول کے مطابق جب انہیں گواہی دینے کے لئے بلایا جائے۔ انہیں مجازی طور پر شہداء کہا گیا جیسا کہ یہ بات پہلے گذر چکی۔

حسن اسے دونوں معنوں پر محمول کرتے ہیں۔ اس نہی کا ظاہری حکم یہ ہے کہ گواہی دینے سے باز رہنا حرام ہے۔

مضمون نمبر: ۶۶

وَلَا تَسْأَمُوا (البقرۃ: ۲۸۲)

"اور کاہلی نہ کرو۔"

یعنی اے مومنو! اے معاملہ کرنے والو! یا اے گواہو! سستی نہ کرو۔

أَنْ تَكْتُبُوهُ "کہ تم اسے لکھو۔" یعنی جو تم قرض کا لین دین کر رہے ہو اس کے لکھنے میں سستی نہ کرو۔ ایک قول کے مطابق تم حق اور سچ لکھو' ایک قول کے مطابق سچی گواہی لکھو' ایک قول کے مطابق سچی کتاب لکھو۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں سستی سے منع فرمایا کیونکہ بعض اوقات قرض کے معاملات لکھتے لکھتے انسان تھک جاتا ہے' پھر اس میں مزید مبالغہ پیدا کیا صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا "خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو" فرما کر' یعنی تم لکھنے میں سستی نہ کرو خواہ کیسی ہی صورت حال ہو اگرچہ قرض زیادہ ہے یا تھوڑا۔

یہاں چھوٹے کا ذکر پہلے کیا اور بڑے کا بعد میں اس کی اہمیت کی وجہ سے اور اس خیال کو دور کرنے کے لئے کہ کوئی کہے یہ تو تھوڑا سا مال ہے اس کے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

اِلٰی اَجَلِہٖ ذٰلِکُمْ ''جس کی مدت مقرر ہے یہ بات۔'' یعنی مذکورہ تحریر جس کی طرف اس فرمان الٰہی کی ضمیر جاتی ہے اَنْ تَکْتُبُوْہُ۔ اَقْسَطُ یعنی زیادہ انصاف اور زیادہ محفوظ اور زیادہ درست ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک۔ وَ اَقْوَمُ لِلشَّھَادَۃِ ''اور گواہی کو بھی درست رکھنے والی ہے۔'' یعنی یہ گواہی کو درست رکھنے اور اسے مزید پختہ کرنے میں مددگار ہے۔ یہ اَقَامَ سے مبنی ہے اور اسی طرح اَقْسَطُ بھی اپنے فعل اَقْسَطَ سے مبنی ہے۔ سیبویہ نے صراحت کی ہے کہ یہ قیاسی ہے یعنی افعل التفضیل کو مبنی قرار دینا۔

وَ اَدْنٰی اور زیادہ قریب کرنے والی ہے۔ یعنی زیادہ قریب ہے اَنْ الَّا تَرْتَابُوْٓا کہ تم شک میں مبتلا ہو۔ یعنی شک وشبہ تمہارے معاملات میں نہ رہنے پائے اور یہ بات کہ جو کتاب تم لکھتے ہو یہ تمہاری عزت و آبرو سے ہر قسم کے شک کو دور کرتی ہے۔

الا اَنْ تکُوْنَ ''ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ معاملہ۔'' ان استثناء کی بنا پر منصوب ہے۔ یہ بات اخفش نے کہی اور کان تامہ ہے یعنی مگر یہ کہ وہ واقع ہو جائے یا تجارت موجود ہو اور استثناء منقطع بھی ہو سکتا ہے یعنی لیکن تمہارے خرید و فروخت کے وقت وہ حاضر ہو یعنی دونوں چیزیں جو ایک دوسرے کے بدلہ میں دینا ہیں۔ تُدِیْرُوْنَھَا بَیْنَکُمْ ''جو آپس میں تم لین دین کر رہے ہو۔'' گھومنے کا معنی ہے لینا اور دینا آپس میں بیع وشراء خرید و فروخت کرنا اور یہ ہاتھوں ہاتھ لینے کا معنی ادا کرتا ہے۔

فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَکْتُبُوْھَا ''تو تم پر اس کے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔'' یعنی تم پر یہ معاملہ نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ وَ اَشْھِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ''خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ مقرر کر لیا کرو۔'' یہ وہ خرید و فروخت ہے جو ابھی مذکور ہوئی یعنی نقد تجارت میں گواہی کافی ہے۔ ایک قول اسی طرح ہے اور ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ جب بھی تم خرید و فروخت کرو وہ نقد ہو یا ادھار کیونکہ یہ صورت سب سے زیادہ اختلاف کی جڑ کو اکھاڑنے والی ہے اور جھگڑے وغیرہ کو سب سے زیادہ کاٹنے والی ہے۔ جبکہ گواہی کے واجب اور مستحب کے بارہ میں قریب ہی اختلاف کا ذکر ہو چکا ہے کہ یہ گواہی واجب ہے یا مندوب۔

مضمون نمبر: ٦٧

وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ۔ (البقرۃ: ٢٨٢)

''اور نہ تو لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو۔''

یہاں فاعل یا مفعول ہونے کا احتمال موجود ہے۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ نہ تکلیف دی جائے لکھنے والے اور گواہ کو ان سے پوچھتے وقت قبول نہ کرنے کی صورت میں یا تحریف و تبدیل کرنے کی صورت میں اور زیادتی اور کمی کرنے کی صورت میں مذکورہ تحریر میں۔ اس تفسیر پر سیدنا عمر بن خطاب، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن ابی اسحٰق کی قراءت دلالت کرتی ہے وَ لَا يُضَآرَّ پہلی راء پر کسرہ۔ دوسری صورت میں ''لایضار کاتب و لاشھید'' کا معنی یہ ہوگا کہ لکھنے والے اور گواہ کو تکلیف نہ پہنچاؤ کہ انہیں اس کام کے لئے اس وقت بلایا جائے جبکہ وہ اپنے کسی ضروری کام میں مصروف ہوں اور ان پر قبول کرنے کے لئے سختی کی جائے اور ان کی رضامندی کے حصول کے لئے تکلیف واذیت دی جائے یا وہ کسی دور کے مقام پر ہوں تو انہیں اس موقع پر حاضر ہونے کا کہا جائے۔

اس پر سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت دلالت کرتی ہے وَ لَا يُضَآرَّ باب مفاعلہ دو باتوں کو ایک ہی مرتبہ معتبر قرار دیتا ہے۔ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا ''اور اگر تم یہ کرو۔'' یعنی جو تکلیف دینے سے تمہیں منع کیا گیا۔ فَاِنَّهٗ ''تو یہ'' یعنی تمہارا ایسا کرنا فُسُوْقٌ ''کھلی نافرمانی ہے۔'' یعنی اطاعت و فرمانبرداری سے نکل کر گناہ میں شامل ہونا ہے۔

مضمون نمبر: ٦٨

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ۔ (البقرۃ: ٢٨٣)

''اور اگر تم سفر میں ہو۔''

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ لکھنے کا قانون اور گواہی کا مسئلہ ذکر فرما چکے تاکہ مال و دولت کی حفاظت ہو سکے اور شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ تو اس کے بعد لکھنے والے کی عدم موجودگی کے عذر کو ذکر کیا اور سفر کے حالات بیان فرمائے کیونکہ یہ من جملہ عذر میں سے ہے اور اسے وہ تمام عذر شامل ہو سکتے ہیں جو اس سفر کے قائم مقام ہو سکتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے گروی دی ہوئی چیز کو لکھنے کے قائم مقام رکھا یعنی اگر تم سفر میں ہو۔

وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا ''اور لکھنے والا نہ پاؤ۔'' اپنے سفر میں فَرِهٰنٌ ''تو پھر کوئی چیز رہن گروی رکھ لی جائے'' اہل علم کا کہنا ہے سفر میں گروی رکھنا قرآن مجید سے ثابت ہے اور حضر میں رسول اللہ ﷺ کے عمل سے جیسا کہ صحیحین میں موجود ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی ایک زرہ یہودی کے پاس گروی رکھی۔ جمہور کا موقف ہے کہ گروی رکھی ہوئی چیز قبضہ میں لینا ضروری ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: مَّقْبُوْضَةٌ امام مالک رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ ایجاب وقبول سے بھی قبضہ کے بغیر گروی رکھنا درست ہے۔

مضمون نمبر: ۶۹

وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔ (البقرۃ: ۲۸۳)

''اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔''

گواہوں کو منع فرمایا کہ جب ان کے پاس گواہی ہو اور انہیں ادا کرنے کے لئے بلایا جائے تو وہ گواہی نہ چھپائیں یہ فرمان الٰہی وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ کی تفسیر ہے، یعنی وہ تکلیف نہ دے، یہ اس صورت میں ہے کہ جب پہلی راء مکسور ہو، پہلے جو دو تفسیریں گذری ہیں ان میں سے ایک کے مطابق ہے۔

- وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ''اور جو اسے چھپالے وہ گنہگار دل والا ہے۔''

بالخصوص دل کا ذکر اس لئے کیا کہ چھپانا اسی کا کام ہے اور اس لئے بھی کہ یہ اعضا کا سردار ہے۔ یہ ایسا ٹکڑا ہے اگر یہ درست رہا تو سارا بدن درست ہوگا اور اگر یہ خراب ہوگا تو سارا بدن خراب ہوگا۔ باقی اعضاء جو کرتے ہیں ان کاموں کو اس کی طرف منسوب کرنا زیادہ بلیغ ہے، کسی کو دل کے کاموں پر مواخذہ کرنے میں یہ زیادہ واضح ہے۔

قلب کو فاعل یا مبتداء ہونے کی بنا پر مرفوع پڑھیں گے اور آثم خبر ہوگی، علم نحو میں جس طرح موجود ہے۔ جائز ہے کہ قلبہ آثم کا بدل ہو بدل البعض من الکل۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس ضمیر کا بدل ہو جو آثم میں ہے جو کہ من کی طرف لوٹتی ہے اس صورت میں قَلْبُهٗ پڑھا جائے گا جس طرح فرمان الٰہی ہے اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی تاریخ میں ابوداؤد، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، ابونعیم اور بیہقی، سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ یہ آیت اس طرح پڑھتے: يَآ اَيُّهَا

الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا تَدَا یَنْتُمْ بِدَیْنٍ" فان اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا تک۔ کہتے ہیں یہ اپنے ماقبل کے لئے ناسخ ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں اس جلیل القدر صحابی سے اللہ راضی ہو یہ آیت نسخ کے باب میں سے نہیں' یہ تو امانت داری سے تعلق رکھتی ہے اور اس سے پہلی آیت اس امن یا امانت داری کے نہ ہونے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بنا پر یہ آیت ثابت اور محکم ہے منسوخ نہیں۔ (یہاں امام شوکانی رحمہ اللہ کے بات ختم ہوگئی)۔

میں کہتا ہوں زیادہ حق بات یہ ہے کہ اس میں تطبیق اور تاویل کی جائے گی اور نسخ کا حکم لگانے سے پہلے جس قدر ممکن ہو دونوں میں سے ایک کو دوسرے میں داخل کیا جائے گا جیسا کہ میں نے یہ بات افادہ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ میں اچھی طرح بیان کردی ہے۔

ابن جریر صحیح سند کے ساتھ سعید بن مسیتب سے بیان کرتے ہیں وہ اسے نبی ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں سے عرش سے اترنے والی سب سے نئی (آخری) آیت قرض کی آیت ہے۔

سورۃ البقرہ کی غیر منسوخ قوانین کی آیات مکمل ہوئیں

سورۃ ال عمران کی تفسیر

اس کی ۲۰۰ آیات ہیں یہ سورۃ مدنی ہے

قرطبی رحمہ اللہ اس پر اجماع ذکر کرتے ہیں کہ جو احادیث اس کی فضیلت کے متعلق آتی ہیں وہ بقرہ اور آل عمران کے مابین مشترک ہیں۔

مضمون نمبر:۱

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ز (العمران:۲۸)

''مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔''

اس آیت میں مومنین کو کافروں کے ساتھ دوستی سے روکا گیا ہے گو وہ کسی وجہ سے بھی ہو۔ اسی طرح فرمان الٰہی ہے: لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (العمران:۱۱۸) ''اے ایمان والو! تم اپنا دلی دوست ایمان والوں کے سوا اور کسی کو نہ بناؤ۔'' مزید ایک جگہ فرمایا: وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (المائدہ:۵۱) ''تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے' تو وہ بے شک انہی میں سے ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (المجادلة:۲۲) ''اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والوں کو آپ ہرگز نہیں پائیں گے۔'' ایک اور جگہ فرمایا: لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ (المائدہ:۵۱ ''اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ مزید ایک جگہ فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ (الممتحنة:۱ ''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو میرے اور خود اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔''

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ''اور جو ایسا کرے گا۔'' یعنی یہ دوستی لگائے گا فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ ''وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حمایت میں نہیں۔'' یعنی اس کی کسی چیز میں بھی دوستی نہ رہے گی بلکہ وہ ہر لحاظ سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ''مگر یہ کہ ان کے شر سے کسی طرح بچاؤ مقصود ہو۔'' یہاں ہوشیار کرنے کے لئے خطاب کا صیغہ استعمال کیا گیا' یعنی اگر تمہیں ان سے کسی قسم کا خوف ہو کہ جس سے بچنا ضروری ہو تو پھر وقتی دوستی ہو سکتی ہے ورنہ کسی بھی حالت میں ان سے دوستی جائز نہیں۔

اگر کسی کام سے تمہیں ڈر ہو تو اس سے بچنا واجب ہے' یہ استثناء مفرغ ہے عام حالات سے اس میں دلیل ہے کہ ان سے خطرہ کے باوجود دوستی جائز ہے لیکن یہ ظاہری ہونی چاہیے نہ کہ باطنی اور حقیقی، جبکہ اس بات کی اسلاف میں سے کچھ لوگوں نے مخالفت کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اس کے بعد تقیہ کرنا جائز نہیں۔

مضمون نمبر:۲

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ ۔ (العمران:۹۷)

''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر اس گھر کا حج فرض کر دیا ہے۔

لِلّٰهِ میں جو لام ہے اسے لام ایجاب اور لام لازم کہتے ف علی ذکر کر کے اس معنی کو مزید مؤکد بنایا' یہ طریقہ عربوں کے نزدیک دلالت کے اعتبار سے سب سے زیادہ واضح ہے جیسا کہ کوئی کہنے والا کہے فلاں کے لئے یہ ذمہ داری ہے۔

اس کے وجوب کو موکد کرنے کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حج کا ذکر کیا اس لئے کہ یہ زیادہ بلیغ طریقہ ہے اور اس کی عزت وحرمت کی عظمت بیان کرنے کے لئے جو اپنایا۔ یہ خطاب تمام انسانیت کو شامل ہے اس سے کوئی نہیں نکل سکتا سوائے اس کے جسے کوئی دلیل خاص کر دے مثلاً بچہ اور غلام۔

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ''جو اس کی طرف راہ پا سکتے ہوں۔''

اہل علم کا اس طاقت کے بارہ میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ زادراہ اور سواری اور انہی دو کی نبی ﷺ نے اس حدیث میں تفسیر کی ہے جو امام حاکم وغیرہ نے روایت کی' اسی موقف کو صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت نے اپنایا اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اکثر اہل علم سے نقل کیا اور یہی بات حق ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آدمی جب قوی اور مضبوط ہو جائے تو اس پر حج لازم ہو جاتا ہے اگرچہ اس کے پاس زادراہ اور سواری نہ بھی ہو۔ جبکہ کمانے کی طاقت رکھتا ہو اور یہی بات سیدنا عبداللہ بن زبیر، شعبی اور عکرمہ نے کہی۔ ضحاک کہتے ہیں اگر وہ مضبوط جوان ہے اور اس کے پاس مال نہیں تو اس پر لازم ہے کہ وہ مزدوری کرے حتیٰ کہ حج مکمل کرے۔

من جملہ استطاعت میں جو پہلی بات داخل ہوتی ہے وہ یہ کہ حج کا راستہ پرامن ہو اس اعتبار سے کہ خود حاجی کی جان اور اس کا مال جو کہ زادراہ ہے وہ بھی پرامن ہو ہاں اگر امن نہیں تو

استطاعت بھی نہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا یہ آدمی خود اپنی جان پر اور اپنے مال پر خوف زدہ ہے تو یہ بیت اللہ تک راہ کی طاقت نہیں رکھتا اور اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

اہل علم کا اختلاف ہے کہ جب دوران سفر ظالم لوگ ہوں جو صرف حاجی کا کچھ زادراہ چھوڑیں تو اس کا کیا حکم ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ اسے کچھ نہ دے اور اس سے حج کا فریضہ ساقط ہو گیا۔ ایک جماعت نے ان کی ہے موافقت کی اور ایک جماعت نے ان کی مخالفت کی اور یہ بات ظاہر ہے کہ جو زادراہ اور سواری کی طاقت رکھتا ہے اور راستہ پر امن ہے اس اعتبار سے کہ وہ گذرنے کی طاقت رکھتا ہو اگرچہ ظالموں کو کچھ مال دے کر حاجی گذر سکتا ہے اور اس کے زادراہ میں نقص نہیں ہوتا اور اس کے لئے کوئی روکاوٹ بھی نہیں تو اس سے حج ساقط نہ ہوگا بلکہ اس پر واجب ہے کیونکہ وہ کچھ مال دے کر راستہ کی طاقت رکھتا ہے لیکن جو مال راستہ میں دینا ہے وہ من جملہ استطاعت کے اندر ہو۔

اگر آدمی کے پاس زادراہ اور سواری تو ہے لیکن وہ راستہ کی چونگی یا ٹیکس نہیں دے سکتا تو اس پر حج واجب نہیں کیونکہ وہ اس راہ کی استطاعت نہیں رکھتا اور یہ انتہائی ضروری ہے یہ بات استطاعت کی تفسیر زادراہ اور سوری کے منافی بھی نہیں کیونکہ حج کی راہ سے گذرنے والوں کو تکلیف دی جاتی ہے سوائے اس کے جو زادراہ اور سواری اس قدر رکھتا ہے جو یہ ٹیکس والے لیتے ہیں۔

شاید امام شافعی رحمہ اللہ کے اس فرمان کی وجہ یہ ہو کہ ٹیکس لینا منکر اور نافرمانی کا عمل ہے تو حاجی پر لازم نہیں کہ وہ منکر میں شامل ہو۔ پس وہ اس قدر طاقت رکھتا ہے کہ جو استطاعت میں داخل ہے کہ حاجی اس قدر صحت مند ہو کہ سواری کے قابل ہو تو اگر وہ ایسی عمر میں پہنچ چکا ہے کہ وہ چلنے اور سوار ہونے کی طاقت نہیں رکھتا تو اسے اجازت ہے اگرچہ زادراہ بھی ہو اور سواری بھی ہو تو وہ گویا راستہ کی طاقت نہیں رکھتا۔

جو زادراہ اور سواری کا مالک ہے اور حج نہ کرے اس کے بارہ میں سخت وعید کی بہت زیادہ احادیث آئی ہیں، جنہیں امام شوکانی رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں ذکر کیا اور ان پر گفتگو بھی کی ہے۔

مضمون نمبر: ۳۰

وَ مَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ (العمران: ۱۶۱)

''ہر خیانت کرنے والا خیانت کو لئے ہوئے قیامت کے دن حاضر ہوگا۔''

یعنی اسے وہ اپنی پشت پر اٹھائے ہوئے لائے گا جس طرح کہ یہ بات نبی ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہے اور وہ خیانت اسے تمام مخلوقات کے سامنے رسوا کر دے گی۔ یہ جملہ خیانت کی حرمت پر مزید تاکید کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور اس سے مزید نفرت پیدا کرنے کے لئے ہے' اس اعتبار سے کہ یہ ایسا گناہ ہے جو گنہگار کو گواہوں کے سامنے سزا دلوائے گا اور محشر والے اسے دیکھ رہے ہوں گے' وہ قیامت کے روز اپنی خیانت کو کمر پر اٹھائے ہوئے آئے گا۔ اس سے پہلے کہ اس سے حساب لیا جائے اور اسے سزا دی جائے۔

ال عمران کی تفسیر مکمل ہوئی۔

تفسیر سورۃ النسآء

اس کی ۱۷۶ آیات ہیں اور یہ پوری سورۃ مدنی ہے

قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سوائے ایک آیت کے جو فتح مکہ کے سال عثمان بن طلحہ حجی کے بارہ میں نازل ہوئی، وہ آیت یہ ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔

''اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہنچاؤ۔''

مضمون نمبر: ۱

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا۔ (النسآء: ۳)

''اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو تم نکاح کرلو۔''

جزاء کو شرط کے ساتھ ملانے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی یتیم بچیوں کی کفالت کرتا ہے کیونکہ یہی ان کا ولی و نگران ہے اور یہ اس سے نکاح کرنا چاہے تو اس کا مہر ساقط نہ ہوگا، یعنی اس بارہ میں وہ انصاف نہ کرے اور جو مہر دوسری بیویوں کو دیا ہے وہ اسے نہ دے، تو اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت میں ان سے نکاح کرنے سے روک دیا ہے، ہاں اگر یہ ان سے انصاف کریں اور انہیں ان کے مہر سے اچھا دیں تو پھر کوئی حرج نہیں اور ان لوگوں کو ان کے سوا دوسری عورتوں سے نکاح کا حکم دیا گیا جو انہیں پسند ہوں۔ اس آیت کا شان نزول یہی ہے یہ نہی اس صورت کے ساتھ خاص ہے اور سلف کی ایک جماعت نے کہا یہ آیت اس رواج کی ناسخ ہے جو جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں یہ رواج تھا کہ آدمی جتنی عورتوں سے چاہتا شادیاں کرلیتا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں چار تک انہیں محدود کر دیا۔ پس جزاء کو شرط کے ساتھ ملانے کی وجہ یہ ہوئی کہ اگر وہ ڈریں کہ بیویوں میں انصاف نہ کر سکیں گے کیونکہ وہ یتیم عورتوں میں حرج محسوس کرتے ہیں اور عام عورتوں میں حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔

خوف کا لفظ ضد کے مد مقابل ہوتا ہے، بعض اوقات جس چیز سے انسان ڈرتا ہے وہ معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات گمان میں ہوتی ہے، اسی لئے ائمہ نے اس آیت کے معنی میں اختلاف کیا

ہے۔ابوعبید کہتے ہیں خِفْتُمْ کا معنی ہے تم یقین کرلو۔دوسروں نے کہا اس کا معنی ہے تم نے گمان کیا۔ابن عطیہ کہتے ہیں اس کا معنی ہے ایقنتم، یعنی کہ اس کا گمان غالب یہ ہے کہ وہ یتیم بچی کے ساتھ انصاف میں کمی کرے گا تو اس سے نکاح کا ارادہ چھوڑ دے اور اس کے علاوہ کسی دوسری عورت سے نکاح کرلے۔

مَا طَابَ میں مَا موصولہ ہے‘ تو معنی یہ ہوا کہ تم عورتوں میں سے پاکیزہ قسم کی عورت سے نکاح کرو‘ یعنی حلال سے اور جو چیز اللہ تعالیٰ نے حرام کی وہ پاکیزہ نہیں ہوسکتی۔ایک قول کے مطابق یہاں ما (ظرفیہ) مدت کے لئے ہے‘ یعنی جب تک تم نکاح کرسکتے‘ ہوا سے ابن عطیہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔فراء نے کہا کہ ما مصدریہ ہے‘ نحاس کہتے ہیں کہ یہ بہت بعید ہے۔

اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت میں مذکورہ شرط کا مفہوم کوئی نہیں‘ اس لئے کہ جسے یتیم کے ساتھ انصاف کے بارہ میں خوف نہ ہو اس کے لئے ایک سے زائد نکاح کرنے جائز ہیں۔

مِّنَ النِّسَآءِ میں مِنَ یا تو بیان کے لئے ہے یا تبعیض کے لئے کیونکہ اس سے غیر یتیم مراد ہیں مَثْنٰی یعنی دو دو۔ وَ ثُلٰثَ یعنی تین تین۔وَ رُبٰعَ یعنی چار چار۔

اس آیت سے چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی حرمت پر استدلال کیا ہے اور یہ وضاحت کی کہ یہ خطاب تمام امت سے ہے اور ہر نکاح کرنے والے کو اختیار دیا کہ اس تعداد میں جو چاہے پسند کرلے‘ جس طرح کسی جماعت سے کہا جائے کہ یہ ہزار درہم ہیں انہیں تقسیم کرلو یا اس تھیلی میں دو دو اور تین تین اور چار چار ہیں اور یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ تقسیم شدہ مال سارا ذکر کیا جائے گا یا خاص مقدار جس میں تقسیم ہوا۔

ہاں اگر وہ مطلق طور پر ہو جس طرح کہ کہا جائے درہم تقسیم کردو اور اس سے مراد یہ لی جائے کہ جو کمایا ہے تو معنی اس طرح نہ ہوگا‘ کیونکہ آیت دوسرے معنی میں ہے نہ کہ پہلے میں۔اس بنا پر جس نے ایسے لوگوں سے کہا جو بہت زیادہ مال معین مقدار میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں کہ تم دو دو‘ تین تین‘ چار چار میں تقسیم کرو‘ تو انہوں نے کچھ مال لوگوں کے مابین دو دو اور کچھ مال تین تین اور کچھ مال چار چار کرکے تقسیم کیا‘ تو یہ معنی عربی لغت کے موافق ہوگا۔

یہ بات بھی معلوم ہے کہ اگر کوئی کہنے والا کہے: "جآء فی القوم مثنیٰ وهم مائة الف" میرے پاس ایک لاکھ افراد آئے دو دو کی ٹولیوں میں‘ تو اس کا معنی یہی ہوگا کہ وہ دو دو کرکے آئے اور جاء علی القوم ثلاث وزباع اسی طرح کہ لوگ میرے پاس تین تین اور چار چار کی ٹولیوں

میں آئے'' کا مفہوم و معنی بھی یہی ہوگا اور یہاں لفظ جمع سے خطاب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ خطاب ہر ایک آدمی سے ہے۔ جس طرح اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وغیرہ۔

فرمان الٰہی: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ۔

''عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کرلو دو دو' تین تین' چار چار سے۔''

تاکہ تم میں سے جس کو جو عورت اسے اچھی لگے وہ نکاح کرلے دو دو' تین تین یا چار چار سے۔ یہی معنی عربی لغت کا متقاضی ہے۔ اس سے یہ آیت ان کے خلاف دلیل ہے جو اس موقف کے خلاف اس سے دلیل لیتے ہیں۔ اس بات کی تائید اس آیت کے آخری جملہ سے ہوتی ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔ اگر تم انصاف کرنے سے ڈرو تو پھر ایک عورت سے شادی کرو۔

اگرچہ یہاں خطاب تمام لوگوں سے ہے لیکن یہ ہر ایک فرد سے خطاب کے برابر ہے' پس سب سے مناسب بات یہ ہے کہ چار سے زائد شادیاں کرنے کی حرمت پر سنت سے دلیل لی جائے نہ کہ قرآن سے' ہاں کچھ لوگوں نے اس آیت سے (۹) نو نکاح کرنے جائز قرار دیئے ہیں اس اعتبار سے کہ واو جمع کرتی ہے گویا کہ اس نے کہا اس مذکورہ پوری تعداد سے نکاح کرلو تو یہ ان کی عربی لغت سے جہالت اور عدم تعلق کی دلیل ہے۔

ان کا یہ استدلال اس وقت درست ہوسکتا تھا کہ جب عبارت اس طرح ہوتی، ''انکحوا اثنین وثلاثا واربعا'' کہ اللہ تعالیٰ فرماتا کہ دو سے اور تین سے اور چار سے نکاح کرو تو اس قول کی توجیہ ہوسکتی تھی' ہاں انصاف کا تذکرہ کرکے یہ امکان بھی زائل کردیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہاں واوَ جمع والی استعمال فرمارہے ہیں اور لفظ ''او' جو کہ تخییر کیلئے ہے اسے استعمال نہیں فرمایا کیونکہ اختیار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعداد میں سے دوسروں کے علاوہ ایک ہی جائز ہے اور یہ نظم قرآنی کے مطابق نہیں۔ یعنی اگر تمہیں انصاف نہ کرنے کا خطرہ ہو تو پھر ایک عورت سے ہی نکاح کرلو اور اس وقت اصل عبارت یہ ہوگی ''فانکحوا واحدة'' جیسا کہ ''فانکحوا ماطاب لکم'' اس پر دلالت کرتا ہے' بعض کا خیال ہے ''الزموا واحدة'' یا ''اختاروا واحدة''، یعنی ایک کو لازم پکڑلو یا ایک پسند کرلو۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔ ''لیکن اگر تمہیں برابری نہ کرسکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے۔''

پہلا معنی زیادہ مناسب ہے' معنی یہ ہوا کہ اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم اپنی بیویوں کے درمیان حقوق وغیرہ کی تقسیم میں عدل نہ کر سکو گے تو ایک سے ہی نکاح کرو۔ یعنی جو انصاف نہ کرنے کا خوف رکھتا ہو' تو اسے ایک سے زائد کرنے سے روکا گیا ہے۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ "یا تمہاری ملکیت کی لونڈی۔"

غلاموں میں سے اگر چہ ان کی تعداد کسی قدر ہو جیسا کہ ما موصولہ اس مفہوم کا فائدہ دے رہا ہے جبکہ ان کے وہ حقوق نہیں ہوتے جو آزاد بیویوں کے ہوتے ہیں' ان سے نکاح کرنے کا معنی ملکیت کی صورت میں ہے نہ کہ نکاح کی صورت میں اور اس میں یہ دلیل ہے کہ لونڈیوں میں تقسیم کا کوئی حق نہیں جیسا کہ یہ دلیل ہے اس بات پر کہ جو تقسیم میں انصاف نہ کر سکنے سے خوف زدہ ہو' اور وہ ایک نکاح کرے۔

ملکیت کی نسبت دائیں ہاتھ کی اس لئے کی کہ اسی سے مال پکڑا جاتا ہے اور اسے بھی اسی سے پکڑا جائے گا اور تمام امور جو عموماً آدمی کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ ذٰلِكَ یہ معنی چار نکاح یا ایک نکاح یا صرف لونڈی رکھنا۔ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ "زیادہ قریب ہے کہ ایک طرف جھک پڑنے سے بچ جاؤ۔" یعنی یہ زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم کرو۔ عال یعول کا معنی ہے جب آدمی جھک جائے اور ظلم کرے۔

اِنْ خِفْتُمْ کا معنی ہے بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنا یہ جس کا تمہیں حکم دیا گیا زیادہ قریب ہے ظلم نہ کرنے کے' یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اَلَّا تَعْدِلُوْا کا معنی ہے کہ تمہاری اولاد زیادہ نہ ہو۔ ثعلبی کہتے ہیں کہ ان کے علاوہ کسی نے یہ نہیں کہا۔

ابن عربی نے بیان کیا کہ جب آدمی کی اولاد زیادہ ہو جائے تو کہا جاتا ہے اَعَالَ الرَّجُلَ لیکن عَالَ كَثُرَ کے معنی میں درست نہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے امام شافعی رحمہ اللہ سے پہلے یہ قول زید بن اسلم اور جابر بن زید نے کہا' یہ دونوں مسلمانوں کے امام ہیں' یہ تینوں قرآن کی ایسی تفسیر نہیں کر سکتے جس کی عربی لغت میں گنجائش نہ ہو۔ یہ بات امام قرطبی نے کسائی' ابو عمرو' الدوری' ابن اعرابی سے نقل کی ہے۔

ابو حاتم کہتے ہیں امام شافعی' ہم سے زیادہ عربی زبان جانتے تھے ممکن ہے یہ بھی ایک لغت ہو۔ دردی کہتے ہیں یہ حمیر کی لغت ہے۔ شعر پڑھو ع

وان الموت یاخذ کل حی   بلا شك وان امشی وعالا

''یعنی اگر چہ اس کی اولاد اور بھیڑ بکریاں زیادہ ہو جائیں۔''

مضمون نمبر:۲

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا۔

(النساء: ۵)

''بے عقل لوگوں کو اپنا مال نہ دے دو جس مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گذر اوقات کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے۔''

اہل علم نے ان بے عقل لوگوں کے بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ یہ کون ہے؟

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ یتیم ہیں کہ تم ان کو ان کے مال نہ دو۔ نحاس رحمہ اللہ کہتے ہیں اس آیت کے بارہ میں جو کہا گیا ان میں سب سے عمدہ بات یہ ہے۔ امام مالک کہتے ہیں یہ چھوٹے بچے ہیں یعنی انہیں اپنے مال نہ دو کیونکہ وہ ضائع کر دیں گے اور کچھ بھی باقی نہ چھوڑیں گے۔

مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں اس سے مراد عورتیں ہیں۔ نحاس وغیرہ کہتے ہیں یہ بات درست نہیں۔ عرب عورتوں کے لئے سفاۃ یا سفہات استعمال کرتے ہیں۔

مخاطب جو کہ بے عقل ہیں ان کی طرف مال کی نسبت کی وجہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی نسبت ان کی طرف اس لئے ہے کہ یہ ان کے ہاتھ میں ہے اور اسے وہ دیکھ رہے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس لئے کہ یہ ان کے مال کی جنس میں سے ہے کیونکہ مال لوگوں میں بنیادی طور پر مشترک ہوا کرتا ہے۔ ایک قول کے مطابق مخاطب لوگوں کے حقیقی مال مراد ہیں۔ یہ بات سیدنا ابوموسیٰ اشعری سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہی۔

اس حکم کا مقصد ایسے لوگوں کو دینے سے روکنا ہے جو کہ اس کا استعمال صحیح نہیں جانتے مثلاً عورتیں بچے اور جو سمجھ بوجھ کم رکھتا ہے جو نہیں جانتا کہ اس مال سے کن صورتوں سے نفع حاصل ہوگا اور وہ نقصان دہ طریقوں سے نہیں بچتا کہ وہ اس کے مال کو تباہ کر دیں گے اور ضائع کر دیں گے۔

وَ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ۔ ''ہاں انہیں اس مال سے کھلاؤ، پلاؤ، پہناؤ اوڑھاؤ۔''

یعنی ان کے لئے اس میں سے کھانا مہیا کرو اور ان کے پہننے کے لئے بھی حصہ نکالو۔ یہ حکم ان لوگوں کے بارہ میں ہے جن کا خرچ اور پہننا اس کے ذمہ ہے، یعنی بیویاں اولاد وغیرہ لیکن جس نے یہ بات کہی کہ اموال سے مراد یتیموں کے مال ہیں، تو معنی یہ ہوا کہ تم اس سے تجارت کرو

حتیٰ کہ فائدہ حاصل کرلو اور ان پر اس نفع سے خرچ کرو اور ان کے مال میں سے ان کے لئے رزق مقرر کرو جو وہ خود اپنے آپ پر خرچ کریں اور اسی سے پہنیں۔

اس آیت سے بے عقل لوگوں پر پابندی لگانے کے جواز پر استدلال کیا ہے یہی بات جمہور نے کہی۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جو بالغ و عاقل ہو جائے اس پر پابندی نہیں لگانی چاہیے۔ اس سے قرابت داروں پر خرچ کرنے کے بارہ میں بھی استدلال کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اختلاف معروف ہے جو اپنی جگہ پر مذکور ہے۔

مضمون نمبر:۳۰

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى۔ (النسآء:٦)

''یتیموں کو آزماتے رہو۔''

ابتلا کا معنی امتحان ہے' امتحان کے معنی میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وصیت کرنے والا یتیم کے با اخلاق ہونے تک کی مہلت دے تا کہ وہ اپنے ہر کام کے انجام کو معلوم کر سکے اور مال کو صحیح طریقہ سے استعمال کر سکے' تو یہ نگران مال اس وقت اسے دے جبکہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائے اور اس کے متعلق اس سے سمجھ داری کی امید ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ وہ اسے کچھ مال دے اور اسے استعمال کرنے کو کہے حتیٰ کہ اسے اس یتیم کی صحیح حالت معلوم ہو جائے' ایک قول یہ ہے کہ اس کے گھریلو خرچ میں دیکھے تا کہ اسے اس مال کے استعمال کا طریقہ دیکھ کر معلوم ہو جائے' اگر یتیم بچی ہے تو اسے اتنا مال دے کہ جو گھر والی کو گھر کے کام کاج کے لئے دیا جاتا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ۔ ''ان کے بالغ ہو جانے تک۔''

بلوغت سے یہاں سمجھ داری مراد ہے' فرمان الٰہی ہے وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ۔ (النور:٥٩) ''اور جب تمہارے بچے بلوغت کو پہنچ جائیں۔'' بلوغت کی نشانیوں میں سے چہرے پر بالوں کا پھوٹنا اور پندرہ سال کی عمر کو پہنچنا ہے۔

امام مالک اور ابوحنیفہ وغیرہ کہتے ہیں۔ احتلام کے بغیر بلوغت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ہاں اگر سترہ سال گذر چکے ہوں۔ یہ علامات مرد اور عورت کے لئے عام ہیں اور جبکہ عورت' حیض اور حمل سے خاص ہے۔

فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا۔ ''پھر اگر ان میں ہوشیاری اور حسن تدبیر پاؤ۔''
یعنی تم اچھی طرح دیکھ لو۔ اسی معنی میں یہ فرمان الٰہی ہے: اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا۔ (القصص: ۲۹) ''کوہ طور کی طرف آگ دیکھی۔'' ایک قول کے مطابق یہاں اس کا معنی ہے کہ وہ جان لے اور پالے اور رُشد اور رَشَد کے بارہ میں کہا گیا کہ یہ دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ اہل علم نے یہاں رشد کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔
ایک قول کے مطابق عقل اور دین میں درستی ہے۔ ایک قول کے مطابق خصوصاً عقل میں درستی ہے۔ سعید بن جبیر اور شعبی کہتے ہیں کہ یتیم کو مال اس وقت تک نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اس میں سمجھ داری نہ دیکھ لی جائے' اگر چہ وہ بوڑھا ہو جائے۔ ضحاک کہتے ہیں اگر چہ وہ سو سال کا ہو جائے۔
جمہور علماء کے نزدیک سمجھداری بلوغت کے بعد ہی آتی ہے اور اگر بلوغت کے بعد بھی وہ سمجھ دار نہ ہو تو اس سے پہلے والی پابندیاں ہٹائی نہیں جائیں گی۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں آزاد بالغ پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی اگر چہ وہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر فاسق ہو اور تباہی و بربادی میں بھی سب سے آگے ہو۔ یہی بات نخعی اور زفر کہتے ہیں۔ قرآنی اسلوب سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں ان کا مال اس وقت دیا جائے گا جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں' اس انتہا سے مراد نکاح کا پہنچنا ہے اور یہ انتہا عقل مندی دیکھنے کے ساتھ مقید ہے۔
تو دونوں حکم جمع کرنے ضروری ہیں' تو یتیموں کو بلوغت سے پہلے ان کے مال نہ دیئے جائیں اگر چہ ان کی عقل مندی معروف ہی ہو اور نہ بلوغت کے بعد ہاں جب تک ان میں سمجھداری اچھی طرح دیکھ نہ لی جائے۔ رشد سے اس کی خاص قسم مراد ہے جو کہ مال کے صحیح استعمال' ضائع نہ کرنے اور اسے اپنی حقیقی جگہ پر استعمال کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔
فَادْفَعُوْٓا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔ ''تو انہیں ان کے مال سونپ دو۔''
بلوغت کی حدود کو پہنچنے تک کی تاخیر کے بغیر ہی۔
وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا۔ ''اور ان کے بڑے ہو جانے کے ڈر سے ان کے اموال کو جلدی جلدی فضول خرچیوں میں تباہ نہ کرو۔''
اسراف کا لغوی معنی آگے بڑھنا اور حد سے گزرنا ہے۔ نضر بن شمیل کہتے ہیں سرف کا معنی فضول خرچی ہے اور بدار کا معنی حد سے گذرنا ہے' یعنی یتیموں کا مال فضول خرچی اور حد سے

گذرتے ہوئے نہ کھاؤ کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں۔ یا یہ معنی ہے کہ نہ کھاؤ فضول خرچی اور حد سے گذرنے کی وجہ سے یا حد سے گذرنے والے فضول خرچی کرنے والے بن کر نہ کھاؤ کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں اور تم کہو کہ ہم یتیموں کے مال جہاں چاہیں خرچ کریں اس سے پہلے پہلے کہ وہ بالغ ہو جائیں اور وہ ہمارے ہاتھوں سے چھین لیں۔

مضمون نمبر: ۴

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ۔

''مال داروں کو چاہیے کہ بچتے رہیں، ہاں اگر وہ مسکین محتاج ہو تو دستور کے مطابق واجبی طور سے کھالے''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نگران وسرپرستوں کے لئے یتیموں کے مال میں سے کیا حلال ہے اس کی وضاحت فرمائی اور غنی کو حکم دیا کہ وہ دور رہے اور بچے کو سارے کا سارا مال دیدے، اس سے کچھ بھی نہ لے جبکہ محتاج کے لئے جائز رکھا کہ اس کے مال سے دستور کے مطابق اس کے مال میں سے کھا سکتا ہے۔

اس بارہ میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے کہ اس کا کیا مفہوم ہے؟ ایک قوم کا کہنا ہے کہ جب ضرورت ہو تو قرض لے سکتا ہے اور جب آسانی سے ادا کر سکے تو ادا کر دے یہ بات سیدنا عمر بن خطاب، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، عبیدہ سلمانی، ابن جبیر، شعیب، مجاہد، ابو العالیہ اور اوزاعی نے کہی۔ نخعی، عطاء، حسن اور قتادہ کہتے ہیں محتاج اگر دستور کے مطابق کھائے تو اس پر ادائیگی نہیں یہی بات جمہور فقہاء نے کہی اور یہی قرآنی اسلوب سے زیادہ قریب تر ہے۔ کیونکہ جب اس کو کھانے کی اجازت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرض نہیں ہے۔

اور معروف سے مراد یہ ہے جو لوگوں کے درمیان دستور ہو تو وہ یتیموں کے مال سے اس قدر آسودہ نہ ہو کہ وہ کھانے، پینے اور پہننے میں تکلفات کرنے لگے اور نہ ہی خود کو فاقہ کشی اور بے پردگی کی حالت میں چھوڑ دے۔

اس آیت میں یتیموں کے ذمہ داروں سے خطاب ہے جو ان کی درستی کے ذمہ دار ہیں مثلاً باپ، دادا یا جنہیں یہ وصیت کر جائیں۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے آیت سے مراد یتیم ہے کہ اگر وہ غنی ہے تو اس پر ہاتھ کھلا رکھے اور اگر وہ فقیر ہے تو اسی قدر اس پر خرچ کرے جس قدر اسے مال

حاصل ہو۔ اور یہ قول انتہائی گرا ہوا ہے۔

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ۔ "پھر جب انہیں ان کے مال سونپو تو گواہ بنالو۔"

کہ انہوں نے تم سے مال لے لیا ہے تا کہ تم اپنے آپ سے تہمت کو دور کر سکو اور ان کی طرف سے پیش آمدہ کسی قسم کے دعویٰ سے بے خوف ہو جاؤ۔ ایک قول کے مطابق قانونی گواہی یہ ہے کہ ان کے سمجھ دار ہونے سے پہلے جو خرچ کیا اس پر گواہ بناؤ۔ ایک قول کے مطابق ان سے لئے ہوئے قرض کی واپس کے وقت گواہ بناؤ۔

قرآن کریم کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ان کا مال انہیں دیا جائے تو گواہ بنانا جائز ہے اور یہ عام ہے، عقل مندی سے پہلے کچھ مال دیا ہو یا بعد میں سارا مال دیا جائے۔ سورۂ انعام میں ہے: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ۔ (الانعام: ۱۵۲) "اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو کہ مستحسن ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔" اور سورۂ اسراء میں بھی اسی طرح آتا ہے۔

مضمون نمبر: ۵

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ (النساء: ۸)

"اور جب تقسیم کے وقت آجائیں۔"

یعنی وراثت کی تقسیم اُولُوا الْقُرْبٰى قرابت سے مراد یہاں ورثاء کے علاوہ قرابت دار ہیں۔ اسی طرح وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ یتیم اور مسکین۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ قانون بنادیا کہ جب یہ لوگ وراثت کی تقسیم کے وقت آجائیں تو ان کا بھی حصہ ہے اور تقسیم کرنے والے انہیں بھی کچھ دیں۔ ایک قوم کا موقف ہے کہ آیت تو محکم ہے اور حکم استحباب کے لئے ہے اور دوسروں کا کہنا ہے کہ یہ فرمان الٰہی يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ سے منسوخ ہے۔

یہاں پہلی بات زیادہ راجح ہے کیونکہ آیت میں مذکور قرابت دار ورثاء کے علاوہ ہیں وہ میراث کی تقسیم میں شامل ہی نہیں کہ جس وجہ سے یہ کہا جائے کہ یہ آیۃ المواریث سے منسوخ ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اُولُوا الْقُرْبٰى جو یہاں مذکور ہیں وہ وارث ہیں تو اس صورت میں

نسخ کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ورثاء کے علاوہ دوسرے قرابت داروں کو کچھ دینا واجب ہے اس قدر کے جس سے ورثاء کے دل خوش رہیں۔ یہی اس کا حقیقی معنی ہے پس اسے استحباب کی طرف قرینہ کے بغیر نہیں لے جایا جا سکتا۔ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ میں ہ ضمیر اس مال کی طرف لوٹتی ہے جو تقسیم کے لئے رکھا گیا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ جو چھوڑ دیا اس کی طرف لوٹتی ہے۔ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿﴾ ''اور ان سے نرمی سے بولو۔'' خوبصورت بات وہ ہے جس میں احسان نہ جتلایا ہو اس تھوڑا سا مال دینے میں اور اسی طرح تکلیف دہ باتیں بھی نہ ہوں۔

مضمون نمبر:۶

یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ ۔ (النساء:۱۱)

''اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے۔''

یہ اس اجمالی فرمان الٰہی لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۔ تفصیل یہ ہے ''ماں باپ اور خویش واقارب کے ترکہ میں مردوں کا حصہ بھی ہے۔''

یہ آیت دین کے ارکان میں سے ایک رکن' احکام کے ستونوں میں سے ایک ستون اور اہم ترین آیات میں سے ایک آیت ہے کیونکہ اس میں علم فرائض کے تمام اہم امور آ گئے ہیں۔ یہ علم صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذی مرتبت علوم میں سے تھا' وہ اکثر و بیشتر اس میں بحث کیا کرتے تھے اور علم فرائض سیکھنے اور سکھانے کی رغبت احادیث میں آئی ہے۔

امام حاکم اور بیہقی اپنی سنن میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرائض کا علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ مجھے تو فوت کر لیا جائے گا اور یہ علم بھی اٹھا لیا جائے گا اور فتنے ظاہر ہوں گے حتیٰ کہ دو آدمی وراثت میں اختلاف کریں گے تو ان کا فیصلہ کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔

امام حاکم ار بیہقی نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم فرائض سیکھو اور سکھاؤ کیونکہ یہ آدھا علم ہے یہ بھلا دیا جائے گا اور یہ پہلا علم ہے جو میری امت سے کھینچ لیا جائے گا۔ سیدنا عمر سیدنا ابن مسعود اور سیدنا انس رضی اللہ عنہم سے علم فرائض سیکھنے کی رغبت کے سلسلہ میں آثار مروی ہیں اور اسی طرح تابعین اور ان کے بعد ایک جماعت سے بھی اس

کی رغبت مروی ہے۔

يُوْصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۔ کا معنی ہے یعنی ان کی وراثت کے بارہ میں' اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ اس میں پوتا شامل ہے یا نہیں؟ شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجازی طور پر شامل ہے حقیقی طور پر نہیں۔ احناف کہتے ہیں کہ ان پر حقیقی معنوں میں اولاد کا لفظ بولا جاتا ہے جبکہ ان کی اپنی صلبی اولاد نہ ہو۔ اور اس بات میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ اولاد کی اولاد وراثت میں اس وقت داخل ہے جبکہ اپنی صلبی اولاد نہ ہو اور جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ اولاد کے لفظ میں اولاد کی اولاد داخل نہیں ہے) اس بات پر اتفاق ہے کہ جب صلبی اولاد نہ ہو تو پھر پوتے وارث ہوتے ہیں، البتہ اختلاف اس بات میں ہے کہ اولاد کا لفظ حقیقی اولاد کی عدم موجودگی میں دلالت کرتا ہے۔ جبکہ حقیقی اولاد موجود نہ ہو۔

پوتوں کو شامل ہے یا نہیں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ کافر اولاد بھی لفظ اولاد میں شامل ہے اسے سنت اولاد سے خارج کرتی ہے' اسی طرح عمداً قاتل بھی اس میں داخل ہے اسے بھی سنت اور اجماع خارج کرتا ہے اور اس میں ہیجڑے بھی داخل ہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں علماء کا اجماع ہے کہ ہیجڑہ پیشاب کرنے کی وجہ سے وارث ہوگا۔ اگر وہ دونوں جگہوں سے پیشاب کرتا ہے تو جہاں سے پہلے کرے گا' اس اعتبار سے اس کا حکم ہوگا اور اگر اس کی دونوں جگہوں سے پیشاب نکلتا ہے کسی ایک جگہ سے پہلے نہیں نکلتا تو اسے مذکر و مونث کے حصوں میں سے آدھا حصہ ملے گا اور ایک قول کے مطابق دو حصوں میں کم حصہ دیا جائے گا اور وہ مونث کا حصہ ہے' یہ بات یحییٰ بن آدم نے کہی اور یہ امام شافعی کا بھی قول ہے۔

یہ آیت ان احکام کی ناسخ ہے جو وراثت کے سلسلہ میں ابتدائے اسلام میں تھے مثلاً قسم اٹھا کر یا ہجرت کر کے اور عہد باندھ کر وراثت ملتی تھی ان سب کو منسوخ کر دیا۔ علماء کا اجماع ہے کہ جب اولاد کے ساتھ ایسا وارث موجود ہوتا ہے جس کا مقررہ حصہ ہے تو اسے دیا جائے گا اور جو مال باقی بچے گا وہ "للذکر مثل حظ الانثیین" یعنی دو عورتوں کے برابر ایک مرد کا حصہ کے اصول کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ اس حدیث کی وجہ سے جو صحیحین وغیرہ میں ان الفاظ کے ساتھ ثابت ہے کہ فرائض ان کے حصہ داروں کو دے دو پس جو ان حصوں سے باقی بچ جائے تو وہ زیادہ قریبی مرد کا ہے مگر یہ کہ اس کی حیثیت کو ختم کرنے والے ساتھ ہوں مثلاً ماں جائے بھائی۔

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۔ "ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔"

یہ جملہ مستأنفہ ہے اور "یوصیکم اللہ فی اولادکم" کا بیان ہے، لہٰذا اس میں منھم کا اضافہ چاہیے تھا۔

اولاد کے بارہ میں وصیت کے لئے یہ زائد جملہ ہے' تو اس میں ضمیر کو مقدر ماننا ضروری ہے جو ان ورثاء کی طرف جاتی ہو یعنی ان میں سے مرد اور اس سے مراد جب مرد اور عورتیں جمع ہوں' لیکن جب الگ الگ ہوں تو کل وراثت میں سے مرد کا سارا حصہ ہوگا اور عورت کا آدھا۔ دو یا زیادہ عورتوں کی صورت میں دو تہائی کی مستحق ہیں۔ اصل عبارت اس طرح ہوگی "للذکر منھم"

فَإِنْ كُنَّ۔ "اگر وہ"

یہاں کن کا اشارہ اولاد کی طرف ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اولاد کی طرف مؤنث ضمیر سے کس لئے اشارہ کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مونث کی ضمیر خبر ہونے کی وجہ سے لائے ہیں تو اس طرح یہ جائز ہے۔ یا پھر کن کا اشارہ بیٹیوں کی طرف ہے یا تمام اولاد کی طرف جو کہ مونث ہوں ان کے ساتھ مرد نہ ہو۔

فَوْقَ اثْنَتَيْنِ۔ "دو سے زائد۔"

یعنی وہ عورتیں دو سے زائد ہوں اس بنا پر کہ یہ نساء کی صفت ہے یا دوسری خبر ہے تو فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ،انہیں مال متروکہ دو تہائی ملے گا اور اس جگہ کے مطابق قرینہ میت پر ہی دلالت کرتا ہے۔

اسلوب قرآنی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دو تہائی بیٹیوں میں سے تین اور تین سے زیادہ کا حصہ ہے اور دو کے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں کیا اسی لئے اہل علم نے ان کے حصہ میں اختلاف کیا ہے۔

جمہور کا موقف ہے کہ اگر بھائیوں کے ساتھ یہ دو ہیں تو ان کا دو تہائی حصہ ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف ہے کہ ان کا آدھا حصہ ہے۔ جمہور نے دو بہنوں پر قیاس کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے بارہ میں فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ۔ "پس اگر بہنیں دو ہوں تو انہیں دو تہائی ملے گا" فرمایا ہے۔

جمہور علماء نے دو بیٹیوں کو دو بہنوں پر قیاس کیا ہے، کیونکہ دو بہنوں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "فان کانتا اثنتین فلهما الثلثان مما ترك" یعنی اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو دو ثلث ملے گا تو اس طرح جمہور علما نے بہنوں جبکہ وہ دو سے زیادہ ہوں' اگر دو تہائی میں شریک کرنے کے لئے بیٹیوں کے ساتھ ملایا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ آیت میں ایسی دلیل موجود ہے کہ دو بیٹیوں کو دو تہائی دیا جائے' اس طرح

کہ بھائی کے ساتھ ایک بیٹی کا ایک تہائی ہے تو جب وہ دو بیٹیاں ہی ہوں گی تو دو تہائی ہو گا۔ اسی لئے اسماعیل بن عیاش اور مبرد نے اس سے دلیل لی ہے۔

نحاس کہتے ہیں یہ دلیل اہل بصیرت کے نزدیک غلط ہے کیونکہ اختلاف تو اس بات میں ہے کہ جب صرف دو لڑکیاں ہوں (لڑکا کوئی نہ ہو) تو پر اس میں بھی اختلاف ہے اور مخالف آدمی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ جب دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہو تو اس وقت دو لڑکیوں کو آدھی جائیداد ملے گی، لہٰذا یہ ان کے حصہ مقرر ہونے کی دلیل ہے۔

جمہور جو دلیل لائے ہیں تو ہے اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایک بیٹی کے لئے نصف مقرر کیا جبکہ وہ اکیلی ہو وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۔ اور جب صرف دو بیٹیاں ہوں تو ان کا حصہ ایک سے زائد رکھا ہے اور قیاس دو بیٹیوں کو دو بہنوں پر اعتماد کرتے ہوئے دو تہائی دینے کو لازم کرتا ہے۔ (یہ بات زیادہ واضح اور راجح ہے، اس لیے کہ احادیث کی کتب میں قیاس کے علاوہ سیدنا سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی کا واقعہ اس بات کی تائید کرتا ہے جبکہ دیگر آئمہ کے پاس کتاب وسنت سے کوئی تائید ثبوت نہیں ہے۔)

ایک قول کے مطابق فَوْقَ زائد ہے۔ تو معنی یہ ہوا: اگر وہ دو عورتیں ہوں۔ جس طرح فرمان الٰہی ہے فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ "تو تم گردنوں پر مارو۔"

یعنی گردنوں کو مارو۔ یہ نحاس اور ابن عطیہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے اس لئے کہ ظروف اور تمام اسماء کلام عرب میں بغیر معنی کے زائد نہیں ہوتے۔ ابن عطیہ نے کہا کہ فوق الاعناق هى فصيح ہے اور فوق کا لفظ زائد نہیں بلکہ محکم غیر زائد ہے کیونکہ گردن پر مارنا جوڑ کی ہڈیوں پر مارنا ہے نہ کہ دماغ پر، اور اگر لفظ فوق زائد مانا جائے جیسا کہ کچھ علماء کا خیال ہے تو پھر عبارت یہ ہونا چاہیے تھی "فلهما ثلثا ماترك"، یعنی ان دونوں کیلئے کل ترکہ کا دو تہائی ہو گا اور وہاں فلهن نہ ہوتا۔

سب سے واضح بات یہ ہے جس سے جمہور دلیل لیتے ہیں جسے ابن ابی شیبہ، احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابویعلی اور ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے اپنی سنن میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ سیدنا سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سیدنا سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی یہ دو بیٹیاں ہیں، ان کے والد جنگ احد میں شہید ہو گئے، ان کے چچا نے ان کا سارا مال لے لیا ہے، اور ان کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑا جبکہ

بغیر مال کے ان کے ساتھ کوئی نکاح بھی نہیں کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ میں فیصلہ فرمایا ہے پس وراثت کی آیت نازل ہوئی یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ ۔ آپ ﷺ نے ان کے چچا کی طرف پیغام بھیجا اور کہا کہ سعد رضی اللہ عنہ کی دونوں بیٹیوں کو دو تہائی دو اور ان کی والدہ کو آٹھواں حصہ دو جو باقی رہ جائے وہ تمہارا ہے۔ انہوں نے کئی سندوں سے عن عبداللہ بن محمد بن عقیل، عن جابر سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ راوی صرف اسی حدیث سے ہی معروف ہے۔ (اس سے دوسری کوئی بھی حدیث مروی نہیں)

وَلِاَبَوَیْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۔ ''اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے۔''

ابوین سے مراد ماں اور باپ ہیں، لفظ اب کو تثنیہ تغلیباً لائے ہیں۔ اہل علم نے دادا کے بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ کیا وہ باپ کے مرتبہ پر ہے؟ وہ بھائیوں کی موجودگی سے ساقط ہوتا ہے یا نہیں؟ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف ہے کہ دادا باپ کے مرتبہ پر ہے ان کے دور خلافت میں کوئی صحابی رضی اللہ عنہ ان کا مخالف نہیں تھا۔ آپ کی وفات کے بعد لوگوں نے اختلاف کیا۔ سیدنا ابن عباس، سیدنا عبداللہ بن زبیر، ام المومنین سیدہ عائشہ، سیدنا معاذ بن جبل، سیدنا سیدنا ابی بن کعب، سیدنا ابودرداء، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہم اور عطاء، طاؤس، حسن، قتادہ، ابوحنیفہ، ابوثور اور اسحٰق: مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرَاهِیْمَ اور یَا بَنِیْٓ آدَمَ اور آپ ﷺ کا فرمان: اِرْمُوْا یَا بَنِیْٓ اِسْمَاعِیْلَ ''اے اسماعیل کے بیٹو تیر پھینکو۔''

سیدنا علی بن ابی طالب، سیدنا زید بن ثابت اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہم دادا کے ساتھ سگے بھائی یا باپ جائے بھائیوں کو بھی وراثت کا حق دار ٹھہراتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک تہائی سے کمی نہیں کرتے اور نہ ہی مقررہ حصہ والوں سے چھٹے حصہ سے کمی کرتے ہیں زید امام مالک، اوزاعی، ابو یوسف، محمد اور امام شافعی۔

ایک قول یہ ہے کہ حصہ داروں وغیرہ کے ساتھ دادا اور بھائی چھٹے حصہ میں مشترک ہوں گے یہ ابن ابی لیلی اور ایک جماعت کا قول ہے۔ جبکہ جمہور کا موقف ہے کہ دادا بھائی کے بیٹوں کی موجودگی میں ساقط ہو جائے گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ انہوں نے تقسیم کے وقت بھائی کے بیٹوں کو بھائی کے مرتبہ پر رکھا ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ دادا باپ کی موجودگی میں کچھ بھی وراثت کا

حق دار نہیں' اس بات پر بھی اجماع ہے کہ نانی چھٹے حصہ کی حق دار ہے جبکہ میت کی والدہ نہ ہو اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ ماں کی موجودگی میں نانی ساقط ہو جائے گی اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ باپ نانی کو ساقط نہیں کر سکتا اور علماء نے نانی اور اس کے زندہ بیٹوں کی وراثت کے بارہ میں اختلاف کیا ہے۔

سیدنا زید بن ثابت اور سیدنا عثمان بن علی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ وہ وراث نہیں ہوگی یہی بات مالک' ثوری' اوزاعی' ابو ثور اور اصحاب رائے نے کہی۔ سیدنا عمر' سیدنا ابن مسعود اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ وہ اس کے ساتھ وارث ہوگی' یہی موقف سیدنا علی اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما کا ہے۔ یہی بات شریح جابر بن زید عبید اللہ بن الحسن' شریک' احمد' اسحٰق اور ابن منذر نے کہی۔

مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ۔ "اس کے چھوڑے ہوئے مال سے اگر اس کی اولاد ہو۔"

اولاد کا لفظ مذکر و مونث دونوں پر بولا جاتا ہے لیکن جب اولاد میں مذکر ہی موجود ہوں یا ان کے ساتھ کوئی مونث بھی ہو تو دادا کے لئے سوائے چھٹے حصہ کے کچھ نہیں اگر صرف مونث ہے تو دادا چھٹا حصہ فرض کے اعتبار سے اور باقی عصبہ ہونے کے اعتبار سے لے جائیگا اور میت کی اولاد کی اولاد میت کی اولاد کی طرح ہے۔

فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ۔ "اور اگر اس کی اولاد نہ ہو۔"

یعنی اس کے بیٹوں کی اولاد نہ ہو' جیسا اس پر اجماع گذر چکا ہے۔

وَّ وَرِثَهُ أَبَوَاهُ۔ "اس کے ماں باپ وارث ہوں۔"

ورثاء باقی تمام کے علاوہ صرف وہی ہوں جیسا کہ جمہور کا موقف ہے کہ ماں ترکہ میں سے ایک تہائی نہیں لے سکتی سوائے اس بات کے کہ جب میت کے وارث والدین کے علاوہ کوئی نہ ہوں' ہاں اگر ان کے ساتھ خاوند بیوی میں سے کوئی ہو تو ماں کے لئے خاوند بیوی کے بعد باقی میں سے ایک تہائی ملے گا۔ فرمان الٰہی ہے فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ۔ "تو اس کی ماں کے لئے تیسرا حصہ ہے۔"

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خاوند یا بیوی میں سے کسی کی موجودگی میں ماں حصہ دار ہو تو اصل مال سے ایک تہائی اسے ملے گا ہے' اس صورت میں ماں کی باپ پر فضیلت لازم آتی ہے اس صورت میں کہ خاوند بیوی میں سے کسی ایک کے ساتھ والدین موجود ہوں حالانکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ باپ ماں سے افضل ہے جبکہ خاوند و بیوی میں سے کوئی ایک ان کے ساتھ ہوں۔

(جب میت کے ورثا صرف ماں باپ ہوں تو اس وقت تمام جائیداد کی ایک تہائی ماں کا حصہ ہیا اور

بقایا تمام کا تمام باپ کا ہے، یہ افضل ہونے کی علامت اور نشانی ہے، یہاں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے بہت اچھی ہے جس کے تعلیم کرنے میں خطرہ کی کوئی بات نہیں اور قرآن حکیم بھی اسی چیز کا تقاضا کرتا ہے۔)

فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ "ہاں اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو پھر اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے"

بھائی کا لفظ سگے بھائی اور باپ یا ماں جائے بھائی سب پر بولا جاتا ہے۔ اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ دو بھائی تین یا تین سے زیادہ کے قائم مقام ہیں۔ اس سلسلہ میں کہ ماں کو تیسرے حصہ سے محروم کر کے چھٹے کی طرف لے جاتے ہیں۔ مگر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دو ایک کی طرح ہیں کہ ایک بھائی تیسرے حصہ سے چھٹے کی طرف نہیں لے جا سکتا اسی طرح دو کا حکم ہے۔ اس بات پر بھی اجماع ہے کہ دو بہنیں ہوں یا زیادہ تو وہ دو بھائیوں کی طرح ہیں۔

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ "یہ حصے اس وصیت کے بعد ہیں جو مرنے والا کر گیا ہو یا میت کے قرض وغیرہ ادا کرنے کے بعد"

اہل علم نے وصیت کو قرض سے پہلے ذکر کرنے کی وجوہات میں اختلاف کیا ہے باوجودیکہ اس بات پر اجماع ہے کہ قرض وصیت سے پہلے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں وراثت سے پہلے لانا مقصود ہے نہ کہ ان کی آپس کی ترتیب ایک قول یہ ہے کہ وصیت لازمی طور پر قرض سے کم تھوڑی ہوتی ہے تو اس کی خصوصیت کی وجہ سے مقدم کیا گیا۔ ایک قول یہ ہے چونکہ اکثر وصیت کی جاتی ہے لہٰذا اسے ہر میت کی طرف سے لازمی امر قرار دیا گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ مسکین وفقیر لوگوں کا حصہ ہے اس لئے اسے مقدم کیا گیا اور قرض کو اس لئے مؤخر کیا گیا کہ یہ قرض دار کا حصہ ہے وہ طاقت وحکومت کے ذریعہ لے سکتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ وصیت میت کی طرف سے ہوئی ہے تو اسے پہلے لایا گیا بہ خلاف قرض کے کیونکہ وہ ثابت ہے اور ادا کیا جاتا ہے اس کا ذکر ہو یا نہ ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ اسے مقدم اس لئے کیا کہ یہ وراثت کے مشابہ ہے یہ کسی چیز کے بدلہ میں نہیں لی جائے گی بعض اوقات ورثاء پر یہ دینا گراں گذرتا ہے بہ خلاف قرض کے کہ اس کو ادا کرنے میں دل مطمئن ہوتے ہیں۔ یہ وصیت اس فرمان الٰہی غَيْرَ مُضَارٍّ سے مقید ہے جس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

آبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا "تمہارے باپ

ہوں یا تمہارے بیٹے تمہیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہنچانے میں زیادہ قریب ہے۔"

ایک قول یہ ہے کہ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ کی خبر مقدر ہے اور وہ یہ ہے کہ اَلْمَقْسُوْمُ عَلَیْهِمْ اور ایک قول کے مطابق اس کی خبر لَا تَدْرُوْنَ اور جو کچھ اسکے بعد ہے اور اَیُّهُمْ کی خبر اَقْرَبُ ہے اور نَفْعًا تمیز ہے یعنی تم نہیں جانتے کہ کون تمہارے قریب ہے فائدہ کے اعتبار سے کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے اور وہ تمہاری طرف سے صدقہ کا حق دار ہو جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ "نیک بچہ جو والد کے لئے دعا کرے۔"

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن کہتے ہیں کہ بعض اوقات بچہ افضل ہوتا ہے اور جب وہ افضل ہوگا تو وہ اپنے والد کی سفارش کرے گا۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ جب بیٹا باپ سے آخرت میں درجات میں بلند ہو جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرے گا کہ اس کے باپ کو بھی بلند کرے اور اگر باپ بیٹے سے بلند ہوگا تو وہ بھی اسی بلندی کا سوال اپنے بیٹے کے لئے کرے گا۔ ایک قول کے مطابق دنیا و آخرت کا فائدہ مراد ہے' یہ ابن زید نے کہا۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ تم نہیں جانتے تمہارے باپ یا بیٹوں میں سے جنہیں تم وصیت کرو گے تمہیں زیادہ فائدہ دے سکتا ہے' تو اللہ تعالیٰ نے وصیت پوری کرنے کی وجہ سے' تمہیں آخرت کا ثواب عطا فرمایا وہ تمہارے لئے نفع کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے یا میت وصیت نہ کرے اور تمہارے لئے دنیاوی سامان زیادہ مقدار میں مہیا کر دے' اسے صاحب کشاف نے قوی و مضبوط قرار دیا ہے کہتے ہیں کیونکہ یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ جس کے درمیان آیا ہے اس کی مناسبت سے ان کی تاکید کرے۔

فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ "یہ حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں۔" یہ موکد مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ مکی وغیرہ نے کہا یہ حال ہے جو تاکید کر رہا ہے اور اس کا عامل یُوْصِیْکُمْ ہے پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیْمًا۔ "بے شک اللہ تعالیٰ پورے علم والا۔"

وراثت کی تقسیم کے بارہ میں۔ حَکِیْمًا "کامل حکمتوں والا ہے۔"

کہ اس نے تقسیم کا حکم دیا اور حصہ داروں کی وضاحت فرمائی۔

زجاج کہتے ہیں وہ جاننے والا ہے تمام اشیاء کو ان کی پیدائش سے پہلے اور حکمتوں والا ہے اس کام میں جو اس نے تقدیر میں لکھا اور جو کرتا ہے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ۔ ''تمہاری بیویاں جو کچھ (مال) چھوڑ مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھا تمہارا ہے۔''

یہاں خطاب مردوں سے ہے اور ولد سے مراد حقیقی بیٹا ہے یا بیٹے کا بیٹا جیسا کہ اس پر اجماع ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ۔ ''اور اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے چھوڑے ہوئے مال میں سے تمہارے لئے چوتھائی حصہ ہے۔''

اس پر اہل علم کا اجماع ہے اختلاف نہیں کہ خاوند کو اولاد نہ ہونے کی صورت میں آدھا حصہ اور اولاد ہونے کی صورت میں چوتھائی۔ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ۔ ''اس وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئی ہوں یا قرض کی ادائیگی کے بعد ملے گا۔'' اس پر گفتگو گزر چکی ہے۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ۔

''اور جو تم چھوڑ جاؤ اس میں ان کے لئے چوتھائی ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو پھر انہیں تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔''

یہ حصہ اولاد ہونے کی صورت میں ہے اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں اور ایک بیوی بھی اس حصہ کی مستحق ہے اور اگر ایک سے زائد بیویاں ہوں تو پھر بھی وہ اسی کی حقدار ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں' اختلاف وصیت اور قرض کی ادائیگی میں ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً۔ ''اور جس کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد کلالہ ہو۔''

الرجل سے مراد میت ہے اور يُوْرَثُ مفعول ہونے کی وجہ سے پڑھا جاتا ہے جس کا وارث ہوا نہ کہ جو وارث ہوا' یہ کان کی خبر ہے اور كَلَالَة' يُوْرَثُ کی ضمیر سے حال ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی دوسری تراکیب بھی ہیں۔ كَلَالَة تَكَلَّلَهُ سے مصدر ہے یعنی اس کو گھیر لیا، اسی وجہ سے تاج کا نام اکلیل رکھا گیا کیونکہ وہ سر کو گھیرے ہوئے ہے۔

کلالہ اس میت کو کہتے ہیں جس کی اولاد نہ اسکا ہو' اور نہ اسکا والد ہو' یہ قول سیدنا ابوبکر صدیق' سیدنا عمر' سیدنا علی اور جمہور اہل علم کا ہے۔ یہی بات کتاب العین والے اور ابو منصور لغوی ابن عرفہ قتیبی ابوعبید اور ابن الانباری نے کہی۔ ایک قول کے مطابق اس پر اجماع ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں یہی بات مدینہ کوفہ اور بصرہ والوں نے کہی' یہی قول ساتوں قاضیوں کا اور چاروں خلفاء کا ہے

اور پہلے اور بعد والے جمہور کا بلکہ تمام لوگوں کا یہی قول ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے اور اس بارہ میں مرفوع احادیث ذکر ہوئی ہیں۔

ابو حاتم اور اثرم نے ابو عبیدہ سے روایت کیا وہ کہتے ہیں کہ کلالہ وہ ہے جس کا وارث نہ باپ ہو نہ بیٹا اور نہ بھائی ہو، تو عرب کے نزدیک وہ کلالہ ہے۔ ابو عمر بن عبد البر کہتے ہیں ابو عبیدہ نے یہاں بھائی کو باپ اور بیٹے کے ساتھ ذکر کیا ہے جو کہ کلالہ کی شرط کے طور پر غلط ہے' اس کی نہ تو کوئی وجہ ہے اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی دوسرے نے اس کو بیان کیا ہے اور جو سیدنا ابو بکر و سیدنا عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کلالہ اسے کہتے ہیں جس کی بالخصوص اولاد نہ ہو تو اس موقف سے ان دونوں شیخین نے رجوع کر لیا تھا۔

ابن زید کہتے ہیں کلالہ زندہ اور مردہ سب کے لئے بولا جاتا ہے' صرف انہوں نے قرابت کا نام کلالہ رکھا ہے اس لئے کہ یہ لوگ میت کے گرد گھومتے ہیں نہ تو وہ اس میت سے ہیں اور نہ یہ میت ان سے ہے' بہ خلاف بیٹے اور باپ کے کہ وہ دونوں اس کے اطراف میں ہیں اور جب وہ دونوں چلے گئے تو نسب میں اسے کلالہ چھوڑ گئے۔ ایک قول کے مطابق کلالہ کلال سے ماخوذ ہے یہ تھکا دینے کے معنی میں ہے گویا کہ میت نے وراثت کو وارث کی طرف دور تک اور تھکا کر پہنچایا۔

ابن اعرابی کہتے ہیں کلالہ چچا کے دور والے بیٹے ہیں۔

قصہ مختصر یُوْرَثُ كَلٰلَةً پڑھنے والے کوفی ہیں اور یُوْرِثُ پڑھنے والے حسن اور ایوب ہیں' تو اس صورت میں کلالہ سے مراد قرابت ہوگا اور جو یُوْرَثُ پڑھتے ہیں یہ پڑھنے والے جمہور ہیں اس صورت میں کلالہ سے مراد میت اور قرابت دونوں کا احتمال ہے۔

سیدنا علی' سیدنا ابن مسعود سیدنا زید بن ثابت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم اور شعبی سے مروی ہے کہ کلالہ اسے کہتے ہیں جو والد اور بیٹے کے علاوہ ورثاء ہوں۔ طبری کہتے ہیں درست بات یہ ہے کہ کلالہ وہ ہیں جو بیٹے اور باپ کے علاوہ وارث ہوں۔ کیونکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں میں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے وارث کلالہ ہیں کیا میں سارا مال ختم نہ کر دوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔

عطاء سے مروی ہے' وہ کہتے ہیں کلالہ سے مراد مال ہے' ابن عربی کہتے ہیں یہ کمزور بات ہے اس کی کوئی دلیل نہیں۔ صاحب کشاف کہتے ہیں لفظ کلالہ تین پر بولا جاتا ہے۔

(۱) جو اپنے بعد نہ بیٹا چھوڑا نہ باپ۔

(۲) جس کے پیچھے رہنے والوں میں سے نہ باپ ہو نہ بیٹا۔

(۳) بیٹے اور باپ کے علاوہ کسی اور طرف سے قرابت داری ہو

اَوِ امْرَاَةٌ یہ رَجُلٌ پر معطوف ہے اور یہ ان تمام احکام کے ساتھ مقید ہے جن سے وہ مرد ہے یعنی جس کی وراثت لی جا رہی ہے وہ عورت کلالہ ہو۔

وَلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ۔ ''اور اس کا ایک بھائی ہو یا ایک بہن ہو۔''

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس جملہ کے ساتھ مِنْ اُمٍّ بھی پڑھا ہے اور عنقریب ان کا ذکر بھی آئے گا جنہوں نے یہ روایت کیا ہے فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ''تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔'' امام قرطبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں علماء کا اجماع ہے کہ بھائی سے مراد یہاں ماں جائے بھائی ہیں، مزید فرماتے ہیں کہ اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ سگے اور باپ جائے بھائی کی وراثت اس طرح نہیں ہے، اس لئے ان کا اجماع دلیل ہے کہ مندرجہ ذیل فرمان الٰہی میں ذکور بھائیوں سے مراد سگے اور باپ جائے بھائی ہیں۔ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۔ ''اور اگر کئی شخص اس ناطہ کے ہیں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کے لئے دو عورتوں کے مثل حصہ ہے''۔

وَلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ میں ضمیر مفرد کی لائے ہیں کیونکہ مراد ان میں سے ایک کی طرح ہے جیسا کہ اس بارہ میں عرب کی عادت چلی آئی ہے کہ جب دو نام حکم میں برابر ذکر کریں تو ان کی طرف لوٹنے والی ضمیر مفرد لایا کرتے ہیں، جیسا کہ اس فرمان الٰہی میں ہے: وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے استعانت (مدد) طلب کرو اور بے شک وہ البتہ بہت بڑی (بھاری) ہے'' اس میں وماء کی ضمیر مفرد ہے جبکہ پہلے دو چیزوں کا ذکر ہے۔ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ ''جو لوگ سونا اور چاندی خزانہ (جمع) کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے'' یہاں بھی ''ینفقونھا'' میں ھاء ضمیر مفرد ہے جبکہ اس سے پہلے بھی دو چیزوں کا ذکر ہے۔ بعض اوقات تثنیہ کی ضمیر بھی لاتے ہیں مثلاً فَاِنْ كَانَ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ ''اگر وہ ملدار ہو یا فقیر تو اللہ تعالیٰ ان کے زیادہ لائق ہے'' یہاں بھما میں تثنیہ کی ضمیر ہے۔

فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ ۔ ''اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہیں۔''

اس فرمان الٰہی کا اشارہ وَلَـــهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ کی طرف ہے' یعنی بھائی یا بہن ایک سے زائد ہو جائیں' اس طرح کہ موجود لوگ دو یا اس سے زائد ہوں' دونوں مرد ہوں یا دونوں عورتیں یا ایک مرد اور ایک عورت ہو۔ تو اسی سے استدلال کیا گیا ہے کہ ماں جائے بھائیوں میں مذکر مؤنث کی طرح ہی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان سب کو ایک تہائی میں شریک کیا ہے اور مذکر کیا ہے مؤنث پر کوئی فضیلت ذکر نہیں کی جیسا کہ بیٹوں اور سگے اور باپ جائے بھائیوں میں ذکر کی۔

امام قرطبی فرماتے ہیں یہ اجماع ہے اور آیت دلالت کرتی ہے کہ ماں جائے بھائی جب ان کے متعلق مسئلہ پورا ہو جائے تو وہ مقدم ہوں گے سگے یا باپ جائے بھائیوں سے اور یہ مسئلہ حماریہ میں ہوگا' وہ یہ ہے کہ جب فوت شدہ عورت خاوند چھوڑے اور ماں اور دو بھائی ماں جائے اور ایک بھائی سگا' تو اس صورت میں ان کو ترجیح ہوگی کیونکہ اس میں وہ شرط پائی گئی ہے جس کی موجودگی میں ماں جائے بھائی وارث بنتے ہیں جبکہ میت کلالہ ہو اور یہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے تمام حصے حق داروں کو دو اور جو باقی بچ جائے' تو وہ سب سے قریبی مرد کے لئے ہے۔ یہ صحیحین وغیرہ میں مذکورہ ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں ہم نے آیت اور حدیث کی دلالت کو اس مسئلہ پر اپنے رسالہ میں جس کا نام "المباحث الدریۃ فی المسألۃ الحماریۃ" ہے بیان کیا ہے۔ اس مسئلہ میں صحابہ اور ان کے بعد اختلاف رہا ہے جو کہ معروف ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ۔ "اس وصیت کے بعد جو کی جائے اور قرض کے بعد۔" اس پر گفتگو گذر چکی ہے۔

غَيْرَ مُضَآرٍّ "جبکہ دوسرون کا نقصان نہ کیا گیا ہو" یعنی اس طریقہ سے وصیت کی جائے کہ کسی بھی وارث کو کسی طریقہ سے نقصان نہ ہو۔ یعنی کوئی ایسی چیز مقرر کرے جو اس کے ذمہ نہیں یا ایسی وصیت کرے جس کا مقصد سوائے ورثاء کو تکلیف دینے کے اور کچھ نہ ہو' یا مطلق کسی وارث کے نام وصیت کر جائے یا وارث کے نام تو وصیت نہیں کی لیکن ایک تہائی سے زائد کر دی جسے وارث جائز قرار نہیں دیتے۔ ایسی حیلہ بازیوں سے اجتناب ضروری ہے۔

غیر مضار میں قید جو لگائی گئی ہے یہ مذکورہ وصیت اور قرض کی طرف وصیت جس سے منع کیا گیا یا ایسی ہے کہ وصیت کرنے والے کا سوائے ورثاء کو تکلیف دینے کے اور کوئی مقصد نہیں تو ایسی تمام باتیں باطل و مردود ہیں اور ایسی باتوں میں سے کوئی بھی بات قابل عمل نہیں' نہ ایک تہائی

اور نہ اس سے کم۔
امام قرطبی فرماتے ہیں علماء کا اجماع ہے کہ وصیت ورثاء کے لئے جائز نہیں۔ تکلیف نہ دینے کی قید ان تمام احکام کے متعلق ہے جو وصیت اور قرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہیں۔ ابوالسعود اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں اس جگہ بالخصوص قید اس لئے ہے کہ وارث گمان کرتے ہیں کہ میت ان کے حق میں کوتاہی کرے گی۔
وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ۔ ''یہ مقرر کیا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔''
یہ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی تمہیں اس بات کی وصیت کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ بھی درست ہے کہ اس میں مضار کو عامل تسلیم کیا جائے تو معنی یہ ہوا کہ اس کے ساتھ تکلیف ہوگی یا اس سبب سے ہوگی اس لئے اس کو مختصرا ذکر کیا اور وصیت اس بنا پر اس کا مفعول ہوگا کیونکہ اسم فاعل ذوالحال کو قرار دیا یا معنوی اعتبار سے منفی ہونے کی وجہ سے۔ حسن نے وَصِيَّةٍ مِّنَ اللّٰهِ پڑھا ہے اسم فاعل کی اس کی طرف اضافت کی وجہ سے جیسا کہ یہ شعر ہے۔ یا سارق اللیلة اهل الدار
وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ۔ ''اور اللہ تعالیٰ دانا ہے بردبار۔''
اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اس وصیت کے کرنے میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں ان مذکورہ تفاصیل کے ساتھ فرائض کے بارہ میں وصیت فرمائی ہے اور جو بھی وصیت ان تفاصیل کے خلاف ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی وصیت ان پر مقدم ہوگی، جیسے وہ وصایا کہ جن میں بعض ورثاء کو بعض پر فوقیت دی گئی ہو یا ایسی کوئی بھی وصیت کہ جو ان کو کسی بھی طرح کی تکلیف اور نقصان دینے کے لیے کی گئی ہو۔
تکلیف کے بڑا گناہ ہونے کے بارہ میں وصیت پر مشتمل بہت سی احادیث آتی ہیں۔ سیدنا ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اسے نسائی بیہقی ابن جریر اور ابن منذر وغیرہ نے ان سے روایت کیا اور اس کی سند کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔
بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک آدمی ستر سال تک نیک لوگوں جیسے اعمال کرتا ہے جب وہ وصیت کرنے لگتا ہے تو اس میں ظلم کرتا ہے۔ تو اس کا خاتمہ برے اعمال پر ہوتا ہے اور وہ آگ میں چلا جاتا ہے اور بے شک آدمی ستر سال برے اعمال کرتا ہے اور اپنی وصیت میں انصاف کرتا ہے تو اس کا خاتمہ اچھے اعمال پر ہوتا ہے اور

وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔" پھر ابو ہریرہ فرماتے ہیں اگر تم چاہو تو یہ فرمان الٰہی پڑھ لو۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○

عبد بن حمید، احمد، ابوداؤد ترمذی (ترمذی نے اسے حسن کہا ہے) ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔اس حدیث کے الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔

اس کی سند میں شہر بن حوشب راوی ہے جسے امام احمد اور ابن معین نے ثقہ قرار دیا ہے۔امام نسائی فرماتے ہیں یہ قوی نہیں ابو حاتم کہتے ہیں یہ اس (اعلیٰ) درجہ کا نہیں۔ابن عون کہتے ہیں محدثین نے اسے چھوڑ دیا تھا۔

فائدہ: قاضی محمد بن علی الشوکانی رحمہ اللہ اپنی مختصر الدرر البھیہ نامی کتاب میں وراثت کے مسئلہ میں فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ کتاب عزیز میں بالتفصیل مذکور ہے' تو لازم ہے کہ ذوی الفروض سے ابتداء کی جائے کہ جن کا حصہ مقرر ہے جو باقی (بچ) رہ جائے اور وہ عصبہ کے لئے ہے' بیٹیوں کے ساتھ بھائی عصبہ ہوتے ہیں اور پوتی بیٹی کے ساتھ چھٹے حصہ کی حق دار ہے جو دو تہائی پر مشتمل ہوگا' اسی طرح باپ جائی بہن' سگی بہنوں کے ساتھ اور ایک یا زیادہ نانی دادی کو ماں کی عدم موجودگی میں چھٹا حصہ ملے گا اور یہی حصہ دادا کا ہے ان لوگوں کے ساتھ جن کی موجودگی سے یہ ساقط نہیں ہوتا۔

بھائیوں اور بہنوں کے لئے بیٹے یا پوتے کی موجودگی میں کوئی حصہ نہیں۔اور جب وہ دادا کے ساتھ آئیں تو اس میں اختلاف ہے اور دادا بیٹیوں کے ساتھ وارث ہوں گے سوائے ماں جائے بھائیوں کے۔سگے بھائیوں کے ہوتے ہوئے باپ جایا بھائی ساقط ہو جائے گا۔رشتہ دار آپس میں وارث ہوتے ہیں اور یہ بیت المال سے زیادہ مقدم ہیں اور اگر فرائض آپس میں ٹکرا جائیں (کمی ہو جائے) تو عول ہوگا۔

لعان کرنے والی بدکار کا بیٹا اپنی ماں کا ہی وارث ہوگا اور اس کے قرابت داروں کا اسی طرح اس کے برعکس حکم ہوگا اور بچہ وارث نہ ہوگا جب تک کہ وہ چیخ نہ مارے اور آزاد شدہ غلام کی وراثت آزاد کرنے والے کو ملے گی' اس میں عصبہ ساقط ہو جائیں گے' حصہ داروں کو حصہ ملنے کے بعد باقی سارا مال اسی کا ہوگا۔ولاء اور ہبہ کو فروخت کرنا حرام ہے اور آپس میں دو مذہب والے وارث نہ ہوں گے اور نہ قاتل مقتول کا وارث ہوگا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ اس کی شرح جو "الدراری المضیۃ" ہے اس میں فرماتے ہیں: جان لو! کہ وراثت بالتفصیل کتاب عزیز میں معروف ہے ہم یہاں اسے ذکر نہیں کریں گے ہم صرف اسے ذکر کرنے پر اکتفاء کریں گے جو سنت اور اجماع سے ثابت ہے اسی طرح ہم وہ باتیں بھی ذکر نہیں کریں گے جن کی سوائے آراء کے کوئی سند نہیں جیسا کہ ہمارا اس کتاب میں اسلوب چلا آرہا ہے۔

تو یاد رہے کہ صرف رائے اس قابل نہیں کہ اسے لکھا جائے کیونکہ ہر عالم کی ایک رائے ہے اور اجتہاد دلیل کے بغیر کی ہوتا ہے اور بعض اہل علم کا اجتہاد دوسروں پر دلیل نہیں ہوسکتا اور جب تو یہ بات پہچان گیا تو جو کچھ کتاب عزیز میں ہے اور جو ہم نے یہاں علم فرائض جو کہ کتاب وسنت سے ثابت ہیں اس تمام کو تیرے لئے جمع کر دیا ہے اگر تجھے کوئی ایسی بات پیش آئے جو ان میں نہیں تو پھر سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے۔ اپنی رائے پر اجتہاد کر کے عمل کر۔

مضمون نمبر: ۷

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ۔ (النساء:۱۹)

"ایمان والو!"

آیت کا معنی اس کے شان نزول سے واضح ہوتا ہے اسے امام بخاری وغیرہ رحمہم اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ جو کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے رشتہ دار اس کی بیوی کے زیادہ حق دار ہوتے اگر وہ چاہتے تو یہ عورت ان میں سے کسی سے نکاح کرتی اور اگر چاہتے تو اس کی شادی کر دیتے اور نہ چاہتے تو نہ کرتے یہ اس کے گھر والوں سے زیادہ حق دار تھے تو بس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ ابوداود میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی آیت کے بارہ میں الفاظ اس طرح ہیں۔

آدمی اپنے قرابت دار کی بیوی کا وارث ہوتا تو وہ اسے موت تک اسی طرح چھوڑے رکھتا یا یہ کہ وہ عورت اپنا حق مہر اسے لوٹا دے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم کے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں کہ اگر وہ خوبصورت ہوتی تو یہ اس سے نکاح کر لیتے اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو اسے روک لیتے حتی کہ جب وہ بھی فوت ہو جاتی تو یہ اس کے وارث ہوتے۔ یہ شان نزول مختلف الفاظ سے مروی ہے۔

لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ "تمہیں حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بنو۔"

اور نہ یہ تمہارے لئے حلال ہے کہ تَعْضُلُوْهُنَّ "تم انہیں روک رکھو" اس بات سے کہ کوئی تمہارے علاوہ اس سے نکاح کرے۔ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ "جو تم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے کچھ لے لو۔" یعنی جب وہ فوت ہوں تو ان کی وراثت تم لو یا جب تم انہیں نکاح کی اجازت دو تو وہ تمہیں اپنا مہر واپس کریں۔

زہرہ اور ابومجلز کہتے ہیں' عربوں کی یہ عادت تھی کہ اگر ان میں کوئی آدمی فوت ہو جاتا اور اس کی بیوی زندہ ہوتی تو اس میت کا بیٹا (جو اس بیوی سے نہیں) یا اس کے قریبی عصبہ میں سے کوئی اپنا کپڑا اس عورت پر ڈال دیتا تو یہ شخص خود اس سے اور اس کے اولیاء سے زیادہ حق دار ہوتا' اب اگر وہ چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا صرف اس مہر کے بدلہ میں جو اسے میت نے دیا تھا اور اگر چاہتا تو اس کے علاوہ کسی دوسرے سے نکاح کرا دیتا اور اس کا مہر خود لے لیتا اور اس عورت کو کچھ نہ دیتا اور اگر چاہتا تو روک رکھتا تا کہ وہ عورت اسے میت سے ملنے والی وراثت فدیہ میں دے یا وہ عورت خود فوت ہو جائے اور یہ اس کا وارث بن جائے' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ایک قول کے مطابق یہ خطاب عورتوں کے خاوندوں سے ہے جبکہ وہ انہیں برے طرز زندگی سے اس لالچ میں روک رکھیں کہ ان کی میراث ملے گی یا وہ اپنا کچھ مہر انہیں بطور فدیہ دیں۔

اسے ابن عطیہ نے پسند کیا اور کہا اس بات کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ "ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ کوئی کھلی برائی اور بے حیائی کریں۔" اور جب وہ بے حیائی کا ارتکاب کرے تو سرپرست کے لئے جائز نہیں کہ اسے روک رکھے تا کہ اس کا مال کے حق دار بن سکے' اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ یہ حکم صرف خاوند کو ہے۔

حسن کہتے ہیں جب غیر شادی شدہ لڑکی زنا کرے تو اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور اسے شہر بدر کیا جائے گا اور جو کچھ اس نے خاوند سے لیا ہے وہ اس کے خاوند کو دلایا جائے گا۔ ابو قلابہ کہتے ہیں جب آدمی کی بیوی بدکاری کرے تو کوئی حرج نہیں کہ یہ اس پر سختی کرے اور مشقت میں مبتلا کرے تا کہ وہ اسے فدیہ دے۔ اسدی کہتے ہیں جب یہ ایسا کریں تو ان سے ان کے مہر واپس لے لو۔ ایک قول ہے کہ بے حیائی کی مرتکب عورت سے مراد بد زبان اور گھریلو معاملات میں بری عورت ہے خواہ یہ کام زبانی ہوں یا عملی۔

امام مالک اور اہل علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے خاوند کے لئے جائز ہے کہ ایسی عورت جو بد دماغ ہو اس کی تمام ملکیت لے لے یہ سب حکم اس بناء پر ہیں فَـلَا تَعْضُلُوْهُنَّ میں خطاب خاوندوں سے ہے۔ آپ یہ معلوم کر چکے ہیں جو ہم نے اس کا شان نزول پہلے ذکر کیا کہ فَـلَا تَعْضُلُوْهُنَّ میں خطاب اس شخص کو ہے جسے لَا يَحِلُّ لَـكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا میں خطاب کیا گیا' تو معنی یہ ہوگا کہ تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم ان عورتوں کو اس لئے نکاح سے روکو تا کہ جو تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لے لو یعنی جو مال ان کے پاس وراثت کے نام پر آئے' سوائے اس کے کہ وہ عورتیں کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں' تو اس صورت میں تمہیں جائز ہے کہ کہیں دوسری جگہ نکاح کرنے سے انہیں روک رکھو۔

اس کلام میں کس قدر تکلف ہے یہ کسی سے پوشیدہ نہیں باوجود اس کے کہ ایسی بے حیاء عورت کو روکنا جائز نہیں اس بات سے کہ وہ کہیں دوسری جگہ نکاح کرلے اور زنا سے مال دار ہو یہ درس ہے۔ اسی طرح انہوں نے اس فرمان الٰہی وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ کو سرپرستوں سے خطاب قرار دیا ہے اس کلام میں بھی تکلف ہے اور اسی طرح انہوں نے لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا کو خاوندوں سے خطاب قرار دیا اس میں بھی تکلف ظاہر ہے حالانکہ یہ آیت کے شان نزول کے مخالف بھی ہے جو ہم ذکر کر آئے۔

سب سے مناسب بات یہ ہے کہ کہا جائے لَا يَحِلُّ لَـكُمْ میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے یعنی اے مسلمانوں کی جماعت! تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم اپنی بیویوں کو روک رکھو یعنی اپنے پاس ہی روک لو باوجود اس کے کہ تمہیں ان میں کوئی رغبت و خواہش نہیں بلکہ تمہارا مقصد یہ ہے کہ تم نے جو مہر انہیں دیا ہے جب وہ واضح بے حیائی کا ارتکاب کریں تو پھر تمہارے لئے جائز ہے کہ جو تم نے انہیں دیا اس میں سے کچھ لے کر۔ ان سے خلع کرلو۔

مضمون نمبر: ۸

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (النساء: ۱۹)

''ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بودوباش رکھو۔''

معروف کا معنی اس شریعت اور اس کے ماننے والوں کے نزدیک اچھی طرح زندگی گذارنا ہے۔ یہ خطاب خاوندوں سے یا ان سے جو ان کی نسبت زیادہ عام ہیں۔ یہ حکم خاوند کی حیثیت

مختلف ہونے کے مطابق مختلف ہوگا اس کے غنی اور فقیر ہونے کے اعتبار سے اور اس کے اعلیٰ اور گھٹیا ہونے کے اعتبار سے ہے۔

فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ۔ "گو تم انہیں ناپسند کرو۔"

کسی بھی وجہ سے ہو مگر بے حیائی اور نافرمانی کی وجہ سے نہ ہو فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا "تو بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت ہی بھلائی کر دے۔"

یعنی ممکن ہے کہ اللہ پاک اس معاملہ کو اس سمت چلا دیں جسے تم پسند کرتے ہو اور تمہاری ناپسندیدگی دور کر کے اور اسے محبت میں بدل دیں تو اس میں زیادہ وقت تک اکٹھا رہنے اور اولاد کے حصول کا بہت فائدہ ہے۔

اس صورت میں قانونی اعتبار سے جزاء محذوف مانی جائے گی جس پر اس کی علت کے ساتھ دلالت کی جاتی ہے ان کرھتموھن فاصبروا ولا تفارقوھن بمجرد ھٰذہ النفرۃ فعسی ان تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا یعنی اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو صبر سے کام لو تم صرف اس نفرت کی بنا پر ان سے علیحدگی نہ کرلو ممکن ہے تم ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت فائدہ رکھ دیں۔ ایک قول کے مطابق اس آیت میں بیوی کے ناپسند ہونے کے باوجود روک رکھنے میں استحباب کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ جب وہ اس کے ساتھ رہنے کو ناپسند کرے گا اور اس ناپسندیدگی کو ثواب کی خاطر برداشت کرے گا اور اس پر خرچ کرتا رہے گا اور اس کے ساتھ اچھی طرح زندگی گذارے گا تو یہ دنیا میں اچھی تعریف کا مستحق ہوگا اور آخرت میں بے پناہ ثواب کا حق دار ہوگا۔

مضمون نمبر: ۹

وَإِنْ أَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا۔ (النساء: ۲۰)

"اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا ہی چاہو اور ان میں سے کسی کو تم نے خزانے کا خزانہ دے رکھا ہو۔"

زوج سے مراد بیوی ہے۔ قنطار سے مراد بہت زیادہ مال ہے اس میں دلیل ہے کہ مہر میں بہت زیادہ مال دیا جا سکتا ہے فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا "تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو۔" ایک قول

کے مطابق یہ آیت محکم ہے اور ایک قول کے مطابق یہ سورۂ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت سے منسوخ ہے: وَلَا تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْئًا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔ ''سب سے مناسب بات یہ ہے کہ دونوں ہی محکم اور غیر منسوخ ہیں یہاں سے خلع کرنے والی عورت کے علاوہ مراد ہے' تو اس کے خاوند کے لئے جائز نہیں کہ جو اس نے اسے دیا ہے اس میں سے کچھ بھی لے۔''

مضمون نمبر: ۱۰

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ (النساء: ۲۲)

''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں۔''

اس دستور سے روکا ہے جس پر جاہلیت کے لوگ تھے کہ جب باپ فوت ہو جاتا تو وہ ان کی بیویوں سے نکاح کر لیتے۔ یہاں سے ان نکاحوں کا بیان شروع ہو رہا ہے کہ کن عورتوں سے نکاح حرام ہے اور کن عورتوں سے حرام نہیں۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ''مگر جو گذر چکا۔'' یہ استثناء منقطع ہے تو معنی یہ ہوگا لیکن جو جاہلیت میں گذر چکا اس سے اجتناب کرو اور اسے چھوڑ دو۔ ایک قول کے مطابق الا بعد کے معنی میں ہے یعنی جو گذر چکا اس کے بعد۔ ایک قول کے مطابق ''اور وہ بھی نہیں جو گذر چکا۔ ایک قول کے مطابق اس فرمان الٰہی مَا نَكَحَ آبَاءُكُمْ سے استثناء متصل ہے۔ یہ حرمت میں مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے اس اعتبار سے کہ کلام کو ایک محال تعلیق کی طرف لے جاتی ہے' اس معنی میں کہ اگر ممکن ہو کہ تم گذشتہ سے نکاح کر سکو تو نکاح کرو' اس کے علاوہ تمہارے لئے حلال نہیں۔

عبدالرزاق ابن ابی شیبہ' احمد' حاکم اور بیہقی نے اپنی سنن میں سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی' وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے ماموں سے ملا ان کے ہاتھوں میں ایک جھنڈا تھا' میں نے ان سے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ فرمانے لگے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے اس آدمی کی طرف جس نے اپنے باپ کی بیوی سے اس کے فوت ہونے کے بعد نکاح کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کی گردن اڑا دوں اور اس کا مال ضبط کر لوں۔

پھر اس اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ نے اس منع کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَسَآءَ سَبِیْلًا۔ کہ یہ بے حیائی کا کام' بغض کا سبب اور بڑا ہی برا راستہ ہے۔ یہ تینوں

صفات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ سخت ترین حرام اور انتہائی قبیح حرکت ہے' اسے جاہلیت میں لوگ ''نکاح المقت'' کے نام سے جانتے تھے' وہ یہ تھا کہ آدمی اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لے اس کے فوت ہونے یا اس کے طلاق دینے کے بعد اسے ضیزن بھی کہا جاتا تھا اور مقت کا اصل معنی عداوت (بغض) ہے۔

مضمون نمبر:۱۱

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ۔ (النساء:۲۳)

''حرام کی گئیں تم پر تمہاری مائیں۔''

یعنی ان سے نکاح کرنا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں ان عورتوں کا ذکر کیا جو حلال ہیں اور جو حرام ہیں' تو اللہ تعالیٰ نے نسب میں سے سات کو حرام قرار دیا اور چھ کو رضاعت اور سسرال میں سے حرام قرار دیا اور متواتر کو بھی بیان کیا کہ عورت اور اس کی پھوپھی' اسی طرح عورت اور اس کی خالہ کو جمع کرنا حرام ہے اور اس پر مسئلہ آئمہ کا اجماع ہے۔

نسب میں سے سات حرام عورتیں ہیں: (۱) مائیں' (۲) تمہاری لڑکیاں' (۳) تمہاری بہنیں' (۴) تمہاری پھوپھیاں' (۵) تمہاری خالائیں' (۶) بھائی کی لڑکیاں اور بہن کی لڑکیاں اور تمہاری وہ مائیں بھی تم پر حرام ہیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو۔ یہ مطلق بیان ہے اسے حدیث میں موجود احکام سے مقید کیا جاتا ہے اس اعتبار سے کہ رضاعت دو سال ہے سوائے سالم مولی ابی حذیفہ کے رضاعت کے واقعہ کے۔ (کہ یہ واقعہ انہی کے لیے خاص ہے کسی اور کے لیے نہیں)

قرآن کا ظاہری اسلوب لغوی اور شرعی اعتبار یہ ہے کہ جس پر رضاعت کا حکم ثابت ہوتا ہے تو وہاں رضاعت کا کا حکم صادق آئیگا اور رضاعت ثابت ہو جائیگی صحیح احادیث میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے پانچ مرتبہ پینے کی قید ملی ہے۔ اس مسئلہ پر بحث وتحقیق بہت طویل ہے امام شوکانی نے اپنی تصنیفات میں اس کا پوری طرح ذکر کیا ہے اور رضاعت پر بے شمار مباحث میں سے صحیح اور سچی بات کو ترجیح دی ہے۔ اس کا کچھ حصہ ہم نے بلوغ المرام کی شرح میں ذکر کیا ہے۔

وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ۔ ''اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔''

رضاعت کی بہن وہ ہے جسے تمہاری ماں نے تمہارے باپ کے پیدا کردہ دودھ سے پلایا ہو' برابر ہے کہ وہ تمہارے ساتھ یا تم سے پہلے یا تم سے بعد تمہارے بہن بھائیوں کے ساتھ دودھ

پیئے اور ماں جائی بہن وہ ہے جسے تمہاری ماں پلائے کسی دوسرے آدمی کے پیدا کردہ دودھ سے پلائے۔

وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ۔ "

اور تمہاری ساس اور تمہاری وہ پرورش کردہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں ہیں تمہاری ان عورتوں سے جن سے تم دخول کر چکے ہو۔"

رضاعت اور سسرال سے جو عورتیں حرام ہیں وہ یہ ہیں' رضاعی ماں' رضاعی بہن' بیوی کی ماں اور ربیبہ لڑکیاں اور تمہاری بہو اور دو بہنوں کو جمع کرنا' یہ چھ ہو گئیں اور ساتویں باپ کی منکوحہ اور آٹھویں عورت اور اس کی پھوپھی کو جمع کرنا۔ امام طحاوی فرماتے ہیں یہ تمام محکم ہیں جن پر اتفاق ہے' ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں اور اس بات پر اجماع ہے سوائے ان عورتوں کے جو تمہاری ایسی بیویوں کی مائیں ہیں جن سے تم نے دخول نہیں کیا۔

جمہور اسلاف کا موقف ہے کہ بیٹی سے صرف عقد کر لینے سے اس کی ماں حرام ہو جائے گی اور بیٹی حرام اس وقت ہو گی جبکہ اس کی ماں سے دخول کر لیا گیا بعض اسلاف کا کہنا ہے ماں اور ربیبہ برابر ہیں ان میں سے ہر کوئی اس وقت حرام ہو گی جبکہ دوسری کے ساتھ دخول ہو گا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس فرمان الٰہی وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ کا معنی یہ ہے کہ وہ عورتیں جن سے تم دخول کرو۔ ان کا گمان یہ ہے کہ دخول کی قید ماں اور ربیبہ دونوں کی طرف لاحق ہے یہ بات خلاس نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور یہ سیدنا ابن سیدنا عباس' سیدنا جابر' سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہم' ابن زبیر اور مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں۔ خلاس کی سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت دلیل کے قابل نہیں اہل الحدیث کے نزدیک اس کی روایت درست نہیں اس کی نسبت جماعت کا قول درست ہے اور ان کے قول کا جواب یہ دیا گیا کہ ماں اور ربیبہ کی طرف دخول کی قید کو لوٹانا اعراب کے اعتبار سے جائز نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب دو خبروں کے عامل مختلف ہوں تو ان کی صفت ایک نہیں ہوتی پس نحویوں کے نزدیک اس طرح جملہ کی ترکیب جائز نہیں کہ مررت بنسائك وھربت نساء زید الظریفات۔ اس بنا پر کہ الظریفات دونوں کی صفت ہو۔ پس اسی طرح آیت میں بھی یہ جائز نہیں الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ دونوں کی طرف لوٹے کیونکہ خبریں مختلف

ہیں۔

ابن منذر کہتے ہیں جمہور کا قول درست ہے اس لئے کہ تمام عورتوں کی مائیں اس فرمان الٰہی میں داخل ہیں ﴿أُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ﴾ اور جمہور کی دلیل وہ حدیث ہے جسے عبدالرزاق' عبد بن حمید' ابن جریر' ابن المنذر اور بیہقی نے اپنی سنن میں دو سندوں سے روایت کیا ہے کہ عمرو بن شعیب اپنے باپ وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "جب آدمی کسی عورت سے نکاح کر لے تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کی ماں سے نکاح کرے خواہ اس کی بیٹی سے دخول کیا ہو یا نہ۔"

ہاں جب ماں سے نکاح کرے اور دخول نہ کیا ہو' پھر طلاق دے دے تو پھر اس کی بیٹی سے نکاح کر لے۔ ابن کثیر اپنی تفسیر میں جمہور کے حق میں استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس بارہ میں روایت آتی ہے باوجود اس کے کہ اس کی سند محل نظر ہے۔ انہوں نے یہ حدیث ذکر کی پھر کہا یہ حدیث ہے اگرچہ اس کی سند میں کچھ کلام وغیرہ ہے لیکن امت کا اجماع اسی قول کے مطابق ہے جو اس کے علاوہ دوسری اسناد کی نسبت اس کی صحت کی گواہی سے بے پرواہ کر دیتا ہے۔ امام زمخشری کشاف میں فرماتے ہیں: "اس بات پر اتفاق ہے کہ عام عورتوں کی ماؤں کی حرمت ربیبہ کے علاوہ غیر واضح ہے کہ ان کی حرمت پر کلام اللہ کے ظاہری الفاظ دلالت کرتے ہیں۔" نواب صدیق الحسن خاں رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اجماع کا دعویٰ مردود ہے یہ بات جن کا پہلے تذکرہ ہو چکا ان کے خلاف ہے۔

جان لو! کہ ماں کے لفظ میں ان کی والدہ دادی نانی اور اوپر تک تمام شامل ہیں کیونکہ وہ تمام جنہیں انہوں نے جنا ہے ان کی مائیں ہیں نیچے تک۔ اسی طرح بیٹی کے لفظ میں اولاد کی بیٹیاں شامل ہیں نیچے تک۔ اسی طرح بہن ہر اس بہن پر صادق آتا ہے جو سگی ماں جائی یا باپ جائی ہو اور پھوپھی ہر اس عورت کا نام ہے جو تیرے باپ یا دادا کے ساتھ سگی یا ماں یا باپ جائی شریک بنتی ہو' بعض اوقات ماں کی طرف سے بھی پھوپھی ہوتی ہے یعنی ماں کی پھوپھی اور خالہ ہر اس عورت کا نام ہے جو تیری ماں کے ساتھ شریک ہو' سگی ہو' ماں یا باپ جائے ہو' بعض اوقات باپ کی طرف سے بھی خالہ ہوتی ہے یعنی تمہارے باپ کی خالہ اور بھتیجی ہر اس عورت کا نام ہے جس کا تیرے بھائی کے ساتھ بالواسطہ یا دور کے واسطہ سے ولادت کا تعلق ہو اسی طرح بھانجی کا معاملہ ہے۔

سسرال کی طرف سے چار محرمات ہیں۔ بیوی کی ماں' اس کی بیٹی' باپ کی بیوی اور بیٹے کی

بیوی اور ربیبہ۔ ربیبہ کہتے ہیں بیوی کی بیٹی کو جو کہ اس سے نہیں بلکہ کسی دوسرے خاوند سے ہوا سے ربیبہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی پرورش اس کی گود میں ہوتی ہے لہٰذا یہ مربوب ہوئی تو ربیبہ فعلیہ کے وزن پر بمعنی مفعولہ کے ہے۔

اگر چہ یہ اس آدمی کی گود میں نہ بھی ہو۔ قرطبی فرماتے ہیں: "فقہاء کا اتفاق ہے کہ ربیبہ اس آدمی پر حرام ہو جاتی جس نے اس کی ماں سے بعد از نکاح دخول کر لیا ہو۔ اگر چہ ربیبہ اس کی زیر تربیت نہ بھی ہو۔

بعض متقدمین اور ظاہری اس اتفاق سے الگ ہوئے ہیں' وہ کہتے ہیں۔ ربیبہ صرف اس صورت میں حرام ہوگی جب کہ وہ اس کی گود میں ہو اگر وہ کسی دوسرے شہر میں ہے اور اس نے ماں کو علیحدہ کر دیا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ اس سے نکاح کر لے۔"

یہ بات سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ابن منذر اور طحاوی کہتے ہیں یہ بات سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں کیونکہ اسے ابراہیم بن عبید مالک بن اوس سے وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں اور ابراہیم مجہول راوی ہے۔ ابن کثیر اپنی تفسیر میں یہ روایت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کر کے فرماتے ہیں یہ سند قوی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے اور ہے بھی مسلم کی شرط پر۔

الحجور۔ حجر کی جمع ہے اسے حَجر اور حِجر بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ماں کی پرورش میں ان پر ان خاوندوں کے نگرانی میں ہیں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق محجور سے مراد گھر ہیں' یعنی تمہارے گھر' یہ بات اثرم نے ابی عبیدہ سے بیان کی۔

فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔

"ہاں اگر تم نے ان سے جماع نہ کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔"

یعنی ربیبہ سے نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں یہ وضاحت ہے اس چیز کی جس پر گذشتہ مفہوم دلالت کرتا ہے۔

اہل علم کا دخول کے معنی میں اختلاف ہے جو کہ ربیبہ کی حرمت واجب کرتا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دخول سے مراد جماع ہے' یہی قول طاؤس اور عمرو بن دینار وغیرہ کا ہے۔ امام مالک' ثوری' ابوحنیفہ' اوزاعی اور لیث فرماتے ہیں کہ جب خاوند اس کی ماں کو شہوت سے ہاتھ لگائے تو اس کی بیٹی اس پر حرام ہو گی' یہ امام شافعی کے دو اقوال میں سے ایک ہے۔ ابن جریر طبری فرماتے ہیں تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت اور مرد کا طرف سے خلوت اختیار

کرنے سے اس کی بیٹی اس مرد پر حرام نہیں ہوتی جبکہ مباشرت اور ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے ایک قول یہ ہے کہ شہوت کے ساتھ شرمگاہ کو دیکھنا ہی دلیل ہے کہ وہ جماع کی کیفیت کو پہنچا ہے۔ انتہیٰ

اسی طرح امام قرطبی نے اجماع نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں: علماء کا اجماع ہے کہ آدمی جب عورت سے نکاح کرے پھر اسے طلاق دے اس کے ساتھ دخول سے قبل ہی یا وہ خود فوت ہو جائے تو اس کی بیٹی سے نکاح جائز ہو جاتا ہے اور دیکھنے میں اختلاف کیا ہے: کوفی کہتے ہیں جب اس کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے گا تو یہ شہوت سے ہاتھ لگانے کے برابر ہوگا اسی طرح ثوری کہتے ہیں مگر انہوں نے شہوت کا ذکر نہیں کیا۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ صرف دیکھنے سے حرام نہ ہوگی حتیٰ کہ وہ اسے ہاتھ لگائے یہی امام شافعی کا قول ہے۔ اس قسم کے اختلافات میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں دخول کی لغوی اور شرعی تحقیق کرنی چاہیے اگر وہ خاص جماع کے معنی میں مستعمل ہے تو پھر اس کو چھونے اور نظر وغیرہ کو ملانے کی ضرورت نہیں اور اگر اس کا معنی جماع سے تمام مراد لیا جائے کہ جس قسم کا بھی فائدہ حاصل ہو تو پھر حرام ہونے کی علت وہی ہے۔

لیکن ربیبہ لونڈی کے متعلق سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان کو ایک آیت حلال اور دوسری حرام قرار دیتی ہے اگرچہ میں ایسا نہیں کرتا۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں علماء کے درمیان اس بات میں اختلاف نہیں کہ آدمی عورت اور اس کی بیٹی جو کہ لونڈی ہیں سے جماع کرے کیونکہ یہ رشتہ اللہ تعالیٰ نے نکاح کی صورت میں حرام کیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمْ۔

لونڈی ان کے نزدیک احکام نکاح کے تابع ہے سوائے اس کے جو کہ سیدنا عمر اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور اس بات پر فتویٰ دینے والے ائمہ اور ان کے متبعین میں سے کوئی بھی نہیں۔ انتہیٰ

وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ۔ ''اور تمہارے بیٹوں کی بیویاں۔''

حلائل حلیلہ کی جمع ہے اس کا معنی بیوی ہے اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ وہ نکاح سے حلال ہوگئی جبکہ اس نے حلال کیا یہ حلیلہ فعلیہ کے وزن پر فاعلہ کے معنی میں ہے۔ زجاج اور کچھ دوسرے لوگوں کا موقف ہے کہ یہ لفظ حلال سے ہے تو اس صورت میں یہ حلیلہ بمعنی محللۃ ہے۔

ایک قول کے مطابق دونوں درست ہیں کیونکہ دونوں کا معنی ہے اپنے ساتھی کا ازار کھولنا۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جن عورتوں سے باپ کا نکاح ہو تو وہ بیٹے پر حرام ہیں۔ اسی طرح جن سے بیٹے کا نکاح ہو' تو وہ باپ پر حرام ہیں۔ برابر ہے کہ نکاح کے ساتھ جماع ہوا یا نہیں' اس کی وجہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔

''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہے۔''

اور فرمان باری تعالیٰ ہے: وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ ''اور تمہارے بیٹوں کی بیویاں۔''

فقہاء کا اس نکاح کے بارہ میں اختلاف ہے جب نکاح فاسد ہو تو جماع حرام ہے یا نہیں جیسا کہ فروع کی کتاب میں واضح ہے؟ ابن منذر کہتے ہیں کہ شہروں کے وہ علماء جن سے علم حاصل کیا جاتا ہے ان تمام کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب آدمی کسی عورت سے نکاح فاسد کے نتیجہ میں جماع کرے تو یہ اس کے باپ دادا اور بیٹے پر حرام نہیں ہوتی۔ اس بات پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ صرف لونڈی کا خریدنا اس کو اس کے خریدنے والے کے باپ اور بیٹے پر حرام نہیں کرتا اور جب' اس کی حرمت واجب ہے ان کی بات تسلیم کرتے ہوئے اور جب انہوں نے ہاتھ لگائے بغیر صرف دیکھنے کے بارہ میں حرمت پر اختلاف کیا تو ان کے اختلاف کی وجہ سے جائز نہیں۔ مزید کہتے ہیں کہ کسی بھی صحابی رسول سے اس بارہ میں جو ہم نے کہا' اختلاف کا نقل کرنا درست نہیں۔

اَلَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ۔ ''جو تمہارے سگے ہیں۔''

یہ بیٹوں کی صفت ہے یعنی ان کے علاوہ جنہیں تم نے اپنے علاوہ دوسروں کے بیٹوں کو متبنی بنا لیا ہے جیسا کہ وہ لوگ جاہلیت میں کیا کرتے تھے۔ اسی معنی میں فرمان باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ (الاحزاب: ۳۷)

''پس جبکہ زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کر لی ہم نے اسے تیرے نکاح میں دے دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے لے پالک کی بیویوں کے بارہ میں کسی طرح کی تنگی نہ رہے جبکہ وہ اپنی غرض ان سے پوری کر لیں۔''

اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (الاحزاب:

۴) ''اور نہ تمہارے لے پالک لڑکوں کو واقعی تمہارے بیٹے بنایا'' اسی معنی میں یہ فرمان الٰہی ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ. (احزاب:۴۰)

''تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ محمد ﷺ نہیں۔''

لیکن رضاعی بیٹے کی بیوی کے متعلق جمہور کا موقف ہے کہ وہ باپ پر حرام ہے۔ ایک قول کے مطابق اس بات پر اجماع ہے باوجود اس بات کے کہ رضاعی بیٹا صلبی اولاد سے نہیں اس کی دلیل وہ صحیح حدیث ہے جو نبی ﷺ سے مروی ہے یحرم من الرضاع مایحرم من النسب کہ رضاعت سے وہ تمام رشتے حرام ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں۔

اس بات میں اختلاف نہیں کہ اولاد کی اولاد نیچے تک صلبی اولاد کے مرتبہ پر ہے' اور ان کی بیویوں سے نکاح کرنا ان کے آباء پر حرام ہیں۔ اہل علم کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ زنا سے بھی نکاح حرام ہوتا ہے یا نہیں؟ تو اکثر اہل علم کا کہنا ہے جب کوئی آدمی کسی عورت سے زنا کرے تو اس وجہ سے اس کے ساتھ نکاح کرنا حرام نہیں ہوتا اسی طرح اس پر وہ عورت بھی حرام نہ ہوگی جبکہ اس کی ماں یا اس کی بیٹی سے زنا کرے اور کافی ہے کہ اس پر حد قائم کردی جائے' اسی طرح ان علماء کے نزدیک اس شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ ایسی ماں کے ساتھ نکاح کرلے جس کے ساتھ اس نے زنا کیا ہے اور اس کی بیٹی کے ساتھ زنا کیا ہے۔

اہل علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ زنا حرمت کا تقاضا کرتا ہے یہ بات سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ' شعبی' عطاء' حسن' سفیان ثوری' احمد' اسحق اور اصحاب رائے سے منقول ہے اور یہی بات امام مالک سے بھی منقول ہے۔ امام مالک سے جو صحیح بات مروی ہے وہ جمہور کے موافق ہے اور جمہور کی دلیل فرمان باری تعالیٰ ہے وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ اور وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ اور جس عورت سے زنا کیا گیا اس پر یہ صادق نہیں آتی کہ وہ ان کی بیویاں ہیں اور نہ ان کی بیٹوں کی بیویاں ہیں۔ دارقطنی ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث لائے ہیں وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آدمی کے بارہ میں پوچھا گیا جو ایک عورت سے زنا کرے' پھر اس کے ساتھ یا اس کی بیٹی کے ساتھ نکاح کا ارادہ کرے' تو آپ ﷺ نے فرمایا حرام' حلال کو حرام نہیں کرتا۔

حرام کہنے والوں نے جریج کے واقعہ سے دلیل لی ہے جو صحیح میں ثابت ہے کہ جریج نے کہا اے بچے تیرا باپ کون ہے؟ اس نے کہا فلاں چرواہا ہے! تو بچے نے خود کو اپنے زانی باپ کی

طرف منسوب کیا زنا کی وجہ سے اس دلیل کی کوئی حیثیت نہیں' اسی طرح انہوں نے آپ ﷺ کی اس حدیث سے بھی دلیل لی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی کی طرف نہیں دیکھے گا جو کسی عورت اور اس کی بیٹی کے شرمگاہ کو دیکھتا ہے۔ یہاں آپ ﷺ نے حلال اور حرام کے درمیان وضاحت نہیں فرمائی۔ اس کا جواب یہ دیا ہے یہ مطلق مقید ہے ان دلائل سے جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ حرام عمل کسی حلال چیز کو حرام نہیں کرتا۔

پھر علماء نے لواطت کے بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ حرمت کا تقاضا کرتا ہے یا نہیں؟ ثوری فرماتے ہیں آدمی جب کسی بچے سے لواطت کرے تو اس پر اس کی ماں حرام ہو جائے گی احمد بن حنبل کا قول ہے کہ جب اپنی بیوی کے بیٹے' اس کی بیٹی یا اس کے بھائی کے ساتھ لواطت کرے تو یہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی اوزاعی فرماتے ہیں جب کسی بچے سے لواطت کی تو جس سے یہ جرم کیا گیا ہے اس کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی تو اس مجرم کے لئے جائز نہیں کہ اس کے ساتھ نکاح کرے کیونکہ یہ اس شخص کی بیٹی ہے جس کے ساتھ اس نے دخول کیا ہے۔

ان اقوال میں جو مختلف اعتبار سے کمزوری ہے اور اعتبار کی حیثیت سے ساقط ہے یہ بات کسی پر مخفی نہیں جن کا قول یہ ہے کہ حرام وطی کرنا یہ حرمت کا تقاضا کرتا ہے' اس لئے کہ اس میں شبہات ہیں جن کی وجہ سے وہ اس استدلال کے قابل نہیں ہیں جس کے متعلق یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ لواطت حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔

وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ۔ "اور تمہارا دو بہنوں کا جمع کرنا۔"

یعنی حرام ہے تم پر کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو۔ یہاں لفظ اختین محل رفع میں ہے کیونکہ یہ سابقہ محرمات پر معطوف ہے' یہ بات نکاح میں یا لونڈی کی حیثیت میں' جمع کرنے کو شامل ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت نکاح میں جمع کرنے کے متعلق خاص ہے نہ کہ لونڈی کی حیثیت میں لیکن لونڈی سے صحبت کرنا یہ نکاح سے ملتا جلتا ہے۔ امت اس بات پر جمع ہے کہ دو بہنوں کو ایک نکاح میں اکٹھا کرنا منع ہے اور انہوں نے لونڈی کی حیثیت میں دو بہنوں کے متعلق اختلاف کیا ہے۔

تمام علماء کا موقف ہے کہ ان دونوں کو صحبت میں اکٹھا کرنا جائز نہیں۔ صرف ملکیت کی وجہ سے بعض اسلاف صحبت میں دو بہنوں کو اکٹھا کرنے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں اور انہوں نے ایسی لونڈی جس کے ساتھ یہ صحبت کرتا ہے اس کی بہن کے ساتھ نکاح کے جواز میں اختلاف کیا ہے' اوزاعی فرماتے ہیں جب آدمی اپنی کسی لونڈی کے ساتھ صحبت کرے تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ

اس کی بہن کے ساتھ نکاح کرے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کسی کا لونڈی ہونا اس کی بہن کے ساتھ نکاح کے لئے رکاوٹ نہیں ظاہریوں کا موقف ہے کہ لونڈی کے ساتھ صحبت میں دو بہنوں کو اکٹھا رکھنا جائز ہے جیسا کہ ان کو ملکیت میں رکھنا جائز ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں وہ بات ذکر کرنے کے بعد جو سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لونڈی کو صحبت میں دو بہنوں کا اکٹھا رکھنا جائز ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اس قول کے مثل اسلاف کی ایک جماعت سے مروی ہے' ان میں سے سیدنا ابن عباس بھی ہیں' لیکن اس بات کے متعلق وہ آپس میں مختلف ہیں اور ان شہروں کے فقہاء میں سے کوئی بھی اس طرف توجہ نہیں کرتا جو فقہاء حجاز کے ہیں' عراق کے ہیں یا اس سے بھی پیچھے مشرق کے اور نہ شام کے اور نہ مغرب کے سوائے اس شخص کے کہ جو اپنی جماعت سے علیحدہ ہو گیا۔ ظاہری حکم کی پیروی کرنے میں اور قیاس کی نفی کرتے ہوئے جس شخص نے ایسا کوئی ارادہ کیا تو وہ متروک ہے۔

فقہاء کی جماعت اس بات پر متفق ہے کہ دو بہنوں کو لونڈی کی حیثیت میں صحبت میں جمع کرنا حلال نہیں جیسا کہ یہ چیز نکاح میں حلال نہیں۔ مسلمان اس بات پر جمع ہیں کہ اس فرمان الٰہی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ مکمل آیت کا معنی یہ ہے کہ نکاح کرنا لونڈی کے ساتھ ان تمام اقسام میں سب برابر ہیں' تو اسی طرح واجب ہے کہ یہ قیاسی حکم ہو اور دو بہنوں کا ایک نکاح میں اکٹھا نہ کرنا اور بیوی اور ربیبہ کا اکٹھا نہ کرنے کا بھی یہی تقاضا ہے اسی طرح یہ موقف جمہور کا ہے اور اسی دلیل کو اسی موقف کے مخالفین نے اپنایا ہے۔ واللہ المحمود انتہی

میں کہتا ہوں یہاں ایک اشکال ہے' وہ یہ ہے کہ انہوں نے مقرر کر لیا کہ صرف عقد باندھ لینے پر نکاح کا لفظ بولا جائے گا اور صرف وطی کرنے پر بولا جائے گا ان میں سے ایک کے بارہ میں حقیقی اختلاف ہے اور دوسرے میں مجازی اختلاف ہے اور ان دونوں کی حقیقت معروف ہے۔

پس اگر ہم اس آیت میں مذکورہ تحریم کو عقد پر محمول کریں جو آیت یہ ہیں کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ اس بات پر کہ اس سے مراد ان کے ساتھ عقد کی حرمت ہے جو کہ اس فرمان الٰہی میں نہیں وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ جو دلالت کرتی ہے کہ دو لونڈیوں کو صحبت میں اکٹھا کرنا حرام ہے۔ اب یہ بات مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہے کہ اس فرمان الٰہی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ میں آزاد اور غلام برابر ہیں نکاح کرنا یا مالک بننا یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اختلاف کی جگہ ہو یعنی دو بہنوں کو لونڈی کی حیثیت میں صحبت میں اکٹھا کرنا یہ اجماع کے مقام کی طرح

ہے اور اس طرح کی جگہ میں صرف قیاس سے حجت قائم نہیں ہوگی' اس لئے کہ اس کے برخلاف نقیضیں موجود ہیں۔

اگر ہم مذکورہ آیت میں حرمت کو صرف صحبت پر محمول کریں تو یہ درست نہ ہوگا' اس لئے کہ اس آیت میں اول تا آخر مذکورہ عورتوں سے نکاح کرنے کی حرمت پر اجماع ہے' اس صورت میں صرف یہ راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس آیت میں حرمت کو نکاح کرنے کی حرمت پر محمول کیا جائے' جو اس بات کا قائل ہے کہ صحبت میں دو بہنوں کو جمع کرنے کی حرمت لونڈی پر بھی لاگو ہوتی ہے' تو اس کی بات دلیل کی محتاج ہے' یہاں یہ بات مفید نہ ہوگی کہ یہ جمہور کا قول ہے حق بات انسانوں کو نہیں پہچانتی اگر حق ملاوٹ سے پاک خالص ہو کر آئے تو درست ہے وگرنہ اصل یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔

آیت میں نکاح کو دونوں معنوں میں اکٹھا محمول کرنا درست نہیں' میری مراد نکاح اور صحبت سے ہے' کیونکہ یہ حقیقت اور مجاز کو جمع کرنا ہے جو کہ منع ہے یا دو مشترک معنوں کو جمع کرنا ہے اس میں اختلاف اصول کی کتب میں' مشہور ہے لہٰذا تم اس میں غور و فکر کرو۔

اہل علم کا اختلاف ہے کہ جب آدمی اپنی لونڈی سے صحبت کرے' پھر وہ اس کی بہن سے بھی صحبت کرنا چاہے تو اس بارہ میں سیدنا علی' سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما' حسن بصری' اوزاعی' شافعی' احمد اور اسحق کہتے ہیں دوسری سے صحبت جائز نہیں جب تک کہ وہ دوسری کی شرمگاہ کو اپنی ملکیت سے نکال کر حرام نہ کر لے اسے فروخت کر دے یا آزاد کر دے یا اس سے نکاح کر لے۔ ابن منذر کہتے ہیں اس بارہ میں قتادہ کا دوسرا قول بھی ہے' وہ یہ کہ یہ شخص پہلی کے بارہ میں یہ نیت کر لے یہ اس پر حرام ہے اور اس کے قریب نہ جائے گا پھر اس سے رک جائے حتیٰ کہ اس کے رحم کے بارہ میں معلوم ہو جائے کہ اس میں اولاد نہیں پھر وہ دوسری کے قریب جائے۔ اس بارہ میں ایک تیسرا قول یہ بھی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے قریب نہ جائے اسی طرح حاکم اور حماد نے کہا یہی معنی نخعی سے بھی مروی ہے۔

امام مالک کہتے ہیں جب کسی کے پاس دو بہنیں ملکیت میں ہوں تو اس کے لئے جائز ہے کہ ان میں سے جس سے چاہے صحبت کرے اور دوسری سے رکے رہنا اس کی امانت پر موقوف ہے اور جب دوسری سے صحبت کا ارادہ کرے تو اس پر ضروری ہے کہ پہلی عورت کی شرمگاہ کو عملاً خود پر حرام کرے اپنی ملکیت سے خارج کر کے مثلاً نکاح کر لے' فروخت کر دے آزاد کر دے' اس سے

مکاتبت کر لے یا زیادہ عرصہ تک کسی کو خدمت کے لئے دے دے' تو اگر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ صحبت کی' پھر دوسری پر جھکا حالانکہ ابھی اس نے پہلی کو حرام نہیں کیا تو ان دونوں سے رک جائے اور اس کے لئے ان میں سے کسی ایک کے قریب جانا جائز نہیں جب تک کہ دوسری کو حرام نہ کر لے' اور اس بات کو اس کی امانت و دیانت کے سپرد نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ متہم ہے۔

قرطبی فرماتے ہیں' علماء کا اجماع ہے کہ آدمی جب اپنی بیوی کو ایک طلاق دے جبکہ یہ اسے واپس لوٹانے کا حق رکھتا ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کی بہن سے نکاح کرے حتیٰ کہ اس مطلقہ کی عدت گذر جائے اور انہوں نے اس طلاق کے بارہ میں اختلاف کیا ہے جس کے بعد رجوع کا حق باقی نہ رہے کہ دوسری بہن کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتا اور نہ ہی چوتھی بیوی سے نکاح کر سکتا ہے جب تک کہ اس طلاق کی عدت نہ گذر جائے' یہ موقف سیدنا علی، سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ' مجاہد' عطاء' نخعی' ثوری' احمد بن حنبل اور اصحاب رائے کا ہے۔ دوسری جماعت کا کہنا ہے اس کے لئے جائز ہے کہ اس کی بہن سے نکاح کر لے اور چوتھی بیوی سے نکاح کر سکتا ہے جبکہ اس کے ماتحت چار بیویاں ہوں اور ان میں سے ایک کو طلاق بائنہ دے یہ موقف سعید بن مسیب' حسن' قاسم' عروہ بن زبیر' ابن ابی لیلیٰ' شافعی' ابوثور اور ابو عبید کا ہے۔

ابن منذر کہتے ہیں میرا یہ گمان ہے کہ یہ امام مالک کا قول ہے اور وہ بھی دو روایات میں سے ایک ہے جو سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور عطا سے بھی مروی ہے۔

إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۔ "ہاں جو گذر چکا سو گذر چکا۔" اس کا ایک معنیٰ تو وہی ہے جو گذشتہ آیت میں گذرے ہیں وَ لَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اس کے علاوہ دوسرا معنیٰ بھی ہو سکتا ہے جو یہ ہے کہ جو گذر چکا وہ جائز ہے۔

اس طرح کہ جب جاہلیت میں یہ جمع کی گئیں تو اس وقت نکاح درست تھا اور جب وہ آدمی اسلام قبول کر لے گا تو پھر تو دو بہنوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لے گا۔ اور صحیح بات پہلا معنیٰ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۔ "یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔"

تم کو ان اعمال میں جو منع کرنے سے پہلے تم کر چکے ہو۔

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ ۔ "اور شوہر والی عورتیں۔"

یہ مذکورہ محرمات پر عطف ہے۔ المحصن کا اصل معنیٰ ہے حفاظت میں آنا' اسی معنیٰ میں یہ فرمان الٰہی ہے لِتُحْصِنَكُمْ مِنْ بَأْسِكُمْ "یعنی تا کہ تم اپنی حفاظت کرو۔" اور حصان اس پاک

دامن عورت کو کہتے ہیں جو اپنے نفس کی حفاظت کرے اس کا مصدر حصانۃ ہے۔

یہاں محصنات سے مراد خاوندوں والیاں ہیں۔ قرآن میں احصان کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے' ان میں سے ایک تو یہ ہے اور دوسرے سے مراد آزادی ہے' فرمان باری تعالیٰ ہے۔

وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (المائدہ: ٥)

''اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور جو لوگ تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں ان کی پاک دامن عورتیں بھی حلال ہیں۔

تیسرا معنی ہے پاک دامنی ہے' اس معنی میں یہ فرمان الٰہی ہے مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ''برے کام سے بچنے کے لئے نہ کہ شہوت رانی کے لئے۔'' چوتھا معنی ہے مطیع و فرمانبردار، میں یہی معنی ہے اور محصنات فَاِذَآ اُحْصِنَّ کی تفسیر میں' ابن عباس' ابوسعید خدری' ابوقلابہ مکحول اور زہری کہتے ہیں۔ یہاں محصنات سے مراد وہ قیدی عورتیں ہیں جو خصوصاً خاوندوں والیاں ہیں' یعنی وہ تم پر حرام ہیں سوائے ان کے کہ وہ دارالحرب سے قید ہو کر تمہاری ملکیت میں آئیں' تو اس صورت میں وہ حلال ہیں اگرچہ ان کے خاوند ہوں۔ یہ امام شافعی کا قول ہے یعنی قید عصمت کو ختم کر دیتا ہے' یہی بات ابن وہب اور ابن عبدالحکم نے کہی اور انہوں نے یہ مسئلہ امام مالک سے روایت کیا' یہی موقف امام ابوحنیفہ' ان کے اصحاب احمد اسحٰق اور ابوثور کا ہے۔

ایسی عورت کے استبرائے رحم کے بارہ میں اختلاف ہے کہ یہ کیسے ہو جیسا کہ یہ بات فروع کی کتب میں لکھی ہوئی ہے۔

ایک جماعت کا کہنا ہے اس آیت میں محصنات کا معنی پاکدامن ہے' یہی بات ابو العالیہ' عبیدہ سلمانی' طاوس' سعید بن جبیر اور عطاء نے کہی' عبیدہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے ان لوگوں کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہو گا کہ تمام عورتیں حرام ہیں سوا' ان کے جو تمہاری ملکیت میں ہے یعنی تم ان کی عصمت کے مالک ہو نکاح اور خریدنے کی وجہ سے تم ان کی گردن کی مالک ہو۔

ابن جریر طبری بیان کرتے ہیں ایک آدمی نے سعید بن جبیر سے کہا کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا' تو سعید کہنے لگے ہو سکتا ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس کا علم نہ ہو۔ ابن جریر نے مجاہد سے بھی نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اس آیت کی تفسیر مجھے کون بیان کرے گا' تو میں

اونٹوں کی گردنیں توڑتا ہوا وہاں تک پہنچ جاؤں۔ انتہی

اور آیت کا معنی اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے واضح ہے کہ اس میں کوئی پوشیدگی نہیں یعنی حرام ہے تم پر عورتوں میں سے پاک دامن یعنی شادی شدہ یہ جملہ اس بات سے زیادہ وسیع معنوں میں ہے کہ وہ مسلمان ہوں یا کافر یا ان میں سے کوئی تمہاری لونڈی ہو۔

لیکن جو قید ہو کر آئے وہ حلال ہے اگرچہ وہ خاوند والی ہو یا فروخت ہو کر آئے اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کا وہ نکاح فسخ ہو جائے گا جس پر یہ تھی' اس لئے کہ یہ اپنے اس سردار کی ملکیت سے نکل آئی ہے جس نے اس سے شادی کی تھی اور یہ اصول معروف ہے کہ اعتبار لفظ کے عموم پر ہوتا ہے نہ کہ کسی خاص سبب کے ساتھ۔

قولہ تعالیٰ کِتَابُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ "یہ اللہ تعالیٰ کا لکھا ہوا ہے تم پر۔" لفظ کتاب مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ بات کتاب میں لکھ دی ہے۔ زجاج اور اور اہل کوفہ کہتے ہیں کہ اس میں ایک لفظ پوشیدہ ہے یعنی تم کتاب کو لازم پکڑ لو یہ اشارہ ہے مذکورہ حرمت کی طرف جو اسی فرمان الٰہی حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ.......... میں ہے۔

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔ اور ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں' اس میں دلیل ہے کہ مسلمانوں کے لئے مذکورہ عورتوں کے علاوہ باقی تمام عورتوں سے نکاح جائز ہے' یہ حکم عام ہے اور اسے وہ چیز خاص کرتی ہے جو نبی ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ عورت اور اس کی پھوپھی اور عورت اور اس کی خالہ کو جمع کرنا حرام ہیں' اسی میں عدت والی عورت سے نکاح کرنا بھی ہے اور اسی طرح جو آزاد عورت سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہو' لونڈی نکاح نہ کرے۔ اور اسی طرح پانچواں نکاح بھی منع ہے اور لعان کرنے والے مرد و عورت آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ گفتگو یہاں محرمات ابدیہ پر ہو رہی ہے اور جن کا ابھی ذکر ہوا وہ محرمات عارضیہ ہیں جن کی حرمت زائل ہو سکتی ہے۔

ہاں! البتہ لعان (لعان یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر آدمی کو قابل اعتراض حالت میں دیکھے تو ان کا آپس میں ایک دوسرے کو لعنت کر کے علیحدہ ہو جانا) یہ بات بھی کہنے والے سے بعید ہے کہ مذکورہ عورتوں کو جمع کرنے کی حرمت اس آیت سے ماخوذ ہے کیونکہ اس آیت نے دو بہنوں کو جمع کرنا حرام قرار دیا ہے' تو جو مسئلہ اس معنی میں ہوگا وہ اسی حکم میں ہوگا یعنی

عورت اور اس کی خالہ یا پھوپھی کو جمع کرنا اسی طرح لونڈی سے نکاح کرنے کی حرمت جو کوئی آزاد سے نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہ اس عمومی حکم کو خاص کرتا ہے۔

اَنْ تَبْتَغُوْا۔ ''کہ تم نکاح کرنا چاہو۔''

یہ علت کی وجہ سے نصبی حالت میں ہے' یعنی حرام کیا گیا تم پر جو حرام کیا گیا اور حلال کیا گیا تم پر جو حلال کیا گیا' تا کہ تم بِاَمْوَالِكُمْ اپنے مال کے ساتھ ان عورتوں کو تلاش کرو جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جائز رکھا ہے اور نہ تلاش کرو اس معاملہ میں حرام کو' اگر ایسا کرو گے تو یہ بری اور مذموم حرکت ہوگی اسی حال میں کہ تم مُّحْصِنِیْنَ یعنی زنا سے بچنے والے ہو غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ یعنی زنا کرنے والے نہیں ہو۔ سفاح کہتے ہیں زنا کو یہ سفح الماء سے ماخوذ ہے یعنی اس کو بہانا گرانا گویا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے احوال کے ساتھ عورتوں کو نکاح کے لئے تلاش کرو نہ کہ زنا کے لئے۔

ایک قول کے مطابق فرمان باری تعالیٰ ہے اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ 'یہ جملہ بدل ہے ما سے جو فرمان الٰہی مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ 'میں ہے' یعنی اس نے تمہارے لئے اپنے اموال کے ساتھ تلاش کرنے کو جائز قرار دیا ہے' پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مذکورہ اموال سے مراد یہ لیتے ہیں کہ جو لوگ آزاد عورت کو مہر دیتے اور لونڈی کی قیمت ادا کرتے ہیں۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ۔ ''اس لئے جن سے تم فائدہ اٹھاؤ۔'' اس کلمہ میں ما موصولہ ہے اور فَاٰتُوْهُنَّ ''پس انہیں دو'' اس میں فاء موصولہ ہے تا کہ موصول معنی کے اعتبار سے شرط کے ذمہ آ جائے اور لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے' یعنی تم انہیں ان کے مہر اس نکاح کے بدلہ میں ادا کرو۔

اہل علم نے اس آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے' حسن اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جو تم فائدہ اٹھاؤ اور لذت حاصل کرو نکاح شرعی کے بنیاد پر عورتوں سے صحبت کر کے تو ان کے حق مہر ادا کرو۔ جمہور کا کہنا ہے اس آیت سے مراد نکاح متعہ ہے جو ابتدائے اسلام میں جائز تھا' اس بات کی تائید سیدنا ابی بن کعب' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی قراءت کرتی ہے۔ پس جو تم ان سے فائدہ حاصل کرو ایک مقررہ مدت تک تو ان کو ان کے حق ادا کرو پھر نبی ﷺ نے اس بات سے منع کر دیا جیسا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں صحیح سند کے ساتھ موجود ہے کہ نبی ﷺ نے نکاح متعہ سے منع فرمایا اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے خیبر کے دن۔ یہ حدیث صحیحین وغیرہ میں موجود ہے۔ صحیح مسلم میں سیدنا سبرا ابن معبد الجہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

نبی ﷺ نے فتح مکہ کے روز فرمایا اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے فائدہ اٹھانے (متعہ) کی اجازت دی تھی اب اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے اسے حرام کر دیا ہے پس جس کے پاس ایسی عورتیں ہیں تو وہ ان کو چھوڑ دیں اور جو انہیں دیا ہے اس میں سے واپس نہ لیں۔ مسلم میں ایک اور جگہ اس طرح کہ آپ ﷺ نے یہ بات حجۃ الوداع کے موقع پر کہی تھی تو اس لئے یہ ناسخ ہوئی۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں متعہ کو وراثت کی آیت نے منسوخ کیا ہے اور متعہ میں وراثت نہیں ہوتی۔ قاسم بن محمد اور ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اس کی حرمت اور اس کی ناسخ قرآن میں موجود ہے فرمان الٰہی ہے

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ○ (المومنون: ٥-٦)

”جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اپنی بیوی اور ملکیت کی لونڈیوں کے علاوہ یقیناً یہ ملاقیوں سے نہیں ہے اور نکاح متعہ والی عورت نا تقہ بیویوں میں سے اور نہ لونڈیوں میں سے ہے۔“

بیوی کی صفت تو یہ ہے کہ وہ وارث بنتی ہے اس کے بھی وارث ہوتے ہیں اور متعہ کرنے والا اس عورت سے اس طرح کا سلوک نہیں کرتا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ متعہ جائز اور باقی ہے اور وہ منسوخ نہیں ہوا اور ان سے یہ بات بھی مروی ہے کہ تو جب ان تک ناسخ پہنچا انہوں نے اس بات سے رجوع کر لیا تھا۔ روافض یعنی شیعہ کی ایک جماعت اس کے جواز کی قائل ہے لیکن ان کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں بعض متاخرین نے بہت زیادہ اس مسئلہ پر گفتگو کر کے خود کو تھکایا ہے اور اس کے جواز کے قائل لوگوں کو تقویت پہنچائی ہے یہ مقام ان کے کلام کو رد کرنے کا نہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس بحث کو بہت زیادہ بیان کیا اور ان کے باطل شبہات کا رد کیا جس کو جواز کے قائل مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں ان باتوں کی طرف ہم نے مسک الختام شرح بلوغ المرام میں اشارہ کیا ہے۔

فَرِيْضَةً ”یہ مقرر ہے۔“ مصدر مؤکد ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا حال ہونے کی وجہ سے یعنی یہ فرض کیا گیا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ۔

”اور مہر مقرر ہو جانے کے بعد تم آپس کی رضامندی سے جو طے کر لو اس میں تم پر کوئی

گناہ نہیں۔"

یعنی مہر میں کمی بیشی پر کیونکہ یہ آپس میں رضا مندی سے طے ہوا ہے۔ یہ موقف اس کا ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ یہ آیت نکاح شرعی کے بارہ میں ہے۔ جمہور کے نزدیک جو یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت متعہ کے بارہ میں ہے تو معنی یہ ہوا کہ متعہ کی مدت میں کمی بیشی رضا مندی یا فائدہ اٹھانے کے بدلہ میں مال وغیرہ دینے میں کمی بیشی پر رضا مندی۔

مضمون نمبر:۱۲

وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا۔ (النساء:۲۵)

"اور تم میں سے جس کسی کو پوری وسعت وطاقت نہ ہو۔"

الطول کہتے ہیں غنی اور وسعت کو، یہ معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، سعید بن جبیر، مہدی، ابو زید، مالک، شافعی، احمد، اسحٰق، ابو ثور اور جمہور اہل علم رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے۔ اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ: جو تم میں سے غنی اور وسعت نہ رکھتا ہو جو اپنے مال میں جس سے مومن پاک دامنہ عورتوں سے نکاح کرنے پر قادر ہو سکے۔

ایک قول ہے کہ "طال يطول طولاً" سے ہے جو زائد اور طاقت کے معنی میں ہے، فلاں ذی طول یعنی قدرت وطاقت والا ہے۔ اور طول چھوٹے کے ضد میں استعمال ہوتا ہے۔ قتادہ، نخعی، عطا اور ثوری رحمہم اللہ کہتے ہیں طول سے مراد صبر ہے، ان کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو کسی لونڈی پر جھکے حتیٰ کہ اس کے علاوہ کسی دوسری عورت سے نکاح کرنے کی طاقت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ اس سے نکاح کر لے جبکہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکتا ہو اور اس کے ساتھ زنا کا خطرہ ہو۔ اگر چہ وہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کے لئے مال کی وسعت رکھتا ہو۔

ابو حنیفہ کہتے ہیں اور یہی بات امام مالک سے بھی مروی ہے کہ وہ طول سے مراد آزاد عورت ہے، جس کی زیر نگیں آزاد عورت ہو اس کے لئے جائز نہیں کہ لونڈی سے نکاح کرے اور جس کے ہاں ایسی صورت نہ ہو، تو اس کے لئے جائز ہے اگر چہ وہ غنی ہو، یہی بات ابو یوسف نے کہی، ابن جریر نے اسے پسند کیا اور اسی موقف کے لئے دلیل بیان کی۔ پہلا قول آیت کے معنی کے مطابق ہے لہٰذا اس کے علاوہ کسی اور قول کو اپنانے کا تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ پس آدمی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی لونڈی سے نکاح کرے مگر جبکہ وہ آزاد عورت سے نکاح کی طاقت نہ رکھتا ہو نکاح کی

ضروریات مہر وغیرہ کے نہ ہونے کی بنا پر۔

فَمِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ

"وہ مسلمان لونڈیاں جن کے تم مالک ہو (اپنا نکاح کر لے)"

اس جملہ کے شروع میں فاء اس لئے لائے ہیں کہ مبتداء شرط کے معنی کو متضمن ہو اور مِنْ فَتَيٰتِكُمُ حال ہونے کی بنا پر نصبی حالت میں ہے۔ آپ کو معلوم ہو گیا کہ آزاد آدمی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی لونڈی سے نکاح کرے مگر جبکہ یہ شرط موجود ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت نہ ہو۔

دوسری شرط کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ آیت کے آخر میں اپنے اس فرمان میں ذکر کرتے ہیں۔ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ۔ "یہ حکم اس آدمی کے لیے ہے جو زنا صادر ہونے سے ڈرتا ہو"۔ کنیزوں سے نکاح کا یہ حکم تم میں سے ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں گناہ اور تکلیف کا اندیشہ ہو۔ پس محتاج کے لئے بھی لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں مگر جبکہ اسے خود پر گناہ کا خطرہ ہو، آیت میں مذکور مومنہ لونڈیوں کے لفظ سے یہ استدلال کیا ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیوں سے نکاح جائز نہیں، یہی موقف اہل حجاز کا ہے اور اہل عراق نے اسے جائز قرار دیا ہے، یہاں لونڈی سے مراد وہ عورت ہے جو کسی دوسرے کی ملکیت میں ہو، لیکن انسان کی اپنی لونڈی کے بارہ میں اجماع ہے کہ اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس سے نکاح کرے کیونکہ وہ تو اس کی ملکیت میں ہی ہے اور اس لئے اس سے حقوق خلط ملط کہ ہوں گے۔ فتیات فتاة کی جمع ہے غلام مرد کو فتی کہتے ہیں اور لونڈی کو فتاة کہتے ہیں، صحیح حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کوئی تم میں سے یہ نہ کہے عبدی و امتی لیکن فتای اور فتاتی کہے۔

وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ۔ "تم سب آپس میں ایک ہی تو ہو۔"

یہ مبتدا اور خبر ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ تم نسب کے اعتبار سے آپس میں ملے ہوئے ہو کیونکہ تمام لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہو یا دین میں آپس میں ملے ہوئے ہو کیونکہ تمام لوگ ایک ہی ملت اور ایک ہی نبی کے ماننے والے ہیں، اس سے مراد عربوں کے نفوس کو روندنا ہے کیونکہ وہ لونڈیوں کی اولاد کو برا، گھٹیا اور کمینہ سمجھتے تھے اور انہیں لونڈی کی اولاد جیسے نام لے کر رسوا کرنے کی غرض سے بلایا کرتے تھے، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ خبر دی کہ یہ عادت اچھی نہیں، تم میں تکبر اور نخوت نہ آئے بلکہ جب تمہیں ان سے نکاح کی ضرورت ہو تو فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ "ان کے

مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرلو' کیونکہ ان کا فائدہ ان مالکوں کو تھا ان کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان سے کچھ فائدہ اٹھا سکے مگر اس شخص کی اجازت سے جو کہ اس لونڈی کا مالک ہے۔

وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ "اور قاعدہ کے مطابق انہیں مہر ادا کرو۔"

یعنی شریعت میں جو مقدار معروف ہے وہ مہر ان کو ادا کرو اس بات سے اس موقف کے قائلین نے استدلال کیا ہے کہ اس صورت میں لونڈی اپنے مالک کی بجائے اپنے مہر کی زیادہ حق دار ہے' یہی امام مالک رحمہ اللہ اور جمہور کا موقف ہے کہ مہر مالک کے لئے ہے۔ لونڈیوں کی طرف صرف ان کی نسبت ہے کیونکہ انہیں دینا گویا کہ ان کے مالکوں کو دینا ہے اس لئے کہ یہ خود ان کا مال ہے۔

مُحْصَنٰتٍ۔ "پاک دامن۔"

دوسرے باقی کسائی نے مُحْصِنٰتٍ پڑھا ہے پورے قرآن کریم میں سوائے والمحصنات من النسآء کے اور قراء نے صاد پر زبر پڑھی ہے۔ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ یعنی اعلانیہ زنا نہ کرنے والی وَ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ نہ خفیہ آشنائی کرنے والیاں دوستی لگانا اور کسی کا ساتھی بننا۔ ایک قول کے مطابق "ذات الخدن" اس عورت کو کہتے ہیں' جو چھپ کر زنا کرے' اس کے بالمقابل "مسافحة" کا لفظ آتا ہے اس کا معنی ہے' جو عورت اعلانیہ زنا کرے' ایک قول کے مطابق مسافحہ کا معنی عام زنا کرنے والی اور ذات الخدن کا معنی کسی ایک سے ہی زنا کرنا ہے۔

عرب لوگ کھلے عام زنا کرنے والی کو برا سمجھتے اور خفیہ آشنائی رکھنے والی کو برا نہ سمجھتے' پھر اسلام نے ان تمام بری عادات کو ختم کر دیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ۔ (الانعام: ۱۵۱)

"اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ خواہ وہ اعلانیہ ہو خواہ پوشیدہ۔"

مضمون نمبر: ۱۴۰

فَاِذَآ اُحْصِنَّ۔

"پس جب یہ لونڈیاں نکاح میں آ جائیں۔"

عاصم، حمزہ اور کسائی "اَحْصَنَّ" کی ہمزہ کو زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں اور باقی لوگ ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، یہاں احصان سے مراد اسلام ہے، یہ معنی سیدنا ابن مسعود، سیدنا ابن عمر، سیدنا انس رضی اللہ عنہم، اسود بن یزید، زر بن حبیش، سعید بن جبیر، عطاء، ابراہیم النخعی، شعبی، اور مہدی رحمہ اللہ سے مروی ہے اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منقطع سند کے ساتھ مروی ہے اسی کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ نے مسئلہ بیان کیا اور یہی جمہور رحمہم اللہ کا موقف ہے۔

سیدنا ابن عباس، سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہم، مجاہد، عکرمہ، طاوس، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ وغیرہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد نکاح ہے، یہی قول امام شافعی سے بھی مروی ہے۔ پہلے قول کی بناء پر کافر لونڈیوں پر کوئی حد نہیں اور دوسرے قول کی بناء پر غیر شادی شدہ لونڈی پر کوئی حد نہیں۔ قاسم اور سالم کہتے ہیں کہ احصان سے مراد اس کا اسلام قبول کرنا اور پاکدامن رہنا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ دونوں قراءتوں کے معنی مختلف ہیں پس جو ہمزہ کی ضمہ سے پڑھتا ہے تو اس کا معنی نکاح کرنا ہوگا اور جو زبر کے ساتھ پڑھے تو اس کا معنی اسلام ہوگا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مذکورہ آیت میں احصان سے مراد نکاح کرنا ہے، لیکن مسلمان لونڈی پر حد واجب ہوگی جبکہ وہ شادی سے پہلے زنا کرے، یہ بات سنت سے ثابت ہے اور یہی موقف امام زہری کا ہے۔ ابن عبدالبر کا کہنا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ لونڈی پر شادی سے پہلے حد جاری نہیں کی جائے گی اگرچہ وہ مسلمان ہو، پھر سنت میں لونڈی کو کوڑے مارنے کا ذکر آیا اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہو تو یہ چیز پہلے بیان سے زائد ہوئی۔

قرطبی فرماتے ہیں کہ مسلمان کی حیثیت محفوظ ہے اور بغیر یقین کے اس پر حد جاری کرنا جائز نہیں اور اختلاف کی بنا پر یقین حاصل نہیں ہوتا اگرچہ سنت صحیحہ سے کوڑے مارنا ثابت ہے۔

ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں ظاہری بات یہ ہے (اور حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے) کہ احصان سے یہاں مراد نکاح کرنا ہے کیونکہ آیت کا سیاق وسباق اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا سے فَإِذَآ أُحْصِنَّ سے آخر آیت تک سارا سیاق مومن لونڈیوں کے متعلق ہے۔ پس فرمان الٰہی فَإِذَآ أُحْصِنَّ کا معنی شادی کرنا متعین ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے پیروکاروں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ مزید فرماتے ہیں ہر دو اقوال میں جمہور کے مذہب کے مطابق اشکال ہے ' وہ کہتے ہیں جب لونڈی زنا کرے تو اسے پچاس کوڑے مارے جائیں وہ مسلمان ہو یا کافر، باکرہ ہو یا ثیبہ اور آیت کا مفہوم

تقاضہ کرتا ہے کہ لونڈیوں میں سے غیر شادی شدہ پر حد جاری نہ کی جائے' تو اس کا جواب دیتے ہوئے بھی انہوں نے اختلاف کیا۔ پھر حافظ ابن کثیر ان جمہور میں سے ان کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اس بات کا جواب دیا کہ وہ ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جو یہ مفہوم ادا کرتی ہوں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو آیت کے مفہوم پر عمل کرتے ہیں اور ساتھ یہ کہتے ہیں کہ جب غیر شادی شدہ لونڈی زنا کر لے اس پر حد نہیں ہے اسے صرف ادب سکھانے کے لئے کوڑے مارے جائیں گے کہتے ہیں یہی بات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں اور یہی موقف' طاوس' سعید بن جبیر' ابو عبید اور داؤد ظاہری کا ان سے منقول ایک روایت میں ہے ان تمام نے آیت کو عام حکم پر مقدم کیا۔

ان لوگوں نے اس قسم کی احادیث کا جو ابو ہریرہ' زید بن خالد سے صحیحین وغیرہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لونڈی کے بارہ میں پوچھا گیا جو غیر شادی شدہ ہو اور زنا کرلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ زنا کرلے تو اسے کوڑے مارو' پھر اگر زنا کرے تو کوڑے مارو' پھر اگر زنا کرے تو اسے فروخت کردو اگرچہ بالوں کی رسی کے بدلہ میں فروخت کرنا پڑے۔

جن لوگوں نے ان احادیث کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا ہے تو ان کا یہ جواب غلط ہے، کیونکہ یہ حدیث بھی جو صحیحین میں موجود ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کسی کی لونڈی بدکاری کرے تو اسے حد لگاؤ اور اسے ملامت نہ کرو' پھر اگر بدکاری کرو تو اسے حد لگاؤ۔ (الحدیث)

مسلم میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! اپنی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ پر لونڈیوں پر حد لگاؤ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک لونڈی نے زنا کیا تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے کوڑے لگاؤں۔ (الحدیث)

لیکن سعید بن منصور' ابن خزیمہ اور بیہقی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لونڈی پر کوئی حد نہیں جب تک کہ وہ کسی خاوند کے ساتھ بیاہی نہ جائے اور جب وہ شادی شدہ ہو جائے پھر تو اس پر شادی شدہ عورتوں کی سزا میں سے نصف سزا ہے۔ ابن خزیمہ اور بیہقی فرماتے ہیں کہ اس کا مرفوع بیان کرنا غلطی ہے اور اس کا موقوف ہونا درست ہے۔

فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ "پھر اگر وہ بے حیائی کا کام کریں۔" تو یہاں بے حیائی سے مراد زنا ہے۔ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ "تو انہیں آدھی سزا ہے اس سزا سے جو آزاد

عورتوں کی ہے۔'' یعنی آزاد باکرہ عورتیں مراد ہیں' کیونکہ ثیبہ کی سزا رجم کرنا ہے یہ ایسی سزا ہے جس کو نصف نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قول کے مطابق یہاں محصنات سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں کیونکہ انہیں کوڑوں اور رجم کی سزا ہے' رجم تو نصف نہیں ہو سکتا اور جوان پر کوڑوں کی سزا بنتی ہے تو وہ ان لونڈیوں پر نصف ہو جائے گی۔

مِنَ الْعَذَابِ ۔ ''سزا سے'' اس سے یہاں مراد کوڑے ہیں لونڈیوں کی حد آزاد عورت سے اس لئے تھوڑی رکھی کہ وہ زیادہ کمزور ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے کہ جس طرح آزاد عورت اپنے مقصد (بدکاری) کو حاصل کر لیتی ہے اس طرح وہ نہیں کر سکتی۔ ایک قول یہ ہے کہ سزا بھی بقدر نعمت ہوتی ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ یُضٰعَفْ لها الْعَذَابُ ضعفين ۔ ''اسے دہرا دہرا عذاب دیا جائے گا۔'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں غلاموں کا تذکرہ نہیں کیا اور وہ قیاس کے راستے لونڈیوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور جس طرح غلام اور لونڈی پر بدکاری کرنے کی صورت میں نصف حد ہے' تو اسی طرح شراب پینے اور تہمت لگانے کی صورت میں نصف حد ہو گی۔

مضمون نمبر:۱۴

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنكُمْ۔

''یہ حکم تم میں سے اس کے لئے ہے جسے یہ خطرہ ہو کہ وہ زنا میں مبتلا ہو جائے گا

یہ لونڈیوں سے نکاح کی طرف اشارہ ہے۔ عنت کا معنی گناہ میں مبتلا ہونا ہے' اس کا لغوی معنی ہے کہ ہڈی کا ٹھیک ہونے کے بعد پھر ٹوٹ جانا پھر استعارہ کے طور پر مشقت کے کام پر بولا جانے لگا۔ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا ۔ اور تمہارا ضبط کرنا لونڈیوں سے نکاح کرنے پر خَيْرٌ لَّكُمْ بہت بہتر ہے' تمہارے لئے ان سے نکاح کرنے سے یعنی تمہارا ضبط کرنا تمہارے لئے بہتر ہے کیونکہ ان سے نکاح کرنا اولاد کو غلامی کی طرف لے جاتا اور خود کو حقیر کام پر آمادہ کرنا ہے۔

مضمون نمبر:۱۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔(النسآء: ۲۹)

''اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ''

باطل کہتے ہیں جو حق اور سچ نہ ہو اس کی وجوہات بہت زیادہ ہیں اور باطل سے وہ سوداگری مراد ہے کہ جس سے شریعت نے منع فرمایا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً ''مگر یہ کہ خرید و فروخت ہو۔''

لغت میں تجارت کا معنی ہے آپس میں کسی چیز کے بدلہ کچھ لینا دینا۔ یہ استثناء منقطع ہے یعنی وہ تجارت ایسی ہو عَنْ تَرَاضٍ مِّنكُمْ۔ "تمہاری آپس کی رضامندی سے۔" یہ تمہارے درمیان جائز ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ تجارت تمہاری آپس کی رضا مندی سے ہو اور تمہارے لئے حلال و جائز بھی ہو۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بقیہ لین دین کی اقسام چھوڑ کر تجارت کا ذکر کیا کیونکہ یہ عام اور اکثر ہوا کرتی ہے اور لفظ تجارت مجازی طور پر نیک اعمال کا بدلہ جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ دیں گے اس کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ اسی معنی میں یہ فرامین الٰہیہ ہیں: هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ (الصف: ۱۰) "کیا میں تمہیں وہ تجارت بتلا دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا لے۔" اور يَرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۔ (الفاطر: ۲۹)
"وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی خسارہ میں نہ ہو گی۔"

اہل علم نے آپس کی رضامندی کے بارہ میں اختلاف کیا ہے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اس کے مکمل ہونے سے یہ واجب یعنی پوری ہو گی وہ اس طرح کہ خریدار اور فروخت کنندہ سودا ہونے کے بعد الگ الگ ہو جائیں یا ان میں سے ایک دوسرے سے کہے کہ پسند کر لو جیسا کہ صحیح حدیث میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا دو سودا کرنے والوں کو جب تک جدا نہ ہوں اختیار حاصل ہے یا ان میں سے ایک دوسرے سے کہے تم پسند کر لو۔ یہی موقف صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا ہے اور یہی قول امام شافعی ثوری اوزاعی لیث ابن عیینہ اور اسحٰق وغیرہ کا ہے۔

امام مالک اور ابوحنیفہ کہتے ہیں بیع اس طرح مکمل ہو گی کہ خریدنے والا زبان سے بات مکمل کر دے تو اس طرح اختیار کا حق ختم ہو جائے گا انہوں نے حدیث کے جواب میں کوئی مفید بات نہیں کہی۔ تجارت کو مرفوع اس بنا پر پڑھا گیا ہے کہ جب کان تامہ ہو اور جب ناقصہ ہو تو منصوب پڑھیں گے۔

امام شوکانی نے اپنی مختصر کتاب میں ایک فائدہ ذکر کیا ہے کہ لین دین میں اعتبار صرف آپس کی رضامندی کا ہے اگرچہ کوئی بولنے کی طاقت رکھنے کے باوجود صرف اشارہ ہی کر دے اور آپ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: اس لئے کہ ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی جو کسی مخصوص لفظ کی طرف رہنمائی کرے جن کو بعض اہل علم معتبر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان لفظوں کے بغیر سودا کرنا جائز نہیں انہیں اس قسم کے الفاظ جو مختلف روایات میں آتے ہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتے کہ میں نے

تجھے یہ چیز فروخت کر دی۔ ہم اس بات کا تو انکار نہیں کرتے یہ ان الفاظ کی ادائیگی سے سودا درست ہوگا جھگڑا تو اس میں ہے کہ سودا صرف انہی الفاظ سے درست ہوگا اس سلسلہ میں کوئی روایت نہیں ملتی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ ''ایسی تجارت جو رضامندی سے ہو۔''

یہ آیت آپس کی رضامندی پر ہی دلالت کرتی ہے اور دلالت کے لئے کوئی لفظ یا اشارہ یا کنایہ ہی ضروری ہے گو وہ کیسا ہی لفظ یا کیسی ہی صورت میں ہو یا کسی مفید اشارہ سے یہ رضامندی حاصل ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی کے لئے کسی مسلمان کا مال جائز نہیں مگر اس کے دل کی خوشی سے اور جب رضامندی کے ساتھ دلی خوشی ہوگئی تو اس کے علاوہ کسی دوسرے کا اعتبار نہ ہوگا۔

مضمون نمبر: ۱۶

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا

''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نہایت مہربان ہے۔''

یعنی اے مسلمانو! تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو مگر ان وجوہات کی بنا پر جنہیں شریعت ثابت کر دے' یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایسے جرائم نہ کرو جن کا انجام قتل ہوتا ہے' وہ اس طرح کہ ایک آدمی دوسرے کو قتل کرے تو وہ خود اس کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے گا۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ انسان خودکشی نہ کرے اس آیت کو ان تمام معانی پر محمول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس بات پر سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا اس آیت سے حجت پکڑنا ہے جبکہ وہ غزوۂ ذات السلاسل میں جنبی ہوئے اور انہوں نے ٹھنڈے پانی سے غسل نہ کیا' نبی ﷺ نے سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ کے اس دلیل بنانے کو باقی رکھا۔ یہ واقعہ مسند احمد اور سنن ابوداؤد وغیرہ میں ہے۔

مضمون نمبر: ۱۷

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ (النساء: ۳۴)

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔''

یہ جملہ مستأنفہ ہے جو اس علت کی وضاحت پر مشتمل ہے جو مردوں کو ان عورتوں پر زائد حق دیتی ہے گویا یوں کہا گیا: مردوں کے وہ کون سے حقوق ہیں جن میں ان کے ساتھ عورتیں شامل نہیں؟ تو فرمایا مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ مرد ان عورتوں سے تکلیف دور

کرتے ہیں جیسا کہ حاکم اور امراء اپنی رعایا سے تکلیف وغیرہ دور کرتے ہیں' مزید یہ کہ ان کی ضروریات مثلاً خرچہ' پہناوا' اور رہائش وغیرہ کا بندوبست کرتے ہیں' یہاں مبالغہ کا صیغہ استعمال ہوا جوان کے خود مختار ہونے حکم میں دلیل ہے۔

بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ۔ ''اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے فضیلت دی ہے۔'' اس جملہ میں باء سببیہ ہے۔ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ ''ایک کو دوسرے پر۔'' اس میں ضمیر مرد اور عورتوں کی طرف لوٹتی ہے' یعنی مرد اس مقام کے حق دار اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے ان مردوں کو فضیلت و برتری اس طرح عطا کی کہ خلیفہ اور حاکم سلطان و امراء ان میں سے ہوتے ہیں اور جنگیں بھی یہ لڑتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا۔ ''اور اس وجہ سے کہ مردوں نے خرچ کئے ہیں۔'' یعنی اس سبب سے جو انہوں نے خرچ کئے مِنْ اَمْوَالِهِمْ ''اپنے اموال سے۔'' یہاں مَا مصدریہ یا موصولہ ہے اسی طرح بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ میں بھی مَا مصدریہ یا موصولہ ہے۔ من تبعیضیہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جوان مردوں نے ان عورتوں پر خرچ کیا اور جوان کے مہر میں اپنے مال دیئے' اسی طرح جو وہ جہاد میں خرچ کرتے ہیں اور دیت وغیرہ انہیں ادا کرنا پڑتی ہے۔

علماء کی ایک جماعت نے اس آیت سے نکاح فسخ کرنے کو جائز قرار دیا ہے جبکہ خاوند اپنی بیوی کے نان ونفقہ سے عاجز آ جائے' یہی قول امام مالک اور شافعی وغیرہ کا ہے۔

مضمون نمبر: ۱۸

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ۔

''اور جن عورتوں کی نافرمانی اور بدماغی کا تمہیں خوف ہو۔''

یہ خطاب خاوندوں سے ہے۔ ایک قول کے مطابق یہاں خوف سے مراد دل کی وہ حالت ہے جو کسی ناپسندیدہ چیز کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے یا کسی ناپسندیدہ بات کے ظاہر ہونے کے خوف سے جو کہ دل میں پیدا ہوتی ہے اور ایک قول کے مطابق یہاں خوف سے مراد علم ہے۔

نشوز نافرمانی کو کہتے ہیں۔ ابن فارس کہتے ہیں جو عورت کے بارہ میں لفظ نشوز آئے تو معنی یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے خاوند کی نافرمانی کی اور یہ لفظ خاوند کے بارہ میں اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ وہ اس عورت کو مارے اور اس پر ظلم کرے۔

فَعِظُوْهُنَّ۔ ''انہیں نصیحت کرو۔''

یعنی انہیں سمجھاؤ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمہ اطاعت و فرمانبرداری لازم کی ہے اور اچھی طرح رہنا لازم کہا ہے انہیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے ڈراؤ اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شوق دلاؤ۔ **وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ** ''اور انہیں الگ بستروں پر چھوڑ دو۔'' کہا جاتا ہے **هَجَرَهُ** یعنی اس سے دور ہوا اور مضاجع مضجع کی جمع ہے' یہ لیٹنے کی جگہ کو کہتے ہیں' یعنی ان کی خواب گاہ سے دور ہو جاؤ اور انہیں اپنے لحاف یا چادر وغیرہ میں سونے کے وقت نہ سلاؤ۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے کہ سوتے ہوئے ان کی طرف اپنی پشت پھیر لو۔ ایک قول کے مطابق صحبت چھوڑنے کی طرف کنایہ ہے اور ایک قول کے مطابق وہ عورت اس گھر میں رات نہ گذارے جس میں اس کی خواب گاہ ہے۔

وَاضْرِبُوْهُنَّ۔ ''اور انہیں مار کی سزا دو۔''

یعنی ایسا مارو جو ہڈی نہ توڑے اور عیب دار نہ کر دے۔ قرآن کریم کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب خاوند کو نافرمانی کا خطرہ ہو تو وہ ان تمام امور کو بجا لا سکتا ہے۔ ایک قول کے مطابق بستر کو اس وقت الگ کرے گا جب وعظ و نصیحت اثر نہ کرے اگر وعظ و نصیحت اثر کر جائے تو پھر بستر چھوڑنے کی طرف نہ جائے اور اگر بستر الگ کرنا ہی کافی ہو تو پھر مارنا نہیں چاہیے۔

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ۔ ''پھر اگر وہ تمہاری تابعداری کریں۔''

جس طرح لازم ہے اور نافرمانی چھوڑ دیں۔ **فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا**۔ ''تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔'' یعنی پھر ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو' یعنی ایسی بات یا ایسا کام جسے وہ برا سمجھتی ہو نہ کرو۔ ایک قول کے مطابق انہیں اپنے ساتھ محبت کرنے کی تکلیف نہ دو کیونکہ یہ ان کے اختیار میں نہیں۔

مضمون نمبر:۱۹

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا۔

(النساء:۳۵)

''اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان آپس کی ان بن کا خوف ہو تو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں میں سے مقرر کرو۔''

شقاق کا اصل معنی یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر کوئی ایسی سمت اختیار کرے جو دوسری سمت سے مختلف ہو یعنی وہ کونہ جو اس کونے کے علاوہ ہے اور شقاق کو ایک جگہ کی طرف منسوب کیا مفعول کی جگہ استعمال کرنے کے لئے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے بل مکر اللیل و النھار کہ "دن رات مکر وفریب" اور عربوں کا مقولہ "یاسارق اللیلۃ اھل الدار" اے رات کو چلنے والے گھر والے" اس آیت میں خطاب حکام وامراء کو ہے اور بیھنما کی ضمیر میاں بیوی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لئے کہ اس چیز کا ذکر پہلے گذر چکا جو ان دو پر دلالت کرتا ہے اور وہ ذکر ہے الرجال والنساء پس تم میاں بیوی کی طرف ایک فیصل بھیجو جو ان کے درمیان فیصلہ کرے اور یہ فیصلہ کرنے والا اس لائق ہو کہ اس کے عقل اس کا دین اس کا عدل وانصاف درست ہو۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکم دیا کہ یہ دو فیصلہ کرنے والے میاں اور بیوی کے گھر والوں میں سے ہوں' کیونکہ یہ دونوں ان کے حالات کو زیادہ قریب سے جانتے ہیں اور جب ان کے اہل سے کوئی فیصلہ کی صلاحیت رکھنے والا شخص موجود نہ ہو' تو ان کے علاوہ کسی غیر آدمیوں افراد کو حاکم مقرر کریں۔ یہ اس وقت ہوگا جب ان میاں بیوی کا معاملہ زیادہ پیچیدہ ہو جائے اور واضح نہ ہوتا ہو کہ ان میں سے غلطی کس کی ہے' ہاں جب غلطی معلوم ہو جائے تو پھر دوسرے کو اس سے حق دلوایا جائے گا۔ دونوں فیصلہ کرنے والوں پر یہ لازم ہے کہ وہ پوری محنت کے ساتھ ان دونوں میں اصلاح کی کوشش کریں اگر اس بات پر عمل کرنے کی طاقت ہو اور اگر وہ ان کی صورت حال کو درست کرنے سے عاجز آ جائیں اور ان کے درمیان جدائی کے سوا کوئی حل نہ دیکھیں تو ان کے لئے جائز ہے کہ حاکم شہر یا کسی طلاق کے ذمہ دار شخص کی اجازت کے بغیر بھی علیحدگی کروا سکتے ہیں یہی موقف امام مالک' اوزاعی اور اسحٰق کا ہے' اور یہی بات سیدنا عثمان' سیدنا علی ابن عباس' رضی اللہ عنہم شعبی' نخعی اور شافعی رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

ابن کثیر جمہور سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا یہ فیصلہ اس لئے کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے حکم ہے کہ یہ دونوں فیصلہ کرنے والے ہوں نہ تو یہ وکیل ہیں نہ گواہ۔ اہل کوفہ' عطاء' ابن زید اور امام شافعی کے ایک قول کے مطابق یہ سب فرماتے ہیں کہ جدائی ڈالنا امام وقت یا حاکم شہر کا اختیار ہے نہ کہ ان دو افراد کا جنہیں میاں بیوی کی طرف سے وکیل بنایا گیا ہے یا پھر جن دو افراد کو امام اور حاکم فیصلہ کرنے کا حکم دیں اس لئے کہ یہ دونوں قاصد اور گواہ ہیں انہیں اپنے طور پر جدائی ڈالنے کا اختیار نہیں۔

اس بات کی طرف یہ فرمان الٰہی رہنمائی کرتا ہے اِنْ یُّرِیْدَآ اگر وہ دونوں ارادہ کریں یعنی دو فیصلہ کرنے والے اِصْلَاحًا اصلاح کا میاں بیوی کے درمیان یُوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا تو اللہ تعالیٰ دونوں میں ملاپ کرادے گا' یعنی اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان موافقت پیدا کردے گا نتیجتاً وہ دونوں آپس کی الفت ومحبت کی طرف پلٹ آئیں گے اور اچھی زندگی گذارنے لگیں گے۔ ارادہ کا معنی دو فیصلہ کرنے والوں کی نیت کا اخلاص ہے کہ وہ میاں بیوی کے درمیاں صلح چاہتے ہیں۔

ایک قول کے مطابق یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا میں ضمیر فیصلہ کرنے والوں کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے۔ اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یعنی اللہ تعالیٰ فیصلہ کرنے والوں کو کسی ایک بات پر متفق کردے اور ان دونوں کا مقصد حاصل ہو جائے اور ایک قول کے مطابق دو ضمیریں میاں بیوی کے لئے ہیں' یعنی اگر وہ دونوں آپس میں اس جھگڑے کو چھوڑ کر اصلاح چاہتے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت اور الفت پیدا کردیں گے۔ جب دونوں فیصلہ کرنے والے مختلف ہو جائیں تو ان میں سے کسی کے فیصلہ کو نافذ نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی کی بات کو قبول کرنا ضروری ہے اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں۔

مضمون نمبر:۲۰

وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ۔ (النساء:۳۶)

''اور ماں باپ کے ساتھ سلوک احسان کرو۔''

یہ فعل محذوف کا مصدر ہے' یعنی اپنے والدین کے ساتھ کو حسن سلوک سے پیش آؤ۔ ابن ابی عبلہ نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کا حکم اور اس کے ساتھ شرک کرنے سے روکنے کے بعد والدین کے ساتھ سلوک واحسان کرنے کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں (والدین) کا حق بہت بڑا ہے مثلاً فرمان باری تعالیٰ ہے اَنِ اشْکُرْلِیْ وَ لِوَالِدَیْکَ۔ ''تم میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو۔'' اس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ میرے ساتھ ساتھ ان دونوں کا بھی شکر ادا کرے۔

وَّ بِذِی الْقُرْبٰی۔ ''اور رشتہ داروں سے۔''

یعنی قرابت والا' یہ لفظ اس پر بولنا درست ہے جس پر قرابت کا نام لیا جائے اگر چہ وہ دور کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنِ ''اور یتیموں سے اور مسکینوں سے۔'' ان کی تفسیر

پہلے گذر چکی ہے۔

معنی یہ ہوا کہ رشتہ داروں کے ساتھ احسان کیا جائے اور اس آیت میں مذکور تمام لوگوں کے ساتھ سلوک واحسان کرو وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی ''اور قرابت دار ہمسایہ سے۔'' اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس پر ہمسائیگی کا لفظ بولا جائے باوجود اس کے کہ اس کا گھر دور ہو۔ اس حکم میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ بغیر کسی تخصیص کے نیکی کرنے کی دلیل ہے' اگر چہ ان کے گھر قریب قریب ہوں یا دور اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ہمسایہ کی عزت واحترام کے خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور اس میں اس شخص کا رد ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ لفظ ہمسایہ آپس میں ملاپ کے ساتھ مخصوص ہے کہ ان دو کے درمیان کچھ حائل نہ ہو یا یہ لفظ دور والوں کو چھوڑ کر قریب والوں کے ساتھ خاص ہے۔ ایک قول کے مطابق فرمان الٰہی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ سے مراد یہاں مسافر شخص ہے ایک قول کے مطابق وہ ایسا اجنبی ہے کہ اس کے اور اس ہمسائے کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو۔ اعمش اور مفضل وَ الْجَارِ الْجَنْبِ پڑھتے ہیں' یعنی پہلو والا ایک طرف والا اخفش کا ایک شعر ہے ؎

لوگ ایک طرف اور امیر دوسری طرف ہیں

ایک قول کے مطابق ہمسایہ رشتہ دار سے مراد مسلمان ہیں اور اجنبی ہمسایہ سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ اہل علم کا اس مقدار میں اختلاف ہے کہ کہاں تک ہمسایہ کا لفظ بولا جاسکتا ہے اور کہاں تک اس کے حقوق لازم ہیں۔ اوزاعی اور حسن سے مروی ہے کہ اس کے گھر سے ہر طرف کے چالیس گھر مراد ہیں ' زہری سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ایک قول کے مطابق جس نے نماز کی اقامت سنی۔ ایک قول کے مطابق جہاں تک ان دونوں کا محلہ ایک ہے جہاں تک اذان کی آواز آتی ہے۔ سب سے مناسب بات یہ ہے کہ ہمسایہ کا معنی سمجھنے کے لئے شریعت کی طرف رجوع کیا جائے' اگر اس میں ایسی ضروری وضاحت موجود ہے کہ لفظ ہمسایہ گھروں میں سے کسی حد تک یا اتنی زمین کی مسافت تک بولا جاسکتا ہے' تو اس کے مطابق عمل کو متعین کیا جائے گا اور اگر وہاں یہ نہ مل سکا تو پھر لغت اور عرف میں اس کے معنی کو تلاش کریں گے۔

شریعت میں تو ایسی کوئی بات منقول نہیں جس میں لفظ ہمسایہ کا معنی ومفہوم موجود ہو کہ اس شخص کے اور ہمسایہ کے درمیان اتنی مقدار ہونی چاہیے اور نہ ہی عرب کی لغت میں ایسی کوئی بات

موجود ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے بلکہ لغت میں "جار" سے مراد وہ ہے جو قریب بیٹھنے والا ہے اور یہ کئی معانی پر بولا جاتا ہے۔صاحب قاموس فرماتے ہیں کہ ہمسایہ اس کو کہتے ہیں' جو قریب بیٹھے اور وہ جسے آپ ظلم سے پناہ دیں اور "مجیر" محافظ کو کہتے ہیں اور عورت کے خاوند کو اور کسی کی بیوی کو عورت کی شرمگاہ کو اور جو گھر کے اعتبار سے قریب ہو اور سرین بھی ہمسایہ کی طرح ہے اور شریک غم ہونے والا اور حلیف اور مددگار بھی ہمسایہ ہے۔

امام قرطبی اپنے تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں ایک قوم کے محلہ میں رہتا ہوں اور میرا سب سے قریبی ہمسایہ ان سب کی نسبت مجھے زیادہ تکلیف دیتا ہے' تو نبی ﷺ نے سیدنا ابوبکر' سیدنا عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم کو فرمایا وہ مسجد کے دروازوں پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دیں' خبردار چالیس گھروں تک ہمسایہ ہے اور وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کا پڑوسی اس کی تکلیفوں سے محفوظ نہ ہو۔'' انہوں نے بیان کیا امام شوکانی فرماتے ہیں اگر یہ واقعہ ثابت ہو جائے تو اس کے علاوہ کسی کی ضرورت نہ ہو گی لیکن جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کسی معروف حدیث کی کتاب کی طرف نسبت کئے بغیر' امام قرطبی اگرچہ علم روایت میں امام ہیں لیکن پھر بھی قابل ذکر سند کے بغیر کی ہوئی ان کی روایت وصل کے قابل نہیں اور نہ ہی یہ بات کسی مشہور کتاب سے انہوں نے نقل کی ہے' اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قرطبی اکثر بیکار باتیں لکھ دیتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنے تذکرہ میں لکھا۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث انہیں الفاظ کے ساتھ امام طبرانی نے نقل کی ہے جیسا کہ ترغیب و ترہیب میں منقول ہے اور امام سیوطی اپنے جامع الصغیر میں نقل کرتے ہیں کہ ہمسائیگی چالیس گھروں تک ہے۔امام بیہقی ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتے ہیں' مناوی اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے جبرائیل نے ہمسایوں کے بارہ میں وصیت کی کہ یہ چالیس گھروں تک ہے۔ یہ دونوں روایات ضعیف ہیں۔معروف اور مرسل وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے نقل کیا' اسی طرح امام سیوطی سے منقول ہے پھر فرمایا: ابوداؤد کے مرسل الفاظ یہ ہیں کہ ہمسائیگی کے حقوق چالیس گھروں تک ہے اس طرف' اس طرف آپ ﷺ نے آگے پیچھے اور دائیں طرف اشارہ کیا امام زرکشی فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند کے تمام رجال ثقہ ہے اور ابویعلی نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مذکورہ الفاظ مرفوعا بیان کیا ہے' لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس

کی سند میں عبدالسلام نامی ایک راوی منکر الحدیث ہے' لہٰذا یہ تمام باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ قرآن مجید میں منقول ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایک شہر میں رہنے والے آپس میں ہمسایہ ہوتے ہیں' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا۔

''اگر اب بھی یہ منافق اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور وہ لوگ جو مدینہ میں غلط افواہیں اڑانے والے ہیں باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کی تباہی پر مسلط کر دیں گے۔ پھر تو وہ چند دن ہمارے آپ کے ساتھ اس شہر میں رہ سکیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں ان سب کا اکٹھا رہنا ہمسائیگی قرار دیا لیکن عرف عام میں ہمسائیگی کا لفظ علاقوں کی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اور قرآن مجید کو عرف عام اور طے شدہ اصطلاحات پر محمول کرنا درست نہیں۔

وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ۔ ''اور پہلو کے ساتھی سے۔''

ایک قول کے مطابق اس سے مراد سفر کا ساتھی ہے' یہ بات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما' سعید بن جبیر' عکرمہ' مجاہد اور ضحاک نے کہی۔ سیدنا علی' سیدنا ابن مسعود اور ابن ابی لیلی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد بیوی ہے ابن جریج کہتے ہیں اس سے مراد وہ شخص ہے جو تجھ سے کسی فائدے کی امید پر تیرے ساتھ چمٹا رہے۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ آیت ان تمام اقوال کو شامل ہو' اس پر مزید یہ کہ یہ آیت ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جو آپ کے پہلو کا ساتھی ہو جیسا کہ کوئی آپ کے پہلو میں علم حاصل کرنے کے لئے یا کوئی کاریگری سیکھنے کے لئے یا تجارت وغیرہ کی غرض سے۔ کھڑا ہے

وَ ابْنِ السَّبِيْلِ۔ ''اور راہ کے مسافر سے۔''

مجاہد کہتے ہیں اس سے مراد وہ شخص ہے جو گذرتے ہوئے تیرے پاس سے آگے نکل جائے' سبیل سے مراد راستہ ہے تو مسافر کی اس کی طرف نسبت کی اس لئے کہ یہ اس پر چلتا ہے اور اس کو لازم پکڑے ہوئے ہیں' تو سب سے مناسب تفسیر یہ ہے اس سے مراد وہ شخص ہے جو سفر میں ہو اور مقیم پر واجب ہے کہ وہ اس کے ساتھ نیکی کرے۔ ایک قول کے مطابق مندرجہ بالا تفسیر کی سند منقطع ہے اور ایک قول کے مطابق ضعیف ہے۔

احسان کرو وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ جن کے مالک تمہارے ہاتھ ہیں ان سے

احسان کرنا' اس سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں۔

نبی ﷺ نے حکم فرمایا کہ ان کے مالک جو خود کھائیں وہ انہیں بھی کھلائیں اور جو خود پہنیں انہیں بھی پہنائیں۔ رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً ملتا ہے کہ والدین' قریبی رشتہ داروں یتیموں اور ہمسایوں کے ساتھ نیکی کرو۔ غلاموں کی ضروریات کو پورا کرنے کے بارہ میں بہت احادیث ملتی ہیں اور جس موضوع پر سنت کی کتابیں بھری پڑی ہیں تو ہمیں اس بات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

مضمون نمبر: ۲۱.

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ (النسآء: ۴۳)

''اے ایمان والو!۔''

یہاں خطاب بالخصوص مومنوں سے ہے کیونکہ یہی لوگ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب آتے ہیں لیکن کافر تو نشہ کی حالت میں اور نہ ہی نشہ کے بغیر نماز کے قریب نہیں آتے۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ۔ ''نماز کے قریب نہ جاؤ۔''

بغوی کہتے ہیں جب لاتقرب' میں لاء پر زبر پڑھیں تو معنی ہوگا کہ تم اس کام میں مبتلا نہ ہو اور جب لاء پر پیش پڑھی جائے تو معنی ہوگا کہ قریب نہ جاؤ۔

یہاں روکنے کا مقصد نماز کو خلط ملط کرنے اور نشہ کی حالت میں آنے سے منع کرنا ہے۔ یہی بات مفسرین کی ایک جماعت نے کہی اور یہی موقف امام ابوحنیفہ کا ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں اس سے مراد نماز کے مقالات ہیں یہ قول امام شافعی کا ہے۔ اس بنا پر یہاں مضاف کو مقدر ماننا ضروری ہوگا اور اسے یہ فرمان الٰہی مزید مضبوط کرتا ہے۔ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ۔

ایک جماعت کا کہنا ہے اس سے نماز اور ان کے مقالات دونوں مراد ہیں کیونکہ وہ اس وقت مسجد میں نماز ہی کے لئے آتے اور نماز باجماعت ادا کرتے تھے' تو یہ دونوں معانی لازم وملزوم ہوئے۔

وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی۔ ''جب تم نشہ میں مست ہو۔''

یہ جملہ حال ہونے کی وجہ سے محل نصب ہے۔ سکاری' سکران کی جمع ہے جیسے کسالی' کسلان کی جمع ہے۔ نخعی سَکاری پڑھتے ہیں یہ سکران کی جمع مکسر ہے۔ اعمش حبلی کے

وزن پر سکوی پڑھتے ہیں۔ جو صفت ہے اور مفرد کا صیلہ ہے۔

تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں سکر سے مراد شراب کا نشہ ہے۔ جبکہ ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد نیند کا نشہ ہے اور اس کا معنی شراب نہیں ہے۔ عبد بن حمید سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس سے مراد اونگھ ہے۔

عبد بن حمید ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن جریر' ابن منذر' ابن ابی حاتم اور حاکم (حاکم نے مختارہ میں اس کو صحیح کہا ہے) سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہمارے لئے کھانا پکایا' ہمیں دعوت دی اور ہمیں شراب پلائی تو اس نے ہماری عقلوں کو جکڑ لیا اور نماز کا وقت ہوا تو انہوں نے مجھے آگے کیا میں نے اس طرح قراءت کی قُلْ يَآ أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ 'تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ابن جریر اور ابن منذر، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نماز پڑھانے والے سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے۔

ابن منذر عکرمہ سے اس آیت کے بارہ میں نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت سیدنا ابوبکر' عمر' علی' سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف اور سیدنا سعد کے بارہ میں نازل ہوئی' سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کھانا پینا تیار کیا' انہوں نے کھایا پیا پھر مغرب کی نماز پڑھائی تو قُلْ يَآ أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۔ آخر تک پڑھی آخر میں کہا لَيْسَ لِيْ دِيْنٌ وَلَيْسَ لَكُمْ دِيْنٌ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ آیت کا شان نزول ہے اسی سے درست باتوں کے مخالفین کے اقوال کا رد ہوتا ہے۔

حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ "جب تک کہ اپنی بات کو سمجھنے نہ لگو۔"

یہ نماز کے قریب آنے سے نشہ کی حالت میں جو روکا گیا ہے اس کی انتہا ہے۔ یعنی اس وقت آؤ جبکہ تم سے نشہ کی حالت زائل ہو جائے اور تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو کیونکہ نشہ میں مبتلا کو معلوم نہیں ہوتا وہ کیا کہہ رہا ہے' اسی کو بطور دلیل انہوں نے لیا جو اس بات کے قائل ہیں نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی کیونکہ جب اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تو اس کے ارادے کی نفی کر دی جائے گی۔ یہی موقف سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ' ابن سیدنا عباس رضی اللہ عنہما' طاؤس اور عطاء کا ہے۔

قاسم اور ربیعہ کہتے ہیں کہ یہی قول لیث بن سعد' اسحٰق' ابوثور اور مزنی کا ہے اور طحاوی نے بھی اسے ہی پسند کیا ہے' وہ کہتے ہیں: علماء کا اجماع ہے کہ نا سمجھ آدمی کی طلاق پر عمل جائز نہیں کیونکہ

نشہ میں مبتلا نا سمجھ ہے' جیسے وہ شخص کہ جسے جن چمٹے ہوئے ہوں۔ایک جماعت نے اس کی طلاق کے واقع ہونے کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ سیدنا عمر بن خطاب' سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ یہی قول ابوحنیفہ' ثوری اور اوزاعی کا ہے۔امام شافعی کا قول ان سے مختلف ہے۔امام مالک کا قول ہے طلاق واقع ہو جائے گی اور زخموں اور قتل کا بدلہ لینا بھی ایسے افراد سے لازم ہے مگر اس کا نکاح اور خرید و فروخت درست نہیں ہے' یعنی اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

وَ لَا جُنُبًا "اور نہ جنابت کی حالت میں۔"

یہ جملہ حالیہ بن کر وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی پر عطف ہے۔ جنابت کا لفظ مؤنث نہیں اور یہ تثنیہ اور جمع پر بھی نہیں بولا جاتا کیونکہ یہ مصدر سے ملا ہوا ہے جیسا کہ بعد اور قرب ہے۔فراء کہتے ہیں مقولہ یہ ہے کہ آدمی جنبی ہو گیا اور وہ جنابت سے جنبی ہوا۔ایک قول کے مطابق جنب کی جمع اجناب آتی ہے۔ایک لغت کے مطابق' عنق اور طنب کی طرح کہ ان کی جمع اعناق اور اطناب آتی ہے۔

اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ "ہاں مگر راہ چلتے گذر جانے والے۔"

یہ استثناء مفرغ ہے' یعنی تم کسی بھی صورت میں نماز کے قریب نہیں جا سکتے سوائے اس صورت کے کہ تم نے نماز سے گذرنا ہو۔ یہاں گذرنے سے مراد سفر ہے۔ لَا تَقْرَبُوا کی ضمیر کی وجہ سے یہ حال ہونے کی بناء پر نصبی حالت میں ہے۔دوسرا حال وَ لَا جُنُبًا بھی اس کی قید ہے اور پہلا حال یعنی وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی قید نہیں۔پس معنی یہ ہوا کہ تم نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم جنبی ہو مگر جبکہ تم مسافر ہو تو اس وقت تم تیمم کر کے نماز ادا کر سکتے ہو۔ یہ قول سیدنا علی ابن سیدنا عباس رضی اللہ عنہما' ابن جبیر' مجاہد اور حکم وغیرہ کا ہے وہ کہتے ہیں: کسی کے لئے جائز نہیں کہ جنابت کی حالت میں نماز کے قریب آئے مگر جب تک کہ وہ غسل نہ کر لے۔ یہ حکم مسافر کے علاوہ ہے کیونکہ وہ تیمم کر سکتا ہے اس لئے کہ دوران سفر پانی نہیں ہوتا اور پانی کی عدم دستیابی حضر میں عموماً نہیں ہوتی سو وہاں یہ حکم نہ ہو گا۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ' عکرمہ' نخعی' عمرو بن دینار' مالک اور شافعی فرماتے ہیں: راہ گذر وہ ہے جو مسجد سے گذر جائے۔ یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہو گا تم نماز کے مقامات یعنی جنابت کی حالت میں۔ مساجد کے قریب نہ جاؤ' ہاں اگر تم اس کی ایک جانب سے

دوسری طرف گذرنا چاہو تو اجازت ہے۔ پہلے قول میں مضبوطی ہے اس اعتبار سے کہ اس میں نماز کے قریب جانے سے روکا ہے' پھر اس میں اس کے حقیقی معنی کو باقی رکھا گیا ہے اور اس میں کچھ کمزوری بھی ہے اس اعتبار سے کہ عَابِرِ سَبِیْلٍ کو مسافر پر محمول کیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس میں معنی بیان ہوا کہ پانی کی عدم موجودگی میں تیمم کر کے قریب آسکتے ہیں' تو بیشک یہ حکم پانی کی عدم موجودگی کا جس طرح مسافر کے لئے ہے اسی طرح مقیم کے لئے بھی ہے اور دوسرے قول میں اس اعتبار سے قوت ہے کہ اس میں فرمان باری تعالیٰ اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ کے معنی میں تکلف نہیں کیا گیا اور اس اعتبار سے کمزوری ہے کہ نماز کو اس کے مقامات پر محمول کیا گیا ہے۔

مختصراً یہ ہے کہ پہلا حال' یعنی وانتم سکاری الصلاۃ کو اپنی حقیقی معنی پر باقی رکھنے کے لئے اضافت کرنے والے مقدر کے لفظ کے بغیر ہی مضبوط کرتا ہے' اسی طرح آیت کا شان نزول بھی اس کو مضبوط کرتا ہے اور فرمان باری تعالیٰ اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ اضافت کرنے والی تقدیر کو مضبوط کرتا ہے' یعنی تم نماز کے مقامات کی قریب نہ جاؤ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ روکنے کی بعض قیود میری مراد یہ ہے کہ (تم قریب نہ جاؤ) اس حال میں کہ تم نشے میں ہو' یہ بات دلیل ہے کہ اس سے مراد نماز کے مقامات ہیں اور کوئی مانع نہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو اس کی قید سمیت مراد لیا جائے جو قید اس پر دلالت کرتی ہو' تو عبارت اس طرح ہوگی ''دونوں نہی ہر ایک ان میں سے مقید ہے ایک قید کے ساتھ' وہ اس طرح کہ تم نماز کے قریب نہ جاؤ جو ذکر واذکار والی رکن والی ہے اس حال میں کہ تم نشے میں ہو اور تم نماز کے مقامات کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم جنبی ہو مگر اس صورت میں جا سکتے ہو کہ تمہیں مسجد کے ایک جانب سے دوسری جانب گذرنا ہو۔ آخری بات جو اس بارہ میں کہی گئی کہ یہ حقیقت اور مجاز کو جمع کرنے کی صورت ہے اور یہ ایک مشہور تاویل کے مطابق جائز ہے۔

ابن جریر ان دو اقوال کو بیان کر کے فرماتے ہیں اس شخص کا قول زیادہ مناسب ہے جو یہ کہتا ہے اور نہ جنابت کی حالت میں مگر راستہ سے گذرنے والا ہو اور اللہ تعالیٰ نے مسافر کا حکم جبکہ جنابت کی حالت میں اسے پانی میسر نہ آئے' بیان اس طرح فرمایا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو یا تم نے

عورتوں سے مباشرت کی ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد کرو
یہ حکم تو مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہے کہ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا اگر دونوں سے مراد مسافر ہے تو پھر وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ کا کوئی مفہوم نہ ہوگا اور اس کا حکم اس سے پہلے گذر چکا ہے۔

تو جب اس کا معنی یہ ہے تو عبارت یہ ہوگی آیت کا معنی یہ ہوگا اے ایمان والو! تم نماز کے لئے مساجد کے قریب نہ جاؤ اسی غرض سے کہ تم نے نماز ادا کرنا ہو جبکہ تم نشہ میں ہو حتیٰ کہ تمہیں معلوم ہو جائے جو تم کہہ رہے ہو اور اسی طرح حالت جنابت میں بھی مساجد کی قریب نہ جاؤ عابر السبیل کا معنی یہ بیان کرتے ہیں کسی جگہ کو گذر کر پار کر جانا اس سے ایک مقولہ ہے میں اس راستہ سے گذر گیا تو میں نے اسے پار کر لیا اور اسی طرح ایک اور مقولہ ہے فلاں نے اس نہر کو پار کر لیا جبکہ وہ اس سے گذر کر دوسرے کنارہ پر پہنچ جائے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں اس چیز نے اسے مدد دی یعنی ابن جریر کو وہ جمہور کا قول ہے اور یہی آیت سے ظاہر ہے۔

حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا جب تک کہ غسل نہ کر لو' یہ منع کرنے کا احتمال وقت ہے نماز کے قریب یا جنابت کی حالت میں نماز کے مقامات کے قریب جانے سے معنی یہ ہوا کہ تم حالت جنابت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ غسل نہ کر لو مگر اس وقت جب کہ تم راستہ کو عبور کرنے والے ہو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اور اگر تم بیمار ہو۔ مَرْضٰۤى کہتے ہیں بیماریوں اور صحت کی خرابی کی طرف جسم کا اعتدال میانہ روی کی حد سے نکل جانا اس کی دو اقسام ہیں (۱) زیادہ (۲) تھوڑی۔

یہاں بیماری سے مراد یہ ہے کہ انسان کو خود اپنے آپ کے ہلاک ہونے کا خوف ہو یا پانی کے استعمال کرنے سے کسی نقصان کا ڈر ہو یا اس کا جسم کمزور ہے اور وہ پانی کے مقام تک پہنچنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

حسن سے مروی ہے کہ وہ غسل کر کے طہارت حاصل کرے اگرچہ فوت جائے' تو یہ قول مندرجہ ذیل فرامین باری تعالیٰ سے ہوتا باطل ہے۔

وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ اور لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اور يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ۔

اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یا سفر میں ہو' اس میں جن پر مسافر کا نام صادق آتا ہے اس کے تیمم کا جواز

ہے اور اس میں اختلاف فقہ کی کتب میں پھیلا ہوا ہے۔ جمہور کا موقف ہے کہ ایسا سفر جس میں قصر ہو سکتی ہے اس کی شرط لگانے کی ضرورت نہیں۔ بعض کا کہنا ہے اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔
علماء کا مسافر کے لئے تیمم کرنے کے بارہ میں اجماع ہے اور مقیم کے بارہ میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب اور ابوحنیفہ اور محمد کا موقف ہے کہ مقیم و مسافر کے لئے جائز ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ تندرست مقیم کے لئے تیمم جائز نہیں مگر جبکہ اسے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو۔

أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ۔ ''یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو۔''

غائط کا معنی ہے پست جگہ یہاں سے آنا یہ کنایہ ہے پاخانہ وغیرہ سے' اس کی جمع الغیطان اور اغوطہ آتی ہے۔ عرب لوگ قضائے حاجت کے لئے لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہونے کے لئے اس قسم کے مقامات کا ارادہ کرتے پھر پاخانہ کو غائط کہا جانے لگا۔ غائط میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو وضو توڑنے والی ہیں۔

أَوْ لَـٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ۔ ''یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو۔'' یہ نافع ابن کثیر ابوعمرو عاصم اور ابن عامر کی قراءۃ ہے اور حمزہ اور کسائی لَمَسْتُمُ پڑھتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق تو دونوں قراءتوں سے مراد جماع ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد صرف مباشرت ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ دونوں باتوں کو جمع کرتا ہے۔ محمد بن زید کہتے ہیں لغت کے اعتبار سے مناسب یہ ہے کہ لَامَسْتُمُ کا معنی بوسہ لینا وغیرہ ہو اور لَمَسْتُمُ کا معنی ڈھانپنا ہو۔

علماء نے اس کے معنی میں اختلاف کیا ہے ان کے مختلف اقوال ہیں' ایک گروہ کہتا ہے یہاں جماع کے بغیر ہاتھ سے چھونا خاص ہے۔

علماء کہتے ہیں جنابت والے کے لئے تیمم کی کوئی صورت نہیں بلکہ وہ غسل کرے یا پانی ملنے تک نماز چھوڑ دے۔ یہ سیدنا عمر بن خطاب اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اس بارہ میں ان شہروں کے فقہاء اہل الرائے اور اہل السنہ والوں میں سے۔ کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی۔

اسی طرح صحیح احادیث اس کا رد کرتی ہیں مثلاً سیدنا عمار' سیدنا عمران بن حصین اور سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہم کی حدیث جو جنبی شخص کے تیمم کے بارہ میں آئی ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے اس سے مراد جماع ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ اور وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ۔ یہ بات علی' ابی بن کعب' ابن عباس' مجاہد' طاؤس' حسن'

عبید بن عمیر' سعید بن جبیر' شعبی ' قتادہ' مقاتل بن حیان اور ابو حنیفہ سے مروی ہے۔امام مالک کہتے ہیں جماع کرتے ہوئے چھونے والا تیمم کرے اور ہاتھ سے چھونے والا بھی جب لذت محسوس کرے تو تیمم کرے اور اگر شہوت کے بغیر ہی ہاتھ لگائے تو وضو نہیں' یہی قول احمد اور اسحٰق کا ہے۔

امام شافعی کہتے ہیں جب آدمی کے جسم کا کوئی حصہ عورت کے جسم تک پہنچ جائے گو وہ ہاتھ سے یا اس کے علاوہ کچھ اور ہو' تو اس سے طہارت ختم ہو جائے گی' وگرنہ نہیں۔ یہ بات امام قرطبی نے سیدنا ابن مسعودؓ اور سیدنا ابن عمر ﷺ' زہری اور ربیعہ سے نقل کی ہے۔امام اوزاعی فرماتے ہیں: جب چھونا ہاتھ سے ہو تو طہارت ختم ہو جائے گی اور اگر بغیر ہاتھ کے ہو تو طہارت زائل نہ ہوگی اس لئے کہ فرمان باری تعالیٰ ہے فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ ۔(تو ان کو اپنے ہاتھوں چھوو)۔

ان تمام نے ایسے دلائل پیش کئے ہیں جن کے بارہ میں ہر گروہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ آیت میں مذکورہ چھونے کے بارہ میں جو ہمارا موقف ہے یہ اس کی دلیل ہے۔فرض کریں کہ اس سے مراد جماع ہے تو جو قراءۃ حمزہ اور کسائی سے ان الفاظ سے مروی ہے کہ اَوْ لَمَسْتُمْ یہ تو بغیر شک وشبہ کے احتمال والی ہے' پس احتمال والی بات دلیل نہیں ہو سکتی اور یہ حکم ایسا ہے کہ عام لوگوں کا اس سے واسطہ پڑتا ہے اس سے عام پابندی لازم آئے گی' تو کسی احتمال والی بات سے کوئی چیز ثابت نہیں ہو سکتی اور اس کے مفہوم میں جھگڑا چلا آیا ہے۔

جب آپ مذکورہ بالا مختلف آراء پہچان چکے تو یہ بھی معلوم کر لیں کہ سنت صحیحہ سے ثابت ہے کہ جو جنبی ہو جائے اور پانی میسر نہ ہو تو اس پر تیمم کرنا واجب ہے' تو جنبی شخص اس دلیل میں شامل ہے اور اگر فرض کریں کہ وہ داخل نہیں تو سنت ہی اس کی دلیل کے لئے کافی ہے لیکن وضو یا تیمم کو اس بنا پر کہ عورت کو ہاتھ یا جسم کے کسی حصہ سے چھونے پر واجب قرار دینا اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے درست نہیں جب کہ آپ اس کے متعلق احتمال کو بھی پہچان چکے ہیں۔

البتہ انہوں نے جو یہ دلیل بیان کی کہ نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ اس شخص کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں جو کسی عورت کے پاس گیا جسے وہ پہچانتا نہیں اور اس کے ساتھ سوائے جماع کے وہ سب کچھ جو اپنی بیوی سے کرتا ہے کر لیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ اور دن کے دونوں کناروں اور رات کے حصہ میں نماز قائم کرو، کیونکہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہر ذکر کرنے والوں کے لیے ہے۔

اس حدیث کو امام احمد' ترمذی اور نسائی نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے تو آپ ﷺ نے اسے وضو کرنے کا حکم دیا کیونکہ اس نے عورت کو چھوا ہے اور جماع نہیں کیا۔

آپ پر یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ حدیث محل نزاع پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ نبی ﷺ نماز کے لئے آنے پر وضو کا حکم دیا جس کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا جبکہ یہ فرمان بھی موجود ہے کہ وضو کے بغیر نماز نہیں۔

مزید یہ کہ یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ یہ ابن ابی لیلیٰ کی سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور ان کی آپس میں ملاقات نہیں' جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا تو یہ بھی جان لیں کہ یہاں دراصل اس حکم سے براءت کا اظہار ہے' یہ حکم کسی ایسی دلیل سے ثابت ہو سکتا ہے جو کہ ایسی آلائشوں سے پاک ہو جو اس کے دلیل بننے کی حیثیت کو کم کر دے۔

اسی طرح ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ وضو کرتے' پھر بوس و کنار کرتے' پھر نماز پڑھاتے اور وضو نہ کرتے۔ یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ اسے امام احمد ابن' ابن ابی شیبہ ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور یہ قول کہ یہ روایت حبیب بن ابی ثابت عن عروۃ عن عائشہ ہے اور حبیب نے عروہ سے نہیں سنا' تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام احمد نے اپنی مسند میں ہشام بن عروہ کی حدیث بیان کی ہے عن ابیہ عن عائشہ۔ اور ابن جریر نے لیث عن عطاء عن عائشہ کی حدیث بیان کی ہے اور امام احمد' ابوداؤد' نسائی نے ابو روف الہمد انی عن ابراہیم التیمی عن عائشہ سے بھی حدیث بیان کی ہے اور ابن جریر نے ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی بیان کی ہے اور انہوں نے زینب السہمیہ کی حدیث بھی بیان کی ہے۔ ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان سے روزہ کی حالت میں بوس و کنار کرتے اس وجہ سے نہ آپ روزہ افطار کرتے نہ دوبارہ وضو کرتے اور زینب السہمیہ کی حدیث کے الفاظ ہیں کہ نبی ﷺ بوس و کنار کرتے پھر نماز پڑھتے اور وضو نہ کرتے۔ امام احمد نے زینب السہمیہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت نقل کی ہے۔

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً۔ اور تمہیں پانی نہ ملے۔ اس قید کو اگر گذشتہ تمام صورتوں جو کہ شرط کے بعد ذکر ہوئیں یعنی بیماری، سفر' قضائے حاجت سے لوٹنا اور عورتوں کو چھونے پر لوٹائیں تو اس میں دلیل ہوگی کہ صرف بیماری اور سفر میں تیمم جائز نہیں' بلکہ دو اسباب میں سے ایک کا پانی کی عدم موجودگی میں ضروری ہیں۔ پس مریض کو جائز نہیں کہ وہ تیمم کرے مگر جبکہ پانی موجود نہ ہو' اسی طرح مسافر

کے لئے بھی حکم ہے لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تندرست آدمی بھی جب پانی موجود نہ ہو تو بیمار کی طرح ہے تو بیماری اور سفر کے بیان کرنے کا خاص فائدہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مریض آدمی پانی تک پہنچنے سے عموماً عاجز ہوتا ہے اور اسی طرح مسافر کو بھی اکثر اوقات پانی میسر نہیں آتا۔

اگر بعد والی دو صورتوں کی طرف اسے لوٹائیں میری مراد یہ فرمان باری تعالیٰ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا کہنا ہے' تو اس میں ایک اشکال ہوگا' وہ یہ کہ جس پر لفظ مریض یا مسافر کا اطلاق ہو سکتا ہے اس کے لئے تیمم جائز ہے اگرچہ اس کے پاس پانی موجود ہو اور استعمال کی طاقت بھی رکھتا ہو۔ ایک قول کے مطابق یہ قید بعد والی دو صورتوں کی طرف لوٹتی ہے اس کے باوجود کہ یہ پہلی دونوں صورتوں کے لئے معتبر مانی جائے گی اس لئے کہ یہ قید ان میں بہت کم ہی واقع ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ گفتگو معیار سے گری ہوئی اور ٹھنڈی توجیہ ہے۔

امام مالک اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تیمم کی شرط میں بیماری اور سفر کی شرط کا ذکر اس اعتبار سے کیا کہ عموماً یہ بھی ان لوگوں میں سے ہوتے ہیں جنہیں مقیم کے برخلاف پانی میسر نہیں آتا' کیونکہ عموماً حالت اقامت میں پانی موجود ہوتا ہے اسی لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کا تذکرہ نہیں فرمایا۔

ظاہر بات یہ ہے کہ صرف بیماری تیمم میں داخل ہو سکتی ہے اگرچہ پانی موجود ہو جبکہ اسے استعمال کرنے سے اسی وقت یا آئندہ کبھی نقصان کا اندیشہ ہو اس وقت ہلاک ہونے کا اعتبار نہیں کیا جائے۔ گا اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ اور وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ اور نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ دین آسان ہے۔ مزید فرمایا آسانی دو تنگی پیدا نہ کرو۔ اور فرمایا جو اسے قتل کریں اللہ تعالیٰ انہیں قتل کرے۔ آپ ﷺ نے مزید فرمایا کہ میں آسان شریعت (قانون) کا حکم دیا گیا ہوں۔

پس جب ہم یہ کہیں کہ پانی میسر نہ آنے کی قید تمام کی طرف لوٹتی ہے تو بیماری کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ پانی کی موجودگی میں تیمم جائز ہے جبکہ اس کو استعمال کرنا نقصان دہ ہو۔ اس صورت میں اس قید کا اعتبار اس کے حق میں ہوگا جبکہ اسے استعمال کرنے سے نقصان نہ ہوگا کیونکہ پانی کے استعمال سے نقصان نہ ہونے کے باوجود بیماری میں یہ احتمال موجود ہے کہ وہ اسے

مانگنے یا حاصل کرنے سے عاجز ہو اس لئے کہ اسے بیماری کی وجہ سے کسی دوسری قسم کی بھی کمزوری لاحق ہو سکتی ہے۔

البتہ مسافر کا بیان اس لئے ہے کہ زمین میں چلتے وقت پانی نہ ملنا کوئی انوکھا امر نہیں اور زمین کے تمام علاقے ایک طرح کے نہیں ہوتے۔

فتیمموا تو قصد کرو، تیمم کو لغت میں کہتے ہیں ارادہ کرنے کو پھر یہ کلمہ بہت استعمال ہونے لگا حتیٰ کہ تیمم کا معنی یہ ہوا کہ "چہرہ اور ہاتھوں پر مٹی ملنا" ابن انباری کہتے ہیں عربوں کا جملہ ہے آدمی نے تیمم کیا، یعنی اس نے اپنے چہرہ پر مٹی مل لی یہ لغوی اور شرعی معنی کا اختلاط ہے! کیونکہ عرب تیمم، چہرہ اور ہاتھوں پر مٹی ملنا نہیں جانتے' یہ تو صرف شرعی معنی ہے۔

اس حکم سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وجوب کے لئے ہے اور اسی پر اجماع ہے' اس بارہ میں بہت سی احادیث بیان ہوئی ہیں' تیمم کی تفصیلات اور اس کا طریقہ سنت مطہرہ میں بیان ہوا ہے اور اہل علم کے مقالات فقہ کی کتب میں جمع ہیں۔

صَعِيدًا۔ "پاک مٹی کا" اس سے مراد زمین کا چہرہ ہے گو اس پر مٹی ہو یا نہ ہو یہ بات خلیل ابن اعرابی اور زجاج نے کہی۔ زجاج کہتے ہیں کہ میں اس بارہ میں اہل لغت کا کوئی اختلاف نہیں جانتا' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا جو کچھ زمین کے اوپر ہے ہم اس کو چٹیل میدان بنانے والے ہیں۔ یعنی ایسی سخت زمین بنائیں گے کہ جس پر کچھ بھی نہ اگے اور فرمان الٰہی ہے: فتصبح صعيدا زلقا تو زمین چٹیل ہو جائے گی' زمین کو صعید اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو بھی زمین سے نکلتا ہے یہ اس کی انتہا ہوتی ہے۔ صعید کی جمع صعدان آتی ہے۔

اہل علم کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ کس چیز سے تیمم کافی ہو گا۔ امام مالک ابوحنیفہ ثوری اور طبری کہتے ہیں کہ زمین کی سطح سے تیمم ہونا چاہیے' وہ مٹی ریت یا پتھر جو بھی ہوئی کافی ہو گا' انہوں نے فرمان الٰہی طَيِّبًا سے یہ مراد لیا ہے کہ وہ جگہ پاکیزہ ہو ناپاک نہ ہو۔ امام شافعی' احمد اور ان کے اصحاب کا کہنا ہے کہ تیمم صرف مٹی سے کافی ہو گا انہوں نے صَعِيْدًا زَلَقًا سے استدلال کیا ہے' یعنی ایسی مٹی جو بے عیب پاکیزہ ہو اسی طرح انہوں نے طیبا سے استدلال کیا ہے کہ طیب مٹی وہ ہوتی ہے جس سے کچھ پیدا ہو۔

طیب کے معنی میں مختلف اقوال ہیں: ایک قول ہے کہ پاک ہو۔ ایک قول ہے کہ اگانے والی۔ ایک قول ہے کہ حلال ہو۔ جبکہ احتمال والی بات دلیل بننے کے قابل نہیں ہوتی' اگر کوئی بھی

ایسی چیز نہ ملے جس سے تیمم کیا جا سکے سوائے اس کے جو کتاب اللہ میں ہے تو اس صورت میں پہلے لوگوں کی بات زیادہ درست ہوگی۔

لیکن صحیح مسلم میں سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم عام لوگوں سے تین باتوں سے افضل ہیں (۱) ہماری صفوں کو فرشتوں کی صفوں جیسا کہا گیا (۲) ہمارے لئے تمام زمین کو سجدہ گاہ بنایا گیا (۳) اس کی مٹی کو ہمارے لئے طہارت کا باعث بنایا گیا جب کہ ہمیں پانی نہ ملے۔ ایک روایت میں اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اس کی مٹی کو پاکیزہ بنایا جب ہمیں پانی نہ ملے۔ ایک روایت میں یہ لفظ ہیں: اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اس کی مٹی کو پاک بنایا۔ یہ آیت میں مذکور صعید کی وضاحت کرتی ہے یا وہاں عام حکم کو خاص کرتی ہے یا اس مطلق حکم کو مقید کرتی ہے۔ جو بات ابن فارس نے کتاب الخلیل سے نقل کی وہ اس کی تائید کرتی ہے۔

تم پاک مٹی سے تیمم کرو یعنی اس کی غبار سے' چٹیل پتھر اسے کہتے ہیں جس پر کوئی غبار نہ ہو۔

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ "اپنے مونہہ اور اپنے ہاتھ مل لو۔" یہاں پر مطلق مسح کا ذکر ہے جو ایک یا دو ضربوں کو شامل ہے اور مسح کہنیوں یا کلائیوں تک کو شامل ہے' اس کی وضاحت سنت مطہرہ نے بہت عمدہ اور واضح طور پر کی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب منتقی الاخبار اور دیگر تالیفات میں اس مسئلہ کے بارہ میں ان احادیث میں جمع اور تطبیق ایسے انداز سے کہ جس سے دوسری کتب کی ورق گردانی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اس مسئلہ کے مابین اختلاف میں تطبیق دی ہے کہ مسح ایک ضرب ہے یا دو اور کہنیوں تک ہے یا کلائیوں تک اپنی منتقی کی شرح اور دوسری کتابوں میں جنہیں دیکھ کر انسان کسی دوسری چیز کا محتاج نہیں رہتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دو ضربوں والی تمام احادیث کی سندوں میں کچھ نہ کچھ کلام ہے اگر ان میں سے کسی کی سند صحیح ہو تو اس میں جو اضافہ ہے اسے متعین کر کے اسے ہی لیا جائے گا۔ اور صحیح بات ان سے رکنا ہے اور عمل اس پر کرنا چاہیے جو صحیحین میں سیدنا عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے کہ ایک ضرب کافی ہے' ہاں اگر وہ صحیح ثابت ہو جائے تو اسی زائد مقدار کے مطابق ہی ثابت ہوگا۔

مضمون نمبر: ۲۲

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۔ (۵۸)

''اللہ تعالیٰ تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں نہیں پہنچاؤ۔''

یہ آیت ان اہم آیات میں سے ہے جو بہت زیادہ شرعی احکام پر مشتمل ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ یہاں خطاب تمام امانتوں کے بارہ میں تمام لوگوں کو عام ہے۔علی زید بن اسلم اور شہر بن حوشب سے مروی ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کے حکام سے ہے' پہلی بات زیادہ واضح ہے۔ کسی آدمی کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے نزول کا ایک خاص سبب تھا، وہ اس کی عمومیت کی نفی نہیں کرتا، کیونکہ کتب اصول کا معین قاعدہ یہ ہے کہ سبب کے خصوص کو دیکھ کر کراہت کو خاص نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے عام ہی مانا جاتا ہے اور کبھی حکم عام اور محیط ہوتا ہے۔ بلکہ واحدی کہتے ہیں کہ مفسرین کا اس پر اجماع ہے۔

اس خطاب میں حکام سب سے پہلے داخل ہیں ان پر لازم ہے کہ ان کے ذمہ جو امانتیں ہیں انہیں ادا کریں' ظلم و جور کی روک تھام کریں' اور اپنے فیصلوں میں انصاف کی کوشش کریں۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس خطاب میں شامل ہیں' ان پر بھی لازم ہے جو ان کے ذمہ امانتیں ہیں انہیں ادا کریں اور جو گواہی یا اہم خبر ان کے پاس ہو اسے ادا کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

جو لوگ اس خطاب کو عام قرار دیتے ہیں ان میں سے سیدنا براء بن عازب سیدنا ابن مسعود سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابی بن کعب ہیں' اسے جمہور مفسرین جن میں ابن جریر بھی ہیں' نے پسند کیا ہے اس پر تمام لوگوں کا اجماع ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچانا ضروری ہیں وہ نیک ہوں یا بد جیسا کہ ابن منذر نے کہا۔ امانت جمع ہے امانۃ کی' یہ مفعول کے معنی میں مصدر ہے۔

وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔ ''اور جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو۔''

فیصلہ کرنے کے بارہ میں حتمی حکم ہے کہ فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق ہو اور صرف رائے کے ساتھ نہ ہو' کیونکہ اس طرح یہ بالکل حق کے مطابق نہ ہوگا' ہاں جبکہ اس فیصلہ کی دلیل کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے موجود ہو' اس فیصلہ کرنے والے کو جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کو جانتا ہے' رائے سے اجتہاد کرنے میں کوئی حرج نہیں حکم شریعت کی عدم موجودگی کے وقت اس کا فیصلہ حق کے سب سے زیادہ قریب ہوگا لیکن جو حاکم اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کے احکام کو اور ان کے قریب ترین کے احکامات نہیں جانتا۔ اور اسے معلوم ہی نہیں کہ انصاف کیا ہے کیونکہ وہ کسی دلیل کو جانتا ہی نہیں، کہاں یہ کہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرے اسے

قیاس کرنے کا کوئی حق نہیں۔

امام الربانی محمد بن علی الشوکانی اپنی کتاب ''مختصر'' میں کتاب القضاء کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اس شخص کا فیصلہ درست ہے جو مجتہد ہو اور لوگوں کے اموال سے بچتا ہو فیصلہ میں عدل کرے اور درست حاکم ہو۔ تو اس کا فیصلہ قابل قبول ہوگا، امام صاحب کیونکہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں جو یہ بات ہے کہ مجتہد کا فیصلہ درست ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ کتاب اللہ میں فیصلہ کرنے کے متعلق حکم ہوا ہے کہ عدل انصاف اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ راہنمائی کی روشنی میں فیصلہ کرے' تو اسے صرف مجتہد ہی پہچان سکتا ہے کیونکہ مقلد تو صرف بغیر دلیل کے اپنے امام کے قول کو جانتا ہے، جبکہ مجتہد ہی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ راہنمائی سے فیصلہ کرتا ہے اور مقلد ایسا نہیں کر سکتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ کی طرف کچھ بھی نہیں عطا ہوتا' وہ تو صرف اپنے امام کی طرف دیکھتا ہے جسے اس نے خود اپنے لئے پسند کر لیا ہے۔

اجتہاد کے معتبر ہونے کی دلیل سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فیصلہ کرنے والے (جج) تین طرح کی ہیں' ان میں سے ایک جنت میں ہوگا اور دو جہنم میں' جنتی وہ شخص ہوگا جس نے حق کو پہچان لیا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا اور ایک ان میں سے وہ ہوگا جس نے حق پہچان لیا اور فیصلہ میں ظلم کیا اس روایت کو ابن ماجہ' ابوداؤد' نسائی' ترمذی' اور امام حاکم نے روایت کیا' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے تمام طرق ایک جز میں جمع کئے ہیں' اس میں وجہ دلالت یہ ہے کہ صرف مجتہد ہی حق پہچانتا ہے' البتہ مقلد جو ہے وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے گا جو اس کے امام نے کہا' وہ نہیں جانتا کہ یہ حق ہے یا باطل' تو وہ قاضی (جج) جو لوگوں کا جہالت کی بنا پر فیصلہ کرے' تو وہ دو آگ والوں میں سے ایک ہے۔

اجتہاد کے شرط ہونے کے دلائل یہ ہے فرمان باری تعالیٰ ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ --- وَالظّٰلِمُوْنَ --- وَالْفٰسِقُوْنَ۔ ''جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر --- ظالم --- اور فاسق ہیں۔'' اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو ان کے الفاظ اور ان کے مفاہیم کو جانتا ہو اس بات پر دوسری دلیل سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کیلئے بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ وہ کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے آپ نے پھر سوال کیا اگر تم اس میں اس مسئلہ کا حل نہ پاؤ تو' وہ کہنے لگے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی سنت سے' آپ نے پوچھا اگر اس میں بھی موجود نہ ہو' تو وہ کہنے لگے پھر اپنی رائے سے۔ یہ مشہور حدیث ہے اس حدیث کی تمام اسناد اور جنہوں نے اسے نقل کیا ہے ان تمام باتوں کو ایک مستقل بحث میں میں نے بیان کیا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ مقلد کتاب وسنت کو نہیں جانتا اور نہ ہی اس کی کوئی رائے ہوتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ یہ حکم کتاب وسنت میں موجود ہے' اس کے مطابق وہ فیصلہ کرے یا اس میں موجود نہیں کہ اپنے رائے سے اجتہاد کرے اور جب کوئی مقلد یہ دعویٰ کرے کہ اس نے اپنے رائے سے یہ فیصلہ کیا ہے تو وہ جان بوجھ کر اپنے اوپر جھوٹ بولتا ہے کیونکہ اس نے اعتراف کیا ہے کہ وہ کتاب وسنت کو نہیں جانتا' تو جب کوئی اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا گمان کرے تو گویا اس نے خود اپنے متعلق یہ اقرار کیا ہے اس نے طاغوت کے ساتھ فیصلہ کیا۔

اس بات کو مزید مضبوط کرتی ہے اور اس کی شرح بیان کرتی ہے وہ بات جو سید محمد بن اسماعیل الامیر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب سبل السلام شرح بلوغ المرام کی شرح میں' سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے کہی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جب کوئی حاکم فیصلہ کرے اور اس میں اجتہاد سے کام لے پھر وہ درست ہو تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور جب فیصلہ کرنے میں غلطی کرنے تو اس کے لئے ایک اجر ہے۔ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر مقدمہ کا فیصلہ ایک ہی ہوتا ہے جو پوری طرح غور وفکر اور دلائل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اسے توفیق عنایت فرمائیں اور درست فیصلہ کرے اور وہ درست فیصلہ کر لے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے ایک اجتہاد کا اور دوسرا درست فیصلہ کا اور وہ جسے ایک اجر ملے گا' تو وہ ایسا مجتہد ہے کہ جو غلطی کر لے تو اس کے لئے اجتہاد کا اجر ضرور ہے۔ اس حدیث سے اہل علم نے یہ دلیل لی ہے کہ حاکم کے لئے مجتہد ہونا شرط ہے شارح' یعنی قاضی المغربی صاحب بدر التمام شرح بلوغ المرام جو کہ شرعی دلائل سے احکام لینے میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں' وہ فرماتے ہیں لیکن ایسے شخص کا وجود نہیں بلکہ کلیتہً ایسا کوئی حاکم نہیں ہے اس عذر کی بناء پر جو یہ شرط لگائے کہ وہ مقلد ہو اور اپنے امام کے مذہب میں مجتہد ہو اور جو یہ شرط لگائے کہ وہ اپنے امام کے اصول اور ان کے دلائل کو پوری طرح جانتا ہو اور جو احکام اس مذہب میں موجود نہیں انہیں ان کے مطابق بیان کرنے یا داخل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو' تو یہ شرط بھی قابل قبول ہوگی۔

میں کہتا ہوں اس گفتگو میں جو باطل اور غلط باتیں ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اگرچہ بڑے

بڑے علماء اس کی مطابقت و موافقت کریں۔ ہم نے متعدد اجتہاد کے دعوے کو غلط ثابت کیا ہے اپنے "رسالہ ارشاد النقاد الی تیسر الاجتهاد" میں جس قدر ان کا رد ممکن تھا میں اس دعوے کے متعلق یہ خیال کرتا ہوں جس کی مختلف لوگ مطابقت کرتے ہیں کہ یہ جو ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں یہ ان کا انکار ہے کیونکہ وہ میری مراد ان دعوے داروں سے ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں اور اسے ثابت کرتے ہیں کہ وہ مجتہد میں یہ ان دلائل کو جانتے ہیں جن سے استنباط ممکن ہے اور جن سے ممکن نہیں یہ لوگ سیدنا عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو جو رسول اللہ ﷺ کے یمن میں قاضی تھے اور سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی یمن میں قاضی تھے اور حاکم تھے اور شریح جو سیدنا عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے طرف سے کوفہ میں قاضی تھے انہیں یہ نہیں پہچانتے' اس بات پر شارح کا قول دلالت کرتا ہے کہ جو یہ شرط لگائے کہ مقلد اپنے امام کے مذہب میں مجتہد ہو اور اس کے اصول اور ان کے دلائل کی تحقیق کرے' تو یہ ایسا اجتہاد ہے کہ جس کی کلیتہً عدم موجودگی کا بہانہ بنایا اور اس کا نام عذر رکھا۔ پس اس مقلد کو چاہیے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اپنے امام کی جگہ پر امام بناتا اور اپنے امام کے احکام تلاش کرنے کے بجائے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے احکام تلاش کرتا اور عبارات کے الفاظ کو کئی معانی پر دلالت کرتے ہیں اس نے اپنے امام کے الفاظ اور ان کے مفہوم کے ساتھ شارع علیہ السلام کے الفاظ اور ان کے مفاہیم کو کیوں تبدیل کیا اور جب اسے شرعی حکم نہ ملا تو وہ اس بنا پر احکام کو رکھتا' بجائے اس کے کہ وہ ایسے احکام کو اپنے مذہب کے امام پر رکھ کے فیصلہ کیا جبکہ اس نے اس مذہب میں کوئی دلیل نہ دیکھی؟ اللہ کی قسم انہوں نے اچھی چیز کے بدلے گھٹیا چیز کو لیا' کتاب وسنت کی پہچان کے بدلہ میں اپنے شیوخ اور بزرگوں کے کلام کو اپنایا' ان کی مراد کو سمجھا اور انہیں کے کلام میں غور وفکر کیا۔

یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور رسول اللہ ﷺ کا کلام ذہنوں کے زیادہ قریب ہے اور مقصود کے حاصل کرنے میں زیادہ مناسب ہے اور اس بات پر اجماع ہے کہ یہ سب سے زیادہ بلیغ کلام ہے اور بولنے اور سننے میں سب سے میٹھا ہے' سمجھنے اور فائدہ اٹھانے میں سب سے قریب ہے' اس بات کا انکار میری قسم کی طبیعت والے لوگ بھی کر سکتے ہیں اور جس کا نفع حاصل کرنے میں کوئی حصہ نہیں وہی کر سکتے ہیں۔ وہ ذہن جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کلام الٰہی کو سمجھا اور نبی علیہ السلام کے خطاب کو سمجھا وہ ہمارے ذہنوں کی طرح ہی ہے اور ان کی عقل ہماری عقل کی طرح ہی ہے' اگر ذہن آپس میں ایک دوسرے سے متفاوت و مختلف ہوں تو کلام الٰہی اور

حدیث نبوی کا مفہوم ساقط ہو جاتا ہے' تو ایسی صورت میں نہ ہم اس کے مطابق عمل کرنے کے ذمہ دار ہوئے' نہ ہمیں کسی کام کا حکم ملتا اور نہ کسی کام سے روکا جاتا نہ اجتہاد کرتے اور نہ ہی تقلید کرتے۔

البتہ پہلی بات تو جائز ہے لیکن دوسری بات یہ ہے کہ ہم اس وقت تک تقلید نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ہمارے لئے تقلید جائز ہے اور ہمیں یہ اسی وقت پتہ چلے گا جب کتاب وسنت سے اس کے جائز ہونے کی دلیل کو سمجھیں گے' اس لئے کہ فقہا نے صراحت کی ہے تقلید کو جائز قرار دینے میں تقلید جائز نہیں لہٰذا یہ عقل وشعور جس سے ہم نے دلیل کو جانا ہے اور اس کے ساتھ ہم دلائل کو بھی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ تھوڑے ہوں یا زیادہ' یعنی ہم دوسرے دلائل کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس بنا پر کہ مصطفیٰ ﷺ نے یہ گواہی دی کہ آپ کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو ان سے زیادہ اپنے دور میں فقیہ ہوں گے اور نبی علیہ السلام کے کلام کی زیادہ حفاظت کرنے والے ہوں گے" آپ ﷺ کا فرمان ہے کچھ پہنچائے جانے والے ان لوگوں سے جو مجھ سے باتیں سن رہے ہیں زیادہ فقیہ ہوں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ سننے والوں سے زیادہ حفاظت کرنے والے ہوں گے۔ ہم نے اس کلام کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے مذکورہ رسالہ میں' یہاں سبل السلام کی بات ختم ہوئی۔ اس مسئلہ میں میں نے اپنے رسالہ الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

مضمون نمبر: ۲۳

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۔(النسآء:۵۹)

"اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ کی۔"

اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام ومنہیات کو مانا جائے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا معنی یہی ہے کہ جو آپ ﷺ نے حکم دیا اسے مان لیا جائے اور جس سے روکا ہے اس سے رکا جائے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی اطاعت اور رسول کریم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا' یہاں لفظ اطاعت دوبارہ اس لئے لائے تاکہ یہ معلوم کروائے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت مستقل طور پر لازم ہے' اسے کتاب اللہ کے احکام پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جب آپ ﷺ نے حکم دیا تو آپ ﷺ

کی اطاعت مستقل طور پر واجب ہوگی' چاہے اس بارہ میں کتاب اللہ میں حکم موجود ہو یا نہ ہو کیونکہ آپ ﷺ کو کتاب اور اس کے ساتھ اس جیسی ایک چیز اور بھی دی گئی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے امراء وحکام کی اطاعت کا مستقل حکم نہیں دیا بلکہ لفظ اطاعت کو حذف کر کے ان کی اطاعت کو رسول کریم ﷺ کی اطاعت میں شامل کر دیا اور یہ بتلایا کہ ان کی اطاعت رسول کریم ﷺ کی اتباع میں رہتے ہوئے ہوگی' تو جو رسول کی اطاعت کا حکم دے اس کی اطاعت لازم ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا حکم دے تو اس کی اطاعت تو کجا' بات سننا بھی ضروری نہیں جیسا کہ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا اطاعت صرف نیک کاموں میں ہے اور حکام کے بارہ میں فرمایا کہ ان میں سے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم دے تو اس کی بات سننا اور اطاعت کرنا جائز نہیں۔

وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ: ''اور تم میں سے اختیار والوں کی۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ججز اور حکمرانوں کو حکم دیا کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں' تو سچ اور عدل وانصاف سے فیصلہ کریں تو ساتھ ہی یہاں لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم بھی دیا۔ اولی الامر اختیار والے کہتے ہیں' حکام' سلطان اور قاضی کو اور ہر وہ شخص کو جس کے پاس شرعی ذمہ داری ہے نہ کہ طاغوتی۔ ان کی اطاعت سے مراد یہ ہے کہ جو وہ حکم دیں یا جس سے روکیں اس پر عمل کرو' جب تک کہ وہ نافرمانی نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں جیسا کہ میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے بیان کی ہے۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ' مجاہد' حسن بصری' ابوالعالیہ' عطا بن ابی رباح' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور امام احمد اپنی دو روایات میں سے ایک میں فرماتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد قرآن اور علم والے ہیں۔ یہی بات امام مالک اور ضحاک نے بھی کہی۔ مجاہد سے مروی ہے اس سے مراد محمد ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ ابن کیسان کہتے ہیں یہ عقل اور رائے والے ہیں۔ جبکہ راجح قول پہلا ہے یہ بات امام شوکانی نے کہی۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اعلام الموقعین میں اس آیت کے ضمن میں کہتے ہیں۔ حق بات یہ ہے کہ حکام کی اطاعت اس وقت ہوگی جب وہ علم کی روشنی میں حکم دیں تو اس طرح ان کی اطاعت علماء کی اطاعت کے تابع ہوگی' بے شک اطاعت صرف معروف میں ہوگی اور جس کام کو علم لازمی قرار دے۔

پس جیسے علماء کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے تابع ہے اسی طرح امراء کی

اطاعت بھی علماء کی اطاعت کے تابع ہوگی۔

جب اسلام کا قیام ان دو گروہوں کے ذمہ ہوا' یعنی حکام اور علماء اور سب لوگ ان کے تابع ہوئے تو پوری انسانیت کی اصلاح ان دو گروہوں سے منسلک ہو جائے گی اور انسانیت کی تباہی و بربادی ان کی تباہی و بربادی سے منسلک ہوگی' جیسا کہ عبداللہ بن مبارک جیسے اسلاف نے فرمایا: لوگوں کی دو قسمیں ایسی ہیں جب یہ درست ہوں گی تو لوگ درست رہیں گے اور جب یہ خراب ہو جائیں گے تو لوگ بھی خراب ہوں گے۔ پوچھا گیا وہ کون ہیں؟ کہنے لگے وہ بادشاہ اور امراء ہیں۔ مزید فرماتے ہیں: میں نے گناہوں کو دیکھا یہ دلوں کو مردہ کر دیتے ہیں اور انہیں ہمیشہ اپنانا ذلت کا باعث ہوتا ہے اور گناہوں کو چھوڑنا دلوں کی زندگی ہے۔ تیرے نفس کے لئے بہتر ہے کہ تو اس دل کی بات نہ مانے۔ اور دین کو برباد کرنے والے بادشاہ' علماء سوء اور پیر و مشائخ ہیں۔

امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس فرمان الٰہی کے بارہ میں روایت نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت عبداللہ بن حذافہ بن قیس بن عدی کے بارہ میں نازل ہوئی جب انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگی قافلہ میں بھیجا تھا' ان کا واقعہ معروف ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے بارہ میں خبر دی کہ جو لوگ آگ میں داخل ہونا چاہتے تھے جبکہ ان کے امیر نے اس میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا' اگر وہ اس میں داخل ہو جاتے تو دوبارہ کبھی اس سے نہ نکلتے' باوجود اس بات کے کہ وہ اپنے امیر کی اطاعت کرتے ہوئے داخل ہوئے تھے اور ان کا گمان تھا کہ اس اطاعت کی کوشش کی جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تھی' انہوں نے اطاعت کے حکم کو ایسی بات پر محمول کیا جو حکم دینے والے' یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں اور اس کی خلاف ورزی دین میں معلوم ہے' تو انہوں نے اجتہاد کرنے میں کوتاہی کی اور انہوں نے خود کو عذاب دینے اور ہلاک کرنے لگے بغیر کسی ٹھوس ثبوت اور واضح دلیل کے کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے یا نہیں؟ تو اس شخص کے بارہ میں کیا گمان ہوگا جو اس حکم کے علاوہ دوسرے کی اطاعت کرتا اور اس کی واضح مخالفت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر بھیجا۔

عبد بن حمید' ابن جریر اور ابن ابی حاتم عطاء سے آیت کے بارہ میں روایت بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا معنی ہے کتاب و سنت کی پیروی کرنا اور با اختیار لوگوں کی اطاعت کا معنی ہے کہ فقہا اور اہل علم کی اطاعت کرنا۔

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس آیت سے تقلید پر استدلال کرنا درست نہیں کیونکہ اس سے مراد

ائمہ ہیں جیسا کہ اکثر لوگوں سے یہی معنی ثابت ہے اگر اس سے علماء مراد لینا درست ہو تو ان کی اطاعت بھی ائمہ اور امراء کے ساتھ لازم ہو گی لیکن ان تمام کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہو گی جیسا کہ یہ بات پہلے گذر چکی۔ مزید یہ کہ علماء تقلید چھوڑنے کی راہنمائی کرتے رہے جیسا کہ چاروں ائمہ وغیرہ سے مروی ہے۔

اس کے باوجود بھی اگر کوئی عالم اپنی تقلید کی دعوت دیتا ہے تو وہ نافرمانی کی راہنمائی کرتا ہے شریعت کی وجہ سے اس وقت اس کی اطاعت جائز نہ ہو گی بلکہ یہ آیت دلیل ہے کہ کتاب وسنت رائے اور قیاس پر مطلق طور پر مقدم ہیں پس ان کے احکام کے مطابق عمل چھوڑنا جائز نہیں اور نہ ہی کسی قیاس خفی وجلی کے ذریعہ ان میں سے کسی ایک کی تخصیص جائز ہے۔

وجہ دلالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اطیعو الرَّسُوۡلَ۔ کا حکم دے کر کتاب وسنت کی اطاعت کا حکم دیا ہے' یہاں مطلق حکم ہے تو اس سے ان دونوں کی پیروی مطلقاً واجب ہو گی۔ خواہ کوئی قیاس ان دونوں کا معارض ومخالف ہو یا ان میں سے کسی کو خاص کرتا ہو یا نہ۔ انہی دلائل میں سے اِنۡ کلمہ ہے اکثریت کے قول کے مطابق یہ اِنۡ شرطیہ ہے' تو فرمان الٰہی اِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ قیاس کے جواز کی واضح دلیل ہے جبکہ اصول میں کوئی دلیل نہ ہو جیسا کہ یہ آیت میں ترتیب کے اعتبار سے بھی آخر میں مذکور ہے اسی طرح معاذ کے واقعہ میں آخر میں قیاس کا تذکرہ ہے۔

ان دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ ابلیس نے سجدہ کے حکم کا کلیۃ انکار نہیں کیا تھا بلکہ اس نے قیاس کرتے ہوئے خود کو اس عام حکم سے خاص کر لیا۔ انہی دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ قرآن تواتر سے قطعی الثبوت ہے اور قیاس ہر لحاظ سے گمان ہی گمان ہے اور قطعی بات ظن وگمان پر راجح ہوا کرتی ہے۔ انہی دلائل میں سے یہ فرمان الٰہی ہے: وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ یہ اس بارہ میں واضح حکم ہے کہ جب ہم کتاب اللہ کے عمومی حکم کو کسی واقعہ کے متعلق پائیں' پھر قیاس سے فیصلہ کریں اس صورت میں اس آیت کے عام حکم میں لازماً داخل ہوں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ سے آگے بڑھنا انہی لوازمات میں سے ہے۔ اس مسئلہ میں ہماری تفسیر فتح البیان میں مکمل بحث موجود ہے اسے دیکھنا چاہیے۔

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ۔ پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو۔ نزع اور منازعت کہتے ہیں کھینچ کو گویا کہ ایک دوسرے کی دلیل کو کھینچتا ہے اس سے مراد ہے اختلاف اور جھگڑا کرنا اور اس میں دلیل یہ ہے کہ ایمان والے بعض احکام میں آپس میں جھگڑتے ہیں اور اس وجہ سے ایمان

سے خارج نہیں ہوتے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت سے احکام کے مسائل میں آپس میں جھگڑتے تھے' وہ مومنوں کے سردار اور امت میں ایمان کے اعتبار سے سب سے کامل ہیں' لیکن الحمدللہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور اس کے افعال کے متعلقہ مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ میں بھی نہیں جھگڑے' بلکہ وہ تمام لوگ اسی بات کو ثابت کرتے تھے جو کتاب وسنت سے نے ثابت کیا کسی موقع پر کوئی ایک کلمہ بھی انہوں نے اپنی طرف سے نہیں کہا' نہ انہوں نے تاویل کا جام پیا اور نہ ہی اس میں تحریف کی کوشش کی' نہ انہوں نے کسی کو تبدیل کیا اور نہ ان میں سے کسی چیز کو باطل قرار دیا' اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کی کوئی مثال بیان نہیں کی اور نہ ہی ان کے اعجاز کو اپنے سینوں سے دور کیا اور کسی نے ان صفات کو ان کی اصل حقیقت سے پھیرنا ضروری قرار نہیں دیا اور نہ ان کو مجاز پر محمول کیا بلکہ انہوں نے انہیں قبول کرنے پر تسلیم خم کر دیا اور ایمان وعظمت کے ساتھ قبول کیا اور اس مسئلہ میں ایک موقف اپنایا اور ایک ہی راستہ پر چلے' انہوں نے خواہش پرست اور بدعتیوں جیسے کام نہیں کیے جو کہ انہوں نے اس عقیدہ کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اس طرح کی کسی کا اقرار کرلیا اور کسی کا انکار کر دیا بغیر کسی واضح دلیل کے باوجود اس بات کے کہ جس کا انہوں نے انکار کیا' یہ بھی ان پر اسی طرح لازم تھا جس طرح کہ انہوں نے کچھ چیزوں کے اقرار کو لازم پکڑا اور انہیں ثابت کیا۔

اس ساری تفصیل کا مقصود یہ ہے کہ ایمان والے احکام کے بعض مسائل میں جھگڑنے کی بنا پر ایمان کی حقیقت سے خارج نہیں ہوتے جب کہ وہ اپنے جھگڑوں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹائیں۔

جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان پر یہ شرط رکھی ہے کہ **فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ** "تو اسے لوٹا دو اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول کی طرف اگر تمہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔"

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ حکم ایک شرط کے ساتھ متعلق ہے ایک کی نفی سے دوسرے کی نفی لازم آتی ہے۔

فِیْ شَیْءٍ کسی چیز میں بھی' یہ نکرہ ہے شرط کے سیاق میں آیا ہے اور یہ عام ہے ہر اس جھگڑے میں جو مومنین کے درمیان دینی مسائل میں پیدا ہوں وہ پیچیدہ ہوں یا عام ظاہر ہوں یا

پوشیدہ' کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں اس بات کا کوئی فیصلہ نہ ہو جس میں وہ جھگڑتے ہیں یا اسے رد کرنے کا کوئی کافی وشافی حکم نہ ہو یا وہ منع کردہ امور میں سے ہو تو اللہ تعالیٰ جھگڑے کے وقت ایسی بات کی طرف لوٹنے کا حکم نہ دیتے جس میں جھگڑے کا فیصلہ موجود نہ ہوتا۔

امام شوکانی فرماتے ہیں فرمانِ الٰہی فِی شَیْءٍ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ دین و دنیا کے امور کو شامل ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ تو اس سے یہ بات واضح ہوگی کہ جس چیز میں جھگڑا ہوا ہے وہ دنیاوی امور سے ہٹ کے دینی امور کے ساتھ خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹانے کا معنی یہ ہے اللہ کے کتاب عزیز کی طرف لوٹایا جائے اور رسول کی طرف لوٹانے کا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی سنت مطہرہ کی طرف لوٹایا جائے' البتہ ان کی زندگی میں ان سے سوال کر کے لوٹایا جا سکتا تھا' یہ معنی ہے ان کی طرف لوٹانے کا' اور ایک قول کے مطابق لوٹانے کا معنی یہ ہے کہ لوگ کہیں اللہ اعلم' یہ قول انتہائی ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے اور 'ردوہ' کا معنی اس جگہ وہی ہے جو مندرجہ ذیل فرمان الٰہی وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ میں مذکور ہے یعنی اگر یہ لوگ اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹا دیتے تو جو لوگ ان میں احکام کے استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں تو وہ سمجھ لیتے کہ اس کا بیان کرنا اچھا ہے یا نہیں۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹانے کا معنی اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف لوٹانا ہے اور رسول کی طرف لوٹانے کا معنی آپ ﷺ کی زندگی میں خود آپ کی طرف اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی سنت کی طرف لوٹانا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس لوٹانے کو ایمان کے واجبات اور اس کی لازمی جزئیات میں سے قرار دیا ہے اور جب وہ اس لوٹانے کی نفی کریں گے تو اُن کے ایمان کی نفی ہو جائے گی کیونکہ ضروری ہے کسی لازم کی نفی کی بنا پر ملزوم کی نفی ہو جاتی ہے' یہاں ان دونوں باتوں میں لازم وملزوم کی شرط ہے' یہ بات دونوں طرف سے ہے' ان میں سے کسی ایک کی نفی دوسرے کی نفی کو لازم آتی ہے' پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں بتلایا کہ یہ لوٹانا ان کے لئے بہتر ہے اور اس کا انجام بہترین انجام ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: فرمان الٰہی اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ میں یہ دلیل ہے کہ جھگڑنے والوں پر یہ لوٹانا لازم ہے اور یہ اس کی شان ہے جو اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس لفظ "ذٰلِكَ" میں اشارہ ہے کہ یہ لوٹانے کا جو حکم دیا گیا یہ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ

تَاْوِیْــــلًا بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے یعنی لوٹنے کے اعتبار سے۔ یہ اول سے ہے آل یؤول الی کذا یعنی اس طرف گیا معنی یہ ہوا کہ یہ تمہارے لئے بہتر اور لوٹنے کی اچھی جگہ ہے جس طرف تم لوٹتے ہو اور یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ لوٹانا بہترین تاویل ہے تمہاری ان تاویلات سے جو بوقت نزاع کرتے ہو۔

یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت کی پیروی کرنا واجب ہے اور یہ آیت تقلید کے رد میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اسی لئے پہلے اور بعد کے تمام علماء نے اس سے اسی مسئلہ پر دلیل لی ہے اس بارہ میں طوالت کے خوف سے ہم زیادہ گفتگو نہیں کرتے جو اسے بالتفصیل دیکھنا چاہے وہ اعلام الموقعین جیسی کتاب کا مطالعہ کرے اس پر حق روز روشن کی طرح اللہ تعالیٰ کی توفیق سے باطل سے نکھر کر سامنے آجائے گا۔

مضمون نمبر: ۲۴

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ۔ (۸۳)

''جب انہیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملی تو انہوں نے اسے مشہور کرنا شروع کر دیا۔''

جب کوئی راز فاش کر دیا جائے تو اہل عرب اذاع الشیء واذاع به کا مقولہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت کے کمزور لوگ تھے یہ جب مسلمانوں کی امن کی بات مثلاً کہ مسلمان کامیاب ہوئے اور دشموں کا مار گرایا یا خوف کی بات مثلاً مسلمانوں کو شکست ہوئی اور کچھ شہید ہو گئے تو اسے پھیلا دیتے ہیں اور گمان یہ کرتے ہیں کہ اس پر انہیں کوئی گناہ نہ ہوگا۔ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ تو اس کی حقیقت وہ لوگ معلوم کر لیتے یعنی وہ اپنے تدبر اور سمجھداری سے حقیقت نکال لیتے۔

معنی یہ ہوا اگر وہ خبر کو پھیلانا چھوڑ دیتے تو اچھا ہوتا، اگر نبی ﷺ سمجھتے کہ یہ بات بیان کرنے کے قابل ہے تو بیان کر دیتے ورنہ نہیں کرتے یا پھر اولوالامر کے ذمہ لگا دیتے تو اچھا تھا کیونکہ وہ بھی اچھی بری بات کی تنقیح کرنے کے قابل ہوتے ہیں، پھر جس چیز کو بیان کرنا ہوتا کر دیتے ورنہ اسے بیان نہ کرتے۔ خود اسے پھیلائیں یا ان میں سے جو ذمہ دار ہو وہ اس خبر کو پھیلائیں کیونکہ یہی لوگ جانتے ہیں کہ کیا بات پھیلانے کی لائق ہے اور کونسی بات چھپانے کی لائق ہے تو اس صورت میں بہتر تھا۔ استنباط استنبطت الماء سے لیا گیا ہے جب کہ اس پانی کو

نکالا جائے اور نبط اس نکلنے والے پانی کو کہتے ہیں جو کنویں کی کھدائی کے وقت سب سے پہلے نکلے۔

ایک قول کے مطابق یہ کمزور مسلمان جب منافقین کی مسلمانوں کے بارہ میں بری خبریں سنتے تو اسے پھیلا دیتے اس طرح خرابی پیدا ہوتی۔

عبد بن حمید اور مسلم بن ابی حاتم نے سیدنا ابن عباس اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بیان کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عورتوں سے علیحدہ ہو گئے تو اس وقت میں مسجد کے دروازہ پر کھڑا تھا' میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ کنکریوں سے کھیل رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی میں نے مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے یہ کہا کہ آپ نے کوئی طلاق نہیں دی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو میں تھا جس نے اس مسئلہ کا استنباط کیا۔

مضمون نمبر: ۲۵

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ۔ (۸۶)

''اور جب تمہیں سلام کہا جائے۔''

لفظ تحیۃ باب تفعلہ سے ہے' اس کا اصل معنی ہے زندگی کی دعا دینا اور تحیہ سلام کو بھی کہتے ہیں اور یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَإِذَا جَآءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ۔ (مجادلہ: ۸) ''اور جب تیرے پاس آتے ہیں اور تجھے ان الفاظ میں سلام کرتے ہیں جن الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے نہیں کہا۔'' یہی موقف مفسرین کی ایک جماعت کا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے یہاں تحیہ سے مراد چھینک مارنے والے کا جواب دینا ہے۔

ابوحنیفہ کے اصحاب کہتے ہیں کہ یہاں تحیہ سے مراد تحفہ ہے اور دو دھا کی وجہ سے اور سلام کو بعینہ لوٹانا ممکن نہیں یہ بات بالکل بے کار ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا بھی مناسب نہیں۔

فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا۔ ''تو تم اس سے اچھا جواب دو۔''

اس کا معنی یہ ہے کہ جو سلام کی ابتدا کرنے والے نے کہا اس کے جواب میں اضافہ کیا جائے' جب ابتدا کرنے والا السلام علیکم کہے تو جواب دینے والا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہے اور جب ابتدا کرنے والا کسی لفظ کا اضافہ کرے تو جواب دینے والا اس جملے پر جو ایک لفظ یا زائد الفاظ ابتدا

کرنے والے نے کچھ اضافہ کرے مثلاً و برکاتہ و مرضاتہ و تحیاتہ۔

امام قرطبی فرماتے ہیں علماء کا اجماع ہے کہ سلام کی ابتدا کرنا ایسی سنت ہے جس کے بارہ میں رغبت دلائی گئی ہے اور اس کا جواب دینا فرض ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فحیوا حکم کا ظاہری تقاضا وجوب ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان اور ردوھا سے مراد یہ ہے کہ جس قدر ابتدا کرنے والے نے الفاظ بولے تو جواب دینے والا بھی انہیں پر اکتفا کرے السلام علیکم کے بدلہ میں وعلیکم السلام کہہ دے۔

آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے اگر سلام کہنے والے کے جواب میں اس سے کم الفاظ لوٹائے جائیں تو یہ کافی نہ ہوں گے اور بعض فقہا نے السلام علیکم کو ہی کامل سمجھا ہے۔ علماء کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ کسی جماعت میں سے کوئی ایک شخص جواب دے دے تو کیا یہ کافی ہے یا نہیں؟ امام مالک اور شافعی اسے کافی سمجھتے ہیں اور اہل کوفہ کا موقف ہے کہ کسی ایک کا جواب کافی نہیں ہوگا' ان کا رد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جماعت کی طرف سے کافی ہے کہ جب وہ گذر رہے ہوں تو ان میں سے کوئی ایک سلام کہہ دے اور بیٹھنے والوں کی طرف سے کوئی ایک جواب دے تو یہ کافی ہے۔

ابوداؤد رحمہ اللہ نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں سعید بن خالد الخزاعی المدنی ہے ان میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں اور بعض نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عبدالبر نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ سنت مطہرہ میں اس بات کی تعیین منقول ہے کہ سلام میں کون ابتدا کرے اور کون اس کے جواب کا مستحق ہے اور کون نہیں' اس موضوع کو یہاں تفصیل سے بیان کرنا مناسب نہیں' ہم نے اس کا حق بلوغ المرام کی شرح میں ادا کر دیا ہے۔

مضمون نمبر: ۲۶

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ۔ (۸۹)

"ان کی تو چاہت یہی ہے کہ تم بھی کفر کرنے لگو۔"

یہ جملہ مستانفہ ہے جو ان منافقین کو شامل ہے اور اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کی خواہش ہے کہ مومن لوگ اسی طرح کافر ہو جائیں جس طرح وہ کافر ہیں یہ خواہش دشمنی کی بنا پر اپنے کفر میں غلو کرتے ہوئے اور اپنی گمراہی میں سرکشی اختیار کرتے ہوئے کرتے ہیں۔

آیت کریمہ میں کـمـا کا کاف یہ ایک مصدر محذوف کی صفت ہے' اصل عبارت یہ ہے کفروا مثل کفرھم یعنی ایسا کفر جو ان کے کفر جیسا ہو یا یہ حال بنتا ہے جیسا کہ سیبویہ سے مروی ہے کہ فتکونون سواء کا تکفرون پر عطف ہے اور یہ دونوں اس حکم میں داخل ہیں کہ فلا تتخذوا منھم اولیاء جو کہ محذوف شرط کا جواب ہے' یعنی جب ان کا حال اس طرح ہو جائے جو ذکر کیا گیا ہے تو تم انہیں دوست نہ بناؤ۔ اولیاء کو جمع مخاطبین کی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے لایا گیا' وگرنہ ان میں سے کسی ایک کو دوست بنانا بھی حرام ہے' جس طرح کہ آیت کے آخر میں یہ الفاظ ہیں حتی کہ وہ ایمان لے آئیں اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہجرت کریں' یعنی ان کا ایمان ہجرت کر کے مزید پختہ ہو جائے' تو اگر انہوں نے ہجرت سے مونہہ موڑا تو تم ان کو جب تمہارا بس چلے پکڑ لو اور انہیں جہاں پاؤ قتل کر لو حرم میں ہو یا حرم سے باہر' ان کا حکم قتل کرنے کے اعتبار سے اور قیدی بنانے کے لئے مشرکین کے حکم کی طرح ہے اور تم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوست نہ بناؤ کہ تم اسے دلی دوستی کرو اور نہ کسی کو مدد کے لئے بلاؤ کہ تم ان سے اپنے کسی کام میں مدد لو۔

مضمون نمبر: ۲۷

اِلَّا الَّذِيْنَ۔ سوائے ان لوگوں کے

یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فـخـذوھم وقتلوھم سے استثناء ہے۔ البتہ ان سے دوستی کرنا مطلقاً حرام ہے اور کسی حالت میں بھی جائز نہیں' تو معنی یہ ہوا سوائے ان کے جو ایسی قوم کے ساتھ مل جاتے ہیں' یعنی اس قوم میں داخل ہو جاتے ہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو چکا ہے ہمسائیگی کا یا قسم کے ساتھ تو تم انہیں قتل نہ کرو' اس لئے کہ ان کے اور تمہارے درمیان ایک معاہدہ اور میثاق طے ہو چکا ہے' اب یہ معاہدہ انہیں بھی شامل ہے یہ قول سب سے درست ہے جو اس آیت کا معنی کرتے ہوئے کہے گئے۔

ایک قول کے مطابق یہاں اتصال سے مراد نسب میں ملنا ہے' تو معنی یہ ہوگا سوائے ان کے جو ایسی قوم کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں کہ ان کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہے' یہ معنی ابوعبیدہ نے کیا ہے۔ مگر اہل علم نے اس کو قبول نہیں کیا ہے کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ نسب لڑائی کیلئے رکاوٹ نہیں اور تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان نسبی تعلق تھا اور یہ تعلق قتال کو مانع نہیں تھا۔

اس قوم کے بارہ میں اہل علم کے مابین اختلاف ہے کہ جن کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ تھا وہ کون تھے ایک قول کے مطابق وہ قریش ہے اور جو ان قریشیوں کے ساتھ ملے وہ بنو مدلج تھے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت ہلال بن عویمر، سراقہ بن جعشم، خریمہ بن عامر بن عبد مناف کے بارہ میں نازل ہوئی کہ ان کا نبی ﷺ کے ساتھ کوئی معاہدہ تھا ایک قول کے مطابق خزاعہ قبیلہ تھا اور ایک قول کے مطابق بنو بکر بن زید تھے۔

اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ "یا جو تمہارے پاس اس حالت میں کہ آئیں کہ وہ تنگ دل ہیں" یہ جملہ یصلون پر عطف ہے اور یہ بھی اس استثناء میں داخل ہے یعنی ان کے سوا جو ملے اور ان کے سوا جو تمہارے پاس آ جائیں۔ جائز ہے کہ قوم کی صفت پر اس کا عطف ڈالا جائے یعنی سوائے ان کے جو ایسی قوم سے مل جائیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہے اور وہ لوگ جو ایسی قوم سے ملے جو تمہارے پاس اس حال میں آ گئے ہیں کہ ان کا دل تنگ ہے، یعنی ان کے سینے جنگ کرنے سے تنگ ہیں، تو تم ان کے ساتھ جنگ کرنے سے رک جاؤ۔

حصر کا معنی ہے تنگ ہونا اور سکڑنا۔ فراء کہتے ہیں اس کا معنی ہے کہ ان کے سینے تنگ ہو گئے یہ حال بنتا ہے جاؤ کم میں مرفوع ضمیر سے جیسا کہ آپ کہتے ہیں فلاں آیا اور اس کی عقل چلی گئی تھی، یعنی اس کی عقل پہلے سے ہی چلی گئی تھا زجاج کہتے ہیں یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے، یعنی وہ تمہارے پاس آئیں پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی اور فرمایا کہ ان کے دل تنگ ہو چکے ہیں۔ اس بنا پر حصرت، جاوء کم سے بدل ہوگا۔ ایک قول کے مطابق حصرت قوم کی صفت بن کر جری حالت میں ہے اور ایک قول کے مطابق اس کی تقدیر اس طرح ہے او جاء و کم رجال او قوم حصرت صدور رھم یا تمہارے پاس مرد آئیں یا کوئی قوم آئیں جن کے دل تنگ ہوں۔ حسن یوں پڑھتے ہیں او جاؤ و کم حصرت صدورھم حال ہونے کی بنا پر نصب پڑھتے ہیں اور محمد بن زید کہتے ہیں حصرت صدورھم ان پر بددعا ہے جیسا کہ تم کہتے ہو اللہ تعالیٰ کافر پر لعنت کرتے اسے بعض مفسرین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

ایک قول کے مطابق بمعنی واؤ ہے، یعنی اور وہ تمہارے پاس آئیں ان کے دل تنگ ہوں اس بات سے کہ وہ تمہارے ساتھ یا اپنی قوم کے ساتھ جنگ کریں، تو ان کے سینے ان دو گروہوں سے جنگ کرنے سے تنگ ہوئے اور انہوں نے اسے ناپسند کیا اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا تمہاری آزمائش اور امتحان کے لئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى

نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَاْ اَخْبَارَكُمْ (محمد:۳۱) "یقیناً ہم تمہارا امتحان کریں گے تا کہ تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو ظاہر کر دیں اور ہم تمہارے حالات کو بھی جانچ لیں۔"

لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ فلقاتلوکم میں لام جواب کے مکرر لانے پر لو کے جواب میں آیا ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا اور وہ تم سے جنگ کرتے۔ فاء تعقیب کے لئے آیا ہے فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ "پس اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور تم سے لڑائی نہ کرے۔" یعنی تمہارے ساتھ جنگ میں کوئی تعرض نہ کریں و القوا الیکم السلم اور تمہاری جانب صلح کا پیغام ڈالیں، یعنی تم سے صلح کر لیں اور تمہارے تابع ہو جائیں مما جعل الله لكم عليهم سبيلا لڑائی کا کوئی راستہ نہیں رہنے دیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان پر۔ پس تمہارے لئے انہیں قتل کرنا، انہیں قیدی بنانا اور ان کا مال لوٹنا جائز نہیں' یہ ان کا خود کو تمہارے سپرد کر دینا ان باتوں کو مانع ہے اور یہ کام حرام کر دیتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت قتال کی آیت سے منسوخ ہے۔ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور اسے دو معاہدوں پر محمول کیا جائے گا۔

مضمون نمبر:۲۸

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ۔ (۹۱)

"تم کچھ اور لوگوں کو ایسا پاؤ گے جن کی بظاہر چاہت ہے کہ تم سے بھی امن میں ہوں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں۔"

وہ تمہارے لئے اسلام ظاہر کرتے ہیں اور اپنے قوم کے سامنے کفر کو ظاہر کرتے ہیں تا کہ وہ دونوں گروہوں سے محفوظ رہیں' یہ تہامہ والی قوم تھی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے امان طلب کی تا کہ وہ آپ سے اور اپنی قوم سے محفوظ رہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ منافقین میں سے ایک قوم کے بارہ میں ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ قبیلہ اسد اور غطفان کے بارہ میں ہے۔

كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ۔ "لیکن جب کبھی فتنہ انگیزی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں" یعنی جب ان کی قوم انہیں اپنی طرف بلاتی ہے اور ان سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا مطالبہ کرتی ہے تو ارکسوا فیھا اوندھے مونہہ ڈال دیئے جاتے ہیں' یعنی وہ اس میں پلٹ جاتے ہیں اپنی

قوم کے ساتھ ملتے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں ارتکاس کا معنی ہے الٹا پھرنا۔

فَإِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ ۔ ''پس اگر کنارہ کش نہ کرے۔''

یعنی ایسے لوگ جو تم سے اور اپنی قوم سے تحفظ چاہتے ہیں وَ يُلْقُوٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ اور تم سے صلح کا سلسلہ جنبانی نہ کریں، یعنی تم سے صلح نہیں کرتے تمہارے معاہدے اور صلح میں داخل نہیں ہوتے اور اپنی قوم سے الگ نہیں ہوتے وَ يَكُفُّوٓا اَيْدِيَهُمْ ''اور اپنا ہاتھ نہ روک لیں''

یعنی تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے فَخُذُوهُمْ وَ اقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ''تو انہیں پکڑو اور مار ڈالو جہاں کہیں بھی پالو'' یعنی جہاں بھی تم انہیں پاؤ اور ان پر قدرت حاصل کرو وَاُولٰٓئِكُمْ یہی وہ ہیں جو ان صفات سے متصف ہیں جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ''جن پر ہم نے تمہیں ظاہر حجت عنایت فرمائی ہے۔''

یعنی یہ ایسی واضح دلیل ہے کہ جس بنا پر تم ان کے اوپر مسلط ہو سکتے ہو اور تم ان پر اپنا قہر ڈال سکتے ہو اس لئے کہ جو ان کے دلوں میں بیماری اور ان کے سینوں میں کینہ و بغض ہے اور کسی بھی فتنہ میں ان کے مونہہ کے بل گرنے کی وجہ سے کسی آسان عمل اور معمولی کوشش سے ہم نے تمہیں ان پر غلبہ دیا ہے۔

مضمون نمبر: ۲۹

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ ۔ (۹۲)

''کسی مومن کو زیبا نہیں۔''

یہ نفی کا صیغہ نہی کے معنی میں ہے جو حرمت کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ''تمہارے لئے یہ بات مناسب نہ تھی کہ تم اللہ تعالیٰ کے رسول کو تکلیف دو۔'' اگر یہ نفی اپنے اصل معنی میں ہوتی تو یہ خبر ہوتی جو کسی واقعہ کو لازم کرتی، اس بات کا تو وجود ہی نہیں تھا کہ کسی مومن نے کبھی کسی مومن کو قتل کیا ہو۔ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے۔ ایک قول کے مطابق وما كان له ذالك في عهدائيه وقيل ما كان له ذالك فيما سلف كماليس له الآن بوجه، یعنی معنی یہ ہے کہ جو قانون اس بارہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدہ میں ہے جس طرح کہ ابھی بھی اس کی کوئی گنجائش نہیں، پھر اس سے استثناء منقطع ذکر کیا فرمایا اِلَّا خَطَـًٔا مگر غلطی سے ہو جائے، یعنی کسی مومن کو جائز نہیں کہ کسی صورت

میں مومن کو قتل کرے لیکن اگر اسے غلطی سے قتل کر بیٹھے تو اس پر یہ یہ سزا ہے یہ سیبویہ اور زجاج کا قول ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ اختیار متصل ہے اور معنی اس طرح ہوگا' نہ یہ ثابت ہے اور نہ ہی اس کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی یہ کسی مومن کو گوارا ہے کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے سوائے غلطی کے جب کہ وہ مغلوب ہو چکا ہو۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے نہ ہی غلطی سے۔ نحاس کہتے ہیں یہ بات کلام عرب میں معروف نہیں اور معنی کے وقت یہ درست نہیں کیونکہ غلطی کا حصر نہیں ہوتا۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ کسی بھی وجہ سے اسے قتل کرنا مناسب نہیں مگر صرف ایک وجہ کہ غلطی سے' تو اس طرح خطا پڑھا جائے گا مفعول لہ ہونے کی بنا پر اور اسے حال ہونے کی بنا پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ اس کی تقدیر اس طرح ہوگی لا یقتلہ فی حال من الاحوال الافی حال الخطاء، یعنی کوئی مومن کسی مومن کو کسی حال میں بھی قتل نہ کرے مگر غلطی کی حالت میں۔ یہاں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ محذوف مصدر کی صفت ہو یعنی سوائے قتل خطا کے قتل خطا کی صورتیں جہت زیادہ ہیں ان کا احاطہ کرنا ارادہ سے باہر ہے' خطا ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص ایسی غلطی کرے جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا۔

وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا۔ "جو شخص کسی مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے۔"

یعنی شکار کے ارادے سے تیر پھینکا وہ اسے لگ گیا یا اس نے ایسی چیز ماری جس سے عموماً لوگ قتل نہیں ہوتے اسی طرح فرمایا گیا ہے فَتَحْرِيْرُ یعنی اس کے ذمہ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ایک مسلمان کی گردن کا آزاد کرنا ہے کہ اس قتلِ خطا کا کفارہ کے طور پر آزاد کرے۔ یہاں لفظ رَقَبَةٍ لائے جو کہ ہر ذات کو شامل ہے۔

رقبة مؤمنة مومن گردن کی' تفسیر کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق وہ غلام نمازیں ادا کرتا اور ایمان کو سمجھتا ہو اس صورت میں نابالغ گردن آزاد کرنا کافی نہیں' یہ بات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما' شعبی اور نخعی اور قتادہ وغیرہ نے کہی۔ عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں ایسا (نابالغ) چھوٹا بچہ بھی کافی ہوگا جو مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوا۔

ایک جماعت جن میں امام مالک اور امام شافعی بھی ہیں ان کا کہنا ہے کہ ہر وہ کافی ہوگا جس پر نماز کی فرضیت کا حکم لگتا ہے اگر چہ وہ فوت ہو چکا ہو۔ جمہور علماء کے قول کے مطابق ایسا کافی نہیں جو اندھا ہو اور چلنے کے قابل نہ ہو اور یا اس کے جسم کا کوئی حصہ بیکار ہو۔ اکثر کے نزدیک

بھینگا اور لنگڑا بھی کفایت کر جائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہاں جب کہ کوئی شخص سخت ترین لنگڑا ہو ان میں سے اکثر کے نزدیک پاگل آدمی کفایت نہیں کرے گا۔ اس مقام میں علم الفروع میں بہت زیادہ تفصیل مذکور ہے۔

وَ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ۔ "اور مقتول کے عزیزوں کو خون بہا پہنچانا ہے۔ دیت کہتے ہیں جو مقتول کے خون کے بدلہ میں مقتول کے وارثوں کو دی جائے' مسلمہ کہتے ہیں جو ادا کر دی جائے اور اھل سے مراد مقتول کے وارث ہیں۔ دیت کی اقسام اور اس کی تفصیل سنت مطہرہ نے بیان کی ہے اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ بطور صدقہ معاف کر دیں۔ یعنی مقتول کے وارث قاتل کو وہ دیت صدقہ کر دیں دیت سے درگذر کرنے کو صدقہ اس لئے کہا گیا تاکہ لوگ اس میں رغبت کریں فَاِنْ كَانَ اور اگر وہ یعنی مقتول مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ تمہاری دشمن قوم کا ہو یعنی حربی کافروں میں سے وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ اور ہو وہ مسلمان تو صرف ایک مومن غلام کی گردن آزاد کرنا لازمی ہے۔

یہ مسئلہ اس مومن کے بارہ میں ہے کہ کافروں کے شہروں میں مسلمان ان سے جنگ کریں اور یہ اس قوم میں سے ہو اور اسلام قبول کرنے کے بعد ہجرت نہ کی ہو اور مسلمان سمجھیں کہ یہ مسلمان نہیں یہ اپنی قوم کے دین پر ہے تو اس کے قاتل پر کوئی دیت نہیں بلکہ اس کے ذمہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔

دیت کے ساقط ہونے کی اقسام کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق اگر مقتول کے وارث حاضر ہیں تو ان کا دیت میں کوئی حق نہیں۔ ایک قول کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ایمان لا کر ہجرت نہیں کی لہٰذا اس کی عزت و احترام تھوڑا ہے' اس لئے کہ فرمان باری تعالیٰ ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (الانفال: ۷۲) "اور جو ایمان تو لائے ہیں لیکن ہجرت نہیں کی تمہارے لئے ان کی کچھ بھی رفاقت نہیں۔" بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اس کی دیت بیت المال کو دی جائے گی۔

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ "اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے۔" یعنی ایک مقررہ وقت تک معاہدہ ہو۔

حسن پڑھتے وہ مومن ہو فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ تو خون بہا لازم ہے' یعنی قاتل کے ذمہ دیت ادا کرنا لازم ہے' اِلٰٓى اَهْلِهٖ' اس کے کنبہ والوں کو۔ یعنی اس کے مسلمان ورثاء کو وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

مُؤْمِنَةٍ اور ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا بھی ہے جیسا کہ گذر چکا فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ تو جو نہ پائے۔ یعنی غلام اور اسے خریدنے کے لئے اس کے پاس مال کی وسعت نہ ہو فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ تو اس کے ذمہ دو ماہ کے روزے ہیں یعنی اس پر لازم ہیں "مُتَتَابِعَيْنِ" لگاتار یعنی ان دو ماہ کے روزوں میں کوئی دو دن میں ایک دن کا بھی فاصلہ نہ ہو اگر اس نے ایک روزہ بھی چھوڑا تو دوبارہ سے سرے سے شروع کرے گا۔ یہ جمہور کا قول ہے لیکن کسی شرعی عذر سے افطار کرنا جیسے حیض وغیرہ تو اس سے دوبارہ شروع کرنا لازم نہیں ہوگا۔

کسی بیماری کی وجہ سے افطار کرنے کے بارہ میں اختلاف ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کھانے کی طرف منتقل ہونے کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ ظہار میں ہے یہی موقف امام شافعی کا ہے۔ تَوْبَةً مِّنَ اللهِ تعالیٰ سے بخشوانے کے لئے۔ یہ مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی یہ توبہ تمہارے لئے قانون بنا دیا یعنی تمہاری توبہ قبول کرنے کے لئے یا مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی اس نے تمہارے اوپر رجوع کی توبہ قبول کرنے کے لئے ایک قول کے مطابق یہ حال ہے یعنی اس حال میں کہ یہ توبہ والا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔

مضمون نمبر: ۳۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۹۴)

"اے ایمان والو! جب تم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جارہے ہو"

یہ جہاد وقتال کے ذکر سے ملی ہوئی عبارت ہے

ضرب کہتے ہیں زمین میں چلنے کو عرب کہا کرتے ہیں ضَرَبْتُ فِي الْاَرْضِ جب وہ تجارۃ یا جنگ وغیرہ کے لئے جائیں اور جب کسی انسان کی ضرورت پوری کرنے کا ارادہ کریں تو فی کے بغیر ضَرَبَ الْاَرْضَ بولتے ہیں۔ اسی معنی میں آپ ﷺ کا فرمان ہے "دو آدمی نہ نکلیں کہ وہ پاخانہ کے لئے جارہے ہوں۔

فَتَبَيَّنُوْا۔ "تو تحقیق کرلیا کرو"

یہ تبین سے ہے جس کے معنی ہیں رکنا یہی جمہور کی قراءت ہے سوائے حمزہ کے وہ فَتَثَبَّتُوْا پڑھتے ہیں جو التثبت سے ہے۔ پہلی قراءۃ ابو عبیدہ اور ابو حاتم نے پسند کی ہے وہ کہتے ہیں جسے تحقیق کا حکم دیا گیا اسے ثبوت حاصل کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ تحقیق کے حکم میں سفر کو خاص کیا ہے

باوجود اس کے کہ تحقیق اور ثبوت حاصل کرنے قتل کے معاملہ میں سفر ہو یا حضر واجب ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ جس حادثہ کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی وہ سفر میں ہوا۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ۔

''اور جو تم سے سلام علیک کرے تم اسے یہ نہ کہہ دو۔''

ابو عبید نے السلام کی قراءت کو پسند کیا ہے اور اہل نظر نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا السلم یہاں زیادہ مشابہت رکھتا ہے' کیونکہ یہ مطیع و فرمانبردار کے معنی میں ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ نہ کہو جو تمہیں ہاتھ دے اور مطیع ہو جائے۔

السلم اور سلام دونوں فرمانبرداری کے معنی میں ہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ دونوں اسلام کے معنی میں ہیں' یعنی نہ کہو اسے جو تمہاری طرف سلام بڑھائے' یعنی کلمہ شہادت کہے کہ ''لَسْتَ مُؤْمِنًا'' تو ایمان والا نہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ دونوں سلام کے معنی میں ہیں جو اسلام والوں کا تحفہ ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس بات سے روکا ہے کہ اگر کافر اپنی کسی بات کو اپنے اسلام کی دلیل کے طور پر پیش کریں تو اسے نظر انداز کر دیں اور مسلمان ایسی بات کہہ دیں کہ یہ لوگ پناہ چاہنے اور بچنے کے لئے یہ کہتے ہیں۔ ابو جعفر نے لَسْتَ مُؤْمَنًا پڑھا ہے یعنی جسے آپ پناہ دیں اور تحفظ دیں اور وہ مومن ہو۔

اس آیت سے کچھ لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ جب کافروں کو لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد قتل کیا گیا تو اسے اس کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا کیونکہ اس نے اس کلمہ سے اپنا خون مال اور گھربار بچا لیا۔ صرف زمانہ نبوت میں اس طرح کے قتل کا واقعہ ہوا تھا' اس لئے کہ انہوں نے تاویل کی اور گمان یہ کیا کہ اس نے اسلحہ کے ڈر سے یہ کلمہ پڑھا حقیقت میں یہ مسلمان نہیں اور یہ کہنے سے اس کا خون محفوظ نہیں ہوتا یہ بھی ضروری ہے کہ اطمینان کی حالت میں جب کوئی خوف نہ ہو یہ کلمہ پڑھنا چاہیے۔

اسلام کا کلمہ بولنے میں حکمت یہ ہے کہ: وہ شخص اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ میں مسلم ہوں اور تمہارے دین پر ہوں۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ آیت کا معنی خود کو مطیع و فرمانبردار کرنا ہے تو یہ مقصد ہر اس بات اور کام سے حاصل ہو جائے گا جس سے اسلام سمجھ آتا ہے' مختصراً ان میں سے کلمہ شہادت اور اطاعت کا کلمہ ہے' بعد والے دو اقوال دوسرے معنی میں پہلے قول میں داخل ہیں۔

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ ''تم دنیاوی زندگی کے اسباب کی تلاش میں ہو۔''
یہ جملہ حال ہونے کی وجہ سے نصبی حالت میں ہے' یعنی یہ بات تم غنیمت لینے کے لئے نہ کہو اس بنا پر یہ نہی قید اور مقید دونوں کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ صرف قید کی طرف۔

دنیاوی سامان کو اسباب اس لئے کہا کہ یہ عارضی اور ختم ہونے والا ہے' یہ ہمیشہ قائم نہ رہے گا۔ ابوعبیدہ نے کہا: کہا جاتا ہے کہ دنیاوی زندگی کا کل سامان عارضی ہے' عَــرَضَ ہوتو درہم و دینار کے علاوہ ہر چیز ہر عَـرُض عَـرَض ہوتا ہے اور ہر عَـرَض عَـرُض نہیں ہوتا۔ کتاب العین میں مذکور ہے عـرض وہ جو دنیا میں حاصل ہو اسی معنی میں فرمان الٰہی ہے تُـرِيْـدُوْنَ عَـرَضَ الدُّنْيَا ''تم دنیاوی سامان چاہتے ہو۔'' اس کی جمع ''عروض'' آتی ہے۔

ابن فارس کی مجمل میں ہے: 'عـــــرض' وہ ہوتی ہے جو انسان کو بیماری وغیرہ لاحق ہو اور 'عـرض الدنیا' کہتے ہیں جو اس دنیا میں مال تھوڑا یا زیادہ موجود ہو اور عرض اثاثہ کو بھی کہتے ہیں جو نقدی کے علاوہ ہو۔

فَعِنْدَ اللّٰهِ۔ ''اللہ تعالیٰ کے پاس۔'' یہ نہی کی علت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس ایسی اشیاء ہیں جو تمہارے لئے حلال و جائز ہیں کسی گناہ کے ارتکاب سے بچتے ہوئے۔ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ''بہت سی غنائم ہیں۔'' کہ تم انہیں حاصل کرو اور اس طرح تم ایسے لوگوں کے قتل سے جو مطیع و فرمانبردار ہو جائیں بے پرواہ ہو جاؤ اور ان کے مال کو غنیمت بنانے سے بھی بے پرواہ ہو جاؤ۔

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ۔ ''پہلے تم بھی ایسے ہی تھے۔''
یعنی پہلے تم بھی کافر تھے اور تمہارے خون کلمہ شہادت ادا کرنے سے محفوظ ہو گئے یا تم بھی اس سے پہلے اسی طرح تھے کہ اپنے ایمان کو اپنی قوم سے چھپاتے تھے خود پر ڈرتے ہوئے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنا دین عطا کر کے تم پر احسان کیا تو تم نے ایمان کا اظہار اور اعلان کر دیا۔

مضمون نمبر: ۳۱

لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۹۰)
''بیٹھ رہنے والے مومن برابر نہیں۔''
بغیر عذر کے جہاد میں شرکت نہ کرنے والوں کے مراتب میں اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مال و جان سے جہاد کرنے والوں کے مراتب میں فرق ہے' اگرچہ یہ بات ضروری طور پر معلوم ہے

لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ بتلانے کا ارادہ یہ ہے کہ مجاہدین چاق وچوبند ہو کر جہاد میں رغبت کریں اور شرکت نہ کرنے والوں کو سرزنش کی تاکہ وہ نفرت کریں۔

غَیْرُ ''علاوہ'' 'قاعدین' کی صفت ہونے کی وجہ سے اہل کوفہ ابو عمرو اور امام ابن کثیر اس کو مرفوع پڑھتے ہیں جیسا کہ اخفش کا کہنا ہے کیونکہ 'قاعدین' سے کوئی خاص قوم مراد نہیں اس طرح یہ نکرہ ہوا تو غیر کو ان کی بطور صفت لانا جائز ہے۔ ابو حیوہ مومنین کی صفت قرار دے کر راء کے کسرہ سے پڑھتے ہیں۔ حرمین والے راء پر فتح پڑھتے ہیں قاعدین یا مومنین سے استثناء کرتے ہوئے' یعنی سوائے تکلیف والوں کے کیونکہ وہ مجاہدین کے برابر ہیں۔ قاعدین سے حال بناتے ہوئے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے' یعنی پیچھے رہنے والے صحت مند برابر نہیں' پیچھے رہیں جب کہ وہ تندرست ہوں۔ اسے ان کا حال بتانا جائز ہے کیونکہ ان کے متعلق بولا گیا لفظ معرفہ ہے۔

علماء کا کہنا ہے کہ اولی الضرر سے مراد عذر والے ہیں کیونکہ اس عذر نے انہیں مجبور کیا حتیٰ کہ انہیں جہاد سے روکا۔ قرآن کے ظاہری اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ عذر والے شخص کو مجاہد کے برابر اجر ملے گا۔ ایک قول کے مطابق بغیر اضافہ کے اجر ملے گا اور مجاہد معرکہ میں موجود ہونے کی وجہ سے کئی گنا زیادہ فضیلت والا ہوگا۔

امام قرطبی فرماتے ہیں: پہلا معنی زیادہ درست ہے ان شاء اللہ اس بارہ میں صحیح حدیث ہے کہ مدینہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے کوئی وادی طے نہیں کی اور نہ کوئی سفر کیا مگر وہ ان مجاہدین کے ساتھ تھے یہ ایسے لوگ تھے' جنہیں عذر نے روکا۔ مزید فرماتے ہیں' اس واقعہ میں ایک دوسری حدیث بھی اس معنی کی موجود ہے کہ جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے کے لئے وہ تمام نیکیاں لکھو جو وہ تندرستی میں کیا کرتا تھا جب تک کہ یہ تندرست نہ ہو جائے یا میں اسے فوت نہ کر لوں۔

وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً۔

''اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے (پیچھے رہ جانے) والوں پر اللہ تعالیٰ نے درجات میں بہت فضیلت دے رکھی ہے۔''

یہ دو گروہوں کے مابین اختلاف فضیلت کا بیان ہے اجمالی طور پر ذکر ہے کہ یہ برابر نہیں۔

یہاں مراد یہ ہے کہ: غیر اولی الضرر میں مطلق کو مقید پر محمول کیا ہے' یہاں درجہ کہا اور اس کے بعد درجات کہا۔ ایک قوم کا کہنا ہے فضیلت پہلے درجہ میں ہے' پھر درجات میں ذکر ہوئی یہ تو مبالغہ اور بیان میں تاکید کے لئے ہے۔

دوسروں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو عذر سے بیٹھنے والوں پر ایک درجہ میں فضیلت دی ہے اور بغیر عذر کے بیٹھنے والوں پر مجاہدین کو کئی درجات میں فضیلت دی ہے۔ یہ بات ابن جریج اور سدی وغیرہ نے کہی۔ ایک قول کے مطابق درجہ کا معنی بلندی ہے یعنی ان کا تذکرہ بلند ہو جائے گا اور تعریف وثناء بڑھے گی اور درجۃ تمیز یا مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے کیونکہ یہ فضیلت کی جگہ آیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے فضیلت عطا فرمائی' یا یہ منصوب بنزع الخافض ہے یا مجاہدین سے حال ہے یعنی درجہ والے۔

وَ كُلًّا۔ مفعول اول ہے وعد سے' تخصیص کے لئے مقدم کیا گیا ہے' یعنی ہر ایک مجاہدین اور بیٹھنے والوں میں سے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ ''اور اللہ تعالیٰ نے خوبی اور اچھائی کا وعدہ دیا ہے۔'' یعنی بدلہ بصورت جنت یہ بات قتادہ نے کہی۔

مضمون نمبر: ۳۲

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا۔(۹۷)

''کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے؟ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ پہنچنے کی بری جگہ ہے۔''

یہاں ارض سے مراد مدینہ ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ عام ہے کیونکہ قانون ہے لفظ کے عموم پر اعتبار کیا جاتا ہے نہ کہ خاص سبب پر جیسا کہ یہی بات سچ ہے۔ تو اس لئے ارض سے مراد ہر وہ زمین کا حصہ ہے جہاں ہجرت کر جانا درست ہو اور پہلی آیت میں مذکورہ زمین سے مراد ہر وہ زمین ہے جہاں سے ہجرت کرنا ہی مناسب ہو۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ۔ ''مگر جو بے بس ہیں۔''

یہ ماواھم کی ضمیر سے استثناء ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ

مستضعفین موصول اور اس کی ضمیر میں داخل نہیں۔ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ ''مرد عورتیں اور بچے۔'' یہ ایک محذوف لفظ کائنین کے متعلق ہے یعنی یہ ان میں سے ہیں۔ بے بس مردوں سے مراد اور ان جیسے ہیں اور ولدان سے مراد عیاش بن ابی ربیعہ اور سلمہ بن ہشام ہیں۔

بچوں کا ذکر اس لئے کیا حالانکہ یہ احکام شریعت کے مکلف نہیں تاکہ ہجرت کے حکم میں مبالغہ ہو سکے اور یہ یقین پیدا کرنے کے لئے کہ یہ غیر مکلف پر بھی واجب ہے جبکہ وہ طاقت رکھتا ہو تو اس کے بارہ میں کیا خیال ہے جو مکلف ہے۔ ایک قول کے مطابق بچوں سے مراد قریب البلوغت اور غلام ہیں۔ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً ''جنہیں کسی چارہ کار کی طاقت نہیں۔'' یہ مستضعفین کی صفت ہے یا پھر رجال نساء ولدان کی۔ یا مستضعفین میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے۔ ایک قول کے مطابق حیلہ لفظ عام ہے یہ ہر اس قسم کو شا[illegible] ہے جو کسی سے خلاصی پانے میں سے ہو یعنی وہ نہ کوئی حیلہ پاتے ہیں اور نہ کوئی راستہ جا[illegible] ۔ وَ لَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا۔ ''نہ کسی راستہ کا علم ہے۔'' ایک قول کے مطابق سبیل سے مراد مدینہ کا راستہ ہے۔

اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو دار الشرک میں ہو اس پر ہجرت واجب ہے یا ایسے علاقہ میں ہو جہاں اعلانیہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے۔ جب وہ ہجرت کی طاقت بھی رکھتا ہو اور مستضعفین میں سے نہ ہو اس لئے کہ اس آیت میں لفظ عام ہیں اگرچہ یہ آیت ایک خاص سبب سے نازل ہوئی جیسا کہ گذر چکا اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک جگہ اور دوسری جگہ اسی طرح ایک زمانہ اور دوسرے زمانہ میں کوئی فرق نہیں۔

ہجرت کے بارہ میں بہت احادیث آتی ہیں ہم نے انہیں ہجرت کے متعلق سوال کے جواب میں ذکر کیا ہے کہ آج سرزمین ہند سے ہجرت کا کیا حکم ہے اسے دیکھنا چاہیے۔ یہ حدیث بھی مروی ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں اس کی صحیح ترین وضاحت ہم نے اپنی بلوغ المرام کی شرح میں ذکر کی ہے اسے بھی دیکھنا چاہیے۔

مضمون نمبر: ۳۳

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۰۱)

''جب تم سفر میں جا رہے ہو۔''

بوقت ضرورت نماز کی کیفیت کی ابتداء ہے سفر میں دشمن کے بالمقابل بارش یا بیماری کے

وقت۔ اس میں تاکید ہے مہاجر کے ہجرت پر پختگی کی اور اس کی رغبت ہے اس لئے کہ اس صورت میں مشقت کم کردی گئی ہے، یعنی جب تم کسی قسم کا بھی سفر کرو جس پر لفظ سفر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ "تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔" یعنی کوئی بوجھ یا کوئی حرج نہیں کہ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ "تم نمازوں کو قصر کرو۔" اس میں یہ دلیل ہے کہ قصر کرنا واجب نہیں اور یہی موقف جمہور کا ہے۔

کچھ لوگوں کا موقف ہے کہ واجب ہے، ان میں سے ہیں عمر بن عبدالعزیز اور اہل کوفہ قاضی اسماعیل حماد بن ابی سلیمان اور یہی بات امام مالک سے مروی ہے۔ انہوں نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا جو صحیح میں ثابت ہے کہ: نماز دو دو رکعات فرض کی گئی پس حضر میں زیادہ کردی گئی اور سفر میں اسے برقرار رکھا۔ اس مسئلہ میں ان کی مخالفت کوئی نقصان نہیں کرتی اس لئے کہ ان سے یہ روایت موجود ہے۔ پس عمل ہوگا اس روایت کے مطابق جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

اسی طرح یعلی بن امیہ کی حدیث ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے پوچھا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو، اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہو کہ کافر لوگ تمہیں فتنہ میں مبتلا کردیں گے اب تو لوگ پر امن ہیں؟ عمر نے کہا جس طرح تو نے تعجب کیا اسی طرح میں نے بھی تعجب کیا تھا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: یہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا ہے تم اس کے صدقہ کو قبول کرو۔ اس حدیث کو امام احمد، مسلم اور سنن والوں نے روایت کیا۔ تو اس کا صدقہ قبول کرو سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصر کرنا واجب ہے۔

اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ "اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے۔"

اس شرط سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصر کرنا صرف اس سفر میں جائز ہے جبکہ کافروں کی طرف سے فتنہ کا خوف ہو اور امن میں جائز نہیں لیکن یہ بات سنت نبوی سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن میں قصر کیا جیسا کہ آپ کو علم ہو چکا ہے۔ خوف کے وقت قصر کرنا قرآن سے ثابت ہے، شرط کا مفہوم اپنے مخالف کی موجودگی میں مضبوط نہیں رہ سکتا جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے امن کی حالت میں قصر کرنا تواتر سے ثابت ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ بطور اغلب کہا گیا ہے کیونکہ اس وقت اکثر اوقات مسلمان سفر میں

خوف کی وجہ سے قصر کیا کرتے تھے اسی لئے یعلی بن امیہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے وہ کہا جو گذر چکا ہے۔ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی قراءۃ میں اِنْ خِفْتُمْ کو ساقط کر کے یعنی ان تقصروا من الصلوٰۃ ان یفتنکم پڑھتے ہیں اس قراءۃ کے مطابق معنی یہ ہوگا اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کافر تمہیں فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔

اہل علم کی ایک جماعت کا موقف ہے کہ یہ آیت صرف ایسے مسافر کے لئے قصر نماز جائز کرتی ہے جسے دشمن کا ڈر ہو جو پر امن ہو اسے قصر کرنا جائز نہیں۔ دوسروں کا کہنا ہے فرمان الٰہی ان خفتم ماقبل سے نہیں ملا ہوا فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلاۃ پر گذشتہ کلام مکمل ہو جاتی ہے۔ پھر کلام شروع کی اور فرمایا: اگر تمہیں کافروں کی طرف سے فتنہ کا ڈر ہو تو اے محمد! (ﷺ) انہیں خوف کی نماز پڑھاؤ۔ ایک قوم کا کہنا ہے خوف کا ذکر سنت سے منسوخ ہے تو اس کی ناسخ حدیث ہے جو ہم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے بیان کی اور جو اس کا معنی بیان ہوا۔

مضمون نمبر: ۲۳

وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ (۱۰۲)

"جب تم ان میں ہو۔"

یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو اور ان کے بعد جو سردار ہوا سے ہے۔ اس کا حکم جیسا کہ اصول کی کتب میں معروف ہے بیان قرآن الٰہی کی طرح ہے کہ خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً "ان سے ان کے اموال میں زکوٰۃ وصول کرو۔"

یہی موقف جمہور علماء کا ہے۔ ابو یوسف اور اسماعیل بن علیہ اس اجماع سے نکلے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے بعد خوف کی نماز نہیں پڑھی جائے گی کیونکہ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ مزید کہتے ہیں: آپ کے علاوہ اس میں کسی دوسرے کو شامل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ بات آپ کی ہی بلند شان کے لائق ہے لیکن تحقیق مردود ہے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے رسول ﷺ کی اتباع و پیروی کا حکم دیا ہے آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ نماز ایسے پڑھو جیسا کہ مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کے معنی کو سب سے زیادہ جانتے تھے انہوں نے یہ نماز آپ ﷺ کے بعد متعدد مرتبہ ادا کی جیسا کہ یہ بات معروف ہے۔

فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ "اور ان کے لئے نماز کھڑی کرو۔"

یعنی کھڑی کرنے کا ارادہ کرو جیسا کہ یہ فرمان الٰہی ہے۔ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ اور فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ۔

فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ ۔ "تو چاہیے کہ ان کی ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہو۔" یعنی دشمن کے سامنے کھڑا ہونے کے بعد دوسری جماعت آپ کے ساتھ نماز میں کھڑی ہو وَلْيَأْخُذُوْا أَسْلِحَتَهُمْ ۔ اور "اپنے ہتھیار لئے ہوئے" یعنی جو جماعت تمہارے ساتھ نماز ادا کر رہی ہو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ضمیر پہلی جماعت کی طرف لوٹتی ہے جو دشمن کے سامنے ہے کیونکہ نماز پڑھنے والی جماعت جنگ تو نہ کر سکے گی۔ پہلی بات زیادہ ظاہر ہے کیونکہ جو جماعت دشمن کے مقابل کھڑی ہے اس کے پاس تو لازمی طور پر اسلحہ ہوگا اس حکم کی ضرورت تو ان کو ہے جو نماز پڑھ رہے ہیں کیونکہ ان کا گمان تھا کہ حالت نماز میں اسلحہ اٹھانا منع ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اسلحہ اٹھا کر پڑھیں نہ کہ نیچے رکھ کر اس سے مراد ہاتھ سے پکڑنا نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنا اسلحہ اس قدر قریب رکھیں کہ بوقت ضرورت قریب سے پکڑ سکیں تو اس طرح دشمن کی ان کے متعلق غفلت کی امید ٹوٹ جائے گی۔

زجاج اور نحاس نے جائز قرار دیا ہے کہ یہ حکم دونوں گروہوں کو ہے کیونکہ یہ دشمن کو زیادہ مرعوب کرنے کا سبب ہے۔ ظاہری مسلک کے لوگ اس اس حکم کو وجوب پر محمول کرتے ہوئے نماز میں اسلحہ اٹھانا واجب قرار دیتے ہیں اس حکم کو وجوب پر محصول کرتے ہوئے۔

امام ابوحنیفہ کا موقف ہے کہ نماز پڑھنے والے اسلحہ نہ اٹھائیں اس طرح ان کی نماز باطل ہو جائے گی۔ ان کا یہ موقف مردود ہے اس لئے کہ آیت اور احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے جیسا کہ ہم نے یہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس نماز کے مختلف ثابت طریقے بھی اپنی "شرح الدرر البہیہ اور مسک الختام" میں ۔ بیان کر دیئے ہیں۔

فَإِذَا سَجَدُوْا ۔ "پھر جب یہ سجدہ کر چکیں۔" یعنی نماز کی حالت میں کھڑے ہو جائیں۔ فَلْيَكُوْنُوْا "تو یہ ہٹ کر" یعنی جو جماعت دشمن کے مقابل کھڑی ہے مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۔ "تمہارے پیچھے آ جائیں۔" یعنی نماز پڑھنے والوں کے ۔ یہ احتمال بھی ہے کہ معنی اس طرح ہو کہ جب آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والے سجدہ کر کے رکعت مکمل کر لیں پھر وہاں سجدہ کا معنی رکعت ہوگا یا پھر پوری نماز فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۔ یعنی فارغ ہونے کے بعد دشمن کے بالمقابل پہرے کے لئے واپس چلے جائیں۔

وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰی لَمْ یُصَلُّوْا۔ ''اور دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ آ جائے۔'' جو دشمن کے مقابل کھڑی ہے فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ۔ ''اور وہ آپ کے نماز ادا کرے۔'' اسی طریقہ سے جیسا کہ پہلی جماعت نے ادا کی ہے۔ وَلْیَاْخُذُوْا۔ ''اور پکڑ لیں۔'' یعنی یہ دوسری جماعت حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ۔ ''اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار۔'' یہ مزید تاکید ہے بچاؤ اور اسلحہ پکڑنے کی دوسری جماعت کو۔ ایک قول کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اب یہ مسلمان اپنے نبی ﷺ کے ساتھ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں، اب ان پر ان کی بے خبری میں حملہ کرنا آسان ہے پہلی مرتبہ تو وہ یقین تھا کہ یہ جنگ کے لئے کھڑے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس لئے کہ دشمن اس وقت سے اپنے ارادہ کو مؤخر نہیں کرے گا کیونکہ یہ آخری نماز ہے اس لئے اپنا بچاؤ اور اپنے ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا۔

سلاح 'اسلحہ' کہتے ہیں اس چیز کو جس سے جنگ میں آدمی اپنی جان کا دفاع کرتا ہے۔ آیت کریمہ میں اس بات کی وضاحت نہیں کہ دونوں میں سے ہر جماعت کتنی نماز ادا کرے' سنت مطہرۃ میں صلاۃ الخوف مختلف صورتوں اور متعدد طریقوں سے آتی ہے جو تمام درست اور قابل عمل ہیں جس نے ان میں سے کسی ایک کے مطابق نماز ادا کی تو اس نے حکم کے مطابق عمل کیا۔ کچھ علماء ایسے بھی ہیں جو ایک کو اختیار کرتے اور دوسروں کو چھوڑ دینے کا موقف رکھتے ہیں' ان کا یہ موقف درستگی سے بہت دور ہے۔ اس کی وضاحت امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی شرح منتقی میں بیان کی ہے۔

وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً۔ ''کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے بے خبر ہو جاؤ تو وہ تم پر اچانک دھاوا بول دیں۔''

اس جملہ میں وہ علت موجود ہے جس وجہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بچاؤ اور اسلحہ پکڑنے کا حکم دیا' یعنی ان کی خواہش ہے کہ تم اسلحہ اور بچاؤ سے غافل ہو جاؤ تاکہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کر لیں اور تمہاری فرصت سے فائدہ اٹھا لیں تو وہ پوری شدت سے تم پر حملہ کر دیں۔ سامان سے مراد وہ سامان ہے جس سے جنگ میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے مثلاً سواری اور زادِ راہ وغیرہ۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًی مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰی اَنْ تَضَعُوْا اَسْلِحَتَكُمْ۔ ''ہاں اپنے ہتھیار اتار رکھنے میں اس وقت تم پر کوئی حرج نہیں جب کہ تمہیں بارش

کا تکلیف ہو یا تم بیمار ہو۔" اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو اسلحہ رکھنے کی رخصت دی جب انہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا بیماری کے وقت کیونکہ ان دونوں حالات میں اسلحہ اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔

وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا "اور اپنے بچاؤ کی چیزیں ساتھ لئے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ نے منکروں کے لئے ذلت کی مار تیار کر رکھی ہے" اللہ تعالیٰ نے پہرے کا حکم دیا تا کہ دشمن ان کی غفلت میں حملہ نہ کر دے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ۔ (۱۰۳)

"پھر جب تم نماز ادا کر چکو۔"

یعنی صلاة الخوف سے فارغ ہو جاؤ' یہ قضاء کے دو معنوں میں سے ایک ہے۔ اس طرح کا ایک معنی یہاں ہے فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ اور فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۔ "تو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو" یعنی ہر حالت میں حتیٰ کہ حالت جنگ میں بھی۔

جمہور علماء کا موقف ہے یہاں جس ذکر کا حکم دیا گیا ہے وہ صرف صلاة الخوف کے بعد ہے یعنی جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو ان حالات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ ایک قول کے مطابق "فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ" کا معنی ہے جب تم نماز ادا کر لو تو پھر کھڑے' بیٹھے' لیٹے جیسے ممکن ہو حالات کے تقاضہ کے مطابق گھمسان کی جنگ میں نماز ادا کر لو۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے فان خفتم فرجالا او رکبانا۔

فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ ۔ "اور جب اطمینان پاؤ۔" یعنی جب تمہیں امن حاصل ہو جائے اور تمہارے دل سکون کر لیں اطمینان کہتے ہیں' خوف سے دل کے پرسکون ہونے کو۔

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ "تو نماز قائم کرو۔" یعنی نماز کو جب اس کا وقت ہو جائے تو ادا کرو اس طریقہ سے جو شریعت نے عام حالات میں مقرر کیا ہے' ذکر اذکار اور ارکان کی ادائیگی اور بقدر امکان اس میں غفلت نہ کرو کیونکہ وہ رخصت تو صرف حالت خوف میں تھی۔ ایک قول کے مطابق آیت کا معنی ہے کہ جو نمازیں اس حالت جنگ میں ادا کیں ہیں ان کی قضا دیں کیونکہ وہ پریشانی اور تکلیف کی حالت میں تھیں اور اذکار و ارکان کی ادائیگی میں بھی کمی تھی' یہ امام شافعی سے مروی ہے' پہلی بات زیادہ راجح ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ''یقیناً نماز مومنوں پر مقررہ اوقات پر فرض ہے۔'' یعنی وہ وقت محدود اور معین ہیں۔ ایک محاورہ ہے'' وقتهٗ فهو موقوت و وقتهٗ فهو موقت'' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر نمازیں فرض کیں اور ان کے اوقات کو محدود مقرر کیا' کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان اوقات کے علاوہ نماز ادا کرے ہاں اگر کوئی شرعی عذر ہو مثلاً: سو گیا یا بھول گیا وغیرہ۔

مضمون نمبر: ۳۵

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى۔(۱۱۵)

''جو شخص باوجود راہ ہدایت کے واضح ہو جانے کے رسول کا خلاف کرے۔''

مشاققت کہتے ہیں دشمنی اور مخالفت کرنے کو۔ راہ ہدایت واضح ہونے کا مطلب ہے کہ وہ اس قدر ظاہر ہے کہ آدمی ایسے دلائل جو رسالت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں ان کو جان لینے کے باوجود پھر مخالفت کرتے ہیں۔

وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ''اور تمام مومنوں کا راستہ چھوڑ کر چلے۔''

یعنی ان کے طریقہ سے ہٹ کر وہ ایسا راستہ ہے جو دین اسلام اور احکام الرسول ﷺ کو مضبوط پکڑنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا اور فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ اور فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وغیرہ وغیرہ۔

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى۔ ''ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر دیں گے جدھر وہ خود متوجہ ہو'' یعنی ہم اسی طرف اس کا رخ کر دیں گے جس گمراہی کی طرف وہ پھرنا چاہتا ہے۔ وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔ ''اور دوزخ میں ڈال دیں گے وہ پہنچنے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔''

اہل علم کی ایک جماعت نے اس آیت وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ سے اجماع کے حجت ہونے کی دلیل لی ہے' جبکہ میرے نزدیک اس میں دلیل نہیں ہے کیونکہ یہاں مومنوں کے راستہ کے علاوہ سے مراد ہے۔ دین اسلام سے نکل کر دوسرے دین کو اپنانا جیسا کہ الفاظ سے معلوم ہو

رہا ہے اور اس کا سبب اس پر شاہد ہے تو یہ اس ملت اسلامیہ کے علماء میں سے کسی عالم پر صادق نہیں آتا جو کہ دین اسلام کے بعض مسائل میں اجتہاد کرے تو اس کا اجتہاد اس وقت کے دوسرے مجتہدین سے مخالف ہو۔ اس نے تو اس طرح مومنوں کے راستہ پر چلنے کا ارادہ کیا ہے جو کہ دین قیم کا نام اور ملت حنیفیہ سے عبارت ہے اس نے تو مومنوں کے راستہ کے علاوہ کوئی راستہ تلاش نہیں کیا۔

امام ترمذی نے اور امام بیہقی نے اپنی کتاب الاسماء والصفات میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس امت کو گمراہی پر کبھی اکٹھا نہیں کرے گا اور جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے' جو علیحدہ ہو' وہ آگ میں جائے گا۔ اس حدیث کو امام ترمذی اور بیہقی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا ہے۔

مضمون نمبر: ۳۶

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ۔ (۱۲۷)

"آپ سے عورتوں کے بارہ میں حکم دریافت کرتے ہیں' آپ فرما دیجئے! کہ خود اللہ تعالیٰ ان کے بارہ میں حکم دے رہا ہے۔"

اس آیت کا شان نزول صحابہ کا عورتوں کے بارہ میں سوال ہے کہ ان کیلئے وراثت کا حکم کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو فتویٰ دیا کہ وہ ان سے کہے اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے یعنی جس بارہ میں تم نے پوچھا تمہارے لئے اس کا حکم واضح کرتا ہے۔

یہ آیت ان آیات کی طرف لوٹتی ہے جن سے سورۃ کی ابتداء ہوئی عورتوں کے احکام کے متعلق میں کچھ احکام باقی تھے جو وہ نہ پہچان سکے تو انہوں نے پوچھ لیا' نتیجتاً انہیں جواب ملا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بتلاتا ہے۔

وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ۔ "معطوف ہے اَللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ پر۔ اس طرح معنی یہ ہوا وہ قرآن جو تم پر پڑھا جاتا ہے اللہ تمہیں ان کے بارہ میں اس میں بتلائے گا۔

یتیموں کے بارہ میں کتاب اللہ تعالیٰ میں یہ آیت پڑھی جاتی ہے وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى۔ "یہ بات بھی جائز ہے کہ وَ مَا يُتْلٰى معطوف ہو يُفْتِيْكُمْ کی ضمیر پر جو مبتدا کی طرف لوٹتی ہے' اس لئے کہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مفعول اور جار مجرور کی وجہ سے فاصلہ ہو گیا ہے۔ جائز ہے کہ یہ مبتداء ہو اور کتاب اس کی خبر ہو' اور اس بنا پر کہ کتاب سے مراد لوح محفوظ

ہو۔اس کے علاوہ بھی اس کے اعراب کے متعلق مختلف آراء ہیں، ہم انہیں ان کی کمزوری کی وجہ سے ذکر نہیں کرتے۔

فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ ۔ "یتیم لڑکیوں کے بارہ میں۔" پہلی اور دوسری توجیہہ کے مطابق یہ یتلی کا صلہ ہوگا اور تیسری توجیہ کے مطابق فیھن سے یہ بدل ہوگا الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا کُتِبَ و فرض لھن من المیراث "جنہیں ان کا مقرر حق تم نہیں دیتے۔" جو ان کا حق وراثت وغیرہ سے فرض ہے وَ تَرْغَبُوْنَ کا عطف لاتؤتونھن پر ہے، یعنی جملہ مثبتہ کا عطف جملہ منفیہ پر ہے اور بعض نے کہا کہ یہ تؤتونھن کے فاعل سے حال بنتا ہے۔

اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ ۔ کہ تم ان سے نکاح کرلو، ممکن ہے کہ اس کی تقدیر اسطرح ہو تم ان کے حسن و جمال کی وجہ سے ان سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح ہو تم ان کے خوبصورت نہ ہونے کی وجہ سے، ان سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو۔ والمستضعفین "اور کمزور بچے۔" یہ معطوف ہے یتیم لڑکیوں پر یعنی جو تم پر کمزور بچوں کے بارہ میں پڑھا جاتا ہے وہ یہ ہے۔ یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ ۔ جاہلیت میں لوگ عورتوں اور کمزور بچوں کو وارث نہیں بنایا کرتے تھے وہ صرف ان مردوں کو وارث بناتے جو لڑائی اور دوسرے امور کے قابل ہوتے۔

وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۔ "اور اس بارہ میں کہ یتیموں کی کارگذاری انصاف کے ساتھ کرو۔" یہ معطوف ہے فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ پر مستضعفین کی طرح، یعنی جو تم پر یتیم لڑکیوں، کمزور بچوں اور یتیموں سے انصاف کے متعلق پڑھا جاتا ہے۔ القسط کو نصبی حالت میں پڑھنا بھی جائز ہے، یعنی وہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم انصاف کرو۔ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ "تم جو نیک کام کرو۔" مذکورہ لوگوں کے حقوق کے بارہ میں یا تم اس برائی کرو۔ اس میں دونوں معنی مراد ہیں۔

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِیْمًا "بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے پوری طرح جاننے والا ہے۔" یعنی وہ تمہارے اعمال کے مطابق تمہیں بدلہ دے گا۔

مضمون نمبر: ۳۷

وَ اِنِ امْرَاَةٌ ۔ (۱۲۸) "اگر کسی عورت کو۔"

محذوف فعل کی وجہ سے مرفوع ہے اس کی تفسیر اس کا مابعد کر رہا ہے۔ یعنی اگر ڈر ہو عورت کو اس معنی میں کہ وہ توقع کرے جو اپنے خاوند سے خطرہ ہے۔ ایک قول کے مطابق وہ یقین کر لے

یہ معنی غلط ہے۔ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا ۔ ''اپنے خاوند سے بد دماغی کا۔'' یعنی ہمیشہ کی ناراضگی کا اور بستر میں علیحدگی اور خرچ میں کمی کا۔ اَوْ اِعْرَاضًا۔ ''یا بے پرواہی کا۔'' اس عورت سے مونہہ موڑ کر۔

نحاس کہتے ہیں: نشوز اور اعراض میں فرق یہ ہے کہ نشوز کا معنی ہے دور رہنا اور اعراض کا معنی ہے بات نہ کرنا اور محبت نہ کرنا۔ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناراضگی اور بے پرواہی کے ڈر سے صلح کرانی جائز ہے۔ یہاں لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ خاص سبب کا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح کرانی چاہیے' گو کسی طریقہ سے بھی ہو' مستقل یا کبھی کبھار اپنی باری چھوڑ کر یا کچھ خرچ کم کر کے یا کچھ مہر دے کر۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا ۔ ''دونوں آپس میں جو صلح کر لیں اس میں کسی پر کوئی گناہ نہیں۔'' اہل کوفہ اسی طرح پڑھتے ہیں یعنی اَنْ يُّصْلِحَا جمہور کی قراءت زیادہ مناسب ہے کیونکہ عرب کا قانون ہے کہ کوئی کام جو دو یا اس سے زیادہ کے مابین ہو تو تصالح الرجلان او القوم' بولتے ہیں اصلح نہیں بولتے صُلْحًا۔ اسم مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا اس بنا پر کہ یہ ایسا مصدر ہے جس کے زائد الفاظ محذوف ہیں یا فعل محذوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی ان کے حالات کی اصلاح کرا دے۔ ایک قول کے مطابق یہ مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۔ ''صلح بہت بہتر چیز ہے۔'' یہ لفظ عام ہے جو تقاضہ کرتا ہے کہ جو صلح دلوں کو سکون اور آپس کے اختلافات کو دور کر دے وہ ہر اعتبار سے بہتر ہے یا وہ تفریق یا جھگڑے یا ناراضگی اور بے پرواہی سے بہتر ہے' یہ جملہ معترضہ ہے۔

مضمون نمبر: ۳۸

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْآ اَنْ تَعْدِلُوْا ۔ (۱۲۹)

''تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ تم ہر طرح عدل کرو۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ خبر دی کہ تم میں اتنی طاقت نہیں کہ تم بیویوں کے درمیان عدل کرو' اس طرح کہ لازمی طور پر کسی دوسری کی طرف میلان نہ ہو۔ اس لئے کہ بشری طبیعتوں کی جبلت یہی ہے کہ ایک کی بجائے دوسری کی طرف میلان ہو جاتا ہے' ایک سے محبت زیادہ ہو جاتی ہے اور دوسری سے کم۔ یہ تخلیق کے متعلق حکم ہے اس اعتبار سے کہ لوگ اپنے دلوں کے مالک نہیں ہوتے

اور نہ خود کو برابر پر کھڑا کر سکتے ہیں۔

اسی لئے صادق المصدوق ﷺ نے فرمایا: اللهم هذا قسمي فيما املك فلا تلمني فيما لا املك (اور یہ اس لئے کہ آپ ﷺ اپنی تمام بیویوں میں سے ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے) یا اللہ! جس تقسیم کا میں مالک ہوں وہ یہ ہے آپ مجھے ملامت نہ کیجئے گا، جس کا میں مالک نہیں۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن منذر نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کی۔ اس کی صحیح ہے۔

وَلَوْ حَرَصْتُمْ۔ "گو تم اس کی کتنی ہی خواہش و کوشش کر لو۔" ان کے درمیان محبت میں عدل کرنے کی۔ فَلَا تَمِيلُوا۔ "پس مائل نہ ہو جاؤ" یعنی اس کی طرف جس سے تم محبت کرتے ہو خرچ اخراجات اور باری کی تقسیم میں جبکہ وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے (اگرچہ وہ اس پر خواہش رکھیں اور اس میں آگے بڑھیں) اللہ تعالیٰ نے انہیں مائل ہونے سے روک دیا۔ كُلَّ الْمَيْلِ۔ "بالکل مائل ہونا" کیونکہ اسے چھوڑنا اور ظلم سے پوری طرح اجتناب کرنا ان کی طاقت و وسعت میں ہے، تو ان کے لئے جائز نہیں کہ ان میں سے ایک کی طرف پوری طرح جھک جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَتَذَرُوهَا۔ "اس طرح چھوڑ دو۔" یعنی دوسری کو۔ كَالْمُعَلَّقَةِ۔ "گویا کہ وہ لٹکی ہوئی ہے۔" وہ جو نہ بیوی کی حیثیت میں ہو اور نہ مطلقہ ہو، اسے اس چیز سے تشبیہ دی جو کسی جگہ ٹھہری ہوئی نہیں نہ آسمان میں نہ زمین پر۔

مضمون نمبر: ۳۹

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ۔ (۱۴۰)

"اور اللہ تعالیٰ تمہارے پاس اپنی کتاب میں یہ حکم اتار چکا ہے۔"

یہ خطاب ان تمام افراد سے ہے جو بھی ایمان کا اظہار کر چکے ہیں وہ مومن ہیں یا منافق ہیں کیونکہ جو ایمان ظاہر کر لے اس پر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کو اپنانا لازم ہو جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ خطاب صرف منافقوں سے ہے جیسا کہ سختی اور ڈانٹ سے معلوم ہوتا ہے۔

اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا۔ "کہ تم جب کسی مجلس والوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے سنو۔" یعنی جب تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اور کفر کرتے ہوئے سنو تو فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ۔ "اس مجمع میں ان کے ساتھ

نہ بیٹھو۔" یعنی مذاق کرنے والوں کے ساتھ جب تک کہ وہ اس طرح کرتے رہیں۔ حَتّٰی يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهٖ۔ "جب تک کہ اس کے علاوہ وہ دوسری باتیں نہ کرنے لگیں" یعنی کفر اور مذاق والی باتوں کے علاوہ۔

اس آیت سے بھی یہی مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کے بارہ میں کتاب اللہ میں نازل کیا کہ وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ۔ "جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں کج بحثی کرتے ہیں آپ ان سے مونہہ موڑ لیں جب تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسری بات میں مشغول نہ ہو جائیں۔" مکہ میں ایک جماعت ایسی تھی جو اسلام میں داخل ہونے کے باوجود مشرک اور یہودیوں کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی اور جب یہودی قرآن کا مذاق اڑاتے تو انہیں اس بات سے روکا گیا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں اس آیت میں ہر وہ شخص داخل ہے جو قیامت تک دین میں کوئی نیا کام شروع کرے گا۔ اسی طرح امام شوکانی فتح القدیر میں فرماتے ہیں: اس آیت میں اس کے لفظ کے خاص سبب کو چھوڑ کر عموم پر اعتبار کرتے ہوئے دلیل یہ ہے کہ ہر وہ مقام جہاں لوگ ایسی باتوں میں مشغول ہوں جن سے شرعی دلائل میں نقص اور مذاق اڑایا جائے، تو وہاں سے بچنا چاہیے جیسا کہ تقلید کے قیدی لوگ اکثر لوگوں کے رائے کے مطابق کتاب وسنت کو تبدیل کر دیتے ہیں، ان کے ہاتھ میں سوائے اس بات کے کچھ نہیں رہا کہ ہمارے مذہب کے امام نے یوں کہا اور اس کے متبعین میں سے فلاں نے یوں کہا، جب وہ کسی ایسے شخص کی بات سنتے ہیں جو کہے کہ اس مسئلہ میں آیت قرآنی یا حدیث نبوی دلیل ہے، تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، جو اس نے کہا اس کی طرف اپنا سر نہیں اٹھاتے اور نہ اس کی کچھ پرواہ کرتے ہیں، ان کا گمان ہوتا ہے کہ یہ بہت قبیح اور گھٹیا بات سنا رہا ہے اور ان کے مذہب کے امام کی مخالفت کرتا ہے جسے انہوں نے شریعت کے استاذ اور معلم کے مرتبہ پر بٹھا رکھا ہے، بلکہ وہ اس میں بھی مبالغہ کرتے ہیں حتیٰ کہ اس کی رائے کو بلند اور اس کے اجتہاد کو جو راہ حق سے ہٹا ہوا ہے اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب اور اس کے رسول پر مقدم کرتے ہیں، انا للہ و انا الیہ راجعون

یہ ان باتوں سے ہیں جنہیں ان مذاہب والے کرتے ہیں اور وہ ہیں جنہیں یہ اپنی رائے سے ان اماموں کی طرف منسوب کرتے ہیں انہوں نے تو اپنی کتب میں صراحت سے اپنی تقلید کرنے سے منع کیا ہے جیسا کہ ہم نے اپنے رسالہ "القول المفید فی التقلید" میں واضح کیا

ہے اور اپنی کتاب "ادب الطلب ومنتهى الارب" میں۔ ادلة الاجتهادو اللهم انفعنابما علمتنا واحلعلنا من المتقدمين بالكتاب والسنة وباعد بيننا وبين آراء الرجال المنية على شفا جرف هار۔ يامجيب السائلين۔ یعنی اے اللہ جو تو نے ہمیں سکھایا اس سے فائدہ پہنچا اور ہمیں کتاب وسنت سے جوڑ دے ہمارے اور ان لوگوں کی آراء کے درمیان دوری رکھ دے جو آگ کے گڑھے کے کنارے پر ہیں اے سوال کرنے والوں کے جواب دینے والے۔"

اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔ "تم بھی اس وقت انہی جیسے ہو۔ یہ نہی کی علت ہے یعنی جب تم یہ کام کرو گے اور اس کام سے باز نہ آؤ گے تو تم بھی کفر اور عذاب کی طرف جانے میں ان کی طرح ہو گے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ مماثلت تمام صفات میں نہیں لیکن یہ مشابہت کا الزام ہے ظاہری حکم کی وجہ سے جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا: وَكُلُّ قَرِيْنٍ بِالْمُقَارِنِ يَقْتَدِيْ۔ ہر دوست دوست کی اقتداء کرتا ہے

تمام اہل علم کے نزدیک یہ آیت محکم ہے سوائے کلبی کے۔ وہ کہتے ہیں یہ اس فرمان الٰہی وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔ سے منسوخ ہے لیکن یہ قول مردود ہے یقیناً یہ تقویٰ کی علامت ہے کہ ایسے لوگ جو اللہ تعالیٰ کی آیات سے کفر کرتے اور مذاق اڑاتے ہیں ان کی مجالس سے اجتناب کیا جائے سورۂ انعام میں بھی اس طرح کی آیت موجود ہے۔

اہل علم کہتے ہیں: یہ دلیل ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے اسی طرح جو کسی نافرمانی پر راضی ہوا یا اس کام کو کرنے والوں میں گھل مل گیا تو یہ گناہ میں ان کے مرتبہ پر ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ان کا ہمنوا ہو کہ وہ اس فعل کا مرتکب نہ بھی ہو اور اگر ڈر اور خوف کی وجہ سے وہاں بیٹھا ہو مگر اس فعل سے نفرت کرتا ہو تو یہ پہلے کی نسبت کچھ آسان ہے۔

مضمون نمبر: ۴۰

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (۱۴۱)

"اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ایمان والوں پر ہرگز راستہ نہ دے گا۔"

اگر سبیل کا معنی نصرت، امداد اور غلبہ ہو تو پھر اس سے مراد ہے کہ یہ قیامت کے دن ہوگا اور اگر اس سے دلیل اور حجت مراد لیا جائے تو پھر اس کا تعلق دنیا سے ہوگا۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: تمام

مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے قیامت کا دن مراد ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں: یہ کمزور بات ہے کیونکہ اس بارہ میں کوئی مفید خبر نہیں' اس کا سبب تو ہم ہے' جو یہ وہم کرتا ہے کہ آخری گفتگو شروع کی طرف لوٹتی ہے' یعنی فرمان الٰہی ہے کہ: اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے روز فیصلہ کریں گے' یہ فائدہ ساقط الاعتبار ہے یا یہ کلام اللہ کے معنی میں تکرار ہے۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے خلاف کافروں کے لئے کوئی راستہ نہیں بنائے گا کہ جس سے مسلمانوں کی حکومت کلی طور پر ختم ہو جائیں، ان کے آثار مٹ جائیں اور ان کی جمعیت کو پارہ پارہ کردے جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ "اس طرح مسلمانوں کو بالکل ختم نہیں کیا جائے گا"۔

ایک قول کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کفار کو مومنوں کے خلاف اس وقت تک کوئی راستہ شرعی حجت نہیں بنائے گا جب تک یہ حق پر عمل کرتے رہیں گے' باطل سے ناراض رہیں گے اور نہی عن المنکر کا عمل بھی نہ چھوڑیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ ابن عربی کہتے ہیں یہ نہایت عمدہ بات ہے ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ ان کے لئے ان پر کوئی شرعی حجت نہیں بنائے گا اگر کوئی ہوا بھی تو خلاف شرع ہوگا کیونکہ شریعت اسلامیہ قیامت تک غالب رہے گی۔

یہ خلاصہ جو اہل علم نے اس آیت کے بارہ میں بیان کیا یہ بہت سارے مسائل کی دلیل کے لئے درست ہے' مثلاً کافر مسلمان کا وارث اور مسلمان کے مال کا مالک نہیں بن سکتا جب کہ اس کا والی بن جائے اور ذمی کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

مضمون نمبر: ۴۱

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ۔ (۱۴۸)

"برائی کے ساتھ آواز بلند کرنے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔"

محبت کی نفی کنایہ ہے بغض کی طرف۔ جمہور کی قراءۃ ہے اِلَّا مَنْ ظُلِمَ مگر مظلوم کو اجازت ہے۔ مجہول کے معنی ہونے کی بنا پر۔ زید بن اسلم' ابن اسحٰق' ضحاک' ابن عباس' ابن جبیر اور عطاء بن السائب معلوم ہونے کی بناء پر مبنی پڑھتے ہیں۔ پہلی قراءۃ کے مطابق استثناء محذوف مضاف کی تقدیر سے متصل ہے یعنی مگر وہ بلند کرے جو مظلوم ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ پہلی قراءۃ کے مطابق بھی منقطع ہے' یعنی جس پر ظلم ہوا اس کے لئے جائز ہے کہ وہ کہہ سکے مجھ پر فلاں نے ظلم کیا۔

برائی پر مظلوم کی آواز کو بلند کرنا جو جائز ہے، اس کی کیفیت میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ایک قول کے مطابق وہ ظالم پر بددعا کرے۔ایک قول کے مطابق ظالم کے بارہ میں آواز بلند اس طرح کرنا کہ فلاں نے مجھ پر ظلم کیا یا وہ ظالم ہے وغیرہ جائز ہے۔ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے مگر جو مجبور ہو کر بلند آواز میں کفریہ کلمہ کہہ دے وغیرہ وغیرہ تو یہ جائز ہے۔اس بنا پر آیت مذکور مجبور کرنے کے بارہ میں ہوگی۔اسی طرح قرطبی نے کہا کہ جائز ہے کہ یہ بدل ہو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا مگر جس سے ظلم ہو یعنی اللہ تعالیٰ ظالم سے نہیں بلکہ مظلوم سے محبت کرتا ہے۔

آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مظلوم کے لئے جائز ہے کہ وہ ایسی بات کہے جو ظالم کے حق میں بری ہو۔اس کی تائید صحیح حدیث سے ہوتی ہے کہ: قرض کی موجودگی کے باوجود ادا کرنے میں پس و پیش کرنا ظلم ہے، یہ عمل اس کی عزت اور سزا کو جائز کرتا ہے لیکن دوسری قراءۃ کی بنا پر استثناء منقطع ہے یعنی جو مظلوم ہے قول یا فعل سے تو اسے بلند کرو بری بات سے ایسا کرنے سے منع کرنے کے معنی میں اور اسے ڈانٹنے کے لئے۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کلام کا معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا کہ کوئی بلند آواز میں برائی کرے، لیکن جو مظلوم ہو کیونکہ وہ ظلم اور زیادتی کی وجہ سے اظہار کر سکتا ہے اور وہ اس طرح ظالم ہوگا اور اکثر ظالموں کی علامت یہی ہوتی ہے یہ ظلم کے باوجود مظلوموں پر زبان درازی کرتے اور ان کی بے عزتی کرتے ہیں۔زجاج کہتے ہیں یہ معنی کرنا جائز ہے: سوائے جو مظلوم ہے تو وہ بھی اس قدر کہے اس کے لئے مناسب ہے کہ اس کے ہاتھ پکڑے۔

مضمون نمبر: ۴۲

يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ۔(۱۷۶)

”آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ خود تمہیں کلالہ کے بارہ میں فتویٰ دیتا ہے۔“

کلالہ کے بارہ میں گفتگو گذر چکی۔اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ ۔”اگر کوئی شخص مرجائے۔“یعنی اگر کوئی فوت ہو جائے جیسا کہ فرمان الٰہی میں وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ۔میں گذر چکا۔

لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ ۔”جس کی اولاد نہ ہو۔“ یہ امرأ کی صفت ہے یا اس سے حال ہے اور اس کے حال بننے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ولد کا لفظ مرد اور عورت دونوں پر بولا جاتا ہے یہاں بچوں کے نہ ہونے کے ذکر کو کافی سمجھا اس بات کے ظاہر ہونے کی وجہ سے اس پر اعتماد کر لیا۔

ایک قول کے مطابق یہاں ولد سے مراد بیٹا ہے' یہ دو مشترک معنوں میں سے ایک ہے کیونکہ بیٹی بہن کو ساقط نہیں کرتی ۔ وَّلَـهٗٓ اُخۡتٌ فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ ۔ '' اور ایک بہن ہو تو اس کے چھوڑے ہوئے مال کا آدھا حصہ ہے۔'' یہ جملہ لَيۡسَ لَهٗ وَلَدٌ پر عطف ہے۔ یہاں اخت سے سگی یا باپ جائی بہن مراد ہے نہ کہ ماں جائی کیونکہ اس کا حصہ چھٹا ہے جیسا کہ پہلے گذر چکا۔

صحابہ تابعین اور ان کے بعد جمہور علماء کا موقف ہے کہ سگی یا باپ جائی بہنیں بیٹیوں کے لئے عصبہ ہیں اگر ان کے ساتھ بھائی نہ ہو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف ہے کہ بہنیں بیٹیوں کو عصبہ نہیں کرتیں۔ یہی موقف داؤد ظاہری اور ایک جماعت کا ہے' وہ کہتے ہیں کہ بہنوں کا چاہے وہ سگی ہوں یا باپ جائی بیٹیوں کے ساتھ وراثت میں کوئی حصہ نہیں ۔ انہوں نے اس آیت کے ظاہری اسلوب سے استدلال کیا ہے' یہاں بچہ کا نہ ہونا مذکر مؤنث دونوں کو شامل ہے اور یہ میراث بہن کیلئے قید ہے۔ اگر حدیث میں نہ ہوتا کہ بہن بیٹی کے ساتھ وارث ہے تو ان کا یہ استدلال صحیح ہوتا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بیٹی اور بہن کے درمیان فیصلہ کیا' بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف دیا۔ یہ بھی صحیح میں موجود ہے کہ نبی ﷺ نے بیٹی پوتی اور بہن کا فیصلہ کیا تو بیٹی کے لئے نصف رکھا پوتی کو چھٹا حصہ دیا اور (بطور عصبہ) باقی سارا بہن کو۔ یہ حدیث تقاضا کرتی ہے کہ ولد کا معنی بیٹا ہو اور بیٹی اس میں داخل نہ ہو۔

وَهُوَ ۔ '' اور وہ '' یعنی بھائی۔ يَرِثُهَآ ۔ '' اس کا وارث ہوگا۔'' یعنی بہن کا اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهَا وَلَدٌ ۔ '' اگر اس کی اولاد نہیں۔'' یعنی مذکر اولاد اگر اس کا اس عورت کی وراثت لینے سے مراد یہ ہو کہ اس کا سارا ترکہ لے لے گا۔ اور اگر مراد اس کی وراثت ثابت ہوتی ہے اس سے اجمالی طور پر تو اس بات سے زیادہ عام ہے کہ وہ ساری ہے یا کچھ۔ تو ولد کی تفسیر اسطرح کرنا درست ہوگا کہ اس میں مرد اور عورت شامل ہو۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صرف ولد کی نفی کرنا اس سے کافی سمجھا باوجود اس بات کے کہ باپ بھائی کو بھی ساقط کر دیتا ہے کیونکہ ولد کے ساتھ بھائی کے سقوط کا ذکر صرف یہاں مراد ہے لیکن اس کا بیٹے کے ساتھ سقوط تو سنت سے ثابت ہے صحیح میں نبی ﷺ کا فرمان موجود ہے کہ حقوق ان کے اہل لوگوں تک پہنچا دو اور جو باقی بچ جائے تو وہ سب سے قریبی مرد کے لئے ہے۔ باپ بھائی سے زیادہ قریبی ہے۔

فَاِنۡ كَانَتَا ۔ '' اگر بہنیں ہیں۔'' یعنی اخوت کی وجہ سے وارث ہیں۔ اثۡنَتَيۡنِ '' دو '' اس کا

عطف سابقہ شرط پر ہوگا۔ مونث تثنیہ اور اسی طرح اس فرمان الٰہی میں: وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً۔ "اور اگر اس ناطہ کے کئی شخص ہیں۔" خبر کی وجہ سے فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ۔ "تو انہیں کل چھوڑے ہوئے کا دو تہائی ملے گا۔" یعنی بھائی اگر اس کی اولاد نہ ہو جیسا کہ گذر چکا اور جو بہنیں دو سے زیادہ ہیں تو ان کے لئے قریبی ہونے کی بنا پر دو تہائی ہے حالانکہ آیت کا شان نزول سیدنا جابر رضی اللہ عنہ ہیں جبکہ وہ سات یا نو بہنیں چھوڑ کر فوت ہوئے وَاِنْ كَانُوْٓا۔ "اگر وہ۔" یعنی جو اخوت کی وجہ وارث ہیں۔ اِخْوَةً "بھائی۔" یعنی اور بہنیں بھی یہاں غلبہ کی وجہ سے مردوں کا ذکر آیا۔ یا اسے کافی سمجھا اس لئے کہ یہ دلیل ہے رِّجَالًا وَّنِسَآءً۔ "یعنی مرد عورتیں آپس میں گھلی ملی ہیں۔" فَلِلذَّكَرِ۔ تو ان میں سے مرد کے لئے عصبہ ہونے کی وجہ سے مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ۔ "دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔" ہم نے یہ کلام واضح کر دیا ہے۔ اختلاف دلائل اور راجح مسلک بیان کر کے کلالہ کے بارہ میں اس سورۃ کی ابتداء میں بات ہو چکی ہے اس لئے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

نسآء

سورۃ المائدہ

(ایک سوبیس آیات ہیں)

قرطبی فرماتے ہیں یہ سورۃ مدنی ہے اس پر اجماع ہے۔

فائدہ: ابو میسرہ کہتے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سورۃ میں اٹھارہ (۱۸) احکام نازل فرمائے جنہیں اس سورۃ کے علاوہ پورے قرآن میں نازل نہیں کیا۔ان کی ابتداء وَالْمُنْخَنِقَةُ سے ہوتی ہے اور انتہا اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ۔

مضمون نمبر:۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا۔(۱)

"اے ایمان والو۔"

یاایھا الذین امنوا سے اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۔تک یہ آیت کہ جس کے ساتھ رب تعالیٰ نے اس سورہ کی ابتدا فرمائی ہے، اس میں اس قدر بلاغت ہے کہ جس سے بشری قوتیں کمزور پڑ جاتیں ہیں مزید یہ کہ اس میں متعدد احکام بھی ہیں مثلاً: عہد و معاہدہ کو پورا کرنا' چوپایوں میں سے حلال جانوروں کا ذکر' حرام کا ذکر' محرم پر شکار کی حرمت اور غیر محرم کو شکار کی اجازت۔

نقاش بیان کرتے ہیں کہ فلیسوف الکندی کے ساتھیوں نے اسے کہا: اے حکیم اس قرآن جیسا ہمارے لئے قرآن بناؤ اس نے کہا جی ہاں اس کے کچھ حصہ کی طرح بناؤں گا۔کافی دن غائب رہنے کے بعد نکلا تو اس نے کہا اللہ کی قسم میں طاقت نہیں رکھتا اور کوئی بھی یہ کام نہیں کرسکتا' میں نے مصحف کھولا تو سورہ مائدہ نکلی میں نے اسے دیکھا کہ وہ سورۃ عہد پورا کرنے کا کہتی ہے اور اسے توڑنے سے روکتی ہے' پہلے عام طور پر حلال کر دیتی ہے' پھر اس میں استثناء کرتی ہے' پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی حکمتیں دو سطروں میں بیان کرتی ہے لہٰذا اس طرح کا لکھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۔"عہد و پیمان پورے کرو۔یہ لفظ اَوْفٰی اور وَفٰی دونوں بولے جاتے ہیں۔ شاعر نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔

أَمَّا ابْنُ طَوْقٍ فَقَدْ أَوْفَى بِذِمَّتِهِ ... كَمَا وَفَى بِقِلَاصِ النَّجْمِ حَادِيهَا

بلاشبہ ابن طوف نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے، جس طرح کہ قسط کی اونٹنیاں اس کے حدی خواں نے پوری کر دی ہیں۔

عقود کا معنی ہے عہد و پیمان۔ عقود اصل میں ربط سے ہے' اس کی واحد عقد آتی ہے۔ عربی کا مقولہ ہے **عقدت الحبل و العهد** ۔ یہ اجسام میں اور مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ کئی معانی میں استعمال ہو جیسا کہ یہاں ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احکام سخت ہیں اور اس کی توثیق بہت مضبوط ہے۔

ایک قول کے مطابق عقود سے مراد وہ عقد ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں سے کیا اور ان پر احکام کی پابندی لازمی اور ضروری قرار دی۔ ایک قول کے مطابق یہ وہ عقد ہے جو لوگ آپس میں معاملات پر باندھتے ہیں۔ سب سے مناسب یہ ہے کہ یہ آیت دونوں کو شامل ہے اور ایک کو دوسری وجہ پر خاص کرنے کی کوئی دلیل نہیں زجاج کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا عقد جو تم پر ہے اسے پورا کرو یا تمہارا آپس میں جو عقد ہے اسے پورا کرو۔'' وہ عقد جسے پورا کرنا ضروری ہے. جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق ہو اگر ان میں سے کسی کے مخالف ہے تو وہ مردود ہے اور اسے پورا کرنا ضروری اور جائز نہیں۔

أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ ۔ ''تمہارے لئے مویشی چوپائے حلال کئے گئے ہیں۔''

بَهِيمَةُ کہتے ہیں چوپائے کو' اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ اس کی گفتگو عقل وفہم ناقص ہونے کی وجہ سے غیر واضح رہتی ہے' اسی معنی میں ہے کہ یہ باب مبہم یعنی بند ہے اور رات اندھیری ہے اور **بهمة** اس بہادر کو کہتے ہیں جسے یہ معلوم نہ ہو کہ دشمن کہاں سے حملہ کرے گا اور مبہم حلقہ اسے کہتے ہیں جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا کنارہ کہاں ہے۔

أَنْعَام کہتے ہیں اونٹ' گائے اور بکری کو' ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ ان کی چال میں نرمی اور آہستگی ہوتی ہے۔ ایک قول کے مطابق **بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ** کہتے ہیں جو چوپایوں میں وحشی ہوں مثلاً بھیڑیا' جنگلی گائے' جنگلی گدھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات ابن جریر طبری نے ایک قول سے بیان کی۔ ان کے علاوہ دوسروں نے سدی ربیع قتادہ اور ضحاک سے بیان کیا' ابن عطیہ کہتے ہیں: یہ بہترین قول ہے' اور یہ بات کہ چوپائے آٹھ جوڑے ہیں اور جو ان کی طرف منسوب ہوں تمام حیوانات میں سے انہیں ان میں جمع کر کے **انعام** یعنی چوپائے ہی کہا جائے گا' پھاڑنے والا' مثلاً

شیر اور ہر کچلی والا' یہ انعام کی حد سے خارج ہے۔

تو بَهِيْمَةُ الْأَنْعَامِ چرنے والا چوپایہ ہے' ایک قول کے مطابق بَهِيْمَةُ الْأَنْعَامِ اسے کہتے ہیں جو شکاری نہ ہو کیونکہ شکاری کو وحشی کہا جاتا ہے نہ کہ بَهِيْمَةُ ' ایک قول کے مطابق بَهِيْمَةُ الْأَنْعَامِ ان بچوں کو کہتے ہیں وہ بچے جو ذبح کے وقت چوپایوں کے پیٹ سے نکلیں' انہیں بغیر ذبح کے کھایا جاتا ہے۔ پہلے قول کے مطابق میری مراد چوپایہ کو اونٹ' گائے' بکری کے ساتھ خاص کرنا یہ اضافت بیانیہ ہوگی' اس کے ساتھ جو حلال ہے وہ شامل ہوگا ان چیزوں میں سے جو اس سے قیاس کی رو سے خارج ہیں بلکہ کتاب وسنت کی نصوص سے بھی مثلاً: قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً۔ اور آپ ﷺ کا فرمان: درندوں میں سے پھاڑنے والا اور پرندوں میں سے پنجے سے شکار کرنے والا حرام ہے' ان کا مفہوم دلیل ہے کہ ان کے علاوہ باقی حلال ہیں' اسی طرح وہ تمام نصوص جو کسی قسم کو خاص کرتی ہیں جیسا کہ سنت مطہرہ کی کتب میں موجود ہے۔

اِلَّا مَا يُتْلٰى ۔ ان کے علاوہ جن کے نام پڑھ کر سنا دیئے جائیں یہ استثناء ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْأَنْعَامِ سے' یعنی کی ان چیزوں کے علاوہ جو تم پر پڑھی جاتی ہیں وہ تم پر حلال نہیں اور جو پڑھی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ نص ہے' اس کی حرمت پر فرمان الٰہی ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ۔ یہ دس چیزیں ہیں پہلی چیز مردار ہے اور آستانوں پر ذبح ہونے والا جانور اور ان میں وہ جانور بھی شامل ہیں جن کی حرمت سنت سے واضح ہوتی ہیں۔

اس استثناء کے بارہ میں احتمال ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہو جو ابھی پڑھی گئی ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد آنے والے وقت میں پڑھی جانے والی اشیاء ہوں' تو یہ دلیل ہے کہ ضرورت کے وقت سے تاخیر کر کے بیان کرنا جائز ہے اور یہاں دونوں باتوں کا احتمال بھی جائز ہے۔

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ۔ "شکار کو حلال جاننے والے نہ بننا۔"

اہل بصرہ کا موقف ہے کہ یہ فرمان الٰہی من بَهِيْمَةُ الْأَنْعَامِ سے دوسرا استثناء اصل عبارت اس طرح ہوگی "احلت لكم بهيمة الانعام الا ما يتلىٰ عليكم الا الصيد و انتم محرمون" یعنی حلال کئے گئے تمہارے لئے مویشی چوپائے سوائے ان کے جو تم پر پڑھے گئے اور سوائے شکار کے احرام کی حالت میں۔ ایک قول کے مطابق پہلا استثناء مویشی چوپایوں سے ہے اور دوسرا پہلا استثناء ہے یہ قول مردود و ممنوع ہے' اس لئے کہ یہ حالت احرام میں شکار کے جواز کو

لازم ہے کیونکہ یہ استثناء ایک ممنوع چیز سے ہے' تو یہ جائز ہوگا۔

وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ۔ "جب تم حالت احرام میں ہو۔" یہ حال ہونے کی وجہ سے نصبی حالت میں ہے' یہ قید ان لوگوں کے نزدیک ظاہر ہے جو مویشی چوپائیوں کو زمینی اور وحشی حیوانوں سے خاص کرتے ہیں' جن کا کھانا جائز ہے' تو اصل عبارت یہ ہوگی "احل لکم صیدا لبر الامی حال الحرام" تمہارے لئے زمینی شکار سوائے حالت احرام کے حلال ہے لیکن اس شخص کے قول کے مطابق جو اسے اضافت بیانیہ کہتا ہے' تو معنی یہ ہوگا "احلت لکم بھیمة ھی الانعام تحریم الصید علیکم بدخولکم فی الاحرام" یعنی جائز ہوگا تمہارے لئے حلال ہے مویشیوں سے چوپائے اس وقت جب شکار تم پر حرام ہو حدود حرم میں داخلہ کے وقت' اس لئے کہ تمہیں اس کی ضرورت ہوگی' تو اس قید سے مراد ان پر احسان کرنا ہے اس چیز کی حلت کے ساتھ ان چیزوں کے علاوہ جو ان پر اس حالت میں حرام ہیں۔ محرم سے مراد وہ شخص ہے جس نے حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھا ہو' اس کو محرم اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر اس حالت میں شکار' خوشبو اور عورت حرام ہوتی ہے اسی طرح حرم کو حرام اور احرام کو احرام کہنے کی بھی ایسی ہی وجہ ہے۔

مضمون نمبر:۲

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُحِلُّوا۟ شَعَـٰٓئِرَ ٱللَّهِ۔(۲)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو۔"

شعائر' شعیرة کی جمع ہے' فعیلة کے وزن پر ہے۔ ابن فارس کہتے ہیں واحد کے لئے اشعارة بولا جاتا ہے اور یہ زیادہ درست ہے' اسی سے ہی استعار لیا گیا ہے جو قربانی کے جانوروں سے کیا جاتا ہے' اسی معنی میں قربانی کو نشان لگانا ہے۔ مشاعر علامات کو کہتے ہیں' اس کا واحد مشعر ہے' یعنی وہ مقامات جو علامات کی وجہ سے پہچانے جاتے۔ ایک قول کے مطابق یہاں شعائر سے مراد حج کے تمام طریقے ہیں اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد صفا' مروہ' ہدی (ہدی سے عام قربانی مراد ہے یعنی بکری، گائے اور اونٹ اور بدن سے صرف اونٹ مراد ہے) اور اونٹ ہے۔ ان دو اقوال کے بناء پر معنی یہ ہوگا تم ان امور کو حلال نہ کرو کہ ان میں کسی چیز سے خلل واقع ہو سکے یا اس وجہ سے کہ تمام اسے اور اس کے کرنے والے کے درمیان حائل ہو سکو۔ محرم کے لئے شکار کی حرمت کا ذکر کرنے کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس بات سے روکا ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ

کے شعائر کو حلال سمجھیں۔

ایک قول کے مطابق یہاں شعائر سے مراد اللہ تعالیٰ کے فرض کردہ امور ہیں اسی معنی میں یہ آیت کریمہ ہے وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی حرمات ہیں۔ اس بات سے کوئی چیز مانع نہیں کہ اسے ان تمام پر محمول کر لیا جائے' تو اس قانون پر اعتماد کرتے ہوئے کہ لفظ کے عموم پر اعتماد کیا جاتا ہے نہ کہ کسی خاص سبب پر اور نہ اس چیز پر جس پر سیاق وسباق دلالت کرے۔

وَ لَا الشَّھْرَ الْحَرَامَ۔ ''نہ ادب والے مہینوں کی۔''

اس سے مراد جنس ہے کہ اس میں حرمت والے تمام مہینے شامل ہیں اور وہ چار ہیں۔ ذالقعدہ' ذالحجہ' محرم' رجب ہیں' یعنی کہیں تم ان میں لڑائی کر کے ان کی بے حرمتی کرو۔ ایک قول کے مطابق یہاں صرف حج کا مہینہ مراد ہے۔ وَ لَا الْھَدْیَ۔ ''اور نہ حرم میں قربان ہونے والے۔'' وہ جانور جو بیت اللہ کی طرف چلایا جائے وہ اونٹنی' گائے یا بکری ہو اس کی واحد ھدیۃ آتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا کہ وہ قربانی کی حرمت کو حلال سمجھیں اس طرح کہ وہ قربانی اس کی مالک سے چھین لے یا اس شخص کے اور بیت اللہ کے درمیان رکاوٹ بن جائے۔ یہاں ہدی کا شعائر پر عطف کرنے کا مقصد جبکہ وہ شعائر کے ضمن میں داخل ہیں، اس کی مزید خصوصیت اور اس کی شان میں مزید اضافہ ہے۔

وَ لَا الْقَلَآئِدَ۔ اور نہ پٹے پہنائے گئے جانوروں کی۔'' یہ قلادۃ کی جمع ہے اس کا معنی یہ ہے کہ قربانی کے جانور کے گلے میں جوتی وغیرہ لٹکا دی جائے اور اس کو حلال سمجھنا یہ ہے کہ غصب کرتے ہوئے چھین لیا جائے' پٹے پہنائے گئے جانوروں کو حلال جاننے سے روکنا قربانی کو حلال جاننے سے روکنے میں تاکید ہے۔ ایک قول کے مطابق قلائد سے مراد جنہیں ہار پہنائے گئے ہوں' تو اس طرح اس کا عطف ھدی پر ہوگا' ھدی کے متعلق مزید تاکید کرتے ہوئے پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ ایک قول کے مطابق قلائد سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس کی تقلید کرتے ہیں' یہ معنی مضاف کو محذوف سمجھنے کی بنا پر ہوگا یعنی اور نہ قلائد والے لوگوں کو حلال سمجھو۔

وَ لَآ اٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ۔ اور نہ ان لوگوں کا جو بیت اللہ کے قصد سے جا رہے ہوں یعنی بیت اللہ کے ارادہ سے جانے والے' عربوں کا مقولہ ہے امممت کذا یعنی میں نے اس کام کا ارادہ کیا' اعمش اضافت کرتے ہوئے پڑھتے ہیں وَ لَا آمِّی الْبَیْتَ الْحَرَامِ تو معنی یہ ہوا کہ تم

ان لوگوں کو نہ روکو جو بیت اللہ کا قصد کر کے حج ' عمرہ کے لئے یا وہاں ٹھہرنے کے لئے نکلے ہیں۔
ایک قول کے مطابق اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مشرکین حج کرتے عمرہ کرتے اور قربانیاں لے جاتے تھے' تو مسلمانوں نے ارادہ کیا کہ ان کو روکیں' اس وقت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ الآ خر نازل ہوئی' تو یہ آیت اس فرمان الٰہی اقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ سے منسوخ ہوگئی کہ اور فَـلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا ۔ سے منسوخ ہوگئی اور فرمان نبوی ﷺ سے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کو نہ آئے' بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور یہ مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔

یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّھِمْ وَ رِضْوَانًا۔

"جو اپنے رب تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضا جوئی کی نیت سے جا رہے ہیں۔"

یہ جملہ حالیہ ہے جو آمِّیْنَ میں پوشیدہ ضمیر ہے۔ جمہور مفسرین کا کہنا ہے اس کا معنی ہے کہ وہ فضل رزق اور کاروبار میں نفع چاہتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتے ہیں۔
ایک قول کے مطابق ان میں سے کچھ تو تجارت چاہتے ہیں اور کچھ حج کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتے۔ یہ تلاش رضا مندی کے لئے ہوئی ان کے متعلق گمان کے مطابق ان کے نزدیک جو اس آیت کو مشرکوں کے بارہ میں رکھتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق یہاں اس فضل سے مراد اجر و ثواب ہے نہ کہ تجارت میں نفع (مراد ہے)۔

وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۔ "ہاں جب تم احرام اتار ڈالو تو شکار کھیل سکتے' ہو یہ وضاحت وانتم حرم کے مفہوم کی' یعنی ان کے لئے شکار کو جائز قرار دیا اس کے بعد کہ ان پر یہ کام ممنوع تھا' اس لئے کہ حرمت والا سبب ختم ہو چکا ہے اور وہ احرام باندھنا ہے۔

مضمون نمبر: ۳۰

وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ۔ (۲)

"اور ان لوگوں کی دشمنی اس بات پر امادہ نہ کرے۔"

ابن فارس کہتے ہیں جَرَمَ وَ اَجْرَمَ اور لَا جَرَمَ تمہاری اس بات کی طرح ہے کہ تم لابد اور لامحالہ کہتے ہو' اس کی اصل جرمٌ سے ہے' یعنی کَسَبَ۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے وہ تمہیں نہ ابھارے' یہ معنی کسائی اور ثعلب نے بیان کیا ہے۔ یہ لفظ دو مفعولوں کی طرف

متعدی ہوتا ہے' عربی کا مقولہ ہے جرمنی کذا علیٰ بغضك ای حملنی علیه اس نے مجھے تیرے بغض پر ابھارا۔ ابوعبیدہ اور فراء کہتے ہیں لَا يَجْرِمَنَّكُمْ کا معنی یہ ہے کہ تمہیں کسی قسم کا بغض اس بات پر امادہ نہ کرے کہ تم حق سے باطل کی طرف اور انصاف سے ظلم کی طرف بڑھ جاؤ۔ الجریمة اور الجارم یہ الکاسب کے معنی میں ہیں۔ یعنی معنی یہ ہوا تمہیں کسی قوم کا بغض ان پر زیادتی کرنے پر نہ ابھاریں یا ان کا بغض تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم زیادتی کر کے حق سے باطل کی طرف چلے جاؤ۔

ایک مقولہ ہے جَرَمَ يَجْرِمُ جَرمًا یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص کاٹ دے۔ علی بن عیسیٰ الرمانی فرماتے ہیں کہ یہی اصل معنی ہیں' تو جرم اس معنی میں ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے کاٹنے کے لئے اٹھانا اور جرم کسب کے معنی میں کسی چیز کو کاٹنے کے لئے بھی آتا ہے۔ جرم کبھی حق کے معنی میں نہیں آتا کیونکہ حق اسے کاٹ دیتا ہے۔ خلیل کہتے ہیں لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ کا معنی ہے یقیناً ان پر آپ لازم ہوگئی۔ کسائی کہتے ہیں جرم اور اجرم ایک ہی معنی کی دو لغات ہیں یعنی اکتسبت۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے لَا يُجْرِمَنَّكُمْ پڑھتے ہیں' اس کا معنی لا یکسبنکم ہوگا اہل بصرہ کے نزدیک اجرم معروف نہیں ہے وہ صرف جرم کہتے ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

شنآن۔ کا معنی بغض ہے' اس کی نون پر زبر اور سکون پڑھا جاتا ہے عربی مقولہ ہے شنات الرجل اشنوۃ شنا ومشننا وشنانا' یہ تمام صیغے اس وقت بولے جاتے ہیں جب کسی کو غصہ میں ڈال دیا جائے۔ یہاں مشنآن ایک مفعول کی طرف مضاف ہے یعنی تم میں سے ایک قوم کا بغض نہ کہ تمہاری کسی قوم کا بغض۔

اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۔ "کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا ہے کہ تم حد سے گذر جاؤ"۔

ہمزہ کو مفتوح اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ لفظ ابن کی وجہ سے مفعول ہے' یعنی اس لئے کہ انہوں نے تمہیں روکا۔ ابوعمرو اور ابن کثیر ہمزہ پر شرط ہونے کی وجہ سے کسرہ پڑھتے ہیں یہی ابوعبید کی پسندیدہ قراءۃ ہے۔ اعمش پڑھتے اَنْ يَصُدُّوْكُمْ شرط والی قراءۃ کے مطابق تو معنی یہ ہوگا کہ اگر انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے منع کیا تھا تو ان کا بغض کہیں تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم ان پر زیادتی کرتے ہوئے ان کو مسجد حرام سے منع کردو۔

نحاس کہتے ہیں اَنْ صَدُّوْكُمْ میں ان کو کسرہ کے ساتھ (ان) پڑھنے سے نحو علم حدیث اور اہل نظر میں سے بڑے بڑے علماء اس طرح پڑھنے سے روکتے ہیں' اس کی کچھ وجوہات ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے سال نازل ہوئی اور مشرکوں نے مؤمنوں کو حدیبیہ کے موقعہ پر ۶ھ میں روکا تھا' تو یہ روکنا آیت سے پہلے ثابت ہوا' اس لئے جب اس کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں مگر یہ کہ یہ واقعہ اس کے بعد کا ہو جس طرح آپ کہتے ہیں کہ فلاں کو یہ چیز نہ دو اگر وہ تم سے لڑائی کرے' تو یہ صرف مستقبل میں ہو سکتا ہے اگر آپ اس کو زبر سے (اَن) پڑھیں تو یہ ماضی کے لئے ہوگا اور یہی عمدہ کلام ہے۔

ابو حاتم اور ابو عبید نے شَنَـٰانُ کو نون کو سکون کے ساتھ پڑھنے سے انکار کیا ہے کیونکہ اس طرح کے مصدر متحرک آتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسروں نے ان کی مخالفت کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ مصدر نہیں بلکہ کسلان و غضبان اسم فاعل ہے کے وزن پر میں کہتا ہوں آپ اس نہی پر غور کریں یقیناً وہ لوگ جو مکہ میں داخل ہونے سے مسلمانوں کو روکتے تھے وہ نفرت پھیلانے والے جنگجو لوگ تھے' تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان سے تعرض کرنے اور ان سے لڑائی کرنے سے روکا گیا' اس سے ظاہر ہوا کہ یہ نہی منسوخ ہے یا ایک قول ہے کہ اس بات سے روکنا' تو صلح کرنے کے معاہدہ کے متعلق ہے جو حدیبیہ میں ہوا اس وجہ سے مؤمن لوگ امن میں ہو گئے میں نے ان دو توجیہات کو ذکر کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے زیادتی کرنے سے روکا تو ان لوگوں کو حکم دیا وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ۔ ''نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہو۔'' یعنی اس کام میں تم ایک دوسرے کی معاونت کرو' یہ بات ہر اس کام کو شامل ہے جس پر نیکی اور تقویٰ کا لفظ صادق آتا ہے وہ جو بھی ہو۔ ایک قول کے مطابق نیکی اور تقویٰ دو لفظ ہیں جن کا معنی ایک ہی ہے دوبارہ تاکید کے لئے لایا۔ ابن عطیہ کہتے ہیں نیکی واجب اور مندوب کو شامل ہے (واجب وہ عمل ہے جس کو نبی ﷺ نے لازمی قرار دیا ہے، جس کے ترک کرنے کی مذمت جائز ہے اور اس عمل کا کرنے والا ثواب کا مستحق ہے، محدثین کے نزدیک واجب اور فرض کے نزدیک ایک ہی معنی میں ہیں اور احناف کے نزدیک عمل کے معاملے میں دونوں ایک ہیں اور صرف عقیدہ کا فرق ہے، فرض کا منکر کافر اور واجب کا منکر فاسق ہے۔ (۲) مندوب (مستحب) کا معنی ہے جس کی دعوت دی جائے، اصطلاحاً اس کی تعریف یہ ہے کہ شارع اس کے لزوم کے بغیر اس کے کرنے کا مطالبہ کرے تو اس

پر عمل کرنے والا ثواب کا حقدار ہوتا ہے اور اس پر عمل نہ کرنے والے کیلئے نہ سزا ہے نہ ہی اس کی مذمت...... الوجیز) جبکہ تقویٰ واجب امور کے ساتھ خاص ہے۔ ماوردی کہتے ہیں نیکی میں لوگوں کی خوشی مطلوب ہوتی ہے اور تقویٰ میں اللہ تعالیٰ کی خوشی مطلوب ہوتی ہے اور جوان دونوں کو جمع کر لے تو اس نے اپنی نیک بختی مکمل کر لی۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو روکا وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ۔ "اور گناہ اور ظلم وزیادتی میں مدد نہ کرو۔" تو گناہ اس کام یا اس بات کو کہتے ہیں جو گناہ کرنے اور گناہ کی بات کہنے کو لازم کر دے اور "عدوان" زیادتی لوگوں پر حد سے گذرنے کو کہتے ہیں جس پر ظلم کیا جائے لہٰذا گناہ کی ہر قسم اور ظلم وستم کا ہر طریقہ اس میں داخل ہے' اس لئے کہ یہ دونوں اقسام ہر اس چیز پر صادق آتی ہیں جن میں ان کا معنی پایا جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تقویٰ و پرہیز گاری کا حکم دیا اور ان لوگوں کو ڈرایا کہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرتے اور حکم کو چھوڑ دیتے ہیں یا جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے وہ کام کر کے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اتقوا اللہ کا جملہ بول کر لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے ان اللہ شدید العقاب اپنی ان حرکات سے باز نہ آئے تو پھر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے پر بھی قادر ہے

امام احمد عبد بن حمید اور امام بخاری اپنی ...... میں سیدنا وابصہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نیکی وہ ہے جس پر دل وجان مطمئن ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور سینے میں تردد ہو' اگرچہ لوگ تجھے اس بات کا شرعی جواز فراہم کریں۔ ابن ابی شیبہ' امام احمد' امام بخاری ادب المفرد میں امام مسلم' ترمذی' حاکم اور امام بیہقی سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے بارہ میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نیکی اچھا اخلاق ہے اور گناہ وہ جو تیرے سینے میں کھٹکے اور تجھے یہ بات ناپسند ہو کہ لوگوں کو تیری اس بات (حرکت) کا پتہ چل جائے' امام احمد' عبد بن حمید' طبرانی' حاکم اور امام بیہقی رحمہم اللہ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے فرمایا جو تیرے دل میں کھٹکے اسے چھوڑ دے' انہوں نے کہا' تو ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جسے اپنی برائی بری لگے اور اپنی نیکی اچھی لگے وہ مؤمن ہے۔

مضمون نمبر: ۴

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ۔ (۳) "تم پر حرام کیا گیا۔"

یہ ابتدا ہے ان محرمات کی تفصیل کی جن کی طرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ میں اشارہ فرمایا تھا' وہ یہ ہیں الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ "مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔" سورہ بقرہ میں اس آیت کے پہلے حصہ کی بحث ہو چکی ہے، اس مقام پر مطلق خون سے حرام ہونے کا تذکرہ ہے، جبکہ دوسرے مقام پر اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور وہاں خون سے وہ خون مراد لیا گیا ہے جو جانور کو ذبح کرتے وقت بہہ جاتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ مطلق چیز مقید پر محمول ہوتی ہے

اور حدیث مبارکہ میں میتہ کی تخصیص موجود ہے، نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "احلت لنا میتتان والدمان فاما المیتتان فالحوت والجراد واما الدمان فالکبد والطحال" یعنی ہمارے لئے دو خون اور دو مردار حلال کئے گئے ہیں' جو مردار سے مچھلی اور ٹڈی اور خون سے مراد کلیجی اور تلی ہیں۔ امام شافعی' احمد' ابن ماجہ' دار قطنی اور امام بیہقی رحمہم اللہ بھی اسے روایت کرتے ہیں اور امام بیہقی کی سند میں مقال ہے۔ اسے "هو الطهور ماء ه والحل میتته" والی حدیث مضبوط کرتی ہے کہ اس کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے' یہ روایت احمد اور اہل السنن وغیرہ نے بیان کی ہے اور اسے ایک جماعت نے صحیح کہا ان میں سے ابن خزیمہ اور ابن حبان رحمہما اللہ ہیں۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس پر اپنی شرح منتقی وغیرہ میں طویل کلام کیا ہے۔

وَ الْمُنْخَنِقَةُ۔ "اور جو گلہ گھٹنے سے مرا ہو۔" یہ وہ ہے جو دم گھٹنے سے مر جائے' یہ سانس کا رکنا خواہ خود اس کے کسی کام سے ہو' مثلاً اس نے اپنا سر رسی یا دو لکڑیوں میں ڈالا یا کوئی آدمی وغیرہ ایسا کرے' جاہلیت میں لوگ بکری کے سانس کو دبائے رہتے اور جب وہ مر جاتی تو اسے کھا لیتے۔

وَ الْمَوْقُوْذَةُ۔ "اور جو کسی ضرب سے مر گیا ہو۔" وہ جسے کسی پتھر یا ڈنڈے سے مارا جائے حتیٰ کہ وہ بغیر ذبح کئے وہ مر جائے۔ کہا جاتا ہے "وقذه یقذه وقذا فهو وقیذ وقذ" کا معنی سخت مارنا ہے۔ جاہلیت والے یہ کام کرتے تھے وہ چوپایوں کو اپنے معبودوں کی خاطر لکڑی سے مارتے اور جب وہ مر جائے تو انہیں کھا لیتے۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں: علمائے متقدمین و متاخرین نے بندوق پتھر اور تیر وغیرہ سے شکار کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ بندوق سے ان کی مراد ہے غلیل میں پتھر رکھ کر مارنا اور معراض

سے ان کی مراد ہے وہ تیر جس کے آگے پھالہ نہ ہو یا ایسی لکڑی جس کے سرے پر لوہا لگا ہوا ہو۔
مزید فرماتے ہیں: جس کا یہ موقف ہے کہ وہ پتھر سے مارا گیا ہے یہ اس کے لئے جائز نہیں مگر یہ کہ اسے ذبح کر لے اس کی مؤیدہ روایت ہے جو سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' یہی قول امام مالک' ابو حنیفہ ان کے اصحاب ثوری اور امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ اہل شام نے اس بارہ میں ان کی مخالفت کی ہے۔ اوزاعی رحمہ اللہ تیر کے بارہ میں فرماتے ہیں اسے کھالو اس تیر نے اسے پھاڑا ہے یا نہیں۔ سیدنا ابو درداء' سیدنا فضالہ بن عبید اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور مکحول رحمہ اللہ اس میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے۔

ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں اسی طرح اوزاعی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو مسئلہ معروف ہے وہ امام مالک رحمہ اللہ نے نافع رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے' وہ کہتے ہیں: اس مسئلہ میں اصل بات اور جس پر عمل ہے اور اسی کے بارہ میں سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث اس بات پر دلیل جس میں یہ منقول ہے کہ ''جو بغیر پھالے کے تیر سے مر جائے اسے نہ کھاؤ کیونکہ اسے پتھر سے مارا گیا ہے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: جو بندوقیں آج کل ہمارے ہاں معروف ہیں یہ لوہے کی ہیں جن میں بارود اور گولیاں چلتی ہیں' ان کے متعلق اہل علم نے کچھ نہیں کہا اس لئے کہ یہ بہت بعد میں آئی ہیں' یہ یمن کے علاقوں میں ہجرت کے دسویں سال پہنچی ہیں' مجھ سے اہل علم کی ایک جماعت نے اس سے شکار کے بارہ میں پوچھا جبکہ شکار اس سے پہلے ہی مر جائے اور شکاری اس کی زندگی میں اسے ذبح نہ کر سکے؟ تو جو بات مجھ پر واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حلال و جائز ہے کیونکہ یہ پھاڑتی ہے اور عموماً ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری جانب نکل جاتی ہے۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گذشتہ صحیح حدیث جس میں آپ نے فرمایا کہ جب تم بغیر پھالے کے تیر مارو اور وہ اسے پھاڑ دے تو کھالو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھاڑنے کو شکار کے حلال ہونے میں اعتماد کیا ہے۔
میں کہتا ہوں یہ مسئلہ بیان کرنے میں سید علامہ محمد بن اسماعیل الامیر سبقت لے گئے ہیں جب کہ انہوں نے یہ بات سبل السلام شرح بلوغ المرام میں ذکر کی کہ میں کہتا ہوں جو بندوقیں آج کے دور میں معروف ہیں' یہ گولیاں پھینکتی ہیں اور جب وہ گولی نکلتی ہے تو اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ جیسے بارود کی آگ نے اسے پگھلا کر سر مچو کی طرح کر دیا ہو، تو اس گولی نے اس کو اپنی نوک سے مار دیا ہے نہ کہ اسے صدمہ سے دوچار کیا ہے، چنانچہ اس سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ بندوق

سے مارا ہوا شکار حلال ہے۔ان کے بیٹے سید علامہ عبداللہ بن محمد الامیر نے ان کا تعاقب کیا اور کہا یہ میرے والد کا وہم ہے (اللہ تعالیٰ ان کی روح کو بابرکت رکھے) کیونکہ گولی بذات خود نہیں پگھلتی بلکہ وہ اسے بارود کی آگ دھکیلتی ہے اور وہ اس کے صدمہ سے مرجاتا ہے' یہ بات وہ تمام لوگ جانتے ہیں جو ان معروف بندوقوں کو جانتے ہیں۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں تحقیق شدہ بات یہ ہے کہ آگ گولی کو پہلے دھکیلتی ہے تو وہ گولی شکار تک پہنچ کر اسے پھاڑ دیتی ہے اور وہ شکار اس پھاڑنے کی وجہ سے مرجاتا ہے تو وہ حلال ہوگا جیسا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس سے دلیل لی ہے۔ واللہ اعلم

وَ الْمُتَرَدِّيَةُ "اور جو اونچی جگہ سے گر کر مرا ہو۔"

جو کہ بلندی سے پستی کی طرف گر کر مرجائے' اس بات میں کوئی فرق نہیں کہ وہ کسی پہاڑ سے گرے یا کنوئیں میں گرے یا کسی مدفن وغیرہ میں گرے۔ التَّرَدِّيْ الرَّدٰی سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ہلاک ہونا۔ وہ خود گرے یا اسے کوئی دوسرا گرا دے۔

وَ النَّطِيْحَةُ "اور جو کسی کے سینگ مارنے سے مرا ہو۔" یہ فعیلۃ کے وزن پر مفعولۃ کے معنی میں ہے' یعنی وہ جسے دوسرا جانور سینگ مارے اور وہ بغیر ذبح کے مرجائے۔ ایک قوم کا کہنا ہے یہ فعیلۃ بمعنی فاعلۃ کے ہے کیونکہ دو جانور آپس میں سینگ مارتے ہیں تو دونوں مرجاتے ہیں۔ اور انہوں نے نَطِيْحَةُ کہا ہے نطیح نہیں کہا' حالانکہ یہ فعیل سے قیاس کیا گیا ہے مگر حذف تاء کا لزوم وہاں ہوتا ہے جہاں موصوف مذکور ہو' اور اگر وہ مذکور نہیں تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ تاء وصفیت سے اسمیت کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

ابو میسرہ کی قراءۃ اس طرح ہے والمنطوحة وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ یعنی اور حرام ہے جسے کچلیوں والا پھاڑ ڈالے' مثلاً شیر چیتا' بھیڑیا اور بجو وغیرہ۔ یہاں اس جملہ سے مراد ہے کہ جو درندہ اس شکار سے کھالے یہ ہے کیونکہ جو اس درندے نے کھایا وہ تو سارا ختم ہوگیا۔ بعض عرب ایسے ہیں جو صرف شیر کو پھاڑنے والا کہتے ہیں۔ جب کوئی درندہ بکری کو کھا جائے اور اس کا کچھ حصہ عرب لوگ پالیں تو یہ اس کو کھا لیتے ہیں اگرچہ وہ مرچکی ہو' یہ اس کو ذبح نہیں کرتے۔

اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ "لیکن اسے تم ذبح کر ڈالو تو حرام نہیں۔" یہ استثناء متصل ہونے کی وجہ سے جمہور کے نزدیک نصبی حالت میں ہے اور یہ بھی اسی کی طرف لوٹتی ہے جن کا ابھی ذکر ہوا کہ ان میں ابھی زندگی باقی ہو اور انہیں ذبح کر لیا جائے۔ اہل مدینہ کہتے ہیں یہ امام مالک کا مشہور مذہب

ہے اور امام شافعی کے دو اقوال میں سے ایک ہے کہ جب کسی شکار کو درندہ پہنچے اور اس کی زندگی باقی نہ رہی تو اسے نہ کھایا جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اسے مؤطا میں سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے' یہی موقف اسماعیل القاضی رحمہ اللہ کا ہے۔ تو اس قول کے مطابق استثناء منقطع ہوگا' یعنی تم پر یہ چیزیں حرام کردی گئی ہے لیکن جنہیں تم ذبح کرلو وہ حلال حرام نہیں' یہاں پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

کلام عرب میں ذکاۃ کا معنی ذبح کرنا ہے' یہ معنی قطرب وغیرہ نے بیان کیا ہے ذکاۃ کا معنی لغت میں مکمل کرنا ہے، یعنی قوت کا مکمل ہونا اور ذکاء کہتے ہیں دل کی گرمی اور بہت ذہین ہونے کو اور ذکاۃ کہتے ہیں جسے آگ بڑھکائی جائے اس معنی میں یہ جملہ بھی ہے کہ میں نے آگ اور جنگ کو بڑھکایا اور ذُکاءُ سورج کا نام ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ ان جانوروں کے علاوہ جنہیں پوری طرح تم ذبح کرلو۔

شریعت میں تذکیہ سے مراد یہ ہے کہ پوری طرح خون کو بہانا' اس کی رگیں کاٹ دینا اور نحر ہونے والے جانوروں کو نحر کرنا ہے اور جو جانور قابو میں نہ آئیں تو ان کو کسی بھی طریقہ سے کاٹ دیا جائے ان سب سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو اور ان پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے۔

لیکن جس آلہ سے ذبح کیا جاتا ہے اس کے بارہ میں جمہور کا موقف ہے کہ جس سے خون بہایا جائے اور رگیں کاٹی جائیں وہ دانت اور ہڈی کے علاوہ ذبح کا آلہ ہے۔ اسی کے بارہ میں صحیح احادیث آتی ہے۔

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ۔ ''اور جو آستانوں پر ذبح کیا گیا ہو۔'' ابن فارس کہتے ہیں النصب کا معنی ہے ایسا پتھر جسے نصب کیا جائے اور پھر اس کی عبادت کی جائے اور اس پر ذبح شدہ جانوروں کا خون بہایا جائے اور نصائب ان پتھروں کو کہا جاتا ہے جو کنوئیں کے کناروں پر رکھے جائیں' اس طرح یہ رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

ایک قول کے مطابق نصب جمع ہے اور اس کی واحد نصاب ہے جس طرح حمار کی جمع حمر آتی ہے۔ طلحہ اسے نُصْب پڑھتے ہیں اور ابو عمرو سے نَصْب مروی ہے بجحدری نَصَب پڑھتے اور اسے اسم واحد بناتے ہیں جیسا کہ جبل اور جمل آتا ہے اس کی جمع انصاب ہوگی جس طرح اجبال اور اجمال ہے۔

مجاہد کہتے ہیں کہ مکہ کے گرد کچھ پتھر تھے جن پر ذبح کیا جاتا تھا۔ ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں:

عرب لوگ مکہ میں ذبح کرتے اور ان کا خون بیت اللہ کے سامنے والے حصہ پر مل دیتے اور گوشت کے ٹکڑے کر کے پتھروں پر رکھ دیتے، پھر جب اسلام آیا تو مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا ہم اس قسم کے کاموں کی نسبت بیت اللہ کی عزت واحترام کا زیادہ حق رکھتے ہیں' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ نازل فرمائی تو معنی یہ ہوا کہ اس سے ان کی نیت میں ان پتھروں کا عزت واحترام تھا کیونکہ ان پر ذبح کرنا جائز نہیں' اس لئے یہ کہا گیا کہ "علی" بمعنی لام ہے' یعنی اس وجہ سے' یہ بات قطرب نے بیان کی۔

اس بنا پر یہ بھی ان میں شامل ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے نام پر مشہور کیا گیا ہو اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کر کے خصوصی تاکید پیدا کی کہ یہ حرام ہے اور یہ وہم دور کرنا بھی مقصود تھا جو وہ سمجھتے تھے کہ یہ بیت اللہ کی بزرگی اور عظمت کا باعث ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ جس کا ذبح کرنے سے مقصود پتھروں کی عظمت ہو اگرچہ ان پتھروں کے پاس ان کا نام نہ بھی لیا جائے۔ اس طرح یہ ذکر دوبارہ نہ ہوا باوجود اس کے کہ جو گذر چکا جبکہ اس میں مثلاً ذبح کرتے ہوئے بت کا نام لیا جائے۔ آپ غور کریں۔

وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا۔ "اور یہ بھی کہ فال گیری کرو۔" یہ ماقبل کی طرف معطوف ہے، یعنی تم پر فال گیری حرام ہے۔ بِالْاَزْلَامِ۔ "قرعہ کے تیروں سے۔" جوئے کے تیر۔ اس کی واحد زلم ہے۔ عربوں کے نزدیک ازلام کی تین اقسام ہیں: (۱) پر اِفْعَلْ لکھا ہوتا ہے۔ (۲) پر لَا تَفْعَلْ لکھا ہوتا ہے۔ (۳) خالی ہوتا ہے اس پر کچھ نہیں ہوتا۔ اس کو ایک تھیلہ میں ڈال دیتے ہیں اور جب کسی کام کا ارادہ کرتے تو اس میں ہاتھ ڈال کر تلاش کر کے ایک نکالتے ہیں، اگر پہلا نکل آئے تو جو ارادہ کیا ہوتا، وہ کر گذرتے ہیں، اگر دوسرا نکلے تو کام ترک کر دیتے اور اگر تیسرا نکلے تو پھر یہی دوبارہ کیا جاتا حتی کہ پہلے دونوں میں سے ایک نکل آئے۔

زجاج کہتے ہیں اس قول اور نجومیوں کے قول کے درمیان کوئی فرق نہیں ستارے کی وجہ سے فال اس طرح نہیں نکالی جاتی بلکہ ستارے کے طلوع ہونے کی اعتبار سے فال نکالی جاتی ہے۔ اسی لئے اس کام کو فال گیری کہا گیا کیونکہ یہ لوگ اس طرح رزق اور جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کی تقسیم کرتے ہیں جیسا کہ مقولہ ہے "استسقی" یعنی اس نے پانی طلب کیا، تو استقسام کا معنی یہ ہوا اپنی قسمت اور حصہ کو طلب کرنا۔ من جملہ جوئے کے تیر دس ہیں جاہلیت میں لوگ ان کے ساتھ جوا کھیلتے۔ ایک قول کے مطابق ازلام رومی اور ایرانی نرد کھیل کا نگینہ ہے جس سے وہ جوا کھیلتے ہیں

اور ایک قول کے مطابق یہ شطرنج ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فال گیری کو شطرنج کے ساتھ حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس طرح یہ علم غیب کی دعوے کا تکلف کرتا ہے اور یہ کہانت کی ایک قسم ہے۔

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ :- "یہ گناہ کا کام ہے۔" یہ اشارہ ہے شطرنج کے ساتھ فال گیری کی طرف یا ان تمام حرام کاموں کی طرف جن کا یہاں ذکر ہوا۔ فسق کا معنی ہے حد سے نکلنا یہ سخت وعید ہے کیونکہ فسق سخت ترین کفر ہے۔ یہ ایسا نہیں کہ کچھ لوگوں نے بطور اصطلاح کے اسے ایمان اور کفر کے درمیان ایک مرتبہ پر رکھا ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ :- "جو مجبور کیا گیا۔" یہ حرام کردہ اشیاء کے ساتھ ملا ہوا ہے اور جو ان کے درمیان جملہ معترضہ موجود ہے وہ دونوں کلاموں میں تاکید کے لئے آیا ہے، یقیناً ان گندی چیزوں کی حرمت مکمل دین میں سے ہے، یعنی جو ان میں سے کسی چیز کو ضرورت کے وقت چھوڑے فِي مَخْمَصَةٍ "شدت بھوک میں" یعنی مردار یا اس کے بعد ذکر کردہ محرمات کو کھانے میں مجبور ہو۔ خمص کہتے ہیں پتلے پیٹ والے کو یہ مقولہ ہے کہ رجل خميص و خمصان اور امراء ة خميصة و خمصانة اسی معنے میں اخمص القدم بھی ہے۔ یہ لفظ اکثر و بیشتر بھوک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ :- "بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو۔" الجنف کہتے ہیں جھکاؤ کو اور اثم کا معنی ہے حرام یعنی بھوک کی وجہ سے مجبوری کی حالت میں گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو، یہ اس معنی میں ہے کہ دین سے بغاوت اختیار نہ کرے اور حدود سے تجاوز نہ کرے اور ہر جھکنے والا متجانف ہے۔

فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ :- "یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔" اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کا اس بات پر مؤاخذہ نہیں کرے گا کہ بھوک کی وجہ سے مجبور ہو کر اس کی طرف جھکا، لیکن اس کے ساتھ حرام کردہ چیزوں کے کھانے اور گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو، اس اعتبار سے کہ وہ احکام شرعیہ سے بغاوت کرنے والا ہے یا جو اسے ضرورت پیش آئی اس سے تجاوز کرنے والا ہے۔

مضمون نمبر: ۵

قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ۔ (۴)

''آپ کہہ دیجئے کہ تمام پاک چیزیں تمہارے لئے حلال کی گئیں ہیں۔''

یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں سلیمہ طبیعت کے لوگ کھاتے وقت لذت حاصل کریں اور انہیں عمدہ سمجھیں مگر اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ہوں اور ان کی حرمت کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد حلال اشیاء ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق طیبات سے مراد ذبح شدہ جانور ہیں کیونکہ ذبح کرنے سے وہ عمدہ ہو جاتے ہیں، یہ کسی خاص کرنے والے کے بغیر ہی عام کو خاص کرنا ہے' سبب اور سیاق وسباق اس کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ۔ ''اور جن جانوروں کو تم نے سکھلا رکھا ہے۔'' اس کا عطف مضاف کو مقدر مانتے ہوئے معنی کو درست کرنے کے لئے طیبات پر ہے، یعنی تمہارے لئے وہ شکار حلال کیا گیا جو تم سکھائے ہوئے جانوروں سے شکار کرتے ہو۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جن لوگوں نے احکام القرآن کے متعلق لکھا ہے ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں: یہ آیت دلیل ہے کہ جن جانوروں کو ہم سکھاتے ہیں انہیں رکھنا جائز ہے ان میں کتا اور تمام قسم کے شکاری پرندے شامل ہیں اور یہ ہر طرح کا فائدہ حاصل کرنے کے جواز کو لازم آتا ہے' پس یہ دلیل ہے کتے اور شکاری جانوروں کو بیچنے اور ہر اعتبار سے فائدہ اٹھانے کی سوائے، اس کے کہ کسی بات کو دلیل خاص کر دے اور وہ ہے ان کو کھانا یعنی کتوں کے اعضا اور پرندوں میں سے پھاڑنے والے۔

فرماتے ہیں امت کا اجماع ہے کہ کتا جب سیاہ نہ ہوا سے کسی مسلمان نے سدھایا ہوا اور اس نے جو شکار کیا ہے، کچھ نہ کھایا ہو یا اس شکار میں کوئی زخم یا دانتوں کے نشان ہوں اور مسلمان نے اسے شکار کے لئے بھیجا ہو اور بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہو کسی اختلاف کے بغیر وہ شکار کھایا جائے گا۔ اور اگر ان میں سے کوئی بھی شرط رہ گئی تو پھر اختلاف پیدا ہو جائے گا، اگر اس شکار میں اس کتے کے علاوہ چیتا وغیرہ شامل ہے مثلاً پرندوں میں سے باز یا شکرہ وغیرہ ہیں' تو جمہور امت کا مسلک ہے کہ ہر وہ شکار جو سکھانے کے بعد ہو وہ درست ہے۔ کہا جاتا ہے فلاں کو زخم آئے جب اس نے شکار کیا اسی معنی میں ''الجارحۃ'' ہے کیونکہ وہ اسے شکار کرتا ہے۔ اسی معنی میں یہ فرامین الٰہیہ ہیں وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ اور اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ۔

مُكَلِّبِيْنَ ۔ "سکھانے والے۔" یہ حال ہے اور مکلب، کتے کو شکار کا طریقہ سکھانے والے آدمی کو کہتے ہیں، کتے کو سکھانے والے کا خصوصیت کے ساتھ اس لیے ذکر کیا ہے کہ عام طور پر ان کے ذریعہ ہی شکار کیا جاتا ہے، اگرچہ کتے کو سکھلانے والا تمام شکار کرنے والے جانوروں کا معلم ہوتا ہے۔ صرف اکتفا پر ہی نہیں کیا وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ باوجود اس بات کے کہ کتے کو سکھانا ہی تعلیم دینا ہے اس لئے کہ تاکید ہو جائے کیونکہ اس میں سکھانا ضروری قرار دیا ہے۔

ایک قول کے مطابق درندہ کا نام کتا رکھا ہے، تو اس میں تمام درندے شامل ہیں جن سے شکار کیا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت کتوں کے ساتھ خاص ہے۔ ابن منذر نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کو انہوں نے کہا جن پرندوں کو باز وغیرہ سے شکار کیا جاتا ہے تو ان میں سے جسے تم ذبح کرلو تو اسے کھالو، وگرنہ تم نہ کھاؤ۔ ابن منذر کہتے ہیں سیدنا ابو جعفر رضی اللہ عنہ سے باز کے بارہ میں پوچھا گیا کہ کیا اس کا شکار حلال ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں ہاں اگر تم اسے ذبح کرلو تو پھر حلال ہے۔ ضحاک اور سدی رحمہما اللہ کہتے ہیں جن جانوروں کو تم شکار سکھاتے ہو وہ خاص کتے ہیں، اگر ان میں سیاہ کتا ہو تو اس کے شکار کو حسن قتادہ اور نخعی رحمہم اللہ نے ناپسند کیا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں کسی رخصت دینے والے کو نہیں جانتا جو کالے کتے کے شکار کی رخصت دیتا ہو، یہی بات ابن راہویہ نے کہی، لیکن عام اہل علم مدینہ یا اہل کوفہ، وہ ہر سکھلائے ہوئے کتے کے شکار کو جائز قرار دیتے ہیں اور سیاہ کتے کے شکار سے روکنے والے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے دلیل لیتے ہیں کہ کالا کتا شیطان ہے۔ اسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا۔

حق بات یہ ہے کہ ہر کتے کا شکار حلال ہے جو شکار کرنے والے جانور کے عمومی حکم کے تحت آتا ہے کتے اور اس کے علاوہ کسی جانور میں یا سیاہ کتے اور کسی دوسرے میں یا پرندہ وغیرہ میں کوئی فرق نہیں۔ اس بات کی تائید آیت کا شان نزول ہے جو سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا باز کے شکار کے متعلق سوال کرنا ہے۔

تُعَلِّمُوْنَهُنَّ ۔ "جنہیں تم سکھاتے ہو۔" یہ جملہ حال ہونے کی وجہ سے نصبی حالت میں ہے۔

مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۔ جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھی ہے، یعنی جو بات تم اللہ تعالیٰ اپنے اندر پیدا کردہ عقل سے جانتے ہو جس کے ذریعہ تم ان کی تعلیم و تربیت کرتے ہو، جس سے وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ جب تم انہیں شکار کی طرف بھیجو تو وہ اس کو تمہارے لئے روک رکھتے ہیں۔

فَكُلُوْا "تم اس سے کھالو۔" یہ فاء تفریعیہ ہے تو یہ جملہ گذشتہ کا ضمنی مسئلہ ہے کہ جو ان جانوروں

کو وہ سکھاتے ہیں ان کا شکار حلال ہے۔

مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ۔ میں مِنْ 'تبعیضیہ' ہے۔ کیونکہ شکار کے کچھ حصے ایسے ہیں کہ ان کو کھایا نہیں جاتا مثلاً چمڑا اور ہڈی اور جسے کتا وغیرہ کھا جائے۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ شکار کرنے والے جانور کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے مالک کے لئے روک رکھے اگر اس نے اس میں سے کچھ کھالیا تو گویا اس نے اپنے لئے روکا تھا جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے۔

جمہور کا موقف ہے اس شکار کا کھانا جائز نہیں جو جانور مالک کے بھیجنے کے بغیر اپنے ارادہ سے گیا ہو ہی۔ عطاء بن ابی رباح اور اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہی بات سیدنا سلمان فارسی، سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، جب کہ سیدنا علی، سیدنا ابن عباس، حسن بصری، زہری، ربیعہ، مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کے قدیم موقف کے مطابق یہ ہے کہ اس کا شکار کھایا جائے گا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا فرمان مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ رد کرتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کا فرمان بھی جو آپ ﷺ نے سیدنا عدی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: جب تو سکھایا ہوا کتا بھیجے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لے تو جو تمہارے لئے روک رکھے وہ کھالو۔

یہ روایت صحیحین وغیرہ میں ان الفاظ میں ہے کہ اگر وہ کھائے تو پھر تم نہ کھاؤ، اس لئے کہ مجھے ڈر ہے کہ اس نے اپنے لئے روکا ہوگا۔ لیکن جو ابوداؤد نے جید سند سے سیدنا ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی، اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب تو اپنا سکھایا ہوا کتا بھیجے اور اس پر اللہ کا نام لے تو کھالے اگرچہ اس نے اس میں سے کچھ کھایا ہو۔ انہوں نے ایک اور روایت جید سند سے بیان کی ہے جو عمرو بن شعیب اپنے باپ وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں اور امام نسائی نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔

بعض شوافع نے ان احادیث کو جمع کر کے یہ کہا کہ اگر شکار پکڑنے کے بعد اس نے فوری طور پر کھالیا تو وہ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ والی روایت کی وجہ سے حرام ہو جائے گا، اور اگر روکا پھر مالک کا انتظار کرنے لگا انتظار طویل ہونے کی وجہ سے بھوک زیادہ ہونے پر اس نے شکار میں سے کھالیا، جو کہ اس نے اپنے لئے نہیں پکڑا تھا تو اس کا اثر نہ ہوگا اور نہ ہی اس طرح شکار حرام ہوگا اور یہ بڑی اچھی تطبیق ہے۔ بعض نے کہا کہ اس میں سے جب کتا کھا جائے ہو تو سیدنا عدی رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے حرام ہے، اور اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا جانور کھالے تو وہ بعض دوسری احادیث کی بنا پر حرام نہیں۔

ایک قول کے مطابق ابن ثعلبہ کی حدیث کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ جب اس نے اس کو پکڑا تو وہاں سے چلا گیا، پھر دوبارہ آ کر اس میں سے کھالیا۔ اکثر اہل علم نے ترجیح کی راہ کو اپنایا ہے اور انہوں نے جمع کی راہ کو نہیں اپنایا کیونکہ ان میں بہت دوری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث زیادہ راجح ہے، اس لئے کہ یہ صحیحین میں آئی ہے، اس مسلک کو امام شوکانی رحمہ اللہ نے منتقی کی شرح میں ثابت کیا ہے جو دیکھنے والے کو مزید بصیرت عطا کرتا ہے۔

وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۔ ''اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرلیا کرو۔'' عَلَيْهِ کی ضمیر مَا عَلَّمْتُمْ کی طرف لوٹتی ہے، یعنی شکار کے لیے کتے وغیرہ کو بھیجتے وقت ان پر اللہ تعالیٰ کا نام لو یا جب وہ تمہارے لئے شکار پکڑ لیں، یعنی جب تم اسے ذبح کرنے کا ارادہ کرو تو اللہ کا نام لو۔

جمہور کا موقف ہے کہ شکاری جانور کو بھیجتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے، انہوں نے اس آیت سے دلیل لی ہے اور اس موقف کی تائید سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ والی روایت سے بھی ہوتی ہے جو صحیحین وغیرہ میں ان الفاظ سے ثابت ہے کہ جب تو اپنا کتا بھیجے تو اللہ تعالیٰ کا نام لے اور جب تو اپنا تیر پھینکے تو اللہ تعالیٰ کا نام لے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے بسم اللہ سے مراد کھانے کا وقت ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں یہی بات زیادہ ظاہر ہے۔ انہوں نے ان احادیث کو دلیل بنایا ہے جن میں بسم اللہ پڑھنے کا ذکر ہے، جب کہ یہ غلطی ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ پڑھنے کا وقت کتے کو بھیجنے اور تیر پھینکنے کا مقرر کیا ہے اور کھانے کے وقت بسم اللہ کی مشروعیت الگ حکم ہے وہ مسئلہ، اس کے علاوہ دیگر مسئلہ ہے پس اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کتاب وسنت میں اس مقام پر احکامات آئے ہیں، انہیں کھانے کے وقت بسم اللہ پڑھنے پر محمول کر دیا جائے اور نہ ہی کوئی ایسی صورت نکلتی ہے۔

صحیحین میں سیدنا عدی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ اگر ''تو اپنے کتے کو بھیجتے وقت بسم اللہ کہہ لے تو اس کے پکڑنے پر کھاؤ۔'' ایک جماعت کا موقف ہے کہ بسم اللہ کہنا شرط ہے اور دوسری جماعت کا موقف ہے کہ یہ صرف سنت ہے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے یہ شرط اس پر ہے جسے بسم اللہ پڑھنا یاد ہو نہ کہ اس پر جو بھول جائے یہ سب سے مضبوط اور سب سے راجح قول ہے۔

مضمون نمبر:٦

اَلْيَوْمَ ۔ (٥) ''آج۔''

اس دن سے مراد اور اس سے دو آیات میں مذکور ایک ہی وقت ہے، یہ صرف تاکید کے لئے لائے ہیں اور اس بارہ میں نئی مختلف باتیں ذکر کرنے کے لئے مکرر لانے کا یہ عمدہ انداز ہے اسی طرح ابوالسعود فرماتے ہیں۔

ایک قول کے مطابق اس دن سے رسول اللہ ﷺ نے وقت کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ تم کہتے ہو یہ فلاں دن گذر رہے ہیں۔

اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۔ ”تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال کی گئیں۔“ یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے یعنی اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۔طیبات کا ذکر ہو چکا۔وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۔ ”اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لئے حلال ہے۔“ طعام ہر اس چیز کا نام ہے جسے کھایا جائے اور اسی میں ذبیحہ بھی آتا ہے۔

اکثر اہل علم کا کہنا ہے کہ یہ لفظ یہاں ذبیحہ کے ساتھ خاص ہے' اس آیت میں دلیل ہے کہ اہل کتاب کا تمام کھانا گوشت وغیرہ کے فرق کے بغیر مسلمانوں کے لئے حلال ہے اگرچہ وہ اپنے ذبیحہ پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیں، تو یہ آیت اس فرمان الٰہی کے عمومی حکم کو خاص کرتی ہے جو یہ ہے وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے اگرچہ یہودی اپنے ذبیحہ پر عزیر علیہ السلام کا نام لیں اور عیسائی مسیح علیہ السلام کا نام لیں۔ یہی موقف سیدنا ابودرداء' سیدنا عبادہ بن صامت' سیدنا ابن عباس رضوان اللہ علیہم' زہری' ربیعہ' شعبی اور مکحول کا ہے۔

سیدنا علی' ام المومنین سیدہ عائشہ اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: جب تم اہل کتاب کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا نام لیتے ہوئے، سنو تو نہ کھاو۔ یہی طاؤس اور حسن کا قول ہے، انہوں نے فرمان باری تعالیٰ وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اور وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ سے دلیل لی ہے کہ وہ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں مکروہ ہے حرام نہیں۔

یہی اختلاف اس وقت ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ انہوں نے اپنے ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام لیا لیکن لاعلمی کے وقت کے بارہ میں طبری اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے اجماع نقل کیا ہے کہ یہ اس آیت اور اس واقعہ کی وجہ سے جو سنت میں آتا ہے حلال ہے کہ آپ ﷺ نے بھنی ہوئی بکری کھائی جو آپ ﷺ کو یہودیہ عورت نے بھیجی تھی اور اسی طرح چربی کا وہ تھیلہ جو کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خیبر سے لیا اور نبی اکرم ﷺ کو اس بات کا علم تھا، تو یہ دونوں واقعات صحیح وغیرہ میں موجود ہیں۔

یہاں اہل کتاب سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں، البتہ مجوس کے بارہ میں جمہور کا موقف

ہے کہ ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے اور نہ ہی ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے کیونکہ وہ مشہور مذہب کے مطابق اہل علم کے نزدیک اہل کتاب میں شامل نہیں' ابو ثور نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے جب کہ دیگر فقہاء نے اس پر انکار کیا ہے حتیٰ کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابو ثور اس مسئلہ میں' اپنے نام ہی کی طرح ہے شاید ابو ثور نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اس مرسل حدیث کو لیا ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس کے بارہ میں فرمایا کہ ان سے اہل کتاب جیسا سلوک کرو' یہ الفاظ ثابت نہیں ہیں، فرض کریں ان کی کچھ اصل بھی ہے تو اس میں کچھ الفاظ زائد ہیں جو ان کا ہی رد کرتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ ان کا ذبیحہ نہیں کھانا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا ہے' یہ اضافہ مفسرین اور فقہاء کی ایک ایسی جماعت نے کیا ہے جنہیں فن حدیث کی کچھ بھی خبر نہیں۔

اس کی اصل اور نہ اضافہ کہیں ثابت ہے بلکہ یہ بات صحیح میں ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے جزیہ لیا لیکن بنو تغلب کے بارہ میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ان کا ذبیحہ کھانے سے منع کیا کرتے تھے کیونکہ وہ عرب تھے اور کہا کرتے کہ انہوں نے عسائیوں سے سوائے شراب نوشی کے کچھ نہیں لیا' اسی طرح باقی عربوں کا حال ہے' جو عیسائی ہوئے مثلاً تنوخ، جذام اور عاملہ وغیرہ وغیرہ۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں یہی قول علمائے متقدمین ومتاخرین میں سے کئی ایک کا ہے۔ سعید بن مسیب اور حسن بصری سے مروی ہے کہ وہ بنو تغلب کے عیسائیوں کا ذبیحہ کھانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جمہور امت کا کہنا ہے کہ ہر عیسائی کا ذبیحہ حلال ہے خواہ وہ بنی تغلب کے قبیلہ کا آدمی ہو یا کسی اور قبیلہ کا، یہی حال یہود کا ہے۔

مزید فرماتے ہیں کہ: علماء کے درمیان ان میں کوئی اختلاف نہیں کہ ذبیحہ کے علاوہ ان کا عام طور پر پکا ہوا کھانا جائز ہے۔

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۔ ''اور تمہارا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے۔'' یعنی مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال ہے۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ اپنے ذبیحہ میں سے اہل کتاب کو کھلائیں۔ یہ ایک دوسرے کو پورا پورا بدلہ دینے کی صورت میں سے ہے اور مسلمانوں کو یہ بتاتا ہے کہ جو وہ کھانے کے بدلہ میں لیتے ہیں وہ ان کے لئے التزامی دلالت کے طریقہ پر بھی حلال ہے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ ۔ ''اور پاکدامن عورتیں۔'' یہ مبتداء ہے اس کی تفسیر میں یہاں اختلاف

ہے۔ایک قول ہے کہ پاکدامن اور دوسرا قول ہے آزاد۔ شعبی اور کسائی ص کے کسرہ سے پڑھتے ہیں۔اس پر سورۂ بقرہ اور نساء میں کافی بحث ہو چکی ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ۔ ''مسلمان عورتیں۔'' یہ اس کی صفت ہے اور خبر محذوف ہے تو عبارت یہ ہوگی ''والمحصنات من المؤمنات حل لکم'' یعنی پاکدامن مومنہ عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں اور اس عبارت کا ذکر آیت کے اگلے جملہ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ کے بطور تمہید ہے ''اور جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ان کی پاکدامن عورتیں بھی حلال ہیں۔ان سے مراد آزاد ہیں نہ کہ لونڈیاں اسی طرح جمہور کا کہنا ہے۔

ابن جریر نے سلف کی ایک جماعت سے یہ بیان کیا ہے کہ یہ آیت ہر اہل کتاب کے بارہ میں عام ہے وہ آزاد ہے یا غلام۔ایک قول کے مطابق اہل کتاب سے مراد اسرائیلی لوگ ہیں یہی قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے اور یہ بغیر کسی دلیل کے خاص کرنا ہے' سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، عیسائی عورتیں حلال نہیں۔مزید فرماتے ہیں۔میں اس سے بڑا شرک اور نہیں جانتا کہ کوئی عورت یہ کہے کہ اس کا رب عیسیٰ (علیہ السلام) ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَ لَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ۔ ''تم مشرکہ سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئے''؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ آیت عام مشرکوں کے حکم میں اہل کتاب کو خاص کرتی ہے، تو عام کی خاص پر بناء ہوگی' جس نے اس آیت سے اہل کتاب کی لونڈیوں سے نکاح کرنے کو حرام کہا ہے تو اس نے اسی سے استدلال کیا ہے، اس لیے کہ اس نے اسے آزاد عورتوں پر محمول کیا ہے اور اس نے فرمان الٰہی فَمِنْ مَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِّنْ فَتَیٰتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ۔ سے بھی استدلال کیا ہے۔ اکثر اہل علم کا یہی موقف ہے۔جب کہ ان کے مخالفین کا کہنا ہے کہ یہ آیت عام ہے یا یہ پاکدامن عورتوں کو خاص کرتی ہے جیسا کہ گذر چکا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اہل کتاب کی پاکدامن آزاد عورت اس آیت میں داخل ہے تمام اقوال کی بناء پر سوائے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے جو عیسائیوں کے بارہ میں ہے اور اس میں ہے کہ ہر آزاد عورت جو پاکدامن نہ بھی ہو، وہ شامل ہے اور پاکدامن لونڈی اس کے قول کے مطابق جو کہتا ہے کہ دو معنوں میں مشترک لفظ کو دونوں جگہ استعمال کرنا جائز ہے لیکن جو اسے جائز نہیں سمجھتے اگر یہاں محصنات کو آزاد پر محمول کیا جائے تو وہ لونڈی سے نکاح کے جواز کا فتویٰ نہ دیں گے، وہ پاکدامن ہوں یا نہ، سوائے کسی اور دلیل کے اور وہ آزاد عورت وہ پاکدامن ہے یا نہیں اس سے

نکاح کے جواز کا فتویٰ دیں گے اور اگر محصنات کو یہاں پاکدامن پر محمول کیا جائے تو وہ کہیں گے کہ پاکدامن آزاد اور لونڈی سے نکاح جائز ہے لیکن آزاد و لونڈی جو پاکدامن نہیں ان سے نکاح جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ اہل کتاب کی لونڈی سے نکاح جائز ہے اس آیت کے عموم کو لیتے ہوئے اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ یعنی ''ان کے حق مہر دو۔'' اور اذا کا جواب محذوف ہے یعنی اس طرح وہ حلال ہیں گویا کہ یہ محصنات کی خبر کی طرف ہے جو کہ پوشیدہ ہے یعنی وہ تمہارے لئے حلال ہے۔ مُحْصِنِيْنَ ''تم باقاعدہ نکاح کرو۔'' یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے'' یعنی اس حال میں کہ تم نکاح کر کے پاکدامنی چاہتے ہو۔ اسی طرح فرمان الٰہی ہے غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ پر اور لا تاکید کے لئے زائد آیا ہے۔

خُـــذْنَ۔ پوشیدہ دوست کو کہتے ہیں یہ مرد و عورت دونوں پر بولا جاتا ہے، یعنی معشوقات نہ بناؤ' اللہ تعالیٰ نے مردوں میں بھی پاکدامنی اور علانیہ زنا اور پوشیدہ دوست بنانے کی شرط لگائی ہے، جس طرح اس نے عورتوں پر شرط لگائی کہ وہ پاکدامن ہوں۔

مضمون نمبر: ۷

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ ۔ (٦)

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے اٹھو۔''

یعنی جب تم قیام کا ارادہ کرو، مسبب کو سبب سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ فرمان الٰہی وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ میں ہے۔

اہل علم نے اس حکم میں اختلاف کیا ہے کہ یہ (وضو کا حکم) نماز کے لئے کھڑے ہونے کے ارادہ کے وقت ہے' ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جب بھی کوئی شخص اس کے لئے کھڑا ہو تو یہ حکم اس پر لاگو ہوتا ہے، خواہ کھڑا ہونے والا ہے باوضو یا بے وضو، اس کے لئے مناسب ہے کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑا ہو تو وضو کرے یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور عکرمہ سے مروی ہے اور داؤد الظاہری اسے واجب قرار دیتے ہیں۔

ابن سیرین کہتے ہیں کہ: خلفاء ہر نماز کے لئے وضو کیا کرتے تھے، ایک جماعت کا کہنا ہے یہ حکم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے مگر یہ موقف کمزور ہے کیونکہ یہ خطاب مومنوں سے ہے اور

حکم بھی انہی کو ہے۔ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ حکم استحباب یعنی فضیلت کی تلاش کے لئے ہے' جب کہ دوسرے ائمہ کا کہنا ہے کہ اس آیت کی رو سے ہر نماز کے لئے وضو کرنا ان پر لازم تھا، پھر فتح مکہ میں منسوخ ہو گیا۔ ایک جماعت کا کہنا ہے یہ حکم بے وضو کے لئے خاص ہے' دوسروں کا کہنا ہے، یہاں یہ حکم مراد یہ ہے کہ جب تم نیند سے نماز کی طرف اٹھو تو یہ خطاب ہر اس شخص سے عام ہے جو نیند سے بیدار ہو۔

امام مسلم، امام احمد اور اصحاب سنن ﷭ نے سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی کہ نبی ﷺ ہر نماز کے لئے وضو کیا کرتے تھے، جب مکہ فتح ہوا تو آپ ﷺ نے وضو کیا اور دونوں جرابوں پر مسح کیا اور آپ ﷺ نے کچھ نمازیں ایک وضو سے پڑھائیں، تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا اے اللہ کے رسول! آپ نے ایسا کام کیا ہے جو آپ پہلے نہ کرتے تھے' آپ ﷺ نے فرمایا اے عمر! میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ یہ روایت مختلف سندوں سے ایسے الفاظ سے مروی ہے جن کا معنی متفق ہے۔

امام بخاری' احمد اور اصحاب سنن سیدنا عمرو بن عامر الانصاری ﷭ سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ نبی ﷺ ہر نماز کے لئے وضو کیا کرتے تھے سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے کہا پھر تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھتے ہیں جب تک کہ ہم بے وضو نہ ہو جائیں۔ مذکورہ بالا سے یہ ثابت ہو گیا کہ وضو کرنا صرف بے وضو شخص پر واجب ہے، یہی جمہور اہل علم کا موقف اور یہی بات درست ہے۔

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ ۔ "تو اپنے مونہہ دھولو۔" لغت میں وجہ (چہرہ) سے لیا گیا ہے جو المواجھہ کئی اعضاء پر مشتمل ہے، اس کی لمبائی اور چوڑائی ہے' لمبائی میں اس کی حد یہ ہے کہ پیشانی کی سطح سے دونوں جبڑوں کے اخیر تک اور چوڑائی میں کان سے دوسرے کان تک۔ ڈاڑھی کے خلال کرنے کے بارہ میں دلیل موجود ہے اور ڈاڑھی کے لٹکتے ہوئے بالوں کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے، اس بارہ میں اپنے مقام پر گفتگو تفصیلاً موجود ہے۔ اہل علم کا اس بارہ میں بھی اختلاف ہے کہ دھونے میں ہاتھ سے ملنا معتبر ہو گا یا صرف پانی بہانا کافی ہے؟ اس میں اختلاف معروف ہے' مرجع و ماخذ عربی زبان ہے اگر ثابت ہو جائے کہ ملنا دھونے میں شامل ہے تو یہ بھی معتبر ہو گا وگرنہ نہیں۔ شمس العلوم میں فرمایا کسی چیز کو دھونا یہ ہے کہ جب اس پر پانی بہایا جائے اور اسے ملا جائے۔

البتہ کلی کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا اگرچہ لفظ وجہ میں مونہہ اور ناک کا باطنی حصہ شامل نہیں پھر بھی سنت صحیحہ سے ثابت ہے' اس کے واجب اور غیر واجب کے بارہ میں اختلاف معروف ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی کتب میں جو حق ہے وہ واضح کیا ہے جیسا کہ ان کی کتاب مختصر اور اس کی شرح اور نیل الاوطار ہے۔

وَ اَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ ۔ ''اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت آخر تک۔'' یہاں علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ الٰی کا مابعد، ماقبل میں داخل ہے یا نہیں؟ سیبویہ اور ایک جماعت کا کہنا ہے اگر مابعد ماقبل کی قسم سے ہے تو اس میں داخل ہے وگرنہ نہیں اور ایک قول کے مطابق وہ یہاں مع کے معنی میں ہے۔ ایک قول کا موقف ہے کہ یہ مطلقاً انتہا کا فائدہ دیتا ہے البتہ اس کا اس میں شامل ہونا یا نہ ہونا ایسا معاملہ ہے جو دلیل سے چلے گا۔

جمہور کا کہنا ہے کہ کہنیوں کو دھویا جائے گا ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو دارقطنی اور بیہقی نے قاسم بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عقیل کی سند سے بیان کرتے ہیں وہ اپنے دادا سے، وہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرتے تو اپنی کہنیوں پر پانی بہاتے لیکن قاسم متروک اور اس کا دادا ضعیف راوی ہے۔

وَ امۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ۔ ''اپنے سروں کا مسح کرو۔'' ایک قول یہ ہے کہ باء زائد ہے تو معنی ہوگا، اپنے سروں کا مسح کرو، یہ پورے سر کے مسح کے عموم کا تقاضہ کرتا ہے۔ ایک قول کے مطابق باء تبعیض کے لئے ہے، یہ سر کے کچھ حصہ کے مسح کو کفایت کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔ باء تبعیضیہ کے کہنے والوں کی دلیل تیمم کے بارہ میں یہ فرمان الٰہی فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡھِکُمۡ۔ ہے، آیت کے اس جملہ میں بالاتفاق چہرے کے بعض حصہ کا مسح کرنا کافی نہیں، یہ بات متفق علیہ ہے۔ ایک قول کے مطابق باء الصاق کے لئے ہے، یعنی اپنے ہاتھوں کو اپنے چہروں سے ملاؤ۔

بہرحال' سنت مطہرہ میں ایسی دلیل موجود ہے جو سر کے کچھ حصہ کے مسح کو کفایت کا فائدہ دیتی ہے جیسا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تالیفات میں واضح کیا ہے' پس یہ مطلوبہ حکم کی دلیل ہے جس میں آیت والا احتمال نہیں، اگر ہم آیت کو احتمال والی فرض کر لیں، تو اس بات میں شک نہیں کہ اس کام سے تشبیہ دیتے ہوئے، جو اس کے علاوہ حکم دے کہ وہ سارے سر کا مسح کرے، جس پر مسح کا لفظ صادق آتا ہے' عربی زبان میں ایسی کوئی چیز نہیں جو یہ تقاضہ کرے کہ جس میں اس کام کی طرح سر کا مسح کہیں ناسخ ومنسوخ ہو

اسی طرح تمام متعدی افعال میں یہی اصول ہے مثلاً تم زید کو مارو یا نیزہ پھینکو۔ تو اس سے عربی میں یہ معنی لیا جائے گا کہ اس کے کسی ایک عضو پر ضرب لگاؤ یا نیزہ مارو' یہ بات اہل لغت یا لغت کا کوئی عالم نہ کہے گا کہ ضرب کا عمل اور نیزہ مارنے کا عمل اس وقت پورا ہوگا جب زید کے تمام اجزاء پر ضرب یا نیزہ مارا جائے گا اور اسی طرح تمام افعال ہیں، لہٰذا اس معنی کو پہچان لے جو تجھ پر سر کے مسح کے بارہ میں اقوال میں درست وضاحت کر دے گا۔

اگر تم یہ کہو کہ اس طرح تو یہ چہرہ ہاتھوں اور پاؤں کے دھونے پر لازم آتا ہے؟ تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ آپ اس وقت لازم کر سکتے ہیں جب سنت میں چہرہ کے بارہ میں کوئی وضاحت نہ ہو اور ہاتھوں اور پاؤں کی حد بیان نہ کی گئی ہو حالانکہ سر کے بارے میں ایسا نہیں کیونکہ سنت میں پورے سر کا مسح اور کچھ حصہ کا مسح آتا ہے۔

وَاَرْجُلَكُمْ ۔ نافع ارجل کو منصوب پڑھتے ہیں یہ حسن بصری اور اعمش کی قراءۃ ہے' ابن کثیر' ابوعمرو اور حمزہ مجرور پڑھتے ہیں۔ منصوب پڑھنے کی بنا پر یہ دلالت کرے گا کہ دونوں پاؤں کا دھونا واجب ہے کیونکہ یہ چہرہ اور ہاتھوں پر معطوف ہوگا' یہی موقف جمہور علماء کا ہے۔ دھونے والے اعضاء سے مسح والے اعضاء کو الگ کرنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان اعضاء کا دھونا ترتیب کو واجب قرار دیتا ہے' اسی موقف پر امام شافعی ہیں۔ مجرور پڑھنا دلیل ہے کہ پاؤں کو مسح کرنے کی کفایت کو جائز قرار دیتا ہے کیونکہ یہ سر پر معطوف ہے' یہ موقف ابن جریر طبری کا ہے' اور یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

داؤد ظاہری کہتے ہیں دونوں احکامات کو اس طرح جمع کرنا لازم ہے جو دونوں قراءتیں تقاضہ کرتیں ہیں۔ ابن عربی کہتے ہیں امت کا اتفاق ہے کہ ان کا دھونا لازم ہے میں طبری کے علاوہ مسلمانوں کے فقہاء میں سے کسی کو نہیں جانتا جو اس کا رد کرتا ہو اور روافض تو مسلمانوں میں سے ہیں ہی نہیں اور امام طبری نے جر پڑھنے کی وجہ سے یہ موقف اپنایا۔ قرطبی فرماتے ہیں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وضو، دو دھونے اور دو مسح کرنے کی چیزوں کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں عکرمہ دونوں پاؤں کا مسح کیا کرتے وہ فرمایا کرتے کہ پاؤں کو دھونا نہیں چاہیے ان کے بارہ میں مسح کا حکم نازل ہوا ہے۔

عامر الشعبی کہتے ہیں جبرئیل علیہ السلام مسح کا حکم لے کر آئے۔ اور فرماتے ہیں کہ قتادہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے دو مسح اور غسل فرض کئے اور فرماتے ہیں کہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ ان دو

کا فرض ہونا غسل اور مسح کے درمیان اختیار ہے۔ دونوں قراءتوں کو دو روایات قرار دیا اس بات کو نحاس نے مضبوط کیا ہے۔ لیکن سنت مطہرہ میں صحیح احادیث سے آپ ﷺ کا قول و فعل ثابت ہے کہ دونوں پاؤں کو صرف دھونا چاہیے۔ آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایڑیوں کے لئے آگ سے ہلاکت ہے اور یہ روایت صحیحین وغیرہ میں موجود ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دونوں پاؤں کو دھونا ضروری ہے اور ان کا مسح کرنا کافی نہیں، کیونکہ مسح کی کیفیت ہی یہ ہے کہ کچھ حصہ کو چھوا جائے اور کچھ سے رہ جائے، اگر یہ کافی ہوتا تو آپ ﷺ یہ نہ فرماتے ایڑیوں کے لئے آگ سے ہلاکت ہے اور یہ بات بھی آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے وضو اور پاؤں دھونے کے بعد فرمایا یہ وضو ہے اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہی نماز قبول فرماتے ہیں۔ اور صحیح مسلم وغیرہ میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک شخص نے وضو کیا اور اس نے پاؤں پر ناخن کے برابر جگہ چھوڑ دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوٹ جاؤ اپنا وضو اچھی طرح کر کے آؤ''

جرابوں پر مسح کرنا متواتر احادیث ثابت ہے اور فرمان الٰہی اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ ''ٹخنوں سمیت'' کا معنی ہے ٹخنوں کو بھی دھونا ہے جیسا کہ سنت مطہرہ نے اسے بیان کر دیا ہے اس بارہ میں گفتگو اسی طرح ہے جیسا کہ کہنیوں کے بارہ میں ہے، کہنیوں کا لفظ جمع کے صیغہ اور ٹخنوں کا لفظ تثنیہ کے صیغہ سے آنے کی وجہ کے متعلق ایک قول ہے کہ ہر پاؤں میں دو ٹخنے ہوتے ہیں اور ہر بازو میں ایک کہنی ہوتی ہے، اس میں دوسری کہنی کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا یہ معنی ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

کواشی کہتے ہیں: ٹخنہ کو تثنیہ اور کہنی کو جمع اس لئے لائے ہیں تاکہ یہ شائبہ دور ہو جائے کہ ہر پاؤں میں دو ٹخنے ہوتے ہیں حالانکہ ہر پاؤں میں ایک ہی ٹخنہ ہوتا ہے البتہ پاؤں کے دو طرف دو کنارے ہوتے ہیں کہنی کے برخلاف کہ اس کا وہم بھی ممکن نہیں۔

وضو میں یہ چار فرض ہیں مزید فرائض نیت کرنا اور بسم اللہ پڑھنا ہے جن کا ذکر اس آیت میں نہیں ہوا بلکہ یہ سنت میں مذکور ہے۔ ایک قول کے مطابق اس آیت میں نیت کی دلیل بھی موجود ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنے چہرے دھو لو۔ اس کی تقدیر یوں ہوگی ''فاغسلوا وجوهكم لها'' یعنی تم اپنے چہرے اس نماز کے لئے دھو لو'' تو یہی معتبر نیت ہے نہ کہ وہ نیت جو مختلف ہے، الفاظ کی صورت میں لوگوں کے درمیان متعارف ہے، کئی ایک علماء نے واضح طور پر اس کا انکار کیا ہے اور بیان کیا کہ یہ نبی اکرم ﷺ سے منقول نہیں بلکہ ان کے بعد صحابہ و تابعین تبع تابعین اور ان کے معتبر ائمہ میں سے بھی کسی سے منقول نہیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا ۔ ''اور اگر تم حالت جنابت میں ہو۔'' یہاں جنابت سے مراد ہے کہ عورت کی شرمگاہ میں مرد کے ذکر کا حشفہ داخل ہو جائے یا پھر احتلام وغیرہ سے مرد کی منی خارج ہو جائے۔ فَاطَّهَّرُوْا ''تو غسل کرلو۔'' یعنی پانی سے غسل کرو۔ سیدنا ابن مسعود اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم کا اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے موقف ہے کہ جنبی بالکل تیمم نہیں کر سکتا بلکہ نماز چھوڑ دے جب تک پانی میسر نہ آئے، جمہور کا موقف ہے پانی کی عدم موجودگی میں جنبی شخص پر تیمم لازم ہے اور یہ آیت تو اس کے بارہ میں ہے جس کے پاس پانی موجود ہو کہ وہ غسل کر لے، یہ حکم عام ہے پانی کی موجودگی میں یا اس کے ساتھ طہارت حاصل کرے جو اس کی عدم موجودگی میں اس کا عوض ہو سکتی ہے اور وہ ہے مٹی لیکن شرط یہ ہے کہ پانی نہ ملے۔ فرماتے ہیں سیدنا عمر اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے جمہور کے موقف کی طرف لوٹنا، ان صحیح احادیث کی وجہ سے جو پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے جنبی کے تیمم کرنے کے بارہ میں آتی ہیں۔ صحیح سند سے ثابت ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ۔

''ہاں اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی حاجت ضروری (پاخانہ پیشاب) سے فارغ ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ملے ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کرلو اسے اپنے چہروں پر اور ہاتھوں پر مل لو۔''

بیماری، سفر اور حاجت ضروریہ سے واپس آنے کی تفسیر سورۃ النساء میں کافی ووافی بیان ہو چکا، اسی طرح عورتوں سے ملنے کے بارہ میں بھی گفتگو گزر چکی اور تیمم اور مٹی کے بارہ میں بھی وضاحت ہوگئی۔

آیت میں مِنْكُمْ ابتدائے غایت کے لئے ہے اور ایک قول کے مطابق تبعیضیہ ہے۔ ایک قول کے مطابق یہاں دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ طہارت کے بارے میں کلام کو پوری طرح ذکر کرنا مقصود ہے۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ ''اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی ڈالنا نہیں چاہتا۔'' یعنی تمہیں پانی یا مٹی کے ساتھ طہارت کا حکم دے کر تم پر دین کو تنگ نہیں کرنا چاہتا، اسی معنی میں یہ فرمان الٰہی ہے وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔

وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ۔ ''لیکن اس کا ارادہ تمہیں پاک کرنے کا ہے۔'' گناہوں اور غلطیوں سے کیونکہ وضو گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔ ایک قول کے مطابق صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔

مضمون نمبر: ۸

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ۔ (۳۱)

''پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کھود رہا تھا تا کہ اسے دکھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کی نعش کو چھپا دے۔''

ایک قول ہے کہ جب اس نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اسے کس طرح چھپائے کیونکہ وہ پہلی میت تھی جو اولاد آدم میں سے قتل ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے دو کوے بھیجے، وہ دونوں جھگڑنے لگے، ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا تو قاتل کوے نے گڑھا کھودا، پھر مقتول کوے کو اس میں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی' جب قابیل نے اسے دیکھا تو قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ۔ ''وہ کہنے لگا ہائے افسوس! کیا میں ایسا کرنے سے بھی گیا گذرا ہو گیا کہ اس کوے کی طرح اپنے بھائی کی لاش کو دفنا دیتا؟ تو اس نے اسے دفنایا۔''

مضمون نمبر: ۹

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ۔ (۳۳)

''جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑیں ان کی سزا یہی ہے۔''

لوگوں نے اس آیت کے شان نزول کے بارہ میں اختلاف کیا ہے، جمہور کا موقف ہے کہ یہ آیت قبیلہ عرینہ کے بارہ میں نازل ہوئی۔ امام مالک' شافعی' ابو ثور رحمہم اللہ اور اصحاب رائے کا کہنا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی جو مسلمانوں میں سے نکلے اور ڈاکے ڈالنے اور زمین میں فساد پھیلانے لگے۔ ابن منذر کہتے ہیں امام مالک رحمہ اللہ کا قول صحیح ہے۔ ابو ثور اس قول سے دلیل لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا قول اس آیت میں ہے اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۔ ''ہاں جو لوگ ان سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پا

لو۔'' یہ دلیل ہے کہ یہ آیت مشرکین کے علاوہ کسی کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ علماء کا اجماع ہے کہ مشرکوں کو جب توفیق ملتی ہے تو مسلمان ہو جاتے ہیں، پھر ان کے خون محترم ہو جاتے ہیں، تو یہ دلیل ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے بارہ میں نازل ہوئی۔

اسی طرح اس پر یہ فرمان الٰہی: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۔ بھی دلیل ہے اور آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ: ''اسلام گذشتہ گناہ ختم کر دیتا ہے'' یہ روایت مسلم وغیرہ نے بیان کی۔

ابن جریر طبری رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بعض اہل علم سے نقل کرتے ہیں کہ اس آیت نے یعنی جنگ والی آیت نے قبیلہ عرینہ کے ساتھ آپ ﷺ کے سلوک کو منسوخ کر دیا ہے اور یہ حکم حدود کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ابن سیرین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ بات حدود نازل ہونے سے پہلے تھی یعنی نبی اکرم ﷺ کا قبیلہ عرینہ سے اس طرح سلوک کرنا، یہی بات اہل علم کی ایک جماعت نے کہی۔ دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ نبی ﷺ کا ان کے ساتھ سلوک منسوخ ہے پس نبی ﷺ نے مثلہ کرنے سے منع فرما دیا۔ یہ کہنے والا ناسخ کے متاخر ہونے کی وضاحت کرے۔

حق بات یہ ہے کہ یہ آیت مشرک وغیرہ سب کو عام ہے جو بھی اس قسم کے کام کا ارتکاب کریں۔ قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اہل علم کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس آیت کا حکم مسلمانوں سے جنگ کرنے والوں پر لاگو ہوتا ہے اگرچہ یہ آیت مرتد اور یہودیوں کے بارہ میں نازل ہوئی۔

ایک قول کے مطابق آیت میں مذکور اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنے سے مراد رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنا ہے اور آپ ﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں سے جنگ کرنا ہے اور آپ ﷺ کے زمانہ کے بعد عبارت کی رو سے قیاس اور دلیل کے بغیر کیونکہ حکم بالمشافہ خطاب کی صورت میں نہیں آیا تاکہ اس سے بوقت نزول لوگوں کو مکلف بنایا جا سکے' خطاب کو ان کے علاوہ دوسروں پر بھی عام قرار دینا دلیل کا محتاج ہے۔ ایک قول کے مطابق ان کی جنگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے ان کی جنگ کو اور ان کی اذیت کو بڑا قرار دینے کے لئے اس لیے قرار دیا کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے نہ جنگ کی جا سکتی ہے اور نہ غلبہ پایا جا سکتا ہے۔

سب سے مناسب تفسیر یہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس کی نافرمانی اور اس کے قوانین کی مخالفت کی جائے اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کو اس کے

حقیقی معنی پر محمول کیا جائے اور آپ ﷺ کی امت کا حکم، آپ ﷺ کے حکم کی طرح ہے اور اس حکم میں یہ سب برابر ہیں۔

زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش شر کی کئی اقسام پر بولا جاتا ہے، جیسا کہ قریب ہی ہم ذکر کر آئے ہیں۔ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: اکثر علمائے متقدمین فرماتے ہیں ان میں سعید بن مسیب رحمہ اللہ بھی ہیں کہ درہم و دینار پر ٹیکس لگانا بھی زمین میں فساد پھیلانے کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ۔

جو ہم نے ثابت کیا جب آپ پر آیت کے عموم کے حوالہ سے واضح ہو گیا اور جنگ کا معنی اور زمین میں فساد پھیلانے کا معنی بھی عیاں ہو گیا،

تو اب جان لو کہ یہ معنی ہر اس شخص پر صادق آئے گا، جو ان میں سے کوئی کام بھی کرے گا، اگرچہ وہ مسلمان ہو یا کافر، شہر میں ہو یا نہ ہو، تھوڑے ہوں یا زیادہ، بڑا ہو یا چھوٹا' بے شک اللہ تعالیٰ کا حکم اس بارہ میں وہی ہے جو منقول ہو، اس آیت کریمہ میں قتل کرنا یا سولی چڑھانا ہاتھ اور پاؤں کا خلاف سے کاٹنا یا زمین سے نکال دینا لیکن یہ حکم کسی بھی گناہ کے نتیجہ میں نہ ہو گا بلکہ جس کا گناہ متعدی ہو کر لوگوں کے خون اور ان کے اموال تک پہنچ جائے' سوائے ان کے کہ جن کے بارہ میں اس حکم کے علاوہ کتاب اللہ میں یا سنت رسول اللہ ﷺ میں کوئی دوسرا حکم موجود ہے مثلاً چوری اور جو اس پر بدلہ لازم آتا ہے کیونکہ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس کے علاوہ دیگر گناہوں اور نافرمانیوں میں مبتلا ہوئے اور آپ ﷺ نے اس آیت میں مذکورہ حکم ان پر جاری نہ فرمایا۔

اس سے وہ قول کمزور ہو جاتا ہے جو مجاہد سے اس آیت میں مذکورہ جنگ کی تفسیر کے بارہ میں ذکر ہوا کہ یہ حکم زنا اور چوری کے بارہ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں گناہوں کے بارہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں اس حکم کے علاوہ دیگر احکامات بھی موجود ہیں' جب آپ اس آیت کے معنی کو جو کہ ظاہر ہے پہچان گئے جو عربی زبان کا متقاضی ہے جس کے ذریعہ ہمیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی تفسیر کرنے کا حکم دیا گیا، تو تم کسی قسم کے دھوکہ سے بچو جو تفصیلاً مروی ہیں اور جو مذاہب منقول ہیں، ہاں یہ اور بات ہے کہ تیرے پاس کوئی ایسی دلیل

لائے جو اس عام حکم کو خاص کر دے یا اس معنی کو مقید کر دے جو عربی زبان سے سمجھا گیا تو، تو اس بارے میں بہتر جانتا ہے تو اسے اس کی جگہ رکھ کر اس پر عمل کر لے اور اگر اس کے سوا ہو تو:

فدع عنك نهبا اصيح في حجراته وهات حديثا ما حديث الرواحل

ہم عنقریب ان مذاہب کی تفصیل بیان کریں گے جو آپ سن لیں گے۔

جان لو کہ علماء کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ جنگ کرنے والے لفظ کا حق دار کون ہے' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ' سعید بن مسیب' مجاہد' عطا' حسن بصری' ابراہیم نخعی' ضحاک اور ابو ثور رحمہم اللہ فرماتے ہیں: جس نے اسلامی مملکت میں تلوار سونتی، راستہ میں لوگوں کو خوف زدہ کیا، پھر کامیاب ہوا اور اسے پکڑ لیا گیا تو مسلمانوں کے امام کو اس کے بارہ میں اختیار ہے، اگر چاہے تو اسے قتل کر دے اور چاہے تو سولی چڑھا دے اور اگر چاہے تو ہاتھ اور پاؤں کاٹ دے۔ یہی بات امام مالک رحمہ اللہ نے کہی، اور وہ مزید فرماتے ہیں کہ ان کے نزدیک جنگو وہ ہے جو لوگوں پر حملہ کرے، خواہ شہر میں یا جنگل میں کسی دشمنی، فساد اور عداوت کے بغیر ان کے اموال اور جانوروں پر غلبہ حاصل کر لے۔

ابن منذر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام مالک رحمہ اللہ سے اس مسئلہ کے نقل میں اختلاف آتا ہے ایک مرتبہ شہر میں جنگ کو ثابت کرتے ہیں اور دوسری مرتبہ نفی کرتے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے گزشتہ روایت کے علاوہ بھی مروی ہے، وہ کے بارہ میں فرماتے ہیں' جب وہ قتل کریں اور مال چھین لیں تو انہیں قتل کر دیا جائے اور سولی چڑھایا جائے جب وہ صرف قتل کریں اور مال نہ چھینیں تو انہیں صرف قتل کیا جائے اور سولی نہ چڑھائے جائیں' اور جب وہ صرف مال چھینیں تو انہیں قتل نہ کیا جائے، مخالف اطراف سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، اور جب صرف خوف زدہ کریں اور مال نہ لوٹیں تو پھر وہ زمین سے نکال دیئے جائیں۔

ابو مجلز' سعید بن جبیر' ابراہیم نخعی' حسن' قتادہ' سدی اور عطاء رحمہم اللہ سے ایک دوسرے سے مختلف روایات سے مروی ہے' ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ جمہور سے نقل کیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اسی طرح کئی ایک علمائے متقدمین سے مروی ہے۔

ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں جب وہ قتل کرے تو اسے قتل کر دیا جائے' جب وہ مال چھینے اور قتل نہ کرے تو اس کے ہاتھ پاؤں مخالف اطراف سے کاٹ دیئے جائیں اور جب وہ مال بھی چھینے اور قتل بھی کرے تو حاکم کو اختیار ہے کہ اگر چاہے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے اور اگر چاہے تو نہ کاٹے مگر قتل کر دے اور سولی چڑھا دے۔ ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں قتل ہر جرم پر لاگو ہوتا ہے

اسی طرح اوزاعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب وہ مال چھینے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے اور اسے داغ لگایا جائے، پھر اس کا بایاں پاؤں کاٹ کر داغ لگایا جائے اور اسے چھوڑ دیا جائے کیونکہ چوری کی سزا سے یہ جرم زائد ہوگا۔ جب وہ قتل کرے تو قتل کر دیا جائے اور جب وہ قتل کر کے مال بھی چھین لے تو اسے قتل کر کے سولی چڑھایا جائے۔ انہی سے مروی ہے کہ اسے تین روز تک سولی پر لٹکایا جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ شافعی رحمہ اللہ کے قول کی طرح فرماتے ہیں کہ اگر وہ قتل کرے تو قتل کیا جائے اور اگر مال چھینے تو ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں۔

ان تفاصیل کی کتاب وسنت کی کسی دلیل سے میں واقف نہیں ہو سکا سوائے اس روایت کے جو ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بیان کی اور وہ اس روایت کو بیان کرنے میں اکیلے ہیں اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں' عبدالملک بن مروان نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو اس آیت کے بارہ میں سوال کرنے کے لئے لکھا، تو سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے جواباً یہ لکھا کہ یہ آیت قبیلہ عرینہ کے اس گروہ کے بارہ میں نازل ہوئی، جو بجیلہ کے مقام پر تھے' وہ مرتد ہو گئے' انہوں نے چرواہوں کو قتل کر دیا، اونٹ ہانک کر لے گئے، راستوں کو خوف زدہ کر دیا اور انہوں نے بدکاری کا ارتکاب بھی کیا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ جنگ کی ان کے فیصلہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا؟ تو انہوں نے فرمایا جو چوری کرے' راستے کو خوف زدہ کرے تو اس کا ہاتھ چوری کی وجہ سے کاٹ دو اور پاؤں خوف زدہ کرنے کی وجہ سے کاٹ دو اور جو قتل کرے تو اسے قتل کر دو اور جو قتل کرے' راستہ خوف زدہ کرے' حرام شرمگاہ کو حلال جان لے، تو اسے سولی پر لٹکا دو۔

یہ سند باوجود اس کے کہ اس میں سخت نکارت (جہالت) پائی جاتی ہے اور اس کی صحت بھی معلوم نہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں ان تفصیلات کو جو ہم نے ذکر کیں ان میں سے کچھ ذکر کر کے ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ ان تفصیلات کی گواہ وہ حدیث ہے جو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں بیان کی اگر اس کی سند صحیح ہو تو پھر یہ حدیث ذکر کی۔

وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا۔ ''اور زمین میں فساد کرتے پھریں۔'' یہ مصدر ہونے کی وجہ سے یا مفعول لہ ہونے کی وجہ سے یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یہ تاویل کریں تو یعنی فساد کرنے والے۔ أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا۔ ''کہ وہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں۔'' اس آیت سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ انہیں سولی پر زندہ ہی لٹکایا جائے حتیٰ کہ وہ اسی حالت

میں مر جائیں کیونکہ یہ ان سزاؤں میں سے ایک سزا ہے جن کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اختیار دیا ہے۔
ایک قوم کا کہنا ہے کہ قتل کرنے کے بعد سولی پر لٹکایا جائے گا کیونکہ قتل سے پہلے سولی پر لٹکانا جائز نہیں، اس طرح اس کے اور اس کی نماز کے درمیان یہ سولی حائل ہو سکتی ہے اور کھانے پینے میں بھی رکاوٹ بن سکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ سزا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے بندوں کے لئے قانون بنا کر نافذ کر دیا ہے۔

اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ ۔ ''یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔'' اس سے ظاہر ہوا کہ مخالف جانب سے پاؤں اور ہاتھ ایک ایک ہی کاٹنا ہے گو دایاں یا بایاں ہاتھ یا پاؤں پہلے سے کٹا ہوا ہو، یہ سزا اس وقت معتبر ہوگی جب یہ مخالف جانب سے ہو یا تو دائیں ہاتھ کے ساتھ بایاں پاؤں ہو یا بائیں ہاتھ کے ساتھ دایاں پاؤں ہو۔
ایک قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ صرف دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے۔

اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۔ ''یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔'' مفسرین نے اس کے معنیٰ میں اختلاف کیا ہے، سدی کہتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ سوار اور پیدل مسافروں کو بلایا جائے، پھر اسے پکڑ کر اس پر حد قائم کی جائے یا اسے دارالسلام سے خوف زدہ کر کے بھگا دیا جائے۔ یہ موقف سیدنا ابن عباس، سیدنا انس رضی اللہ عنہم امام مالک، حسن بصری، سدی، ضحاک، قتادہ، سعید بن جبیر، ربیع بن انس اور زہری رحمہ اللہ سے ربانی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اسے ایک شہر سے دوسرے شہر میں نکال دیا جائے اور اس پر حد قائم کرنے کے لئے تلاش کیا جائے، یہی بات لیث بن سعد نے کہی۔

امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جس شہر میں اس نے جرم کیا ہے تو اسے وہاں دوسرے شہر کی طرف منتقل کر دیا جائے اور وہاں زانی کی طرح قید کیا جائے۔ اسے ابن جریر اور قرطبی رحمہما اللہ نے راجح قرار دیا ہے۔ اہل کوفہ کہتے ہیں کہ ان کو جلا وطن کرنا ہی ان کی قید ہے، انہیں دنیا کی وسعت سے تنگی کی جانب نکالا جائے۔ آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اس زمین سے دھتکارا جائے جس میں اس نے یہ جرم کیا، نہ تو اسے جیل میں دھکیلا جائے اور نہ ہی کسی اور جگہ بھگایا جائے، نکالنا بھی تو ہلاکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں یہ مراد نہیں۔

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا ۔ ''یہ تو ہوئی ان کی دنیوی ذلت اور خواری۔'' یہ گذشتہ احکام کی طرف اشارہ ہے۔ رسوائی ذلت وخواری کو کہتے ہیں۔ وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۞ ''اور آخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب ہے۔ ہاں جو لوگ اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پا لو تو یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑی بخشش اور رحم کرنے والا ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گذشتہ سزاؤں کے مستحق عام لوگوں سے ان توبہ کرنے والوں کو جو قید ہونے سے پہلے توبہ کر لیں مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خون مال یا ان کے علاوہ دوسرے گناہ جو معین حدود کی سزاؤں کو لازم کرتے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں، پس قید ہونے سے پہلے توبہ کرنے والے سے کسی سزا کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور اسی پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ہے۔ بعض اہل علم کا موقف ہے کہ اس سے قصاص اور لوگوں کے تمام حقوق قید ہونے سے پہلے توبہ کے ذریعہ ساقط نہ ہوں گے، درست بات پہلی ہے۔ البتہ قید ہونے کے بعد توبہ کرنا آیت میں مذکورہ سزاؤں کو موقوف نہیں کرے گی، اس کی دلیل گرفتاری سے قبل توبہ کی قید ہے۔

قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل علم کا اجماع ہے کہ حاکم جنگجو کا ذمہ دار اور ولی ہے اگر لڑنے والا کسی کے بھائی کو قتل کر دیتا ہے اور یہ اس کے پاس دوران لڑائی آتا ہے، تو خون کا بدلہ لینے والے کیلئے اس لڑائی میں سے کچھ نہیں اور نہ ہی خون کے ذمہ دار سے درگذر کرنا جائز ہے۔

مضمون نمبر: ۱۰

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بتایا کہ علانیہ مال لوٹنے والا جنگجو ہے تو اس کے فوراً بعد ذکر کیا کہ پوشیدہ مال لینے والا چور ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا۔ (۳۸)

''چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دیا کرو، یہ بدلہ ہے اس کا جو انہوں نے کیا۔''

اللہ تعالیٰ نے چور مرد کے ساتھ چوری کرنے والی عورت کا ذکر مزید وضاحت کے لئے کر دیا کیونکہ قرآن مجید میں اکثر اوقات شرعی احکام کے ذکر میں مردوں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے، نحو کے ائمہ نے چوری کرنے والے مرد وعورت کی اس خبر کے بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ آیا وہ پوشیدہ ہے یا فَاقْطَعُوْٓا ہے؟ پہلا موقف سیبویہ کا ہے، وہ کہتے ہیں، اس کی تقدیر یوں ہے ''فیما فرض علیکم' یا فیما یتلی علیکم السارق والسارقة ای حکمهما'' یعنی اس چیز میں جو کہ تم

پر فرض ہوئی یا اس سے جو تم پر پڑھی جاتی ہے، وہ ہے چوری کرنے والے مرد و عورت، یعنی یہ ان کا حکم ہے۔ مبرد اور زجاج دوسرے قول کے حامی ہیں۔ فاء آنے کی وجہ ہے کہ مبتدا شرط کے معنی کو بھی شامل کر لے تو اس وقت عبارت اس طرح ہوگی "الذی سرق والتی سرقت فاقطعوا" یعنی معنی یہ ہوگا کہ وہ مرد جو چوری کرے اور وہ عورت جو چوری کرے۔

اسے "السارق والسارقة" پر نصب بھی پڑھا ہے، اس کی تقدیر ہوگئی اِقْطَعُوْا اس قراءۃ کو سیبویہ نے راجح قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں عرب کی کلام میں نصب پڑھنا عام ہے جیسا کہ آپ کہتے ہیں زیدا یعنی اضرب لیکن عام قراء حضرات اس قراءۃ کا انکار کرتے ہیں اور اسے مرفوع پڑھتے ہیں۔

راء پر زیر پڑھیں تو چوری ہونے والی چیز کا نام ہے اور یہ 'سرق یسرق سرقا' کا مصدر بھی ہے۔ یہ جوہری کا قول ہے۔ اس کا معنی ہے آنکھوں سے چھپ کر کسی چیز کو پکڑنا اور اسی معنی میں استرق اسمع وسارقة النظر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کو جمع اس لیے لایا گیا ہے کہ دو تثنیہ کو جمع کرنا مکروہ ہے۔ سنت مطہرہ نے یہ بات واضح کردی کہ کاٹنے کی جگہ کلائی ہے' ایک قوم کا کہنا ہے کہنی سے کاٹا جائے جب کہ خوارج کہتے ہیں کہ کندھے سے کاٹا جائے۔

چوری کے لئے ضروری ہے کہ وہ چوتھائی دینار یا اس سے زائد ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مال کسی محفوظ مقام پر ہو جیسا کہ یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے، جمہور علماء کا خیال ہے کہ دینار کا چوتھا حصہ معتبر ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر دس درہم کی چوری ہو تو قطع ید کا حکم لگا دیا جائے گا اور جمہور کا یہ موقف بھی ہے کہ مال کے محفوظ مقام پر ہونا بھی ضروری ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں' جب کپڑا گھر میں جمع کیا جائے (اور وہاں سے چوری ہو) تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔ فقہ اور حدیث کے شارحین نے چوری کی بحث کو بہت زیادہ لکھا ہے اور یہاں اس طوالت کا ذکر زیادہ مفید نہیں۔

جَزَآءً بِمَا كَسَبَا۔ یہ مفعول لہ ہے، یعنی بدلہ اور سزا کے لئے کاٹو یا محذوف فعل کا مصدر مؤکد ہے، یعنی یہ بدلہ ہے باء سببیہ اور ما مصدریہ ہے یعنی اس سبب یا موصول ہونے کی وجہ سے یعنی یہ سزا ہے اس جرم کی جو چوری کر کے کمایا ہے۔

مضمون نمبر:۱۱

فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ۔ (۴۲)

''اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں اختیار ہے، خواہ ان کے آپس کا فیصلہ کرو خواہ ان کو ٹال دو۔''

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیں یا ان سے مونہہ موڑ لیں، اسی سے مسلمان حکمرانوں کے بارہ میں استدلال کیا گیا ہے کہ وہ بھی ان دو باتوں میں صاحب اختیار ہیں۔ علماء کا اجماع ہے کہ مسلمان حاکم پر لازم ہے کہ جب مسلمان اور ذمی ان تک اپنا فیصلہ لے جائیں تو ان کے مابین فیصلہ کریں اور ذمیوں کے آپس کے اختلافات کے بارہ میں اختلاف ہے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ واجب ہے، جب کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس میں اختیار ہے اور وہ کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت فرمان الٰہی: وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ سے منسوخ ہے اور یہی قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما' مجاہد' عکرمہ' زہری' عمر بن عبدالعزیز اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ سے صحیح سند سے ثابت ہے اسے اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے اکثر علماء سے نقل کیا ہے۔

مضمون نمبر:۱۲

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۴۴)

''جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں۔''

مَنْ کا لفظ عام صیغوں میں سے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ کسی خاص گروہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر وہ شخص جو کسی فیصلہ کا ذمہ دار ہو۔ ایک قول ہے کہ یہ اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ مطلق کفار کے ساتھ خاص ہے کیونکہ مسلمان کبیرہ گناہ کر کے کافر نہیں ہوتا، ایک قول کے مطابق یہ اس بات پر محمول ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ اسے کمتر سمجھ کر یا اس کو حلال جان کر یا اس کا انکار کرتے ہوئے کیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ میں مَنْ کی طرف اشارہ ہے اور جمع اس کے معنی پر اعتبار کرتے ہوئے ہے اسی طرح هُمُ الْكٰفِرُوْنَ میں جمع کی ضمیر بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ فریانی سعید بن منصور' ابن منذر' ابن ابی حاتم' حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس فرمان باری تعالیٰ کے بارہ میں

روایت بیان کی، وہ فرماتے ہیں یہ وہ کفر نہیں کہ جس سے یہ لوگ اس کفر تک پہنچ جائیں اور یہ ایسا بھی کفر نہیں جو ملتِ اسلام سے خارج کر دے، بلکہ یہ اس کفر سے کمتر کفر ہے۔

عبد بن حمید اور ابن منذر' عطاء بن ابی رباح سے اس فرمان الٰہی اور **هم الظالمون** اور **هم الفاسقون** کے بارہ میں بیان کرتے ہیں کہ یہ اس کفر سے اس ظلم سے اس فسق سے کمتر ہیں۔

مضمون نمبر: ۱۴۳

وَ كَتَبْنَا۔ (۴۵) "اور ہم نے مقرر کر دیا۔"

اس کا معنی ہے ہم نے فرض کر دیا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ ۔ یہودیوں کے ذمہ اس میں۔ "یعنی تورات میں۔ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔ "کہ جان کے بدلے جان ہے۔"

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو فرائض قصاص کی صورت میں مقرر تھے انہیں بیان فرمایا' کہ قصاص جان آنکھ' ناک' کان' دانت اور دوسرے زخم کے بدلہ میں ہے۔

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اہل علم کی ایک جماعت نے اس آیت سے دلیل لی ہے کہ مسلمان کو ذمی کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا کیونکہ وہ بھی ایک جان ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اہل علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ ہم سے پہلے قانون شریعت کی خبر ہے نہ کہ یہ ہمارے لئے قانون ہے۔

اس کی تفصیل ہم سورۂ بقرہ کی اس آیت **کتب علیکم القصاص فی القتلی** کی شرح میں کافی ذکر کر آئے ہیں۔ اہل علم نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ ہم سے پہلی شریعت ہم پر بھی لازم ہے یا نہیں؟ جمہور کا موقف ہے کہ ہم پر لازم ہے جب کہ وہ منسوخ نہ ہو' یہی بات حق اور درست ہے۔ ابن الصباغ نے الشامل میں علماء کا اجماع ذکر کیا ہے کہ اس آیت سے ان مسائل پر دلیل لینا قابل حجت ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں' تمام ائمہ نے دلیل لی ہے کہ اس آیت کریمہ کے عمومی حکم کی وجہ سے مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا۔

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی منتقی کی شرح وغیرہ میں جو حق اور درست بات ہے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس آیت میں یہودیوں کو ڈانٹ ڈپٹ ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر تورات میں لازم کیا تھا یہ اس کی مخالفت کرتے تھے جیسا کہ ابھی بیان ہوا اور وہ جانوں کو فضیلت دیتے تھے جیسا کہ ابھی ذکر ہوا۔ وہ لوگ بنو نضیر کا بدلہ بنو قریظہ سے لیا کرتے اور بنو قریظہ کا بدلہ بنو نضیر سے نہ لیتے۔

وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ۔ "آنکھ کے بدلہ میں آنکھ۔" قرآن کریم کے ظاہری اسلوب سے تو یہی

معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی کی آنکھ اس حد تک پھوڑ دی جائے کہ اس میں دیکھنے کی قوت ہی باقی نہ رہے تو اس کے بدلہ میں مجرم کی آنکھ بھی پھوڑی جائے گی۔

وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ ۔ "ناک کے بدلہ میں ناک۔" جب سارا کاٹ دیا جائے تو مجرم کا ناک بھی اس کے بدلہ میں کاٹا جائے گا۔ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ ۔ "کان کے بدلہ میں کان۔" جب سارا کاٹ دیا جائے تو اس کے بدلہ میں مجرم کا کان بھی کاٹا جائے گا۔ اسی طرح وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۔ "دانت کے بدلہ میں دانت۔" البتہ اگر اس جرم سے آنکھ کا کچھ دیکھنے کا حصہ یا کچھ ناک یا کان یا دانت ضائع ہو تو اس آیت میں اس کے قصاص کوئی دلیل نہیں۔

اہل علم کا اس بارہ میں اختلاف ہے جب اس کی مقدار معلوم ہو اس کی حقیقت کا ادراک ممکن ہو علماء کے اقوال فروعی کتابوں میں مرتب ہیں۔ السِّنَّ بِالسِّنِّ سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ سامنے کے چار دانت اور کچلیاں اور ڈاڑھیں اور کچلیوں اور سامنے کے چار دانتوں کے درمیان والے چار دانت، ان میں کوئی فرق نہیں' ایک کے بدلہ میں دوسرا توڑا جا سکتا ہے ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں' یہی موقف اکثر اہل علم کا ہے جیسا کہ ابن منذر رحمہ اللہ نے کہا۔ جب کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے متبعین نے اس بات کی مخالفت کی ہے، ان کا موقف اپنی جگہ پر موجود ہے ،لیکن مناسب یہ ہے کہ مجرم سے اسی دانت کے مقابل والا دانت توڑا جائے جو اس نے اس شخص کا توڑا ہے اگر وہ پہلے ٹوٹا ہوا ہے تو اس کے ساتھ والا توڑا جا سکتا ہے۔

وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۔ "زخموں کا بھی قصاص ہے۔" یعنی یہ زخم بھی بدلے والے ہیں۔ اہل علم نے بیان کیا ہے کہ ان زخموں میں قصاص نہیں جن سے فوت ہونے کا خدشہ ہو اور نہ ہی ان میں قصاص لینا درست ہے، جن کی گہرائی لمبائی یا چوڑائی کی مقدار معلوم نہ ہو۔ فقہاء ائمہ نے ہر زخم کا معلوم مقدار میں تاوان مقرر کیا' ہے' یہ مقام ان اقوال کے ذکر کرنے کا نہیں اور نہ ہی اس مقدار کو پوری طرح نقل کرنے کی یہ جگہ ہے۔

فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۔ "پھر جو شخص اس کو معاف کر دے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے۔" یعنی جس نے قصاص کے حقدار کو قصاص معاف کر دیا اس طرح کہ مجرم کو معاف کر دیا تو یہ صدقہ کرنے والے کے لئے کفارہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہ معاف کر دیں گے۔ ایک قول کے مطابق یہ مجرم کے لئے کفارہ ہوگا اس سے آخرت میں اس کا بدلہ نہ لیا جائے گا' کیونکہ درگذر اور معافی یہ اپنا حق لینے کے قائم مقام ہے' پہلی بات زیادہ راجح ہے کیونکہ

ضمیر دوسری تفسیر کے مطابق غیر مذکور کی طرف لوٹتی ہے۔

مضمون نمبر:۱۴

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۴۸)

"اس لئے آپ ان کے آپس کے معاملات میں اسی اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب کے ساتھ حکم کیجئے۔"

یعنی جو اس نے آپ کی طرف قرآن میں نازل فرمایا: اس کے مطابق فیصلہ کریں، کیونکہ قرآن مجید ان تمام مسائل پر مشتمل ہے۔ جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سابقہ کتب میں بیان فرمائے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر شریعت نازل فرمائی۔ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ "ان کی خواہشات کے پیچھے نہ جایئے" یعنی سابقہ ملتوں کی خواہشات کے۔ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔ "جو آپ کے پاس حق آیا اس سے ہٹ کر۔" یہ لَا تَتَّبِعْ کے متعلق ہے کیونکہ وہ معنوی اعتبار سے لَا تَعْدِلْ میں شامل ہے، یا اس کا معنی ہے کہ آپ حق سے روگردانی کرتے ہوئے ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔

ایک قول کے مطابق یہ محذوف کے متعلق ہے یعنی تو ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر انکار کرتے ہوئے یا حق سے مونہہ موڑتے ہوئے۔ اس میں آپ ﷺ کو روکا گیا ہے کہ آپ اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی کریں اور اس حق کا انکار کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ پہ اتارا ہے، کیونکہ ہر ایک ملت یہ چاہتی ہے کہ معاملہ اس طرح ہو جس پر وہ ہیں اور جس پر انہوں نے اپنے پہلے لوگوں کو پایا ہے، اگرچہ وہ باطل اور منسوخ ہے یا اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل کردہ حکم میں تحریف ہو چکی ہے جیسا کہ رجم وغیرہ جیسے مسائل ہیں، جن کو انہوں نے کتاب اللہ سے تحریف کر کے مسائل کو غلط رنگ دیدیا ہے۔

مضمون نمبر:۱۵

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ۔ (۸۷)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو۔"

الطیبات کہتے ہیں ان لذیذ چیزوں کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے حلال کی ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایمان والوں کو روکا ہے کہ وہ اپنے اوپر ان میں سے، یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کا تقرب حاصل ہوگا، کسی چیز کو حرام نہ کریں اور یہ دنیا سے بے رغبتی، نفس اور خواہشات کو کچلنے والی بات ہے یا اس ارادہ سے کہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حلال کردی ہے اسے خود پر حرام کرنے کے لئے جیسا کہ بہت سارے عوام اپنی اس بات سے اظہار کرتے ہیں کہ یہ مجھ پر حرام ہے یا میں نے اسے اپنے اوپر حرام کردیا ہے وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ بھی اس قرآنی نہی میں داخل ہیں۔

ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے حلال کی ہے اسے وہ خود پر حرام کرلے مثلاً عمدہ اور لذیذ لباس، کھانے، اور نکاح اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے دنیا سے بے رغبت ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت نہ دی، تو اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے بندوں کے لئے حلال کیا ہے اسے چھوڑنے میں کوئی فضیلت نہیں' فضیلت اور نیکی اس بات میں ہے کہ جو کام اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے مستحب رکھے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر عمل بھی کیا ہے، انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کیلئے مسنون قرار دیا ہے اس لیے ان پر عمل کیا جائے اور آپ کے طریقہ پر چلتے ہوئے ہدایت یافتہ ائمہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے پیروی کی' جبکہ سب سے اچھی راہنمائی ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

تو جب بات اس طرح ہے تو ان کی غلطی واضح ہوگئی جو روئی اور کاٹن کے کپڑوں پر بالوں اور اون کے کپڑوں کو ترجیح دیتے ہیں جبکہ اس لباس پر حلال طریقہ سے قدرت رکھتا ہے اور اس نے معمولی کھانے کو ترجیح دی گوشت وغیرہ چھوڑ کر اس ڈر سے کہ اس طرح عورت کی حاجت ہوگی، آپ فرماتے ہیں اگر کوئی ہمارے کہے کے علاوہ میں زیادہ فضیلت کا گمان رکھے اس لئے کہ معمولی لباس اور معمولی کھانا یہ نفس پر مشقت ہے اور جو رقم ان سے زائد ہوا سے ضرورت مندوں میں تقسیم کرنا یا اطاعت ہے تو اس کا یہ گمان غلط ہے۔

یہ زیادہ مناسب ہے کہ انسان خود اپنی اصلاح کرے اور اپنے رب کی بات ماننے، اس کا مددگار بنے لہٰذا جسم کو ردی قسم کے کھانوں سے تکلیف میں مبتلا کرنے کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ یہ عقل کو خراب کرتی ہے اور اس کے نتیجہ میں انجام دینے والے اعمال میں کمزوری واقع ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کا سبب رکھا ہے۔

مضمون نمبر:١٦

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ۔ (٨٩)

''اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں لغو قسم پر مواخذہ نہیں فرماتا۔''

سورہ بقرہ میں لغو کی تفسیر اور اس میں اختلاف کا ذکر ہو چکا۔ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ يُؤَاخِذُكُمْ کا صلہ ہے۔ فِيْ مِنْ کے معنی میں ہے اور اَيْمَانٌ يَمِيْنٌ کی جمع ہے اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ لغو قسموں پر اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں کرے گا اور نہ ان میں کفارہ لازم آتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور ان کے بعد جمہور علماء کا موقف ہے کہ آدمی کا لَا وَاللّٰهِ اور بَلٰى وَاللّٰهِ دوران گفتگو کہنا یہ اعتقادی قسم نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس آیت کی تفسیر یہی بیان فرمائی اور وہ سب سے زیادہ قرآن کے معانی کو جانتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جھگڑے، غصہ اور جلد بازی میں اٹھائی گئی قسم کا نام لغو ہے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ۔ ''لیکن مواخذہ اس پر فرماتا ہے کہ تم جن قسموں کو مضبوط کر دو۔'' عقد کی دو قسمیں ہیں، ایک حسی ہے جیسا کہ رسی کی گرہ اور دوسری حکمی ہے جیسے قسم اور سوداگری کی گرہ۔ پس قسم وہ ہوگی جو دل میں گرہ باندھی جائے کہ وہ ایسا مستقبل میں ضروری کرے گا یا ایسا نہیں کرے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری ان قسموں پر مؤاخذہ کرے گا جو پختہ ارادہ اور نیت سے باندھو گے جب تم اس بارہ میں قسم اٹھاؤ۔ البتہ جھوٹی قسم وہ ہے جو مکر دھوکہ اور جھوٹ کے لئے اٹھائی جائے۔ قسم اٹھانے والا گنہگار ہوگا اور یہ قسم باندھی نہ جائے گی اور نہ اس میں کفارہ ہوگا جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ بھی باندھی ہوئی قسم ہے یہ بھی دل کے عمل سے منعقد ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام سے ملی ہوئی نہیں۔ راجح بات پہلی ہے۔ وہ تمام احادیث جو قسم کے کفارہ کے بارہ میں منقول ہیں ان سے وہی قسم مراد ہے جو دل سے اٹھائی جائے، اور ان میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جو جھوٹی قسم پر دلالت کرے بلکہ جو کچھ جھوٹی قسم کے بارے میں آتا ہے وہ وعید ہے اور ڈراوا ہے کہ یہ کبیرہ گناہ ہے اسی کے متعلق فرمان الٰہی اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ہے۔

فَكَفَّارَتُهٗ "اس کا کفارہ۔" یہ تکفیر سے لیا گیا ہے، اس کا معنی ہے چھپانا، اسی طرح کفر کا معنی بھی چھپانا ہے اور کافر چھپانے والا کیونکہ وہ گناہ کو چھپاتا اور ڈھانپتا ہے۔ کفارتہ میں ضمیر بِمَا عَقَّدْتُّمُ کی طرف لوٹتی ہے۔

اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ "دس محتاجوں کو درمیانہ درجہ کا کھانا دینا ہے، جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔" یہاں اوسط سے مراد دونوں اطراف سے درمیانہ ہو، اسراف بھی نہ ہو اور کمی بھی نہ ہو اس سے مراد اعلیٰ قسم کا کھانا نہیں جیسا کہ اس جگہ کے سوا یہ بات مذکور ہے، یعنی ان کو اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے گھر والوں کو کھانا کھلاتے ہو، تم پر لازم نہیں کہ انہیں ان سے اچھا کھانا کھلاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ ان سے ادنیٰ درجہ کا کھانا کھلاؤ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس آدمیوں کے لیے اتنا کھانا کافی ہے کہ جس سے وہ سیر ہو جائیں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دس آدمیوں کو صرف ایک وقت کا کھانا کھلانا ہی کافی نہیں بلکہ انہیں دو پہر اور شام دونوں وقت کا کھانا کھلائیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں یہی شہروں کے ائمہ کا فتویٰ ہے۔ حسن بصری اور ابن سیرین رحمہما اللہ کہتے ہیں دس مسکینوں کو ایک وقت روٹی اور گوشت کھلا دینا کافی ہے۔

سیدنا عمر بن خطاب، ام المومنین سیدہ عائشہ رضوان اللہ علیہم، مجاہد، شعبی، سعید بن جبیر، ابراہیم النخعی، میمون بن مہران، ابو مالک ضحاک، حکم، سیدنا مکحول، ابوقلابہ اور مقاتل رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ دس افراد کے لیے آدھا صاع گندم یا کھجور بھجوا دیں۔ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی مروی ہے۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں آدھا صاع گندم اور اس کے علاوہ کسی چیز کا ایک صاع دیدیں۔

ابن ماجہ اور ابن مردویہ رحمہما اللہ، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کا ایک صاع کفارہ دیا اور لوگوں نے بھی اسی مقدار میں کفارہ دیا اور جو اس کی طاقت نہ پائے، تو وہ آدھا صاع گندم کا دے، اس کی سند میں عمر بن عبداللہ الثقفی ہے جس کے ضعف پر اجماع ہے۔ دار قطنی کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے۔

اَوْ كِسْوَتُهُمْ "یا ان کو کپڑے دینا۔" اس کا عطف کھانے پر ہے اسے ك کے ضمہ اور کسرہ سے پڑھا گیا ہے یہ دونوں لغت ہیں، جیسے اُسوۃ اِسوۃ بولا جاتا ہے۔ مردوں میں کپڑے کی مقدار ہے جس سے بدن چھپ جائے اگرچہ وہ ایک کپڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح عورتوں کو۔

اس سے آدھا کپڑا دیں، ایک قول کے مطابق عورتوں کو دوپٹہ اور قمیص ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد اس قدر کپڑا ہے جس سے نماز ادا کرنا جائز ہو۔

اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ۔ ''یا ایک غلام یا لونڈی آزاد کرنا ہے۔'' آزاد کرنے سے مراد غلامی سے نکالنا ہے اور یہ آزادی قیدیوں کو چھوڑنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے اور مشقت میں پھنسے ہوئے شخص کو اس کے کام سے معاف کر دینا اور اس سے تکلیف دور کر دینا ہے۔ اہل علم کے ہاں اس گردن کے بارے میں جس کا کفارہ کفایت کرے گا۔ بہت سی مباحث ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر قسم کی گردن کا کفارہ کفایت کر جائے گا، خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ایک جماعت جن میں امام شافعی رحمہ اللہ بھی ہیں کا موقف ہے کہ ایمان شرط ہے کسی کے آزاد کرنے میں، وہ یہ قتل کے کفارہ پر قیاس کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ۔ ''اور جس کی طاقت نہ ہو تو اس کے لیے تین دن کے روزے ہیں، یعنی جو مذکورہ کاموں میں سے کچھ کرنے کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا کفارہ تین دن کے روزے ہیں۔ ایک قراءۃ کے مطابق مُتَتَابِعَاتٍ یعنی لگاتار روزے رکھے بھی آیا ہے۔ یہ قراءۃ سیدنا ابن مسعود اور سیدنا ابی بن کعب سے منقول ہے۔ پس یہ قراءۃ روزے کے اطلاق کو مقید کرتی ہے، یہی ابوحنیفہ اور ثوری رحمہما اللہ کا قول ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے دو اقوال میں سے ایک ہے۔

امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ اپنے دوسرے قول کے مطابق فرماتے ہیں کہ الگ الگ رکھنا بھی جائز ہے۔

ذٰلِکَ کَفَّارَةُ اَیْمَانِکُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ۔ ''یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب کہ تم قسم اٹھالو۔'' یعنی یہ مذکورہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم اٹھالو۔ وَاحْفَظُوْٓا اَیْمَانَکُمْ۔ ''اور اپنی قسموں کا خیال رکھو۔'' اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ قسموں کی حفاظت کرو اور ان کو توڑنے میں جلد بازی نہ کرو۔

مضمون نمبر: ۱۷

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا۔ (۹۰)

''اے ایمان والو!''

یہ تمام مومنوں سے خطاب ہے۔ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ "بات یہ ہے کہ شراب اور جوا" جوئے کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گذر چکی۔ وَ الْأَنْصَابُ "اور تھان" وہ بت جو عبادت کے گاڑے جاتے ہیں۔ وَ الْأَزْلَامُ اور فال نکالنے کے پانسے کے تیر۔ اس کی تفسیر بھی اسی سورہ میں گذر چکی ہے۔ رِجْسٌ گندی باتیں ہیں۔ یہ لفظ پاخانہ اور گندگی دونوں پر بولا جاتا ہے۔ یہ خمر کی خبر ہے اور معطوف علیہ کی خبر محذوف ہے۔ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ۔ شیطانی کام ہیں۔ یہ رجس کی صفت ہے، یعنی یہ شیطانی کاموں میں سے ہیں، اس لئے کہ شیطان انہیں خوبصورت اور مزین کر کے پیش کرتا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد خود وہ کام ہے جس کے پیچھے اولاد آدم چلتی ہے۔ فَاجْتَنِبُوهُ "ان سے الگ رہو" میں ضمیر رجس کی طرف لوٹتی ہے یا مذکورہ تمام اشیاء کی طرف لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ "تاکہ تم فلاح یاب ہو۔" یہ ماقبل کی علت ہے۔

امام زمخشری رحمہ اللہ کشاف میں فرماتے ہیں کہ شراب اور جوے کی حرمت کو کئی ایک وجوہات کی بنا پر موکد کیا ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ اس جملہ کی ابتداء اِنَّمَا سے کی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انہیں بتوں کی عبادت کے ساتھ ذکر کیا، اسی معنی میں آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ شرابی بتوں کی عبادت کرنے والے کی طرح ہے تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو 'رجس' گندگی قرار دیا جیسا کہ فرمایا "فاجتنبوا الرجس من الاوثان" یعنی تم بتوں کی گندگی سے بچو۔ چھٹی وجہ یہ ہے کہ انہیں شیطانی عمل قرار دیا کہ شیطان سے صرف برائی ہی صادر ہوتی ہے۔ پانچویں وجہ ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے پرہیز کرنے کا حکم دیا۔ چھٹی وجہ یہ ہے کہ اس اجتناب کو کامیابی قرار دیا اور جب اجتناب کامیابی ہے، یہ ہے تو اس کو اپنانا رسوائی اور بدنامی کا باعث ہوا۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ ان کے نتیجہ میں وبال آتا ہے جو دشمنی اور بغض پیدا کرتا ہے شرابیوں اور جوا بازوں کے درمیان اور یہ دونوں یہ ہے، انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے روکتے ہیں اور نماز کو اپنے اوقات سے لیٹ کراتے ہیں۔

یہ آیت شراب کی حرمت کی دلیل ہے اس لئے کہ یہ ان باتوں میں شامل ہے جن سے پرہیز کا حکم دیا گیا جو وجوب سے ہے اور ذکر اللہ سے روکنے کی حرمت ہے جب شریعت میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ گندگی کے قریب بھی نہیں جانا تو کہاں یہ کہ اسے شراب بنا کر پیا جائے۔

اہل علم مفسرین وغیرہ کا کہنا ہے کہ شراب کی حرمت تدریجاً ہوئی اور مختلف اوقات میں اس کی حرمت نازل ہوئی، اس لئے کہ وہ اسے پینے سے بہت مانوس تھے اور شیطان نے ان کے دلوں

میں پسندیدہ کر دیا تھا تو اس بارہ میں جو پہلی آیت یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ نازل ہوئی۔ اس پر کچھ مسلمانوں نے اسے پینا چھوڑ دیا اور کچھ نے نہ چھوڑا' تو پھر آیت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى۔ نازل ہوئی پھر کچھ نے چھوڑ دی اور کہنے لگے کہ جو ہمیں نماز سے مشغول کر دے اس کی ہمیں ضرورت نہیں اور کچھ لوگ نماز کے علاوہ اوقات میں پینے لگے، تو پھر آیت اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ نازل ہوئی تو یہ ان پر حرام ہو گئی حتیٰ کہ ان میں سے بعض لوگ کہنے لگے، اللہ تعالیٰ نے شراب سے زیادہ سخت حرمت کسی کی نہیں اتاری۔

یہ بات اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس شدت کو بھانپ لیں جو اس آیت میں ڈانٹ موجود ہے اور ان چیزوں سے بھی جو صحیح احادیث میں شراب نوشی کی وعید کے بارہ میں آتا ہے اور یہ بڑے گناہوں میں سے ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اسے بیچنا فائدہ حاصل کرنا بھی حرام ہے جب تک یہ شراب ہے۔ جس طرح یہ شراب کی حرمت پر بھی دلالت کرتی ہے اسی طرح جوئے تھان' پانسے کے تیر کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔

اس کے شان نزول کے بارہ میں بہت سی روایات منقول ہیں جو ہمارے ذکر کردہ موقف کے مطابق ہیں اور اسی طرح بہت سی احادیث شراب اور شرابی کی مذمت کے بارہ میں بھی منقول ہیں اور اس پر سخت وعید بھی منقول ہے اور یہ کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، یہ بات حدیث کی کتب میں لکھی ہوئی ہے اس جگہ انہیں بیان کر کے ہم طوالت نہیں اختیار کرنا چاہتے۔ اس پر ہم نے اپنی شرح "مسک الختام لبلوغ المرام" میں تفصیلاً گفتگو کی ہے اس کی طرف لوٹنا چاہیے۔

مضمون نمبر: ۱۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ۔ (۹۵)

"اے ایمان والو! شکار کو قتل مت کرو جب کہ تم حالت احرام میں ہو۔"

یہ حکم تمام مسلمان مردوں عورتوں کو شامل ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے "رجل حرام، امراة حرام" مرد عورت حرام ہو گئے ان کی جمع حرم آتی ہے اور آدمی نے احرام باندھ لیا اور وہ حرم میں داخل ہو گیا۔ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا۔ "اور جو تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا۔" "متعمد" کا معنی ہے کہ آدمی کسی چیز کا اس وقت ارادہ کرے جبکہ اسے اس کی

حرمت کا علم ہو جائے اور غلطی کرنے والا وہ ہے جو کسی دوسری چیز کا اس وقت ارادہ کرے اور شکار کر بیٹھے اور بھولنے والا وہ ہے جو شکار کا ارادہ کرے لیکن حالت احرام اسے یاد نہ ہو۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام احمد رحمہ اللہ انہی سے روایت کرتے ہوئے، داؤد نے دلیل لی ہے اس بات سے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صرف عمداً کرنے والے پر اقتصار کیا، یہ دلیل ہے کہ اس کے علاوہ کسی پر کفارہ نہیں بلکہ صرف اس اکیلے پر واجب ہے، یہی بات سعید بن جبیر' طاؤس اور ابو ثور نے کہی۔ ایک قول کے مطابق کفارہ غلطی کرنے والے اور بھولنے والے سب کو لازم ہے جیسا کہ جان بوجھ کر کرنے والے کو لازم ہے' انہوں نے عمداً کی اکثر اوقات کا خیال رکھتے ہوئے گلائی ہے۔ یہ بات عمر' حسن' نخعی' زہری' سے مروی ہے' یہی بات امام مالک' شافعی' ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ کہتے ہیں اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

ایک قول کے مطابق عمداً جان بوجھ کر کرنے اور بھولنے والے پر اس احرام کی وجہ سے کفارہ لازم ہے، یہی قول مجاہد کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر اسے یاد ہے کہ وہ حالت احرام میں ہے تو وہ حلال ہو گیا، اس کا حج نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس نے اس احرام میں گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو یہ احرام اس پر باطل ہو گیا جیسا کہ اگر وہ نماز میں کلام کرے یا اس کا وضو ٹوٹ جائے۔

فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ ۔ "تو اس پر فدیہ واجب ہوگا۔" جو کہ مساوی ہوگا اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا، یعنی اس کے ذمہ ہے جس جانور کا شکار کیا اس کے برابر جانور بدلہ میں دے' یہ وضاحت ہے کہ برابر کا جانور دے۔ ایک قول کے مطابق برابری سے مراد قیمت ہے اور ایک قول کے مطابق پیدائش، یعنی جسامت مراد ہے۔

پہلا موقف امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے اور دوسرا موقف امام مالک' شافعی' احمد اور جمہور ائمہ کا ہے' یہی درست ہے کیونکہ جانوروں کی مماثلت کا بیان اس بات کا تقاضا کرتا ہے۔ اسی طرح هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ ۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ برابر کی قیمت ادا کرنے کو جائز قرار دیتے اگر چہ اس جانور کی طرح کوئی موجود ہو اور یہ کہ محرم کو اختیار ہے فَجَزَآءُ مِّثْلِ مَا قَتَلَ ۔ بھی پڑھا گیا اور فَجَزَآءٌ مِّثْلُ بھی اس بنا پر پڑھا گیا ہے، کہ جزاء کی اضافت مثل کی طرف کریں تو يَحْكُمُ بِهِ ۔ "فیصلہ کریں اس کا۔" یعنی اس بدلہ کا یا قتل کی ہم مثل کا ذَوَا عَدْلٍ "دو عدل وانصاف والے۔" یعنی دو ایسے مرد جو اپنی عدالت نیکی میں مسلمانوں کے مابین معروف ہوں، جب وہ فیصلہ کر دیں گے تو لازم ہو جائے گا اور اگر وہ اختلاف کریں گے تو پھر کسی

دوسرے دو افراد کی طرف لوٹنا پڑے گا۔

گنہگار کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ فیصلہ کرنے والوں میں سے ایک خود ہو، جب کہ ایک قول کے مطابق جائز ہے۔ پہلی بات ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہی اور دوسری بات امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو اقوال میں سے ایک میں یہ بات کہی' آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گنہگار کے علاوہ دو فیصلہ کرنے والے لوگ ہوں۔

هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ۔ خواہ وہ فدیہ خاص چوپایوں میں سے ہو جو نیاز کے طور پر کعبہ تک پہنچا جائے۔ ہدیا کو منصوب حال یا مثل سے بدل ہونے کی وجہ سے پڑھا گیا اور بالغ الکعبۃ، ہدی کی صفت ہے کیونکہ یہ اضافت غیر حقیقی ہے، تو معنی یہ ہوا کہ جب وہ دونوں بدلہ کا فیصلہ کر دیں گے تو وہ اس کے ساتھ وہی کرے گا جو کسی قربانی کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی مکہ تک پہنچانا وہاں ذبح کیا جائے گا، نشان زدہ کیا جائے گا اور گلے میں پٹکا ڈالا جائے گا۔

یہاں بعینہ کعبہ مراد نہیں کیونکہ قربانی کعبہ میں تو نہیں کی جاتی، اس سے مراد حرم کا علاقہ ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اَوْ كَفَّارَةٌ۔ "یا کفارہ ہو۔" یہ النعم پر معطوف ہے اور وہ مرفوع ہے کیونکہ وہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ۔ "مسکینوں کو کھانا کھلا کر۔" یہ کفارہ کا عطف بیان ہے یا اس سے بدل ہے یا یہ بھی مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ۔ "یا اس کے برابر۔" یہ طعام پر معطوف ہے' ایک قول کے مطابق یہ جزاء پر معطوف ہے' اس موقف میں کمزوری ہے' اور مجرم ان مذکورہ اقسام میں اختیار ہے' کسی چیز کی برابری اس کی غیر جنس سے ہوتی ہے۔ صِيَامًا۔ "روزے رکھے۔" یہ تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ بعض علماء نے ہر شکار کے برابر کھانا اور روزے مقرر کیے ہیں اور جمہور علماء کا موقف ہے کہ مجرم کو ان مذکورہ اقسام میں اختیار ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ محرم کو کھانا اور روزہ کافی نہ ہوگا، ہاں اگر اسے قربانی نہ ملے۔ العدل کو عین کی زیر اور زبر دونوں سے پڑھا جا سکتا ہے، یہ دو لغات ایک جیسی ہیں، یہ بات کسائی نے کہی۔ فراء کہتے ہیں کسرہ سے پڑھنے پر معنی یہ ہوگا کہ "اس کی مثل اسی جنس سے" اور زبر سے پڑھیں تو معنی ہوگا "اس جنس کے علاوہ سے۔"

مضمون نمبر:۱۹

اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ۔ (۹۶) "اس میں اہل بصرہ بھی کسائی کے موافق ہیں"۔
"تمہارے لئے دریا کا شکار پکڑنا حلال کیا گیا ہے۔"

یہ خطاب عام مسلمانوں سے یا خاص احرام والوں سے ہے دریا کا شکار سے مراد یہ ہے کہ جو اس میں شکار کیا جائے اور یہاں دریا سے مراد ہے ہر وہ پانی ہے، جس میں دریائی شکار موجود ہو اگرچہ وہ کنواں یا جوہڑ ہو۔ وَ طَعَامُہٗ مَتَاعًا لَّکُمْ وَ لِلسَّیَّارَۃِ۔ "اور اس کا کھانا تمہارے اور مسافروں کے فائدہ کے لیے ہے" اور کھانا ہر اس چیز کا نام ہے جسے کھایا جائے' یہ بات پہلے گذر چکی ہے۔

یہاں اس کے معنی و مفہوم میں اختلاف کیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ: جسے سمندر باہر پھینک دے اور اوپر تیرنے لگے' یہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا کھانا وہ ہے جو نمکین ہو اور اس میں باقی رہے' ایک گروہ کا یہی خیال ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا کھانا اس کی ہر نمکین چیز جو اس پانی سے پیدا ہوتی ہے، وہ ہر قسم کی نباتات وغیرہ ہیں' یہ ایک جماعت کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ہے جو شکار کھایا جائے، یعنی جس کا کھانا حلال ہے اور وہ صرف مچھلی ہے، یہ قول احناف کا ہے۔

تو معنی یہ ہوا کہ تمہارے لئے ان تمام چیزوں سے جن کا شکار سمندر میں کیا جاتا ہے فائدہ حاصل کرنا حلال و جائز ہے اور کھانے میں تمہارے لئے صرف مچھلی حلال ہے تو یہ عام حکم کے بعد خاص حکم آ گیا' اور (مصنف کے خیال میں) یہ ایسا تکلف ہے کہ جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

مَتَاعًا۔ کو منصوب اس لئے لائے کہ یہ مصدر مطلق ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ مفعول بہ ہے جو طعام کے ساتھ مختص ہے یعنی تمہارے لئے سمندر کا کھانا بطور فائدہ کے حلال کیا گیا ہے' یہ تکلف ہے جو دوسرے قول والے صاحب نے کیا ہے' بلکہ جب وہ مفعول لہ ہوگا تو یہ تمام سے ہوگا، یعنی تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے اور تمہارے لئے فائدہ کا سامان ہے، یعنی اس کے لئے جو تم میں سے مقیم ہو، وہ تازہ پکڑ کر کھائے۔

لِلسَّیَّارَۃِ۔ کا معنی ہے کہ جو تم میں سے مسافر ہو اس کا زاد راہ بنا لے اور اس کے ٹکڑے کر کے

رکھ لئے ایک قول کے مطابق السیارۃ سے مراد وہ لوگ خاص ہیں، جو اس پر سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

وَ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ صَیْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۔ "اور خشکی کا شکار پکڑنا تمہارے لئے حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم حالت احرام میں رہو" یعنی حالت احرام میں خشکی کا شکار تم پر حرام ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محرم پر یہ شکار حرام ہے اگر چہ شکاری حالت احرام میں نہ ہو، یہی جمہور کا موقف ہے مگر شرط یہ ہے کہ غیر محرم نے وہ شکار محرم کے لیے کیا ہو، البتہ جب اس کے لئے شکار نہیں کیا تو پھر یہ شکار محرم کے لئے بھی حلال ہوگا، یہی راجح قول ہے اور اسی کے مطابق احادیث میں تطبیق ممکن ہے ایک قول کے مطابق یہ مطلقاً حلال ہے، یہ موقف ایک جماعت کا ہے ایک قول کے مطابق اس پر مطلقاً حرام ہے اور کچھ دوسرے لوگ یہ موقف اپناتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسے اپنی شرح منتقی میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔

مضمون نمبر: ۴۰

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۔ (۱۰۵)

"اے ایمان والو! اپنی فکر کرو۔"

یعنی خود کو لازم پکڑو اور اس کی حفاظت کرو جیسا کہ آپ کہتے ہیں عَلَیْكَ زَیْدًا ۔ یعنی اسے لازم پکڑو۔ لَا یَضُرُّكُمْ ۔ "تمہیں نقصان نہیں۔" ایک قراءۃ میں مجزوم پڑھا گیا ہے اس بنا پر کہ یہ جواب امر ہے جو اسم فعل پر دلالت کرتا ہے۔ نافع رضی اللہ عنہ سے اس بنا پر مرفوع پڑھتے ہیں کہ یہ مستانفہ ہے یا راء پر ضمہ ضاد کی پیروی کرتے ہوئے پڑھتے ہیں اور ضاد پر کسرہ بھی پڑھا گیا ہے اور لَا یَضِیْرُكُمْ بھی ایک قراءۃ ہے۔

مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ۔ "جب تم راہ راست پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ رہے" یعنی تم اپنے آپ کی فکر کرو جب تم راہ راست پر ہو تو کسی گمراہ آدمی کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

اس آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کو ساقط کرے کیونکہ جس نے یہ مَا چھوڑ دیا باوجود اس کے کہ وہ دین کے اہم ترین فرائض کی بجا آوری کر رہا ہے تو وہ راہ راست پر نہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ فرماتے ہیں، قرآنی آیات اور بے شمار

احادیث امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے واجب ہونے کی دلیل ہیں جو اسے لازمی اور حتمی طور پر واجب کرتی ہیں' لہٰذا اس آیت کو ایسے افراد پر محمول کیا جائے گا جو اس واجب یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی کی طاقت نہیں رکھتے یا کسی خاص حالات میں اس کے اثرات کی امید نہیں یا ان کو اپنی جان کا ڈر ہے کہ وہ لوگ انہیں کوئی تکلیف پہنچائیں گے تو ایسے لوگوں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اسے چھوڑ دیں۔

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ "اللہ تعالیٰ ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے پھر وہ تم سب کو بتلا دے گا جو کچھ تم سب کرتے رہے۔" یعنی دنیا میں جو کچھ تم کرتے رہے تھے، تو اب اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والے کو اس کا بدلہ دے گا اور گناہ کرنے والے کو بھی اس کا بدلہ دے گا۔

ابن ابی شیبہ' احمد' عبد بن حمید' ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' ابن جریر' ابن منذر' ابن ابی حاتم' ابن حبان' دارقطنی اور مختارہ (ﷺ) میں قیس بن ابی حازم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے انہوں نے حمد وثناء کی اور فرمانے لگے: اے لوگو! تم یہ آیت: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ......... پڑھتے ہو، تم اس کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھتے، اور تحقیق میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے کہ "جب لوگ کسی برائی کو دیکھیں اور اسے تبدیلی (ختم کرنے کی کوشش) نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی کسی عذاب میں مبتلا کر دے۔' ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے، ابن ماجہ، ابن جریر اور بغوی نے اپنی معجم میں، ابن ابی حاتم، طبرانی، ابوالشیخ، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

ابن مردویہ اور بیہقی نے ابو امیہ شعبانی سے شعب الایمان میں نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں سیدنا ابوثعلبہ الخشنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس آیت کے بارہ میں کیا کہتے ہیں، انہوں نے کہا، کونسی آیت؟ میں نے کہا "یاایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اھتدیتم" تو انہوں نے کہا کہ خبردار فرمانے لگے البتہ اللہ کی قسم میں نے اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: بلکہ تم نیکی کا حکم دو برائی سے روکو حتیٰ کہ تو یہ حالات دیکھے کہ لالچ کی پیروی ہونے لگے اور خواہشات کی اتباع ہونے لگے اور دنیا کو ترجیح دی جانے لگے اور ہر ایک اپنے رائے کو پسند کرنے لگے تو پھر تو خود کو لازم پکڑ لے اور خود سے لوگوں کے معاملات دور کر دے' پس یقیناً تمہارے بعد صبر کے دن آنے والے ہیں

ان میں صبر کرنا انگارہ کو پکڑنے کے برابر ہوگا' ان دنوں میں عمل کرنے والے کا اجر پچاس آدمیوں کے برابر ہوگا جو تمہارے جیسا عمل کریں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ عامر اشعری اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم کہاں جا رہے ہو؟ اس کا معنی تو یہ ہے کہ کافروں میں سے جو گمراہ ہوا وہ تمہیں نقصان نہیں دے گا جب تم راہ راست پر ہو گے۔ اسے احمد' طبرانی' ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے روایت کیا۔

عبدالرزاق' سعید بن منصور' عبد بن حمید' ابن جریر' ابن منذر' طبرانی اور ابوالشیخ حسن رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے فرمان الٰہی عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ کے بارہ میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: اے لوگو! آج وہ زمانہ نہیں آج کے دن تو ایسے ہیں کہ نیکی کو قبول کیا جاتا ہے لیکن قریب ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے، تم نیکی کا حکم دو اور تمہارے ساتھ ایسا اور ایسا کیا جائے یا آپ نے فرمایا وہ تم سے قبول نہیں کیا جائے گا، اس وقت تم پر لازم ہے کہ اپنی حفاظت کرو' لا آیہ۔ انہی سے دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ "تم نیکی کا حکم دو برائی سے منع کرو جب تک کہ اس دور کی بجائے کوڑے اور تلوار کا دور آ جائے اور جب ایسا ہو تو تم اپنی حفاظت کرو"۔

ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہما اللہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا، یہ ایسی قوم کے بارہ میں ہے جو ہمارے بعد آئیں گے، اگر کوئی بات کہیں گے تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ ابن مردویہ رحمہ اللہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کے بارہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس ذکر ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس کی تفسیر کا ابھی وقت نہیں آیا اس کی تفسیر کا وقت وہ ہوگا، جب عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آئیں گے۔

اس مسئلہ میں بہت سی روایات منقول ہیں، اور جن کا ہم نے ذکر کر دیا وہ کافی ہیں' ان میں وہ دلائل موجود ہیں جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں کہ آیات اور احادیث جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارہ میں منقول ہیں، ان میں جمع اور تطبیق ہوگئی جیسا کہ یہ مسئلہ پہلے بیان ہوا ہے۔

مضمون نمبر: ۲۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ۔۔۔ (۱۰۶)

"اے ایمان والو!"

مکی نے کہا کہ یہ تینوں آیات اہل معانی کے نزدیک اعراب، معانی اور حکم کے لحاظ سے قرآن کریم کی سب سے مشکل آیات میں سے ہیں۔ ابن عطیہ کہتے ہیں یہ کلام ایسا ہے کہ کوئی بھی اپنی تفسیر میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا اور یہ مکی رحمہ اللہ کی کتاب سے واضح ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو بات مکی رحمہ اللہ نے ذکر کی یہی بات ان سے پہلے ابو جعفر النحاس نے بھی ذکر کی۔ سعد الدین کشاف کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ یہ مقام اعراب مفہوم اور حکم کے اعتبار سے سب سے مشکل ہے۔

شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ ۔ "تمہارا آپس میں دو آدمیوں کا گواہ ہونا۔" بین یعنی آپس کی ظرف گواہی کی اضافت وسعت کے اعتبار سے ہے کیونکہ یہ ذوی العقول میں جاری ہوتی ہے۔ ایک قول کے مطابق اصل یوں ہے کہ شَهَادَةُ مَا بَيْنِكُمْ تو ما حذف کر دیا گیا اسے ظرف کی طرف مضاف کر دیا، جیسا کہ فرمان الٰہی بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ہے اور اسی معنی میں یہ فرمان الٰہی هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ہے۔ ایک قول کے مطابق یہاں شہادت وصیت کے معنی میں ہے اور ایک قول کے مطابق وصیت سے بچنے کے معنی میں ہے۔

ابن جریر اور طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ یہاں قسم کے معنی میں ہے، تو معنی یہ ہوگا کہ "يمين ما بينكم ان يحلف اثنان" یعنی تمہاری آپس میں قسم یہ ہے کہ دو افراد قسم اٹھائیں۔ اس پر انہوں نے دلیل یہ لی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہیں جانتا جس میں گواہ پر قسم لازم ہو۔ یہ قول قفال نے پسند کیا ہے اور اسے ابن عطیہ نے کمزور قرار دیا ہے انہوں نے یہ بات اختیار کی کہ یہاں گواہی سے مراد وہی گواہی ہے جو شہادت کے وقت پیش ہوتی ہے۔

إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ۔ "جب کہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے۔" یہ ظرف ہے شہادت سے، اس سے مراد یہ ہے کہ جب اس کی موت کی نشانیاں نظر آنے لگیں کیونکہ جو فوت ہو گیا اس سے گواہی ممکن نہیں، مفعول کو مقدم اہتمام کی وجہ سے کیا اور نفس کے پاس فاعل پوری طرح موجود ہے۔

حِينَ الْوَصِيَّةِ ۔ "وصیت کرنے کا وقت ہو۔" یہ حضر یا موت کا ظرف ہے یا پہلے ظرف سے بدل ہے۔ اثْنَانِ "دو شخص۔" یہ محذوف تقدیر کی بنا پر شہادت کی خبر ہے یعنی دو کی گواہی یا یہ شہادت کا فاعل ہے اس بنا پر کہ اس کی خبر محذوف ہے، فيما فرض عليكم شهادة بينكم اثنان یعنی جس چیز میں تم پر آپس کی گواہی فرض کی گئی وہ گواہی دو ہیں، اس میں تقدیر یہ ہوگی کہ ان يشهد

اثنان گواہی دو افراد دیں، ابوعلی الفارسی نے دونوں وجوہات بیان کی ہیں۔

ذَوَا عَدْلٍ ۔ ''وہ دونوں دیندار ہوں۔'' یہ اثنین کی صفت ہے اور اسی طرح مِنْكُمْ بھی صفت ہے، یعنی وہ دونوں تم میں سے ہوں یعنی تمہارے قریبی ہوں۔ اَوْ اٰخَرٰنِ ''یا دوسرے ہوں'' یہ اثنان پر معطوف ہے مِنْ غَيْرِكُمْ ''تمہارے علاوہ۔'' یہ بھی اس کی صفت ہے، یعنی وہ اجنبی ہوں۔ ایک قول کے مطابق مِنْكُمْ میں ضمیر مسلمانوں کے لئے ہے اور غَيْرِكُمْ میں ضمیر کافروں کے لئے ہے۔ یہ آیت کے سیاق کے اعتبار سے سب سے مناسب ہے، اور یہی بات سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہی۔

پس اس آیت میں دلیل ہے کہ ذمیوں کی گواہی مسلمانوں کے خلاف بالخصوص وصیت کے بارہ میں لینا جائز ہے جیسا کہ قرآنی اسلوب سے معلوم ہوتا ہے اور اسی کی گواہی شان نزول بھی دیتا ہے، تو جب وصیت کرنے والے کے پاس کوئی مسلمان موجود نہ جو اس کی وصیت پر گواہی دے تو کفار میں سے دو مرد گواہی دیں' اور جب وہ دونوں اس کی وصیت پر گواہی دیں اور عصر کے بعد قسم اٹھائیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے اور نہ اسے تبدیل کر رہے ہیں اور جو وہ گواہی دے رہے ہیں وہ درست ہے تو اس وقت اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ پس اگر بعد میں یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے جھوٹ بولا یا خیانت کی ہے، اور وصیت کرنے والے کے اولیاء اس بات کی قسم اٹھائیں تو کافر گواہ اس بات کی چٹی بھریں گے، جو ان پر خیانت وغیرہ ظاہر ہوگی۔

یہ آیت کا معنی ہے ان کے نزدیک جن کا ذکر پہلے گذر چکا' یہی بات سعید بن مسیب' یحییٰ بن یعمر' سعید بن جبیر' ابومجلز' نخعی' شریح' عبیدالسلمانی' ابن سیرین' مجاہد' قتادہ' سدی' ثور' ابوعبید' اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے کہی اور پہلا موقف میری مراد اس تفسیر سے ہے کہ منکم کی ضمیر قریبی رشتہ داروں یا قبیلہ کی طرف اور غَيْرِكُمْ کی تفسیر اجنبی لوگوں کی طرف جاتی ہے۔ زہری' حسن اور عکرمہ کا بھی یہی خیال ہے۔

امام مالک' شافعی اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ وغیرہ فقہاء کا موقف ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ انہوں نے فرمان الٰہی مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اور وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ سے دلیل لی ہے۔ یہ دونوں عام ہیں لوگوں زمانوں اور مختلف حالات میں اور یہ آیت زمین میں سفر کے دوران، وصیت اور اس حالت کے ساتھ خاص ہے، جبکہ مسلمان گواہ موجود نہ ہوں، یہاں عام اور خاص میں کوئی تعارض نہیں۔

اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ۔ ''اگر تم کہیں سفر میں گئے ہو۔'' فعل کا فاعل محذوف ہے جو ضربتم کی تفسیر کرے یا یہ مبتداء ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ پہلا جمہور نحویوں کا مذہب ہے اور دوسرا اخفش اور اہل کوفہ کا مذہب ہے۔ زمین میں چلنے سے مراد سفر ہے۔ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ۔ ''اور تمہیں موت آ جائے۔'' یہ گذشتہ پر معطوف ہے اور اس کا جواب محذوف ہے، یعنی اگر تم زمین میں سفر کرو اور موت آ جائے اور تم وصیت کا ارادہ کرتے ہو اور مسلمانوں میں سے کوئی گواہ نہیں ملتا جو تمہارے وارثوں تک تمہاری وصیت اور تمہارا ترکہ بھی پہنچا دے، تو وہ وارث ان کے معاملے میں شک کریں یا ان پر خیانت کا دعویٰ کریں تو حکم یہ ہے کہ تم ان کو گرفتار کر لو۔ جائز ہے کہ یہ ابتداء ہو پوشیدہ سوال کے جواب میں گویا انہوں نے کہا ہم کیا فیصلہ کریں اگر ہمیں گواہی میں شک ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ۔ ''تو ان دونوں کو نماز کے بعد روک لو۔'' اگر تمہیں ان کی گواہی میں شک ہو۔ نماز کے بعد کو عصر کی نماز سے خاص کیا ہے یہ بات اکثر نے کہی کیونکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹی قسم کھانے والے فاجر شخص پر غضب اتاریں جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے اور ایک قول کے مطابق اس لئے کہ یہ لوگوں کے جمع ہونے کا وقت ہے اور حاکم لوگ امور حکومت چلانے کے لئے بیٹھتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق ظہر کی نماز اور ایک قول کے مطابق کوئی بھی نماز ہو۔

ابوعلی الفارسی کہتے ہیں يَحْبِسُوْنَهَا صفت ہے آخران کی۔ اِنْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ موصوف صفت کے درمیان جملہ معترضہ ہے اور روکنے سے مراد گواہوں کو اس وقت قسم کے لئے کھڑا کرنا ہے اس میں عام معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے قید کرنے کا جواز نکلتا ہے اور اس بات میں بھی جواز نکلتا ہے کہ قسم اٹھانے والے پر وقت اور جگہ وغیرہ کی سختی کی جا سکتی ہے فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ۔ ''پھر دونوں اللہ کی قسم اُٹھائیں۔'' یہ يحبسونهما پر معطوف ہے، یعنی دونوں گواہ اس ایک وصیت یا کئی وصیتوں پر، اللہ تعالیٰ کی قسم اُٹھائیں۔

اس سے ابن ابی لیلیٰ نے گواہوں سے مطلقاً قسم لینے پر دلیل لی ہے، جب ان کی گواہی میں شک معلوم ہو، یہ بات محل نظر ہے کیونکہ یہاں گواہوں کا قسم اٹھانا یہ اس وقت ہے جب ان پر خیانت وغیرہ کا الزام ہے۔

اِنِ ارْتَبْتُمْ۔ ''اگر تم کو شبہ ہو۔'' اس شرط کا جواب محذوف ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔

لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا ۔ ”ہم اس قسم کے عوض کوئی نفع نہیں لینا چاہتے۔“ یہ جواب قسم ہے اور بہ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے: معنی یہ ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے حصہ کو اس تھوڑے سے سامان کے عوض فروخت نہیں کرتے کہ ہم اس مال کے لئے جھوٹی قسم اُٹھائیں، جس کا تم ہمارے اوپر دعویٰ کرتے ہو۔ ایک قول کے مطابق یہ ضمیر قسم کی طرف لوٹتی ہے یعنی ہم اللہ تعالیٰ کے نام پر صحیح قسم کو دنیاوی ساز و سامان کے لئے تبدیل نہیں کرتے۔ ایک قول کے مطابق یہ گواہی کی طرف لوٹتی ہے ضمیر صرف اس لئے ذکر کی گئی کہ وہ قول کے معنی میں ہے یعنی ہم اپنی گواہی کو قیمت کی صورت میں تبدیل نہیں کرتے۔

اہل کوفہ کہتے ہیں: کہ یہاں ”ثمن“ سے مراد ”ثمن“ ہے یعنی قیمت والی، مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا' یہ اس بنا پر کیا کہ عروض یعنی سامان کو قیمت کا نام نہ دیا جائے، حالانکہ اکثر کے نزدیک اسی کو قیمت کہتے ہیں جیسا کہ اسے فروخت شدہ کہتے ہیں۔

وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۔ ”اگر چہ کوئی قرابت دار بھی ہو“ یعنی جس پر قسم یا گواہی دینا ہے وہ اس کا قریبی ہی کیوں نہ ہو' یقیناً ہم حق اور سچ کو ہی ترجیح دیں گے ہم دنیاوی ساز و سامان یا قرابت داری کو ترجیح نہ دیں گے۔ لَوْ کا جواب ماقبل کی اس پر دلالت کی وجہ سے محذوف ہے' یعنی اگر چہ قرابت دار ہی ہوں ہم ان کے بدلہ قیمت نہیں لیں گے۔ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ ۔ ”اور اللہ تعالیٰ کی بات کو ہم پوشیدہ نہ کریں گے۔“ یہ لَا نَشْتَرِیْ پر معطوف ہے، یہ بھی اس کے ساتھ قسم کے حکم میں شامل ہے اور گواہی کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے طرف منسوب کیا کیونکہ وہی اسے ادا کرنے کا حکم کرتا اور اسے چھپانے سے منع کرتا ہے۔

اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا ۔ ”ہم اس حالت میں سخت گنہگار ہوں گے۔ پھر اگر اس کی اطلاع ہو کہ وہ دونوں گواہ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔“ عُثِرَ عَلٰی كَذَا ، یہ ایک محاورہ ہے جو اس وقت بولا جاتا ہے جب اس کا پتہ چل جائے، اس کا معنی ہے کہ اس بات کا علم ہوا۔ اسی طرح یہ لفظ ہیں عَثَرْتُ مِنْهُ عَلٰی خِيَانَةٍ، یعنی میں نے اطلاع پائی اور اپنے علاوہ کسی کی بات کا علم ہو۔ اس معنی میں یہ فرمان الٰہی ہے وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ ۔ عثور کا اصلی معنی ہے کسی چیز پر واقع ہونا یا گرنا۔

تو معنی یہ ہوا کہ وہ جب قسم اٹھانے کے بعد یہ جان لیں کہ گواہ یا وصیت پہنچانے والے گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں یعنی گناہ کیا ہے گواہی میں جھوٹ بول کر یا قسم میں یا خیانت کا ارتکاب

کر کے۔ ابو علی الفارسی کہتے ہیں کہ یہاں گناہ ایسی چیز کو کہا گیا ہے جو پکڑی جائے کیونکہ پکڑ نے والا گنہگار ہوگا جیسا کہ جو چیز ناحق لی جائے اسے مظلوم کہا جاتا ہے۔ سیبویہ کہتے ہیں مظلوم اس چیز کو کہتے ہیں جو تم سے لی جائے، اس طرح اس پکڑی جانے والی چیز کا نام مصدر کے نام سے رکھ دیا گیا ہے۔

فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا۔ ''تو دو دوسرے گواہ یا دوسرے دو قسم اٹھانے والے ان لوگوں کی جگہ پر کھڑے ہوں گے جن کے بارہ میں اطلاع ملی کہ وہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو وہ دونوں گواہی دیں یا قسم اٹھائیں اس بات پر جو درست ہے' اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ دونوں ان دو کی جگہ کھڑے ہوں وہ گواہی دینے کے لئے جس پر ان کا گناہ ثابت ہوا ہے۔

مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْهِمُ الْاَوْلَیٰنِ۔ ''ان لوگوں میں سے جن کے مقابلہ میں دوسرے دو شخص جو سب سے قریب تر ہیں۔'' اسْتَحَقَّ مفعول ہونے کی وجہ سے جمہور کی قراءۃ میں مبنی ہے۔ سیدنا علی' سیدنا ابی ابن عباس رضوان اللہ علیہم اور حفص نے فاعل ہونے کی وجہ سے الْاَوْلَیٰنِ کو مبنی پڑھا ہے پہلی قراءۃ کے مطابق مرفوع ہوگا کہ وہ مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی وہ دونوں قریبی ہیں گویا یہ کہا گیا کہ وہ دونوں کون ہیں؟ تو جواب دیا کہ وہ دونوں قریبی ہیں۔ ایک قول کے مطابق یَقُوْمٰنِ میں ضمیر۔ سے یا آخَرَانِ سے بدل ہے۔ یحییٰ بن وثاب اعمش اور حمزہ ''الاولین'' پڑھتے ہیں اول کی جمع قرار دے کر' اس بنا پر کہ یہ الذین سے یا علیہم میں ھم سے بدل ہے۔ حسن اَوْلَانِ مفعول کے لئے فعل کی بنا پر پڑھتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا ان لوگوں سے جن پر گناہ ثابت ہو گیا یعنی ان پر جرم لاگو ہو گیا، وہ اس کے گھر والے اور قبیلہ والے ہیں وہ گواہی اور قسم کے ان کے غیر کی نسبت زیادہ حق دار ہیں۔

پس اَوْلَیَانِ اَوْلٰی کا تثنیہ ہے' معنی یہ ہوا کہ فاعل ہونے کی وجہ سے مبنی قرار دے کر ان لوگوں سے جن پر گواہی ثابت ہوئی ان کے قریبی رشتہ داروں میں سے کہ انہیں الگ سے کھڑا کریں گواہی کے لئے اور جھوٹے لوگوں کا جھوٹ واضح کریں کیونکہ یہ میت کے زیادہ قریبی ہیں۔ پس اولیان استحق کا فاعل ہے اور اس کا مفعول یہ ہے کہ تم انہیں گواہی کے لئے کھڑا کرو۔ ایک قول کے مطابق مفعول محذوف ہے اور تقدیر یوں ہوگی ''من الذین استحق علیهم الاولیان بالمیت و صیته التی اوصیٰ بها'' یعنی ان لوگوں سے جو میت کے زیادہ قریبی ہیں جن پر زیادہ لازم ہے کہ اس کی وصیت کو بیان کریں جو اس نے کی ہے۔

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ ۔ ''پھر دونوں اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائیں۔'' یہ یقومان پر معطوف ہے یعنی وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائیں۔ لَشَهَادَتُنَا ۔ ''کہ بالیقین ہماری یہ قسم۔'' یہاں گواہی شہادت سے مراد قسم ہے جیسا کہ اس فرمان الٰہی: فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ میں ہے، یعنی وہ دونوں قسمیں اٹھائیں کہ ہماری گواہی ہے کہ یہ دونوں جھوٹے اور خائن ہیں۔ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا ''زیادہ راست ہے ان دو کی قسموں سے۔'' اس بات پر کہ ہم دو سچے اور امانت دار ہیں'' وَمَا اعْتَدَيْنَآ ''اور ہم نے ذرا تجاوز نہیں کیا'' یعنی اپنی قسموں میں حق سے تجاوز نہیں کیا اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ ''ہم اس حالت میں سخت ظالم ہوں گے'' اگر ہم باطل اور جھوٹی قسم اٹھائیں گے۔''

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ ۔ ''یہ قریب ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ لوگ واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں۔'' یعنی اس بیان کو جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس واقعہ میں پہلے بیان کیا ہے۔

ہم یہ جان چکے ہیں کہ جو سفر میں وصیت کرنا چاہتا ہے اور اس کے پاس اس کے گھر یا قبیلہ والوں میں سے کوئی نہیں اور اس کے پاس کافر ہیں تو وہ کیا کرے؟ زیادہ قریب یہ بات ہے کہ گواہ اس گواہی کو جو اٹھائے ہوئے ہیں وصیت کے مطابق گواہی ان کے سامنے رکھ دیں تو نہ تم تحریف کرو نہ تبدیل کرو اور نہ ہی خیانت کرو۔

یہ ابتدائی کلام ہے جو اپنے اندر نفع اور فائدہ لئے ہوئے ہے جو اس حکم میں موجود ہیں جنہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب کے اس مقام پر قانون بنایا ہے۔ يَّاْتُوْا میں ضمیر ان گواہوں کی طرف لوٹتی ہے جو کافر اور وصیت کے گواہ ہیں' ایک قول کے مطابق یہ ان مسلمانوں کے طرف لوٹتی ہے جو اس حکم کے مخاطب ہیں اور اس سے مراد ان کو خیانت سے ڈرانا ہے اور اس بات کا حکم دینا ہے کہ وہ حق کی گواہی دیں۔

اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۔ ''یا اس بات سے ڈر جائیں کہ ان سے قسمیں لینے کے بعد قسمیں الٹی پڑ جائیں گی'' یعنی یہ حق وارثوں کو ملے گا تو وہ اس گواہی کے خلاف گواہی دیں گے جو وصیت کے گواہوں نے دی ہے، اس طرح وہ لوگ رسوا ہو جائیں گے' یہ اس فرمان الٰہی يَّاْتُوْا پر معطوف ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس حکم سے شرعی طور پر دو میں سے ایک فائدہ حاصل ہوا کہ وصیت کے گواہ جھوٹ اور خیانت سے گریز کریں تو وہ گواہی لوگوں کے سامنے

ادا کریں گے کہ وہ رسوائی سے ڈریں جب میت کے قریبی اس کی قسم کو لوٹا دیں گے، پس وہ لوگ ان کے جھوٹ اور خیانت کے خلاف قسم اٹھائیں گے، تو یہ وصیت کے گواہوں کی لوگوں کا سامنے بغیر جھوٹ اور خیانت کے گواہی دینے کا سبب ہوگا۔

ایک قول کے مطابق اَنْ یَّخَافُوْا معطوف ہے پہلے جملہ کے بعد مقدر لفظ پر، تقدیر یوں ہوگی "ذالك ادنیٰ ان یاتوا بالشهادة علی وجهها ویخافوا عذاب الاخرة بسبب الکذب والخیانة" یعنی یہ زیادہ مناسب ہے کہ وہ ان کے سامنے گواہی دیں اور آخرت کے عذاب سے ڈریں جھوٹ اور خیانت کی وجہ سے یا پھر عبارت اس طرح ہوگی "اویخافوا الافتضاح برد الیمین" یعنی قسم لوٹ آنے کی وجہ سے رسوائی سے ڈریں، ان دو میں سے کوئی ایک خوف بھی ہوتی مقصود حاصل ہو جائے گا۔

کتاب عزیز کے اس مقام میں جو بیان ہوا اس کا حاصل کلام یہ ہے: جسے موت کی علامات نظر آنے لگیں، تو وہ دو مسلمان عادل گواہوں کو گواہ بنالے، اگر گواہ مسلمان میسر نہ آئیں اور وہ سفر میں ہو اور کافر میسر ہوں تو ان میں سے دو افراد کو اپنی وصیت پر گواہ بنالے یہ جائز ہے، پس ان دو کے متعلق وصیت کرنے والے کے ورثاء قسم دیں کہ ان دونے درست گواہی دی ہے گواہی میں سے کچھ نہیں چھپایا اور نہ میت کے ترکہ سے کچھ چھپایا ہے، تو اگر اس کے بعد کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی ہے جس پر انہوں نے گواہی دی جو ان کے گواہی میں خلل پیدا کرتی ہے یا میت کے ترکہ سے کوئی چیز کسی بھی صورت ظاہر ہو اس گمان پر کہ وہ چیز ان گواہوں کی ملکیت میں آگئی ہے، تو ورثاء میں سے دو آدمی قسم اٹھائیں گے اور اس کے مطابق فیصلہ ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

سورۃ الانعام

(اس کی ۱۶۵ آیات ہیں)

یہ سورۃ مکی ہے، سوائے چھ آیات وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ سے آخر کی تین آیات تک تعداد کے اختلاف کے ساتھ۔

مضمون نمبر: ۱

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ۔(۱۰۸)

"اور مت گالی دو ان کو جن کی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں کیونکہ پھر وہ جہالت کی وجہ سے حد سے گذر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔"

موصولہ الہٰ سے عبارت ہے جس کی کافر عبادت کیا کرتے تھے' معنی یہ ہوا کہ اے محمد! (ﷺ) ان کفار کے معبودوں کو گالی نہ دو جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے علاوہ پکارتے ہیں' تو کیونکہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے دشمنی میں حق سے تجاوز کر کے اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ حق کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے والا جب اس بات سے ڈرے کہ اس وجہ سے وہ کام ہوگا جو اس برائی اور حق کی مخالفت سے زیادہ برا کام ہوگا تو ایسی تبلیغ چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہے بلکہ اس پر یہی واجب اور لازم ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی آیات لوگوں تک پہنچانے کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں، یہ آیت بہت نافع اور بڑا فائدہ رکھتی ہے جبکہ یہ لوگ گونگے' بہرے لوگوں کے درمیان ہوں، جنہیں یہ اگر نیکی کا حکم کریں تو اس نیکی کو اور جو نیکیاں کرتے تھے انہیں بھی چھوڑ دیتے ہیں، اسی طرح اگر کسی گناہ سے روکیں تو یہ گناہ اور دوسرے گناہ جو نہیں کرتے انہیں بھی اپنا لیتے ہیں، حق سے دشمنی اور سچے لوگوں کی پیروی سے بغض رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ پر جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ ان میں تلوار کے علاوہ کوئی چیز فائدہ نہیں دے سکتی' یہی عادلانہ حکم ہے جو شریعت مطہرہ سے دشمنی رکھے اور اس کی مخالفت کرے اور اس شریعت والوں پر جرأت کا مظاہرہ کرنا اس نے اپنی عادت بنالی ہے۔

جیسا کہ یہ بات اہل بدعت میں واضح ہے کہ جنہیں حق کی طرف بلایا جائے تو وہ بہت سے گناہ کے کاموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جب ان کی کسی سنت کی طرف راہنمائی کی جائے تو اس کے بدلہ میں ان کے اپنے پاس جو بدعت ہو اسے ہی قبول کرتے ہیں' یہی لوگ دین کو کھیل بناتے ہیں اور قانون کو معمولی جانتے ہیں، یہ لوگ زنادقہ میں سے بھی سب سے برے ہیں کیونکہ یہ باطل سے دلیل لیتے ہیں اور بدعات کی طرف منسوب ہیں، کسی خوف اور ڈر کے بغیر یہ لوگ اسی کو غالب کرتے ہیں' زنادقہ کو اسلامی تلواروں نے ہی لگام ڈالی ہے اور انہیں کے ماننے والوں سے تحفظ دیا ہے۔

بعض اوقات وہ اپنے مکر سے منافقت کرتے ہیں اور اپنی باطل پرستی اور کفر پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کمزور مسلمانوں پر چھپا کر بچتے ہوئے خوف اور ڈر کی حالت میں۔

جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ یہ آیت محکم ثابت ہے منسوخ نہیں اور یہی بنیاد ہے برائی کے ذرائع کو روکنے میں اور کئی شبہات کے جنم لینے میں رکاوٹ ہے۔ عَدْوًا حال یا مصدر یا مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

مضمون نمبر:۲

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔(۱۱۸)

''سو جس جانور پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے اس میں سے کھاؤ۔''

ایک قول کے مطابق یہ خاص سبب کے لئے نازل ہوئی جیسا کہ یہ بات ابوداؤد' ترمذی اور بزار وغیرہ میں موجود ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہودی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، انہوں نے کہا ہم جو خود قتل کریں اسے تو کھاتے ہیں اور جسے اللہ تعالیٰ قتل کریں اسے نہیں کھاتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔

لیکن یہاں لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ خاص سبب کا' پس جب بھی ذبح کرنے والا اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لے گا تو حلال ہے اگرچہ اس کا کھانا اللہ تعالیٰ نے جائز ہی رکھا ہو۔ عطاء فرماتے ہیں اس آیت میں پانی پینے کے وقت، ذبح کے وقت اور ہر کھانے پر اللہ تعالیٰ کے نام لینے کا حکم ہے۔ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ۔ یعنی تفصیل سے تمہارے لئے واضح کر دیا جو اس آیت کا شک وشبہ دور کر دیتا ہے کہ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا الخ، پھر اس میں سے یہ لفظ فرما کر استثناء کر دیا اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ، یعنی ان تمام اشیاء میں سے جو اللہ تعالیٰ نے

تم پر حرام کردی ہیں کیونکہ ضرورت حرام کو حلال کر دیتی ہے۔اس کی تحقیق سورہ بقرہ میں گذر چکی ہے۔

مضمون نمبر: ۳۰

وَلَا تَأْكُلُوْا۔(۱۲۱) ’’اور نہ کھاؤ۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جس کھانے پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو اسے کھانے سے روکا ہے اس حکم کے بعد جو اللہ تعالیٰ نے نام لئے گئے کھانے کا دیا ہے اس میں یہ دلیل ملتی ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے وہ کھانا حرام ہے۔

اہل علم نے اس میں اختلاف کیا ہے' سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ، نافع ان کے غلام شعبی اور ابن سیرین کا یہی موقف ہے اور یہی امام مالک اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہے، یہی قول ابو ثور' ابو داؤد اور امام ظاہری رحمہ اللہ کا ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو اس ذبیحہ کو کھانا حرام ہے اور جان بوجھ کر چھوڑنے والا اور بھولنے والا اس میں برابر ہیں، اس کی دلیل یہی آیت ہے اور دوسری دلیل یہ آیت ہے فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔ یہ استدلال مزید تاکید پیدا کرتا ہے کیونکہ اس آیت کریمہ میں ہے کہ: وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ہے۔

صحیح احادیث میں شکار وغیرہ پر بسم اللہ پڑھنے کا حکم موجود ہے، امام شافعی اور ان کے ساتھیوں کا موقف یہی ہے، یہی امام مالک اور احمد سے مروی ہے کہ بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے واجب نہیں' یہی بات سیدنا ابن عباس' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما اور عطاء بن ابی رباح سے مروی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ آیت کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ جس نے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا' یہ بغیر کسی کے آیت کو خاص کرنے والی بات ہے۔

ابوداؤد مراسیل میں بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے یا نہ۔ اس مرسل روایت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو اس آیت کو خاص کرنے کیلئے درست ہو۔ ہاں البتہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کچھ لوگ گوشت لاتے ہیں ہمیں معلوم نہیں کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا یا نہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم (اللہ تعالیٰ کا) نام لو اور کھاؤ۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ پڑھنا کھانے کے وقت کافی ہے باوجود اس کے کہ ذبح کے وقت پڑھنے کے بارہ میں کچھ شک ہی کیوں نہ ہو۔

امام مالک' احمد رحمہ اللہ کے مشہور مذہب کے مطابق ابو حنیفہ رحمہ اللہ ان کے اصحاب اور اسحٰق بن راہویہ کا موقف ہے کہ بسم اللہ پڑھنا اگر بھولنے کی وجہ سے رہ جائے تو نقصان نہ دے گی ہاں، اگر جان بوجھ کر چھوڑی گئی تو پھر ذبیحہ کھانا جائز نہیں' یہ سیدنا علی' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما' سعید بن میسب' عطاء' طاؤس' حسن بصری' ابو مالک' عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ' جعفر بن محمد اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن سے مروی ہے انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو امام بیہقی سے روایت ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان اگر ذبح کے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو کھانے کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے اور کھالے۔ اس حدیث کو مرفوع کہنا غلطی ہے یہ تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

اسی طرح امام بیہقی نے عبدالرزاق' سعید بن منصور' عبد بن حمید اور ابن منذر کا قول بھی نقل کیا ہے۔

ہاں اس مذہب والے لوگوں کا اس طرح کے فرمان الٰہی: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "رفع عن امتی الخطاء والنسیان" "میری امت سے غلطی اور بھول اٹھالی گئی ہے، سے استدلال کرنا ممکن ہے۔"

البتہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جسے ابن عدی نے روایت کیا کہ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول اس بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے کہ جو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا بھول جائے؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا نام ہر مسلمان کی زبان پر ہے، یہ حدیث ضعیف ہے اور اسے امام بیہقی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اِنَّهٗ لَفِسْقٌ میں ضمیر مضاف کو مقدر مانتے ہوئے ما کی طرف لوٹتی ہے یعنی اگر وہ کھایا گیا جس پر نام نہ لیا گیا ہو تو یہ فسق ہوگا۔ جائز ہے کہ "تاکلوا" کے مصدر کی طرف لوٹے، یعنی پھر کھانا گناہ ہے۔ فسق کی تحقیق گذر چکی ہے۔ یہ ان کی دلیل ہے جو اس آیت کو ذبح لغیر اللہ پر محمول کرتے ہیں اس فرمان باری وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ کی وجہ سے، استدلال کی وجہ یہ ہے کہ چھوڑنا فسق نہیں ہوسکتا بلکہ فسق یہ ہے کہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ فسق کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرض کردہ امور کو چھوڑا جائے نہ کہ جو کام شرعاً ممنوع ہو۔

مضمون نمبر: ۴۰

وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ۔ (۱۴۱)

"اور اس میں جو حق واجب ہے وہ اس کے کاٹنے کے دن دیا کرو۔"

اہل علم کا اختلاف ہے کیا یہ آیت محکم ہے یا منسوخ ہے یا استحباب پر محمول کی جائے گی؟
سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ' عطاء' مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ کا موقف ہے کہ آیت محکم ہے اور مالک پر لازم ہے کہ کٹائی کے دن مسکینوں میں سے جو موجود ہوں انہیں مٹھی بھر یا گٹھا بھر کے دیں وغیرہ وغیرہ۔
سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ' محمد بن الحنفیہ' حسن' نخعی طاؤس' ابوالشعثاء' قتادہ ضحاک اور ابن جریج رحمہم اللہ کا موقف ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ سے منسوخ ہے۔ ابن جریر نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور زکوٰۃ والی آیت مدنی ہے جو ہجرت کے دوسرے سال نازل ہوئی' یہ موقف جمہور اہل علم کا پہلے اور بعد والوں میں سے ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے یہ آیت استحباب پر محمول ہوگی نہ کہ وجوب پر۔

مضمون نمبر: ۵

وَ لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (۱۴۱)۔

"اور حد سے مت گذرو یقیناً وہ حد سے گذرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔"

اس طرح کی ایک آیت سورۂ اعراف میں بھی ہے، یعنی تم خرچ کرنے میں حد سے نہ بڑھو۔" لغت میں اسراف کا معنی غلطی ہے اور فقہ میں فضول خرچی ہے۔ سفیان کہتے ہیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت سے ہٹ کر خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے اگرچہ اس کی مقدار تھوڑی ہی کیوں نہ ہو' ایک قول کے مطابق یہ خطاب ذمہ داروں سے ہے، اللہ تعالیٰ ان سے فرماتے ہیں کہ تم اپنے حق سے بڑھ کر نہ لو' ایک قول کے مطابق معنی ہے کہ تم کسی چیز کو ناحق نہ لو اور نہ کوئی چیز نامناسب جگہ پر رکھو۔

مضمون نمبر: ۶

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ۔ (۱۴۵)

"آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ان میں تو میں کوئی حرام نہیں پاتا۔"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ انہیں اطلاع دو کہ آپ ﷺ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے اس میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے یعنی قرآن میں' اس میں یہ اشارہ ہے کہ حلال وحرام کی کسوٹی وحی ہے نہ کہ صرف عقل۔ مُحَرَّمًا حرام سوائے ان مذکورہ اشیاء کے' تو یہ دلیل ہے کہ حرام

کردہ اشیاء اس آیت میں سمو دی گئی ہیں اگر یہ مکی نہ ہوتی‘ اس کے بعد مدینہ میں سورہ مائدہ نازل ہوئی اس میں ان حرام شدہ پر اضافہ کیا گیا کہ گلا گھوٹنے سے مرنے والا‘ کسی ضرب سے مرنے والا‘ گر کر مرنے والا اور سینگ مارنے سے مرنے والا حرام ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ درندے میں سے ہر کچلی والا اور پرندے میں سے ہر پنجہ سے شکار کرنے والا جانور، پرندہ حرام ہے۔ اسی طرح گھریلو گدھے اور کتے وغیرہ اور اس جیسی کئی ایک چیزیں حرام ہیں۔ مختصر یہ کہ اس عمومی حکم کی نسبت اگر ماکول اللحم جانوروں کی طرف ہو جیسا کہ اس پر سیاق دلالت کرتا ہے اور استثناء سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے تو اس میں ہر وہ شامل ہوگا جو اس کے بعد کتاب وسنت میں آیا ہے ان میں سے جو بھی جانوروں میں سے کسی حرمت پر دلالت کرتا ہے۔

اگر اس عموم کی نسبت پر حرام کردہ چیز کی طرف ہو جانور یا ان کے علاوہ کوئی چیز بھی تو اس میں وہ تمام اشیاء شامل ہوں گی کہ اس کے بعد ان کی حرمت مذکور ہوئی۔ سیدنا ابن عباس، سیدنا ابن عمر اور عائشہ ﷺ سے مروی ہے کہ اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے صرف وہی حرام ہیں۔ یہ امام مالک سے بھی مروی ہے، حالانکہ یہ قول ساقط اور انتہائی کمزور مذہب ہے کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جو اس کے بعد قرآن میں نازل ہوا، اسے بے کار کر دیا جائے اور جو نبی ﷺ سے صحیح سند سے ثابت ہے اسے بھی کہ آپ ﷺ نے اس آیت کے نزول کے بعد کسی چیز کو حرام قرار دیا بغیر کسی سبب کے جو اس کا متقاضی ہو اور کسی لازم کرنے والے کے بغیر ہی جو اس کو واجب کرے، یہ بھی یاد رہے کہ نبی ﷺ کے فرمان کے مقابلہ میں کسی کی بھی بات قابل تمسک نہیں، خواہ وہ صحابی ہی ہو، کیونکہ یہ انصاف سے بہت دور ہے۔

مُحَرَّمًا محذوف موصوف کی صفت ہے یعنی ایسا کھانا جو حرام ہے عَلٰی یعنی طَاعِمٍ یُطْعَمُهٗ۔ کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے۔ کسی بھی کھانے کو۔ یُطْعَمُهٗ میں مزید تاکید ہے اور ماقبل کی وضاحت ہے۔ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ ”مگر یہ کہ وہ“ یعنی وہ چیز یا کھانا یا وہ ذات یا جسم یا نفس۔ یکون کو تکون بھی پڑھا گیا ہے۔ مَیْتَةً ”مردار“ اسے مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اس بنا پر کہ کان تامہ ہو۔ اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا۔ ”یا بہتا ہوا خون“ اس سے مراد بہتا ہوا خون ہے اور غیر مسفوح کہتے ہیں جو خون رک جاتا ہے مثلاً جو خون ذبح کے بعد رگوں میں رہ جائے جیسے جگر اور کلیجی ہے اسی طرح جو گوشت میں گھل مل جائے۔ امام قرطبی نے اِس پر اجماع نقل کیا ہے۔

اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ۔ ”یا خنزیر کا گوشت۔“ ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ گوشت خاص ہے کہ

گوشت کے سوا سے فائدہ اٹھانا حرام نہیں۔ اور اِنَّهٗ رِجْسٌ ''کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے۔'' میں ضمیر گوشت یا خنزیر کی طرف لوٹتی ہے۔ رجس کا معنی ناپاک ہے اس کی تحقیق گذر چکی ہے۔ اَوْ فِسْقًا ''یا گناہ ہے'' یہ بھی خنزیر کے گوشت پر عطف ہے۔ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ ''کہ غیر اللہ کے نامزد کردیا گیا ہو'' یہ فسق کی صفت ہے یعنی جو بتوں وغیرہ کے نام پر ذبح کیا جائے، اسے فسق اس لئے کہتے ہیں کہ یہ فسق کے باب میں علو کرنا ہے۔ جائز ہے کہ فسق کو اھل کا مفعول لہ قرار دیا جائے، یعنی جو غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا وہ فسق ہے، اہل پر عطف ڈالتے ہوئے اور یہ ایسا تکلف ہے کہ جس کی ضرورت نہیں۔ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ۔ ''پھر جو شخص مجبور ہو جائے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا'' اس کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ''واقعی تیرا رب بخشنے والا'' یعنی بہت بخشنے والا رَحِيْمٌ رحم کرنے والا ہے، یعنی بہت رحم کرنے والا ہے کہ مجبور کو جس طرف اس کی ضرورت لے جارہی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر اس چیز کا مواخذہ نہیں کرے گا۔

سورۃ الاعراف

یہ سورہ سوائے آٹھ آیات: وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ سے وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ تک مکی ہے۔ ابن عباس' ابن زبیر' حسن مجاہد' عکرمہ' عطاء اور جابر بن زید نے یہ بات کہی ہے۔ اور قتادہ کہتے ہیں اعراف کی ایک آیت وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ مدنی ہے اور باقی ساری سورہ مکی ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ نبی ﷺ مغرب میں اس سورہ کو دو حصہ کر کے دو رکعات میں پڑھا کرتے۔ اس کی آیات دو سو چھ ہیں۔

مضمون نمبر:۱

يَبَنِيْ آدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔(۳۱)

''اے اولاد آدم! تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔''

یہ خطاب تمام اولاد آدم کو ہے، اگرچہ یہ خاص سبب سے نازل ہوئی' لیکن لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ خاص سبب کا۔ زینۃ سے مراد ہر وہ چیز جو انسان لباس میں سے پہن کر زینت اختیار کرتا ہے۔ انہیں حکم دیا گیا کہ جب بھی مسجد میں نماز یا طواف کے لئے آئیں تو زیب و زینت سے آئیں۔ اس آیت سے نماز میں شرمگاہ کو چھپانے پر بھی استدلال کیا ہے' یہی جمہور اہل علم کا موقف ہے بلکہ شرمگاہ کا چھپانا تو ہر حال میں واجب ہے اگرچہ آدمی اکیلا ہی ہو جیسا کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں' شرمگاہ اور جس قدر چھپانا ضروری ہے اس پر گفتگو فروع کی کتب میں تفصیل سے درج ہے۔

مضمون نمبر:۲

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ۔(۳۲)

''آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اسباب زینت کو جن کو اس نے اپنے بندوں کے لیے بنایا ہے کس شخص نے حرام کیا ہے؟''

زینۃ کہتے ہیں ہر وہ چیز جس سے انسان زینت خوبصورتی اپناتا ہے ملبوسات یا اس کے علاوہ دیگر جائز چیزوں سے' مثلاً وہ خزانے جن کے بارہ میں روکا نہیں گیا کہ ان سے زینت اختیار نہ کرو

اور جواہر وغیرہ۔

بعض ائمہ جو یہ کہا کہ یہ ملبوسات سے خاص ہے، تو اس کی کوئی دلیل نہیں بلکہ یہ من جملہ ان میں سے ہے جن کو آیت کریمہ شامل ہے' پس ایسا کپڑا جو عمدہ بیش قیمت اور اعلیٰ ہو، اسے پہننے میں کوئی حرج نہیں جبکہ وہ حرام کپڑوں میں سے نہ ہو۔ اسی طرح ان اشیاء کو استعمال کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں جن کا زینت کے ساتھ کوئی تعلق ہو اور ان کے متعلق کوئی شرعی رکاوٹ بھی نہ ہو اور جو شخص یہ گمان کرے کہ یہ کام زہد کے مخالف ہے، تو وہ واضح غلطی پر ہے۔

اس طرح کھانے پینے وغیرہ کی پاکیزہ اشیاء جنہیں لوگ کھاتے ہیں انہیں چھوڑنا زہد میں شامل نہیں' اسی لئے یہ آیت استفہام کے معنی میں آئی ہے جو کہ ایسے شخص پر انکار کا معنی لئے ہوئے ہے جو خود پر یا کسی پر کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے۔ کس قدر عمدہ بات ابن جریر طبری نے کہی انہوں نے کہا کہ ''اس نے غلطی کی جس نے اون اور بالوں کے لباس کو سادہ کاٹن وغیرہ پر ترجیح دی باوجود اس کے کہ اسے پہننا حلال ہے اور جس نے سبزی اور دال کو گندم کی روٹی کی جگہ کھایا اور جس نے گوشت کھانا اس لئے چھوڑا کہ شہوت سے بچ سکے۔''

وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ۔ ''اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو۔'' یعنی کھانے میں سے لذیذ اشیاء' ایک قول کے مطابق یہ لباس اور طعام کا عام نام ہے۔ قُلۡ ھِیَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۔ ''کہہ دیجئے کہ یہ اشیاء دنیوی زندگی میں مومنوں کے لئے بھی ہیں'' یعنی یہ انہی کے لئے ہیں اور اصلا یہی اس کے مستحق ہیں اگرچہ کفار بھی تاحیات ان کے ساتھ شریک ہیں۔ خَالِصَۃً یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ''قیامت کے روز خالص ہوں گی۔'' یعنی یہ ان کے ساتھ قیامت کے روز خاص ہوں گی اس وقت ان میں کفار شریک نہ ہوں گے۔

نافع خالصۃٌ پڑھتے ہیں، یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءۃ ہے اس بنا پر کہ یہ خبر کے بعد پھر خبر ہے اور باقی لوگ حال ہونے کی وجہ سے اسے منصوب پڑھتے ہیں۔ ابو علی الفارسی کہتے ہیں کہ الدنیا پر وقف جائز نہیں کیونکہ اس کا ما بعد اس فرمان الٰہی لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے متعلق ہے: یہ حال ہے اس تقدیر سے کہ قُلۡ ھِیَ ثَابِتَۃٌ للذین امنوا فی الحیوۃ الدنیا فی حال خلوصھا لھم یوم القیامۃ'' یعنی کہہ دیجئے یہ ثابت ہے دنیاوی زندگی میں ایمان والوں کے لئے اس حال میں کہ یہ ان کے لئے روز قیامت خاص ہوگا۔

مضمون نمبر:۳۰

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ۔(۳۳)

"آپ فرمائیے کہ میرے رب نے صرف تمام فحش باتوں کوحرام کیا ہے۔"

یہ فاحشۃ کی جمع ہے اس کا معنی ہے ہر قسم کا گناہ نافرمانی۔مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۔"جو علانیہ ہیں اور جو پوشیدہ ہیں۔"ایک قول کے مطابق یہ زنا کی فحاشی سے خاص ہے'اس کی دلیل کوئی نہیں۔وَ الْاِثْمَ "اور گناہ کو" یہ ہر نافرمانی کو شامل ہے جو گناہ کا سبب ہوتی ہے'ایک قول کے مطابق یہ شراب کے ساتھ خاص ہے،اس معنی میں یہ شعر ہے ع

شربت الاثم حتی ضل عقلی　　　كذاك الاثم يذهب بالعقول

گناہ پیا میں نے یہاں تک کہ عقل گمراہ ہوگئی،اسی طرح ہی گناہ عقلوں کو لے جاتے ہیں۔

اہل علم کی ایک جماعت نے خاص کرنے سے انکار کیا ہے اور اس کی حقیقت یہی ہے کہ اس سے تمام گناہ مراد ہیں۔فراء کہتے ہیں گناہ وہ ہے جو حق کے علاوہ ہو اور لوگوں کو نشہ میں مبتلا کردے اور لفظ اسم کو شراب پر بولنے کے لئے خاص کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔

وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ "اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو"یعنی ایسا ظلم جو حد سے تجاوز کرجائے' اس کو ماقبل الاثم میں شامل ہونے کے باوجود الگ سے ذکر اس لئے کیا کہ یہ بڑا گناہ ہے جیسا کہ فرمان الٰہی:وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ۔اور وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ہے۔"یعنی تم اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہو جس کی تم پر اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔"اس سے مراد مشرکوں کو دھمکی دینا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسی کوئی دلیل نہیں اتاریں گے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی شریک کے لئے ہو۔

وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "اور تم اللہ تعالیٰ پر ایسی بات کہو جس کی تم حقیقت نہیں جانتے۔"یعنی اس کی حقیقت کو اور اس بات کو کہ یہ اللہ نے کہی ہے۔یہ اسی طرح ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف کسی چیز کی حلت اور حرمت منسوب کرتے جس کی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اجازت نہ دی تھی۔

مضمون نمبر:۴۰

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا۔(۲۰۴)

''اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کان لگا کر سننے کا حکم دیا اور اس کی قراءۃ کے وقت خاموش رہنے کی تلقین کی تا کہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں اور اس میں جو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ان میں غور وفکر کریں۔

ایک قول کے مطابق یہ حکم نماز کے وقت امام کی قراءۃ کے دوران سے خاص ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ حکم صرف رسول اللہ ﷺ کے تلاوت قرآن کے ساتھ خاص تھا' اس کی دلیل کوئی نہیں، حالانکہ لفظ اس معنیٰ سے زیادہ عام ہیں اور عام چیز کسی سبب کے ساتھ کم نہیں ہوتی' تو غور سے سننا اور قراءۃ قرآن کے وقت خاموش رہنا یہ ہر حالت میں اور ہر کیفیت میں جن اوقات میں سننے والے پر لازم ہے، سوائے اس حالت کے جسے آپ ﷺ نے مستثنیٰ قرار دیا' مثلاً مقتدی کا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا، خواہ قرأت آہستہ ہو یا جہری۔

کیونکہ اس بارہ میں مشہور اور واضح احادیث صحیح سند سے مذکور ہیں اور بہت زیادہ آثار بھی مروی ہیں جو مقتدی پر فاتحہ کی قراءۃ کو مزید مؤکد اور لازم کرتے ہیں' بلکہ کئی ایک حدیث وفقہ معتبر ائمہ نے صراحت کی ہے کہ یہی مذہب اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین رحمہم اللہ کا ہے۔ کسی خبر کے علاوہ کوئی صحیح اثر نہیں ملتا کہ جس میں خاص فاتحہ سے روکنے کی صراحت موجود ہو اگرچہ اہل علم کی ایک جماعت نے عام منقولات سے دلیل لی ہے، لہٰذا پڑھنے والے کو چاہیے کہ وہ انصاف کرے کہ عمومات سے استدلال کرنا صحیح ہوتا ہے؟

میں نے مقصود کو اللہ کی مدد و توفیق سے **مسك الختام، الروضة الندیه** اور **هدایة السائل الی ادلة المسائل** میں تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور اسی موضوع پر **اعلام الاعلام بقراءة الفاتحة خلف الامام** ہے جو ہمارے بعض دوستوں کی ہے یہ کتاب مختصر اور نہایت عمدہ ہے۔ **لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ** ۔ ''امید ہے کہ تم پر رحمت ہو۔'' یعنی تم رحمت حاصل کر لو اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کر کے کامیاب ہو جاؤ۔

مضمون نمبر: ۵

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ ۔(۲۰۵)

''اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بندوں کو حکم دیا کہ اسے اپنے دل میں یاد کرو کیونکہ پوشیدگی اخلاص میں زیادہ داخل ہونے کا سبب ہے اور قبولیت کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ایک قول کے مطابق یہاں ذکر سے مراد قرآن وغیرہ سے زیادہ عام ذکر مراد ہے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے۔نحاس کہتے ہیں معنی میں کوئی اختلاف نہیں: اپنے رب کو یاد کرو اپنے دل میں یہ دعا ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ قرآن کے ساتھ خاص ہے، یعنی قرآن غور وفکر سے پڑھو۔تَضَرُّعًا وَّ خِيفَةً ''عاجزی اور خوف کے ساتھ'' یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے وَّدُوْنَ الْجَهْرِ ''بلند آواز کے بغیر'' یعنی اسے بلند کر کے یہ ماقبل پر عطف ہے، ''اذكر حال كونك متضرعا وخائفا ومتكلما بكلام هو دون الجهر من القول'' یعنی اسے اس حال میں یاد کرو کہ تم عاجز خوف زدہ اور ایسی گفتگو کرنے والے ہو جو قدرے بلند آواز سے کم اور پوشیدہ سے کچھ زیادہ، یعنی ان دو کے درمیان ہو۔

بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ۔ ''صبح اور شام کے وقت۔'' یہ ''اذكر'' کے متعلق ہے، یعنی شام اور صبح کے اوقات میں۔غدو' غدوة کی جمع ہے اور آصال' اصيل کی جمع ہے۔یہ بات زجاج اور اخفش نے کہی کہ یہ یمین اور ایمان کی طرح ہے۔ایک قول کے مطابق الآصال' اصيل کی جمع ہے، اس بنا پر یہ جمع الجمع ہوگی' یہ بات فراء نے کہی۔جوہری کہتے ہیں اصیل عصر کے بعد سے مغرب تک کا وقت ہے اس کی جمع اصل آصال اور اصائل آتی ہے گویا یہ اصلیۃ کی جمع ہے۔

ان دو اوقات کو ان کی بزرگی کی وجہ سے خاص کیا۔اس سے مقصد یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ہے۔یعنی اللہ عزوجل کے ذکر اس کی یاد سے، غافل نہ ہونا۔

سورة الانفال

اکثر مفسرین نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ مدنی ہے اور اس میں سے کچھ بھی مستثنیٰ نہیں کیا' یہی بات حسن' عکرمہ' جابر بن زید اور عطاء نے کہی۔ اسی کی مثل سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے نحاس نے اپنی کتاب ناسخ میں ذکر اس کا کیا ہے' ابوالشیخ اور ابن مردویہ بھی ان سے بیان کرتے ہیں، اس روایت میں ہے کہ یہ سورۂ بدر ہے، یعنی بدر میں نازل ہوئی، اس کی مکمل آیات ۷۵' ۷۶ یا ۷۷ ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے مغرب میں پڑھا کرتے تھے جیسا کہ طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

مضمون نمبر:۱

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ (۱) ''یہ لوگ آپ سے غنائم کا حکم دریافت کرتے ہیں۔''

انفال، نفل کی جمع ہے جس کا معنی ہے غنیمت۔ نفل کا اصل معنی ہے زیادہ اور غنیمت کو نفل اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ زائد مال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے حلال کیا ہے جو کہ ان کے علاوہ دوسروں پر حرام ہے' یا یہ معنی ہے کہ یہ اس سے زائد ہے جو کہ مجاہد اجر حاصل کرتا ہے، ان کے علاوہ نفل دوسرے معانی پر بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً قسم' تلاش' معروف پیداوار۔ اور نافلہ کہتے ہیں زائد نماز کو کیونکہ وہ واجب سے زائد ہوتی ہے اور نافلہ پوتے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ بیٹے سے زائد ہوتا ہے۔

بدر کے دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف اس آیت کے شان نزول کا سبب بنا، کہ نوجوان کہنے لگے یہ مال غنیمت ہمارا حق ہے اس لئے کہ ہم نے جنگ کی اور بوڑھے کہنے لگے کہ ہم تمہارے لئے پرچم کے نیچے، اوٹ تھے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ۔ ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیجئے کہ یہ غنائم اللہ تعالیٰ اور رسول کے ہیں۔'' یعنی ان کا حکم ان دونوں کے ساتھ خاص ہے تمہارے درمیان اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے تقسیم کریں گے، تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اپنی مستدرک میں بیان کرتے ہیں کہ تمہارے لئے اس میں کوئی حکم نہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کی ایک جماعت کا موقف ہے کہ غنیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے لئے خاص تھی اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہ تھا حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ تو وہ آیت اس کی وجہ سے منسوخ ہوگئی۔ یہی بات مجاہد، عکرمہ اور سدی نے کہی۔

ابن زید کہتے ہیں یہ آیت بھی محکم ہے اللہ تعالیٰ نے خمس والی آیت میں اس کا مصرف بیان فرمایا ہے، نسخ نہیں ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ ''سو تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔'' اللہ تعالیٰ نے انہیں تقویٰ، آپس کی اصلاح، اپنی اور رسول کی اطاعت اور ان کے حکم کو تسلیم کرنے کا حکم دیا اور جو ان میں اختلاف پیدا ہو چکا ہے اسے چھوڑنے کا حکم دیا۔

مضمون نمبر:۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا۔(۱۵)

''ایمان والو! جب تم کافروں سے دوبدو مقابل ہو جاؤ۔''

الزحف کہتے ہیں آہستہ آہستہ قریب ہونا اس کا اصل یہ ہے کہ اپنی مقصد کے بل گھسٹنا، پھر یہ ہر اس شخص پر بولا جانے لگا جو جنگ میں دوسرے کی طرف چلتا ہے اور التزاحف ایک دوسرے کے قریب ہونے کو کہتے ہیں، عربی کا محاورہ ہے زحف الی العدو زحفا۔ اور ازدحف القوم۔ یعنی بعض لوگ دوسروں کی طرف چلے۔ زَحْفًا یا تو محذوف فعل کا مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی يَزْحَفُوْنَ زَحْفًا۔ یا یہ مومنین سے حال ہے یعنی اس حال کہ تم کافروں کی طرف چلنے والے ہو یا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے حال ہے یعنی اس حال میں کہ کافر تمہاری طرف چلنے والے ہیں یا فریقین سے حال ہے یعنی آپس میں ٹکرانے والے۔

فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ۔ ''تو ان سے پشت مت پھیرنا۔'' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو روکا کہ کفار سے شکست کھائیں جب ان سے مقابلہ ہو جائے اور ایک دوسرے کے بالمقابل جنگ کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اس آیت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمومی حکم تمام مومنوں کو ہر زمانہ اور ہر حالت میں ہے، سوائے دوبارہ حملہ کرنے یا اپنے گروہ کے ساتھ جا ملنے کے۔

سیدنا عمر، سیدنا ابن عباس، سیدنا ابوہریرہ، سیدنا ابوسعید رضوان اللہ علیہم، ابونصر، عکرمہ، نافع، حسن، قتادہ، زید بن ابی حبیب اور ضحاک رحمہم اللہ سے مروی ہے اور اہل بدر ایسے نہ تھے کہ وہ بھاگتے

اگر وہ بھاگتے بھی تو مشرکوں کی طرف بھاگتے جبکہ اس وقت ان کے علاوہ کرۂ ارض پر کوئی مسلمان نہ تھے اور نبی اکرم ﷺ کے کوئی گروہ نہ تھا' البتہ اس کے بعد ہر کوئی ایک دوسرے کے لئے گروہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی ابوحنیفہ کا موقف ہے۔ وہ کہتے ہیں اس کی تائید یہ فرمان باری تعالیٰ کرتا ہے۔ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ" یہ اشارہ بدر کے دن کی طرف ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت کمزوری والی آیت سے منسوخ ہے۔

جمہور علماء کا موقف ہے کہ یہ آیت محکم اور عام ہے، خاص نہیں اور جنگ سے بھاگنا حرام ہے، اس کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ یہ آیت جنگ بدر کے اختتام کے بعد نازل ہوئی' پہلے قول والوں کا جواب یہ دیا گیا کہ یَوْمَئِذٍ میں بدر کی طرف اشارہ دراصل جنگ کے دن کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سیاق سے معلوم ہوتا ہے اور اس آیت اور کمزوری والی آیت میں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہ آیت اسے مقید کرتی ہے اور اس شرط کے ساتھ جنگ سے بھاگنا جسے اللہ تعالیٰ نے کمزوری والی آیت میں واضح کر دیا حرام ہے۔ اس بات کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ جنگ بدر کے دن اس میں موجود لوگوں کے علاوہ زمین پر کوئی مسلمان نہ تھا، حالانکہ مدینہ میں اس وقت بہت سے لوگ موجود تھے جنہیں نبی اکرم ﷺ نے نکلنے کا حکم نہ دیا کیونکہ آپ ﷺ اور آپ کے ساتھ نکلنے والوں کا شروع میں یہ خیال نہ تھا کہ جنگ ہوگی۔ اس کی تائید ان صحیح اور واضح احادیث سے بھی ہوتی ہے کہ جنگ سے بھاگنا جملہ کبائر میں سے ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ سات تباہ کرنے والی چیزوں سے بچو اور اس میں جنگ سے بھاگنے کا ذکر بھی ہے اسی طرح کی اور احادیث بھی مذکور ہیں۔ اس بحث کی مباحث طویل اور اس کے کئی طرق ہیں، یہ بحث اپنی جگہ پر پوری طرح واضح ہے۔

ابن عطیہ کہتے ہیں ادبار، دبر کی جمع ہے۔ اس آیت میں دبر کی تعبیر فصاحت کی بنا پر ہے کیونکہ اس میں بھاگنے والے کی رسوائی اور مذمت کا ذکر ہے۔

اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ "مگر جو لڑائی کے لئے پینترا بدلتا ہو" التحرف، درست سمت سے ہٹ جانے کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ہے۔ دوران معرکہ جنگی چالوں کو استعمال کرتے ہوئے اور دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے ایک سمت سے دوسری طرف پھرنا، جیسا کہ آدمی انہیں یہ وہم دلائے کہ وہ شکست کھا گیا ہے تاکہ دشمن اس پر چڑھائی کرے، تو یہ اچانک اس پر حملہ کر کے قابو پالے وغیرہ وغیرہ یعنی جو جنگی چالیں ہیں ان کو استعمال کرتے ہوئے، کیونکہ جنگ تو دھوکہ

ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ۔ "یا اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آتا ہو۔" یعنی مسلمانوں کی جماعت جو اس جماعت کے علاوہ ہے جو دشمن کے بالمقابل کھڑی ہے۔ متحرفا اور متحيزا اس لئے منصوب ہیں کہ واپس پھرنے والوں سے مستثنٰی ہیں یعنی جو ان میں سے پیٹھ پھیر کر بھاگے گا، اس آدمی کے علاوہ جو جنگی چال سے پھرے یا اپنی جماعت کی طرف لوٹے۔

اسے حال ہونے کی وجہ سے بھی منصوب پڑھنا جائز ہے اور حرف استثناء کو لغو قرار دیا جائے کہ اس کا کوئی عمل نہیں۔ فَقَدْ بَآءَ "پس وہ لوٹا" یہ شرط کی جزاء ہے اور معنی یہ ہے کہ جو شکست کھا جائے اور جنگ سے بھاگ کھڑا ہو تو وہ اس طرح لوٹا کہ بِغَضَبٍ ناراضی جو کہ مِّنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے سوائے جنگی چال کے لئے پینترا بدلنے والے یا جماعت کے ساتھ ملنے والے کے۔

مضمون نمبر: ۳۰

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا۔ (۳۸)

"اے محمد ﷺ آپ ان کفار سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ باز آ جائیں۔"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان کفار کو یہ بات کہہ دیں گو انہی الفاظ میں کہیں یا ان سے ہٹ کر کوئی اور لفظ استعمال کر لیں۔ ابن عطیہ کہتے ہیں اگر ایسے ہی ہو جیسا کسائی نے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یہ آیت اس طرح ہے کہ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ تَنْتَهُوْا ۔ یعنی خطاب کا صیغہ ہے تو پیغام رسالت صرف انہی الفاظ کے ساتھ پہنچایا جائے گا۔

زمخشری کشاف میں فرماتے ہیں یعنی تو کہہ دے ان کے اس قول کی وجہ سے اور وہ ہے اِنْ تَنْتَهُوْا اگر یہی لفظ ان سے خطاب کے معنی میں ہو تو یوں کہا جاتا اگر تم باز آ جاؤ تو تمہیں معاف کر دیا جائے گا' یہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ کی قراءۃ ہے اور اس سے مماثلت رکھتی ہوئی یہ آیت ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ۔ اس آیت کے ذریعہ ان کے علاوہ دوسروں کو خطاب کیا گیا اس لئے کہ یہ سن لیں تو معنی یہ ہوگا کہ اگر وہ باز آ جائیں اس کام سے جس پر یہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی دشمنی اور اسلام میں داخل ہونے کے بارہ میں آپ سے جنگ کرتے ہیں۔ يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ "تو ان کی دشمنی کی وجہ سے

ان کے سارے گناہ جو پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیئے جائیں گے۔'' ایک قول کے مطابق اس کا معنیٰ ہے اگر وہ کفر سے باز آ جائیں۔

ابن عطیہ کہتے ہیں اس پر جواب شرط کو محمول کرنا ہے، پس انہیں بخش دیا جائے گا جو پہلے گذر چکا اور گزشتہ کی معافی اس لئے ہے کہ وہ کفر سے لوٹ آئے ہیں۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اسلام سابقہ جرائم کو مٹا دیتا ہے۔

مضمون نمبر:۴

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔(۳۹)

''اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ نہ رہے۔''

یعنی کفر شرک وَ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ''اور دین اللہ تعالیٰ ہی کا ہو جائے۔'' اس میں مومنوں کو کفار کے خلاف جنگ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اس کی تفسیر سورۂ بقرہ میں کافی وشافی گذر چکی ہے۔

مضمون نمبر:۵

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ۔(۴۱) ''جان لو کہ تم جس قسم کی غنیمت حاصل کرو۔''

قرطبی فرماتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ اس آیت میں غنیمت سے مراد کفار کا مال ہے جبکہ مسلمان ان پر غلبہ یا رعب کے ساتھ کامیاب ہو کہ غالب آ جائیں۔ مزید فرماتے ہیں لغت اس تخصیص کا تقاضہ نہیں کرتی لیکن شرع نے اس لفظ کو اس قسم کے ساتھ مقید کر کے معروف کر دیا۔

ابن عبدالبر نے دعویٰ کیا کہ اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ کے بعد آتی ہے اور یہ کہ غنیمت کے پانچ حصوں میں سے چار غنیمت حاصل کرنے والے نمازیوں پر تقسیم ہوں گے اور يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ آیت اس وقت نازل ہوئی جب بدری لوگ بدر کی غنیمت کے بارہ میں جھگڑے جیسا کہ اس طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ ایک قول کے مطابق يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ کی آیت محکم ہے، منسوخ نہیں اور رسول اللہ ﷺ کے لئے جو غنیمت ہے وہ نمازیوں میں تقسیم نہ ہوگی، اسی طرح نبی ﷺ کے بعد والے امام کا حکم ہے۔

ماوردی نے اکثر مالکیوں سے یہ بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں امام کے لئے جائز ہے کہ اس غنیمت کو ان سے نکالے، انہوں نے فتح مکہ اور حنین کے واقعہ سے دلیل لی ہے۔

ابو عبیدہ کہا کرتے تھے رسول اللہ ﷺ نے مکہ زبردستی فتح کیا اور اس کے باسیوں پر احسان کر کے مال غنیمت انہیں لوٹا دیا، اسے تقسیم نہ کیا اور اسے مال فئی قرار نہ دیا۔ اہل علم کی ایک جماعت نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ مدینہ کے خمس میں سے چار حصے نمازیوں کے لئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ بیان کیا وہ ابن منذر' ابن عبدالبر' داؤدی' مازری' قاضی عیاض اور ابن عربی ہیں۔ نمازیوں میں غنیمت کی تقسیم اور اس کے طریقہ کار کے بارہ میں بہت احادیث موجود ہیں۔

قرطبی فرماتے ہیں میرے علم کے مطابق کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ یَسْـئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ کی ناسخ ہے، بلکہ جمہور کا قول ہے کہ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ ناسخ ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف اور تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ جو فتح مکہ کا واقعہ ہے اس میں کوئی دلیل نہیں اس لئے کہ علماء اس فتح کے بارہ میں اختلاف کرتے ہیں اور حنین کا واقعہ ہے تو اس میں انصار معاوضہ دیا گیا جبکہ انہوں نے کہا تھا کہ اہل قریش کو غنائم دی گئیں اور ہمیں چھوڑ دیا گیا حالانکہ خود ہماری تلواریں ان کے خون سے رنگین ہوئیں، تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کیا تم اس پر راضی نہیں کہ لوگ دنیا لے جائیں اور تم رسول اللہ ﷺ کو اپنے گھروں کی طرف لے جاؤ؟ یہ مسلم وغیرہ میں مروی ہے۔

آپ ﷺ کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ ایسی بات کہے بلکہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ میں ہر وہ چیز شامل ہے جس پر غنیمت کا لفظ بولا جاتا ہے جبکہ اصلاً وہ دشمن سے غنیمت حاصل کی گئی ہو۔ مِّنْ شَیْءٍ ماموصولہ کا بیان ہے۔ آیت کے عموم سے اجماعی طور پر قیدی خاص ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کا اختیار امام کو ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں اسی طرح اگر امام اعلان کر دے تو مقتول کا چھینا ہوا مال بھی چھیننے والے کو ملے گا۔ ایک قول کے مطابق یہی حکم اس زمین کا ہے جو غنیمت میں حاصل ہو۔ اس بات کو رد کیا گیا ہے کہ زمین کے بارہ میں اجماع منقول نہیں۔

فَـاَنَّ۔ ''پس یقیناً'' یعنی یہ حق اور واجب ہے کہ لِـلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ۔ ''اللہ تعالیٰ اور رسول کے لئے پانچواں حصہ ہے۔'' علماء نے خمس کی تقسیم کے طریقہ کار کے بارہ میں اختلاف کیا ہے اور ان کے چھ اقوال ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا کہنا ہے خمس کو چھ حصوں پر تقسیم کر کے چھٹا حصہ کعبہ کے لئے ہوگا اور یہ اللہ تعالیٰ کا حصہ ہوا۔ دوسرا رسول اللہ ﷺ کے لئے تیسرا اقربی رشتہ داروں کے لئے چوتھا

یتیموں کے لئے۔ پانچواں مسکینوں کے لئے چھٹا اور آخری مسافروں کے لئے۔

(۲) ابو العالیہ اور ربیع کا کہنا ہے کہ غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا ایک حصہ الگ کر کے باقی چار غازیوں میں تقسیم کر دیئے جائیں گے، پھر جو حصہ الگ کیا تھا اس میں ہاتھ ڈال کر جتنا حصہ اس میں آ جائے وہ کعبہ کے لئے الگ کیا جائے گا، پھر اس میں سے باقی حصہ کو پانچ پر تقسیم کر کے رسول اللہ ﷺ کے لئے اور جن کا ذکر آپ ﷺ کے بعد آیت میں ہے ان کے لئے ہوگا۔

(۳) زین العابدین علی بن حسین کہتے ہیں کہ پانچواں حصہ ہمارے لئے ہے، ان سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ تو یتیم مسکین اور مسافر فرماتے ہیں؟ تو وہ فرمانے لگے کہ اس سے ہمارے یتیم، ہمارے مسکین اور ہمارے مسافر مراد ہیں۔

(۴) امام شافعی کا قول ہے خمس کو پانچ پر تقسیم کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا حصہ ایک ہی ہے اسے مسلمانوں کی ضروریات میں صرف کیا جائے گا اور باقی چار حصے، ان چار قسم کے لوگوں میں خرچ کئے جائیں گے جن کا ذکر آیت میں ہے۔

(۵) ابو حنیفہ کا قول ہے کہ پانچواں حصہ تین پر تقسیم کیا جائے گا یتیم مسکین اور مسافر کے لئے۔ رسول اللہ ﷺ کی موت سے جس طرح آپ کے حصہ کا حکم اٹھ گیا اسی طرح آپ کے اقرباء کا حکم بھی اٹھ گیا۔ وہ فرماتے ہیں پانچویں حصہ سے عمارتوں کی درستگی اور مساجد کی تعمیر کی جائے گی اور قضاۃ اور فوج کے کھانے کا انتظام کیا جائے گا۔ اس طرح کا قول امام شافعی سے بھی مروی ہے۔

(۶) امام مالک کا قول ہے کہ یہ حصہ امام کی نظر اور اس کے اجتہاد کے سپرد ہے، وہ اس سے بغیر اندازے اور حساب کے لے سکتا ہے اور اپنے اجتہاد سے غازیوں میں تقسیم کر سکتا ہے اور باقی مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے لئے صرف کر سکتا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں یہی بات چاروں خلفاء رضوان اللہ علیہم نے کہی اور اسی کے مطابق انہوں نے عمل کیا اور اسی پر آپ ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ "اللہ تعالیٰ تمہیں جو مال فئی کے طور پر دیں، تو اس میں سے میرے لئے صرف پانچواں حصہ ہے اور وہ بھی تم پر ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔" اسے پانچ یا تین حصوں میں تقسیم نہ کیا جائے گا اور آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہوا وہ صرف

تنبیہ اور خبر کے لئے تھا کیونکہ وہ لوگ سب سے اہم ہیں جن کی طرف یہ مال لوٹایا جاتا ہے۔

زجاج اس فرمان باری تعالیٰ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ سے۔ استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان میں خرچ کرنا چاہیے اور اس پر اجماع ہے کہ ان اقسام کے علاوہ بھی خرچ کرنا جائز ہے جبکہ ان میں ضرورت دیکھیں۔

وَلِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ۔ ''اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔'' ایک قول کے مطابق بعد والوں کی بجائے صرف ذِي الْقُرْبٰى پر لام کو دوبارہ لانا یہ اس وہم کو دور کرتا ہے جو ان کو نبی اکرم ﷺ کے حصہ میں شریک کرتے ہیں، تو معنی یہ ہوا کہ خمس کا جو پانچواں حصہ ہے، وہ آپ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں کے لئے ہے۔

علماء نے آپ ﷺ کے قرابت داروں کے بارہ میں اختلاف کیا ہے اور ان کے کئی اقوال ہیں:

(۱) اس سے قریش کے تمام لوگ مراد ہیں، یہ بات بعض اسلاف سے مروی ہے اور وہ اس روایت سے دلیل لیتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ صفا پہاڑی پر چڑھے اور قریش کے تمام قبائل کو یہ کہہ کر بلا رہے تھے' اے فلاں کی اولاد، اے فلاں کی اولاد۔

(۲) امام شافعی' احمد' ابو ثور' مجاہد' قتادہ' ابن جریج اور مسلم بن خالد کہتے ہیں، آپ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ: بنو ہاشم اور بنو المطلب ایک ہی چیز ہیں، وہ ہاشم اور عبدالمطلب کی اولاد ہیں' اور آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو آپس میں ملا دیا۔ یہ واقعہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔

(۳) ایک قول کے مطابق یہ خاص کر بنو ہاشم ہیں، یہ بات امام مالک' ثوری اور اوزاعی رحمہم اللہ وغیرہ نے کہی اور یہ علی بن حسین اور مجاہد سے بھی مروی ہے۔ اسی طرح اہل علم نے اس بارہ میں بھی اختلاف کیا ہے کہ ان کا حصہ باقی ہے یا آپ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی ساقط ہو گیا اور باقی سارا حصہ بقیہ تین مصارف پر صرف کر دیا جائے گا؟ اور امام مالک، امام شافعی جمہور کا موقف ہے کہ وہ حصہ باقی اور ثابت رہے گا اور اس میں محتاج و غنی سب برابر ہوں گے، ایک مرد کو دو عورتوں کے حساب سے حصہ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اہل الرائے کا موقف ہے کہ یہ حصہ ساقط ہو جائے گا۔ اس کی تفصیل اپنے اپنے مقامات پر دیکھی جائے۔

مضمون نمبر:٦

وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا۔(٤٦)

''آپس میں اختلاف نہ کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے۔''

اس میں جھگڑنے سے روکا ہے، یہ رائے کا اختلاف ہے کیونکہ اس سے جنگ میں بزدلی پیدا ہوتی ہے، البتہ دلیل کے ساتھ اگر آپس میں جھگڑنا حق کو واضح کرنے کے لئے ہو تو وہ جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ بلکہ اس کا مقررہ شروط کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ فاء جواب نہی کے لئے ہے اور فعل اَن کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور فعل کو تَنَازَعُوْا پر معطوف بنانا بھی جائز ہے جو کہ جازم کی وجہ سے مجزوم ہے۔

وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ۔ ''اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ فعل کو منصوب اور مجزوم دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ تَفْشَلُوْا پر عطف ڈالتے ہوئے دونوں صورتوں میں۔ ہوا سے مراد قوۃ اور مدد ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے الريح فلان۔ جب کوئی کسی کام میں غالب ہے اور الريح الدولة بھی کہا جاتا ہے اسے اپنے کام میں ہوا کے ساتھ ہے کیونکہ داخل ہونے سے تشبیہ دی گئی، وہ ہر چھوٹی جگہ بھی داخل ہو جاتی ہے، اسی معنی میں شاعر کا قول ہے ع

اِذَا هَبَّتْ رِيَاحُكَ فَاغْتَنِمْهَا ... فَعُقْبٰى كُلِّ خَافِقَةٍ سُكُوْنُ

یعنی جب تیری ہوائیں چلیں تو انہیں تو غنیمت سمجھ، کیونکہ ہر جھنڈے کا انجام سکون ہے۔

ایک قول کے مطابق ہوا سے مراد باد صبا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ نبی ﷺ کی مدد کی جاتی تھی۔

مضمون نمبر:٧

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ۔ ''اور اگر تمہیں کسی قوم سے ڈر ہو۔''

معاہدین بنو قریظہ اور بنو نظیر سے اگر آپ ڈرتے ہیں کہ وہ خیانت کریں گے۔ خِيَانَةً۔ ''خیانت کا۔'' یعنی وہ دھوکہ دیں گے یا معاہدہ کو توڑیں گے۔ فَانْبِذْ ''پس توڑ دو۔'' یعنی پھینک دو۔ اِلَيْهِمْ۔ ''ان کی طرف۔'' اس عہد کو جو تمہارے اور ان کے درمیان ہے عَلٰى سَوَآءٍ۔ ''برابری پر۔'' یعنی برابری کی صورت میں۔ تو معنی یہ ہوا کہ انہیں پوری طرح واضح کر کے باخبر کر دو جو سر عام ہو جس میں کوئی نقص نہ ہو اور ان سے اچانک لڑائی کا آغاز نہ کر دو۔

ایک قول کے مطابق عَلٰی سَوَاءٍ کا معنی ہے ایسی صورت میں جو معلومات میں کمی کے اعتبار سے برابر ہو جو ان کے زیادہ قریب اور زیادہ مناسب ہو۔ یا تو ان کے برابر ہوتا کہ وہ تجھے دھوکہ دے کر غداری نہ کریں۔ کسائی کہتے ہیں' برابر کا معنی ہے انصاف، بعض اوقات یہ لفظ درمیانہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ اسی معنی فرمان الٰہی فِیْ سَوَاءِ الْجَحِیْمِ ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے کہ اعلانیہ ہو، خفیہ نہ ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر معاہدہ کرنے والے کے متعلق جن سے اس میں کوتاہی کا اندیشہ ہو، یہ آیت عام ہے۔ ابن عطیہ کہتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بنو قریظہ کا معاملہ فرمان الٰہی سے ختم ہو گیا۔ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ۔ ''پھر اللہ تبارک و تعالیٰ اس آیت میں اس حکم سے ابتداء کرتے ہیں کہ آئندہ جن سے خیانت کا ڈر ہو ان سے کیا کیا جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۔ ''اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔'' یہ ماقبل کی علت اور وجہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کو ڈانٹا گیا ہو کہ جب تک انہیں برابری میں اطلاع نہ دو اس وقت اچانک حملہ نہیں کرنا اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس قوم کی طرف لوٹے جن سے خیانت کا ڈر ہو۔

مضمون نمبر: ۸

وَ اَعِدُّوْا لَـهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔

''تم ان کے مقابلہ کے لئے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ قوت کو تیار رکھنے کا حکم دے رہے ہیں، یعنی ہر وہ چیز جس سے جنگ میں طاقت حاصل کی جاتی ہے اور اسلحہ اور تیر وغیرہ اسی معنی میں ہیں۔ صحیح مسلم وغیرہ میں یہ حدیث موجود ہے کہ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ خبردار قوت سے مراد تیر اندازی ہے، آپ ﷺ نے یہ جملہ تین مرتبہ دہرایا۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد قلعے اور مورچے ہیں، یہ معانی بھی اسی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت اور متعین ہیں۔

وَ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ ۔ ''اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی۔'' ابو حاتم کہتے ہیں' الرباط من

الخیل‘ کا معنی ہے خمس یا اس سے زائد گھوڑے تیار رکھو۔ یہ وہ گھوڑے ہیں جو دشمن کے بالمقابل پہرہ پر متعین ہیں اسی معنی میں شاعر کا قول ہے ع

اُمِرَ الْاِلٰـــــہُ بِرَبْطِهَا لِعَدُوِّهٖ فِی الْحَرْبِ اِنَّ اللّٰهَ خَیْرُ مُوَفِّقٍ

معبود حقیقی نے جنگ میں دشمن کی سرکوبی کے لیے گھوڑے باندھنے یعنی تیار رکھنے کا حکم دیا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہتر توفیق دینے والے ہیں۔

زمخشری کشاف میں فرماتے ہیں رباط گھوڑوں کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پہرہ دیتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ رباط کو پہرہ کے معنی میں استعمال کیا جائے اور اس کا ربیط بمعنی فصیل اور فصال کی جمع قرار دیا جانا بھی جائز ہے۔

جس نے قوت کی تفسیر یہ کی کہ ہر وہ چیز جس سے جنگ میں تقویت ملے اس نے گھوڑے کو اسی پر معطوف کیا ہے اس صورت میں کہ خاص کا عام پر عطف ڈالا جائے۔

تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ۔ ”کہ اس سے تم اللہ تعالیٰ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو۔“ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، ترہیب کا معنی ہے کسی کو خوف زدہ کرنا بہ کی ضمیر ما کی طرف لوٹتی ہے جو مَا اسْتَطَعْتُمْ میں ہے یا اس مصدر کی طرف لوٹتی ہے جو واعدوا سے سمجھ آ رہا ہے یعنی الاعداد۔ اللہ تعالیٰ اور ان کے دشمنوں سے مراد اہل مکہ اور ان کے علاوہ اہل عرب کی مشرک ہیں۔

مضمون نمبر:۹

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَـهَا۔(۶۱)

”اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی صلح کی طرف جھک جائیں۔“

جنوح کا معنی جھکنا اور السلم کا معنی صلح کرنا ہے۔ اہل علم کا اختلاف ہے کہ آیا یہ آیت محکم ہے یا منسوخ؟ ایک قول کے مطابق یہ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ سے منسوخ ہے۔ یہ بات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہی۔ ایک قول کے مطابق یہ منسوخ نہیں کیونکہ اس سے مراد ان لوگوں سے جزیہ لینا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد حکام نے جزیہ وصول کیا تو یہ اہل کتاب سے خاص ہے، یہ بات مجاہد نے کہی۔ ایک قول یہ ہے کہ اگر مشرک صلح کی دعوت دیں تو اسے قبول کرنا جائز ہے اور جو لوگ مشرکوں سے صلح کرنے سے روکتے ہیں تو وہ آیت کریمہ فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى

السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ کو لیتے ہیں اور اس کام کے عدم جواز کی قید اس صورت میں لگاتے ہیں کہ جب مسلمان عزت وقوت میں ہوں اور جب ایسے حالات نہ ہوں تو پھر صلح کر لینا جائز ہے جیسا کہ یہ عمل آپ ﷺ نے مشرکوں سے عارضی جنگ بندی کر کے کیا۔ خلفاء اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہی موقف رہا۔ اہل علم کی باتیں اس مسئلہ میں معروف اور اپنی جگہ لکھی ہوئی ہیں۔

مضمون نمبر:۱۰

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔(۶۶)

”اچھا اب اللہ تعالیٰ تمہارا بوجھ ہلکا کرتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ تم میں ناتوانی ہے، تو اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے۔“

اس میں ایک آدمی پر واجب قرار دیا کہ وہ دو کافروں کے مقابلہ میں ثابت قدمی دکھائے۔ ایک قول کے مطابق اس بیان میں کہ ایک سو دو سو پر اور ایک ہزار دو ہزار پر غالب آئیں گے اس میں خوشخبری ہے مسلمانوں کو کہ اسلام کے لشکر دس، سو اور ہزاروں سے زیادہ ہو جائیں گے۔ اہل علم کا اختلاف ہے کیا یہ تخفیف نسخ کے حکم میں ہے یا نہیں؟ تو یہاں اس اختلاف کو ذکر کرنے سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔

امام بخاری اور نحاس رحمہ اللہ اپنی ناسخ کی کتاب میں اور ابن مردویہ اور بیہقی رحمہ اللہ اپنی سنن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ جب آیت فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ۔ نازل ہوئی تو یہ مسلمانوں پر بہت بھاری معلوم ہوئی جب یہ بات ان پر فرض کی گئی کہ ایک کے مقابلہ میں جب دس ہوں تو بھاگنا جائز نہیں، تو اس آیت سے تخفیف نازل ہوئی: اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے تعداد میں کمی کر دی تو اسی کے مطابق ان کی طرف سے صبر میں بھی کمی واقع ہو گئی۔

مضمون نمبر:۱۱

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ۔(۶۸)

"نبی کے ہاتھ میں قیدی نہیں ہونے چاہئیں جب تک کہ ملک میں اچھی خونریزی کی جنگ نہ ہو جائے۔"

یہ جہاد کے احکام میں سے دوسرا حکم ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کام نبی کے لئے درست اور بہتر نہیں۔ الاسری۔ اسیر کی جمع ہے اور اسیر کی جمع میں اساری کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ یہ الاسر سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہوتا ہے چمڑے کا تسمہ کیونکہ وہ لوگ اس سے قیدی کو باندھا کرتے تھے۔ ابوعمرو بن علاء کہتے ہیں: الاسری کہتے ہیں جنہیں پکڑنے والے باندھ کر نہ رکھیں اور الاساری کہتے ہیں جنہیں باندھ دیا جائے۔

اثخان کہتے ہیں قتل عام اور اس میں مبالغہ کرنے کو' مقولہ ہے کہ اثمن فلان فی هذا الامر یعنی اس کام میں مبالغہ کیا، تو معنی یہ ہوا کہ نبی ﷺ کے لئے یہ لائق ہے کہ پاس قیدی ہوں تو ان کو خوب قتل کرے۔ ایک قول کے مطابق اثخان کا معنی جگہ حاصل کرنا ہے۔ ایک قول کے مطابق قوت حاصل کرنا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ خبر دی کہ بدر کے دن مشرکوں کا قتل ان کو قید کرنے اور فدیہ لینے سے زیادہ بہتر تھا، پھر جب مسلمان بکثرت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں گنجائش دے دی اور فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اس کے بعد احسان کر کے یا فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دو۔

مضمون نمبر: ۱۲

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔(۷۲)

"وہ لوگ جو ایمان لائے۔"

مکہ مکرمہ میں رہنے والوں میں سے۔ وَلَمْ یُهَاجِرُوْا۔ "اور انہوں نے وہاں سے ہجرت نہیں کی۔" یہ مبتدا ہے اس کی خبر مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ ہے "تمہارے لئے ان کی کچھ بھی رفاقت نہیں۔" یعنی ان کی مدد کرنا اعانت وغیرہ اور حق وراثت بھی نہیں اگرچہ وہ تمہارے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ مِنْ شَیْءٍ "کچھ بھی" کیونکہ انہوں نے ہجرت نہیں کی۔ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا "یہاں تک کہ وہ ہجرت کر لیں" تو ان کے وہی حقوق ہوں گے جو پہلے گروہ کے ہیں جو ایمان اور ہجرت دونوں کو جمع کئے ہوئے ہیں۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ۔ "ہاں اگر وہ تم سے دین کے بارہ میں مدد طلب کریں" یعنی وہ لوگ جو ایمان تو لا چکے ہیں اور ابھی تک ہجرت نہیں کی' جب وہ مشرکوں کے خلاف اپنے

لئے تم سے مدد کا مطالبہ کریں تو فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ "تم پر ان کی مدد کرنا ضروری ہے۔" یعنی تم پر واجب ہے۔ اِلَّا ہاں اگر وہ تم سے مدد طلب کرتے ہیں۔ عَلٰی قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ "ایسی قوم کے خلاف کہ جن کا تمہارے ساتھ عہد و پیمان ہے" تو تم ان کی مدد نہ کرو اور اس عہد کو نہ توڑو جو تمہارے اور اس قوم کے درمیان ہے حتیٰ کہ اس معاہدہ کی مدت پوری ہو جائے اور وہ مدت دس سال ہے۔

مضمون نمبر: ۱۳۰

وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ۔ (۷۵)

"اور رشتے ناطے والے ان میں سے بعض بعض سے زیادہ نزدیک ہیں۔"

دوسروں سے ان میں سے کہ ان میں اور ان میں وراثت کا کوئی رشتہ نہیں۔ ان سے مراد قریبی رشتہ دار ہیں یہ ہر قرابت دار کو شامل ہے۔ ایک قول کے مطابق ان سے مراد یہاں صرف عصبہ ہیں جیسا کہ عرب کہا کرتے ہیں "صلتك رحم" "تم رشتہ داری ملاؤ تو اس سے ان کی مراد ماں کی طرف سے قرابت نہیں ہوتی۔ یہ بات آپ پر پوشیدہ نہیں کہ یہاں اس بات سے کوئی رکاوٹ نہیں کہ یہ غیر عصبہ پر بولا جائے، حالانکہ اس آیت سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو ذوی الارحام کے لئے وراثت ثابت کرتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو عصبہ اور ذوی الفروض نہیں ہوتے۔ وراثت کے اہل علم کی اصطلاحات کے مطابق اس میں اختلاف معروف ہے جو کہ اپنی جگہ لکھا ہوا موجود ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ آیت دوستی اور مدد کی وجہ سے وراثت کے حق داروں کے لئے ناسخ ہے، ان کے نزدیک جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ کی گذشتہ تفسیر کی ہے اور جو اس کے بعد وراثت کے بارہ میں ذکر ہوا، البتہ جس نے مدد اور تعاون کے بارے میں تفسیر کی تو اس نے اس آیت کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے خبر قرار دیا کہ قرابت والے ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ۔ "اللہ تعالیٰ کی کتاب میں" یعنی اس کے حکم یا لوح محفوظ یا قرآن میں۔ اس میں وراثت کی قربت زیادہ قریب سے شامل ہے کیونکہ اس کا سبب موجود ہے' اور اس سے میری مراد قرابت ہے۔

سورة براءت (توبہ)

اس کی آیات ایک سوتیں یا انتیس ہیں، اس کے کئی نام ہیں جن میں سے ایک نام سورۃ توبہ ہے، کیونکہ اس میں مومنوں کی توبہ کا ذکر ہے' اس کا نام فاضحہ بھی ہے، یعنی رسوا کر دینے والی، کیونکہ یہ ان منافقوں کے بارہ میں مسلسل نازل ہوتی رہی یہاں تک کہ قریب تھا کہ کسی ایک کا بھی تذکرہ نہ چھوڑے، اس کا نام بحوث بھی ہے کیونکہ یہ منافقوں کے دوسروں سے رازوں پر بحث کرتی ہے۔ یہ سورۃ مدنی ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس پر اتفاق ہے۔ ابوالشیخ' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ سورۃ براء فتح مکہ کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔

مضمون نمبر:1

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔(1)

"اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے بیزاری کا اعلان ہے۔"

یہاں ھذہ محذوف ہے، یہ اعلان برأت ایک محاورہ ہے، کہا جاتا ہے کہ برئت من الشیء ابراء براءۃ۔ میں اس سے بری ہوں، اور "انا منه بریٔ" یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب تو خود سے کسی کو دور کر دے اور اس تعلق کو توڑ دے جو تیرے اور اس کے درمیان ہے۔ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ "ان مشرکوں کے بارہ میں جن سے تم نے عہد و پیان کیا تھا۔" عہد کہتے ہیں اس پختہ عقد کو جو قسم سے پختہ کیا جائے اس میں مسلمانوں سے خطاب ہے۔

مسلمانوں نے مکہ اور ان کے علاوہ دوسرے مشرکوں سے معاہدہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس معاہدہ سے بری ہیں، اس وجہ سے جو کفار کی طرف سے ہو چکا کہ انہوں نے معاہدہ توڑ دیا تو ان کا وعدہ انہی کی طرف پھینک دیا گیا جو کہ مسلمانوں میں سے معاہدہ کرنے والوں پر لازم تھا کہ اسے نبھائیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی براءۃ کا معنی اسی اللہ کی طرف سے اجازت کا ملنا ہے کہ مسلمان مشرکوں کی طرف سے معاہدہ توڑنے کی بنا پر ان سے معاہدہ ختم کر دیں، اس میں براءۃ کی زبردست شان اور اس کی دہشت کا اظہار ہے اور مشرکوں پر ذلت اور رسوائی کو درج کرنا مقصود ہے جو کسی سے

پوشیدہ نہیں۔ فَسِیۡحُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ۔ ”اے مشرکو! تو تم چلو پھرو زمین میں۔“ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ ۔ ”چار ماہ تک۔“ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اس براءۃ اور بیزاری کی اطلاع دینے کے بعد سیر کرنے کا حکم ہے اور سیاحت کہتے ہیں سیر کرنے کو۔ مقولہ ہے کہ فلاں نے زمین کی سیر کی۔ یسیح سیاحة وسیوحا و سیحانا سے یہ باب آتا ہے۔

آیت کا معنی یہ ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مشرکوں کی طرف سے معاہدہ پھینک دینے کے بعد مشرکوں کے لئے زمین میں گھومنا پھرنا جائز قرار دیا کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہیں گھوم پھر لیں سیر وسیاحت کر لیں، لیکن چار ماہ کے بعد جنگ کے لیے تیار رہیں۔ اس سیاحت سے مراد یہ نہیں کہ وہ اس سیر کے ذمہ دار اور مکلف ہو گئے ہیں۔

محمد بن اسحق رحمہ اللہ وغیرہ کہتے ہیں مشرکوں کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ ہے جن کے معاہدہ کی مدت چار ماہ سے تھوڑی تھی، تو انہیں چار ماہ تک مہلت دے دی اور دوسری قسم وہ تھی جن کے معاہدہ کی مدت اس سے زیادہ تھی تو اس مدت کو کم کر کے چار ماہ کر دیا تا کہ یہ لوگ خود کو اس کے بعد ہونے والی جنگ کے لئے تیار کر لیں جو اللہ تعالیٰ اس کے رسول اور مومنوں کے ساتھ ہوگی اور ان کے بارہ میں حکم یہ ہے کہ یہ جہاں بھی ہوں انہیں قتل کر دیا جائے۔ اس مدت کی ابتداء حج اکبر کے دن سے ہوگی اور اختتام دس ربیع الآخر کو ہوگا۔ البتہ جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا ان کی مدت حرمت والے ماہ ختم ہونے تک ہے، یہ پچاس دن ہیں بیس دن ذی الحجہ کے اور محرم کا پورا مہینہ۔

کلبی کہتے ہیں: چار ماہ کی مدت اس کے لئے ہے کہ ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان چار ماہ سے کم معاہدہ تھا اور جن کا معاہدہ اس سے زیادہ تھا تو اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس معاہدہ کو فرمان الٰہی: فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰى مُدَّتِهِمۡ کے ذریعہ پورا کریں۔ اس بات کو جریر وغیرہ نے فرمان باری تعالیٰ اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ثُمَّ لَمۡ يَنۡقُصُوۡكُمۡ شَيۡــًٔا راجح قرار دیا۔ ”بجز ان مشرکوں کے علاوہ جن سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے اور انہوں نے تمہیں ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا“ یعنی ان کی طرف سے معاہدہ میں معمولی سی بھی دراڑ نہیں آئی، اگرچہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ مشرکوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے معاہدہ توڑا اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے معاہدہ نہیں توڑا تھا۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو اجازت دی کہ جس نے توڑ دیا اس کے ساتھ معاہدہ ختم کر دو اور جس نے ایسا نہ کیا اس کے ساتھ

مقررہ مدت تک وفا کرو۔

وَلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ۔ ''نہ کسی کی تمہارے خلاف مدد کی۔'' المظاهرہ کا معنی ہے تعاون کرنا، یعنی انہوں نے تعاون نہ کیا۔ اَحَدًا ''کسی کا'' تمہارے دشمنوں میں سے۔ فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ ''تو تم بھی ان کے معاہدہ کی مدت ان کے ساتھ پوری کرو'' الی مدتهم'' یعنی ان سے کیا ہوا معاہدہ پورا کرو اس مدت میں کمی نہ کرو جو تم نے ان سے مدت مقرر کی ہے اگرچہ وہ چار ماہ سے زائد ہو۔

ان سے ایسا معاملہ نہ کرو جو انہوں نے کیا کہ لڑائی کر کے اس مدت کو توڑ دیا مذکورہ مدت چار ماہ یا پچاس مختلف اقوال کی وجہ سے کہ جن کا اوپر تذکرہ ہوا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ۔ ''اللہ تعالی پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے پھر حرمت والے ماہ کے گذرتے ہی مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔''

مہینوں کا گذرنا یہ ہے کہ ایک ایک کر کے سارے گذر جائیں جیسا کہ جسم سے چمڑے کو آہستہ آہستہ اتارا جاتا ہے۔ یہاں وقت مقرر کرنے والے کا اس کے وقت سے نکلنے کو تشبیہ دی ہے کسی جگہ رہنے والے سے جو اپنی جگہ سے الگ ہو جاتا ہے۔ علماء نے ان حرمت والے مہینوں کے بارہ میں اختلاف کیا ہے جو یہاں مذکور ہیں؟ ایک قول کے مطابق یہ وہی حرمت والے ماہ ہیں جو معروف ہیں یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب، تین اکٹھے اور ایک اکیلا ہے۔ اس بناء پر آیت کا معنی ہوا کہ جن سے معاہدہ نہیں ان مشرکوں سے ان مہینوں میں لڑائی سے رکنا لازم ہے۔

یہ اعلان اور مشرکوں کی طرف ان کے معاہدہ کو قربانی کے دن پھینکا گیا تو حرمت والے مہینوں سے وہ تین مسلسل مہینوں میں سے پچاس دن باقی رہ گئے جو کہ محرم الحرام کے گذرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مشرکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جہاں بھی ہوں حل میں یا حرم میں۔ یہی بات اہل علم کی ایک جماعت نے کہی ہے، ان میں سے ضحاک بھی ہیں۔ یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور ابن جریر نے بھی اسے پسند کیا ہے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد معاہدہ کے ماہ ہیں جن کی طرف فرمان الٰہی: فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ۔ اشارہ کیا گیا ہے'' اور انہیں حرام کہہ دیا گیا کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان مہینوں میں مسلمانوں پر حرام کیا ہے کہ مشرکوں کا خون بہایا جائے یا ان سے جھگڑا وغیرہ کیا جائے۔ یہ موقف اہل علم کی ایک جماعت کا ہے جن میں سے مجاہد، ابن اسحٰق، ابن زید اور عمرو بن

شعیب ہیں۔ایک قول کے مطابق یہ مہینے وہ ہیں جو آیت فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ میں مذکور ہیں۔" یہ بات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک جماعت سے مروی ہے اسے ابن کثیر نے راجح قرار دیا ہے اور اسے مجاہد' عمرو بن شعیب' محمد بن اسحق' قتادہ' سدی اور عبدالرحمن بن زید بن اسلم سے بیان کیا ہے۔

وَخُذُوْهُمْ۔ "انہیں پکڑو" یعنی انہیں "اخیذ" قید کرو کیونکہ اخیذ کا معنی قیدی ہوتا ہے۔اور وَاحْصُرُوْهُمْ۔ "انہیں گھیرو" یعنی وہ مسلمانوں کی اجازت کے بغیر ان کے شہروں میں تصرف اور آمدورفت نہیں کرسکتے۔وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ۔ "اور ان کی تاک میں ہر گھاٹی میں جا بیٹھو" یعنی ایسی جگہ جا بیٹھو، جہاں سے دشمن کی نگرانی کی جا سکے۔

یہ آیت اپنے ضمن میں حرمت والے مہینے گذر جانے کے بعد ہر اس مشرک کے لئے جو اس مکہ سے نہ نکلے قتل کا حکم لئے ہوئے ہے، سوائے اس کے جسے سنت خاص کر دے مثلاً عورت' بچہ اور ایسا عاجز و کمزور جو جنگ نہ کر سکتا ہو۔اسی طرح وہ اہل کتاب بھی اس سے خاص ہو جاتے ہیں جو اس مقدار میں جزیہ ادا کرتے ہیں، جو مشرکوں پر لاگو ہوتا ہے۔یہ آیت ان تمام آیات کو منسوخ کرتی ہے جس میں مشرکوں سے مونہہ موڑنے اور ان کی تکالیف پر صبر کرنے کی تلقین ہے۔

ضحاک' عطاء اور سدی کہتے ہیں یہ آیت فرمان الٰہی: فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً سے منسوخ ہے اور قیدی کو باندھ کر نہ قتل کیا جائے بلکہ اس پر احسان کر کے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کہتے ہیں بلکہ یہ اس آیت: فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً کی ناسخ ہے کہ مشرک قیدیوں کے بارہ میں سوائے قتل کے کوئی صورت جائز نہیں۔ابن زید کہتے ہیں کہ دونوں آیات اپنی اپنی جگہ محکم ہیں۔قرطبی کہتے ہیں: یہی بات درست ہے کیونکہ احسان کرنا قتل کرنا اور فدیہ لینا یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس پہلی جنگ یعنی بدر کے دن تھا۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ۔ "ہاں اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں" یعنی وہ شرک سے توبہ کریں جو وجہ اور سبب ہے قتل کا اور توبہ ثابت کریں گے ایسے کام سے جو کہ ارکان اسلام میں سب سے بڑا ہے یعنی نماز کا قیام' اس رکن کو ذکر کرنا کافی سمجھا گیا ان تمام ارکان سے جو بدنی عبادات کے متعلق ہیں کیونکہ یہ ان تمام کی اصل ہے اور دوسرا رکن مالی، یعنی زکوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر کر کے کافی سمجھا گیا ہر اس عبادت سے جو مال سے متعلق ہے کیونکہ یہ ان میں سب سے بڑا رکن ہے۔

فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ۔ ''تو تم ان کے راستے چھوڑ دو'' یعنی ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو، انہیں قید نہ کرو ان کا گھیراؤ نہ کرو اور نہ ہی انہیں قتل کرو۔

مضمون نمبر:۲

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ۔

''اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے۔''

مقولہ ہے 'استجرت فلانا' یعنی میں نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ میرا ہمسایہ ہو جائے، یعنی حمایتی محافظ ہو جبکہ کوئی مجھ پر ظلم کرے یا کوئی مجھ سے جھگڑا کرے۔

تو معنی یہ ہوا کہ اگر ان مشرکوں میں سے کوئی بھی تجھ سے پناہ طلب کر لے جن سے لڑنے کا تجھے حکم دیا گیا ہے۔ فَاَجِرْهُ ''تو تو اسے پناہ دے'' یعنی تو اس کا ہمسایہ بن کر اس کو امن اور حمایت دے۔ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ۔ ''یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے'' یعنی وہ تجھ سے کلام سن کر اچھی طرح اس میں غور و فکر کرے اور اس حقیقت سے واقف ہو جائے جس کی طرف اسے بلایا جا رہا ہے۔ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ۔ ''پھر اسے اپنی جائے امن تک پہنچا دے'' یعنی اس گھر تک جس میں وہ بے خوف ہو کر رہے گا، کلام اللہ سن لینے کے بعد اگر وہ اسلام نہ لائے۔ پھر اس کے جائے امن تک پہنچنے کے بعد آپ سے جنگ کر سکتا ہے کیونکہ وہ تیری پناہ سے نکل گیا اور اپنی اس حالت کی طرف پلٹ گیا جس میں وہ پہلے سے تھا کہ اس کا خون مباح ہو گیا اور اسے قتل کرنا لازم ہو گیا جہاں بھی وہ مل جائے۔

مضمون نمبر:۳

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ۔ (۷)

''مشرکوں کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد کیسے رہ سکتا ہے۔''

یہاں استفہام اس تعجب کو متضمن ہے جس میں انکار ہو۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ ''سوائے ان کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس عہد و پیمان کیا ہے۔'' انہوں نے نہ اس میں کوتاہی کی اور نہ اسے توڑا تو تم بھی ان سے نہ لڑو۔ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ ''تم بھی ان سے وفاداری کرو۔'' ایک قول کے مطابق یہ لوگ بنو بکر تھے اور ایک قول کے مطابق بنو کنانہ اور بنو ضمرہ تھے۔

مضمون نمبر:۴

فَإِنْ تَابُوا۔(۱۱) "اب بھی اگر یہ توبہ کر لیں۔"
شرک سے اور اسلامی احکام کی پابندی کرنے لگیں۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ۔ "اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوۃ دیتے رہیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں" یعنی دین اسلام کے احکام جیسے تمہارے لئے ہیں اسی طرح ان کے لئے ہیں اور جو سزائیں تمہارے اوپر ہوں گی وہی ان پر ہوں گی۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس آیت نے نماز پڑھنے والوں سے جنگ اور ان کا خون بہانا حرام کر دیا ہے۔

مضمون نمبر:۵

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ۔(۱۷)
"لائق نہیں کہ مشرک اللہ تعالیٰ کی مساجد کو آباد کریں۔"

عمارت کا معنی یا تو حقیقی اور ظاہری مراد لیا جائے گا یا مجازی مراد لیا جائے گا اور وہ ہے اس میں ہمیشہ رہنا اور عبادات بجالانا، یہ دونوں کام مشرکوں کے لئے جائز نہیں، البتہ پہلا کام کرنے سے مسلمانوں پر ان کی مساجد تعمیر کر کے احسان جتلایا جائے گا اور دوسری صورت میں کفار کی عبادت کی کوئی حیثیت نہیں حالانکہ انہیں مسجد حرام کے قریب آنے سے بھی روکا گیا ہے تو معنی یہ ہوا کہ مشرکوں کے لئے یہ جائز و درست اور صحیح نہیں کہ وہ یہ کام کریں اس حال میں کہ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ۔ "وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں" یعنی وہ بتوں کو گاڑ کر ان کی عبادت کر کے انہیں الٰہ مانتے ہوئے، اپنے کفر کا اظہار کر رہے ہیں۔ پس یہ ان کی کفر کی گواہی خود اپنے خلاف ہے، اگر چہ وہ لوگ اس کا اپنی زبانوں سے انکار ہی کرتے ہوں، تو دو متضاد چیزیں آپس میں کیسے جمع ہو سکتی ہیں: مساجد کی تعمیر جو کہ مومنوں کا شیوہ ہے اور خود اپنے خلاف کفر کی گواہی، یہ ایسے شخص کی عادت نہیں ہو سکتی جو مسجد کی تعمیر کر کے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونا چاہے؟

ایک قول کے مطابق اس گواہی سے مراد ان کی وہ بات جو وہ طواف کے وقت کہتے تھے کہ لبيك لا شريك لك لبيك: الا شريك هو لك تملكه و ما ملك۔

ایک قول کے مطابق خود اپنے بارہ میں کفر کی گواہی دینے سے مراد یہ ہے کہ یہودی کہے میں

یہودی ہوں، عیسائی کہے میں عیسائی ہوں، صابی بے دین کہے کہ میں بے دین ہوں، اسی طرح مشرک کہے میں مشرک ہوں۔

اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ۔ "ان کے اعمال غارت واکارت ہیں۔" وہ جن پر یہ لوگ فخر کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ اچھے کام ہیں، یعنی وہ ضائع ہو گئے ان کا کوئی اثر نہ رہا۔ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۔ "اور وہ دائمی طور پر جہنمی ہیں۔" اس جملہ اسمیہ میں ظرف کے مقدم کرنے کے ساتھ جو خبر سے متعلق ہے، اس کے مضمون میں تاکید پیدا کرنا ہے۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ "اللہ تعالیٰ کی مساجد کی رونق و آبادی تو ان کا حصہ ہے، جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں اور وہ کام کرے جو ایمان کے لازمی امور میں سے ہیں۔ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ۔ "نمازوں کے پابند ہوں، زکوۃ دیتے ہوں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔" جس میں یہ اوصاف جمع ہوں تو وہ صحیح معنوں میں مساجد کی تعمیر کا حق دار ہے، نہ کہ وہ جو ان تمام صفات سے عاری یا بعض صفات سے عاری ہو۔ یہاں نماز، زکوۃ اور خوف الٰہی کو تنبیہ کے طور پر ذکر کیا کیونکہ یہ دین کے اہم ترین امور میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مقرر کیا ہے کیونکہ تمام فرائض ایمان کے لازمی اجزاء میں سے ہیں۔

مضمون نمبر: ۶

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ۔ (۲۸) "بے شک مشرک بالکل ہی ناپاک ہے۔"

لفظ نجس مصدر ہے، اس کا نہ تثنیہ اور نہ ہی جمع آتا ہے۔ اس آیت سے ان لوگوں نے دلیل لی جو کہتے ہیں کہ مشرک بذات خود نجس ہے جیسا کہ بعض ظاہری لوگوں کا موقف ہے۔

حسن بصری اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے اور پہلے اور بعد والے اسلاف کا موقف بھی یہی ہے، ان میں چاروں مذاہب والے شامل ہیں کہ کافر بذات خود نجس نہیں کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کا کھانا جائز قرار دیا اور نبی اکرم ﷺ کا اس بارہ میں خود اپنا عمل بھی ثابت ہے اور آپ ﷺ کا فرمان بھی موجود ہے کہ یہ لوگ بذات خود نجس نہیں، آپ ﷺ نے ان کے برتنوں میں کھایا اور پیا اور ان میں وضو کیا اور ان کفار کو اپنی مسجد میں ٹھہرایا۔

فَلَا يَقْرَبُوْا۔ "وہ پاس نہ آئیں۔" فاء "تفریع" کے لئے ہے معنی یہ ہوا کہ وہ قریب

اَلْمَسْجِدَ الْحَرَامَ "مسجد حرام کے" نہ آئیں۔ یہ نماز کی نجاست پر متفرع ہے۔ مسجد حرام سے عطاء کی روایت کے مطابق تمام حرام مراد ہے۔ ان کے علاوہ بقیہ اہل علم کا موقف ہے کہ اس سے مراد خود مسجد حرام ہے، اور باقی حرم میں مشرکوں کے داخلہ پر کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں۔

اہل علم کا اختلاف ہے کہ اس کے علاوہ بقیہ مساجد میں مشرک کا داخلہ جائز ہے یا نہیں؟ مدینہ اہل کا موقف ہے کہ ہر مشرک کسی بھی مسجد میں نہیں جا سکتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت تمام مشرکوں کے بارہ میں عام ہے، جو مسجد حرام کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا انہیں اس کے علاوہ بقیہ مساجد میں داخلہ سے نہیں روکا جائے گا۔ ابن عربی فرماتے ہیں: اسے ظاہر پر ہی رکھا جائے گا کیونکہ فرمان باری تعالیٰ: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ہے۔ یہاں اس وجہ کی نشاندہی ہے کہ وہ شرک اور نجاست ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس تو اس واقعہ سے رد ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ثمامہ بن اثال کو اپنی مسجد میں باندھا اور ثقیف کا وفد یہاں ٹھہرایا تھا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی امام شافعی رحمہ اللہ کے قول جیسا منقول ہے، اس میں یہ بات زائد ہے کہ ذمی بغیر ضرورت کے بھی تمام مساجد میں جا سکتا ہے اور امام شافعی نے ضرورت کی قید لگائی ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں: یہ بات مشرکوں کے علاوہ ذمیوں کے لئے جائز ہے۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ان کا حرم میں جانا بھی جائز ہے، پھر مسلمانوں کو روکا ہے کہ وہ انہیں یہاں ٹھہرائیں، تو یہ بات اس معنی میں ہے کہ میں تجھے دوبارہ یہاں نہ دیکھوں۔

بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۔ "وہ اس سال کے بعد۔" اس میں دو اقوال ہیں: ایک یہ کہ یہ نواں سال تھا یعنی جس میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس موسم میں حج کیا۔ دوسرا یہ کہ وہ دسواں سال تھا، یہ بات قتادہ نے کہی۔ ابن عربی کہتے ہیں: یہی درست ہے جو کہ لفظ کا تقاضہ ادا کرتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اسے نواں سال قرار دیا جائے حالانکہ یہ وہ سال ہے کہ جس میں اعلان کا واقعہ ہوا۔ اگر کسی کا غلام کسی دن اس کے گھر میں جائے تو اس کا مالک اسے یوں کہے کہ آج کے بعد تو نے اس گھر میں داخل نہیں ہونا تو اس سے وہ دن مراد نہ ہوگا جس میں وہ آیا تھا۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جو الفاظ مفہوم ادا کر رہے ہیں وہ ان کے گمان اور دعوے کے خلاف ہیں کیونکہ فرمان باری تعالیٰ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا میں اشارہ ہے اسم اشارہ سے پہلے ہی مذکورہ سال کی طرف اور وہی اعلان والا سال ہے۔ اسی طرح اس مقولہ میں جس میں مراد ذکر ہوئی کہ یہاں آنے سے روکا ہے اس دن کے بعد جس میں یہ اعلان ہوا اور حکم تو ظاہر ہے پوشیدہ نہیں۔

شاید انہوں نے بعد کو الی عامهم کی طرف مضاف کرنے کی تفسیر کے ارادہ سے کیا ہو۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ دسواں سال ہے، البتہ جس سال کی طرف ھذا کے ساتھ اشارہ کیا ہے تو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ نواں سال تھا اور اسی پر قتادہ کے قول کو محمول کیا جائے گا۔

ایسے لوگ جو مسجد حرام وغیرہ مساجد میں مشرکوں کے داخلہ کو جائز قرار دیتے ہیں ان کی دلیل یہ قید ہے میری مراد عَامِهِمْ هٰذَا والا جملہ، ان کا کہنا ہے کہ نہی تو حج اور عمرہ کے اوقات کے ساتھ خاص ہے، پس یہ لوگ صرف حج وعمرہ سے روکے گئے ہیں نہ کہ عام داخلہ سے۔ تو اس کا جواب یوں دیا گیا کہ ظاہری طور پر اس سال کے بعد قریب آنے پر منع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رکاوٹ ان تمام اوقات کے لئے ہے جو اس کے بعد ہوں گے، ان میں سے کچھ کو جائز قرار دینا کسی خاص کرنے والی دلیل کا محتاج ہے۔

مضمون نمبر: ۷

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (۲۹)

''ان لوگوں سے لڑو جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حرام کردہ شئے کو حرام نہیں جانتے، نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ ذلیل وخوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔''

اس میں ان لوگوں سے لڑنے کا حکم ہے جن میں یہ صفات موجود ہوں۔

الجزیۃ بروزن فِعْلَۃ ہے جزی یجزی سے، جزیہ شرع میں اسے کہتے ہیں جو معاہدہ کرنے والا اپنے معاہدہ کے خلاف کرے۔ اہل علم کی ایک جماعت کا موقف ہے جن میں امام شافعی، احمد، ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب ثور اور ابو ثور رحمہم اللہ شامل ہیں کہ جزیہ صرف اہل کتاب سے لیا جائے گا۔ امام اوزاعی اور امام مالک رحمہما اللہ کہتے ہیں: کہ جزیہ ہر قسم کے کافر سے لیا جائے گا چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ پہلے قول کے مطابق اہل کتاب میں مجوسی بھی شامل ہیں، ابن منذر فرماتے ہیں کہ میں اس بارہ میں کسی اختلاف سے واقف نہیں کہ ان سے جزیہ لیا جائے۔

اہل علم نے جزیہ کی مقدار میں بھی اختلاف کیا ہے، عطاء فرماتے ہیں اس کی کوئی مقررہ مقدار نہیں اور جو مقدار طے ہو جائے وہی لی جائے' یہی بات یحییٰ بن آدم' ابوعبید اور ابن جریر نے کہی مگر انہوں نے یہ بھی کہا کہ کم از کم ایک دینار ہو اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مال دار اور محتاج پر ایک دینار ہے جو آزاد اور بالغ ہوں اس میں کمی نہ ہوگی' یہی بات ابوثور نے کہی۔ امام شافعی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ اگر اس سے زائد پر مصالحت ہو جائے تو زائد لینا جائز ہے اور جب یہ بڑھا دیا جائے اور یہ عمل انہیں ناگوار نہ ہو تو ان سے وصول کیا جائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سونا رکھنے والے پر چار دینار ہیں اور چاندی رکھنے والے پر چالیس درہم ہیں، مال دار اور محتاج اس میں برابر ہیں اگرچہ وہ مجوسی ہو اس میں نہ اضافہ ہوگا اور نہ ہی کمی ہوگی۔

ابوحنیفہ ان کے ساتھی محمد بن الحسن اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ بارہ' چوبیس اور اڑتالیس لئے جائیں گے، اس بارہ میں کلام اپنی جگہ لکھی جا چکی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان اقوال میں سب سے درست بات وہ ہے جو ہم نے منتقی کی اپنی شرح میں اور دوسری تالیفات میں لکھ دی ہے۔ ان پر سید علامہ محمد الامیر سبقت لے گئے، انہوں نے اس مسئلہ پر مستقل رسالہ لکھ کر اس میں اس کے احکام ذکر کر دیئے ہیں اور اس کا نام انہوں نے **افادۃ الامۃ باحکام اھل الذمۃ** رکھا ہے، انہوں نے اسے بہت عمدہ اور مفید لکھا ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر اپنی بلوغ المرام کی شرح میں گفتگو کی ہے اس کی طرف لوٹنا چاہیے۔

مضمون نمبر: ۸

وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ۔ (۳۴)

"جو لوگ سونے اور چاندی کو خزانہ کرتے ہیں۔"

ایک قول کے مطابق ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا، درویش اور زاہد لوگ' ایسا کیا کرتے تھے۔ ایک قول کے مطابق ان سے مراد وہ ہیں جو مسلمانوں میں سے ایسا کریں۔ سب سے مناسب یہ ہے کہ آیت کو لفظ کے عموم پر ہی محمول کیا جائے جو کہ زیادہ وسیع ہے۔ لغوی اعتبار سے کنز کہتے ہیں اکٹھا کرنا اور جمع کرنا اور یہ سونے چاندی کے ساتھ خاص نہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کنز ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے مل کر جمع کی جائے، خواہ وہ زمین کے اندر ہو یا باہر۔

جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی جائے آیا اس کا نام کنز رکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اہل علم نے اس مال کے بارہ میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قول ہے کہ وہ کنز ہے اور دوسرا قول ہے کہ وہ کنز نہیں۔ دوسرے قول کے قائل: سیدنا عمر بن خطاب' سیدنا ابن عمر' سیدنا ابن عباس' سیدنا جابر رضی اللہ عنہ ابو ہریرہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وغیرہ۔ یہی بات درست ہے کیونکہ واضح دلائل موجود ہیں کہ جس کی زکوٰۃ ادا کردی جائے وہ کنز نہیں رہتا' صرف سونے اور چاندی کو باقی تمام اموال سے ذکر کے اعتبار سے خاص کیا ہے کیونکہ یہ چیزوں کی قیمتیں ہیں اور اکثر اوقات یہی خزانہ کے طور پر رکھی جاتی ہیں اگر ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز کنز کے طور پر رکھی تو اس پر بھی کنز کی حرمت کا حکم ہوگا۔

وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَـہَا۔ ''اور خرچ نہیں کرتے۔'' یہ اشارہ ہے زکوٰۃ وغیرہ ادا نہ کرنے کی طرف فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَـبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ۔ ''اللہ تعالیٰ کے راستہ میں انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجئے۔''

مضمون نمبر: ۹

اِنَّ عِدَّۃَ الشُّہُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰہِ اثۡنَا عَشَرَ شَہۡرًا۔(۳۶)

''مہینوں کی گنتی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتاب اللہ میں بارہ کی ہے۔''

یعنی وہ بارہ ماہ اللہ تعالیٰ کے حکم فیصلہ اور حکمت کے مطابق ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب کسی خاص حکم کا کسی وقت میں حکم دیا تو کفار نے ان اوقات کو کمی بیشی کر کے تبدیل کر دیا' پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے اصل حکم کی خبر دی۔ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ''اسی دن سے جب سے آسمان وزمین کو اس نے پیدا کیا ہے۔''

اس آیت میں یہ وضاحت ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ مہینے بنائے اور اس نے خود اپنی مرضی سے اس معروف ترتیب کے مطابق نام رکھے جس دن آسمان وزمین کو اس نے پیدا کیا' یقیناً یہی وہ ترتیب ہے جس میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے اور ان مہینوں میں کتابیں نازل ہوتی رہیں' اور ان مہینوں کا کوئی اعتبار نہیں جو عجمیوں' رومیوں اور قبطیوں کے ہاں معروف ہیں اور انہوں نے ان مہینوں میں سے کسی کے تیس دن بنائے اور کسی کے کم یا زیادہ بھی بنائے ہوئے ہیں، یہاں صرف قمری مہینوں کا تذکرہ ہے جو ۲۹ یا تیس دن کے بعد نئے چاند کے طلوع ہونے پر شروع ہوتا ہے۔

مِنۡہَاۤ اَرۡبَعَۃٌ حُرُمٌ ۔ ''ان میں سے چار حرمت وادب کے ہیں۔'' وہ ذوالقعدہ' ذوالحجہ' محرم

اور رجب ہیں۔ تین پے در پے اور ایک الگ ہے جیسا کہ ان کی وضاحت سنت مطہرہ میں موجود ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۔ یہی درست دین ہے، یعنی ان مہینوں کا اسی طرح ہونا ہی درست ہے ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی درست دین اور صحیح حساب ہے اور پوری تعداد بھی اسی طرح ہی ہے۔

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ۔ ”تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔“

یعنی ان حرمت والے مہینوں میں جنگ شروع کر کے اور ان کی حرمت پامال کر کے ظالم نہ بنو۔ ایک قول کے مطابق هِنَّ کی ضمیر تمام مہینوں کی طرف جاتی ہے وہ حرمت والے ہوں یا ان کے علاوہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان میں ظلم کرنے سے روکا ہے۔

پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

اہل علم کی ایک جماعت کا موقف ہے کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے کی حرمت ثابت اور محکم ہے اس آیت اور مندرجہ آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ۔ اور فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ سے منسوخ نہیں ہوئی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ مشرکوں سے جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے کا حکم حرمت والے مہینے گذرنے کے ساتھ مقید ہے جیسا کہ مذکورہ آیت میں ہے، تو ایسی تمام آیات جن میں جنگ کا حکم ہے تو وہ ان احکام کے ساتھ مقید ہیں، جو حرمت والے مہینوں میں جنگ کی حرمت کے بارہ میں ہیں۔

البتہ جنہوں نے اس بات کو دلیل بنایا کہ آپ ﷺ نے طائف کا حرمت والے مہینہ میں محاصرہ کیا، یعنی ذوالقعدہ میں جیسا کہ صحیحین وغیرہ میں موجود ہے تو ان کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ان کا محاصرہ تو شوال میں کیا گیا نہ کہ ذوالقعدہ میں اور حرام تو یہ ہے کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ شروع کی جائے نہ کہ ختم کرنا حرام ہے اور یہی صورت تمام دلائل کو آپس میں جمع کرنے کی ہے۔

مضمون نمبر: ۱۰

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ۔ ”اور تم تمام مشرکوں سے جہاد کرو۔“

یعنی سارے مشرکوں سے' یہ حال کی جگہ پر مصدر ہے۔ زجاج کہتے ہیں اس طرح کے اور بھی مصادر ہیں مثلاً عامۃ خاصۃ، نہ ان کی نہ جمع آتی ہے اور نہ ہی تثنیہ۔ كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ”جیسے کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں۔“ اس میں مشرکوں سے جنگ کے لازم ہونے کی دلیل ہے

اور یہ سب پر فرض ہو جائے گی اگر کچھ لوگ اس کی ادائیگی نہ کریں۔

مضمون نمبر:۱۱

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا۔(۴۱)

''نکل کھڑے ہو جاؤ ہلکے پھلکے ہو تو بھی اور بھاری بھر کم ہو تو بھی۔''

ایک قول کے مطابق اس سے مراد اکیلے اکیلے اور اکٹھے مل کر' ایک قول کے مطابق خوشی اور ناخوشی سے ایک قول کے مطابق محتاج اور مال دار ایک قول کے مطابق اسلحہ کی کمی یا کثرت کے وقت ایک قول کے مطابق تندرست یا بیمار۔ ایک قول کے مطابق بچوں والے ہوں یا بچوں والے نہ ہوں' ایک قول کے مطابق جو جنگ میں آگے نکل گیا مثلاً حملہ آور یا پیچھے رہ گیا مثلاً چھاؤنی میں، ان کے علاوہ بھی بہت اقوال ہیں۔

اس آیت کو ان تمام معانی پر محمول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں کیونکہ آیت کا معنی ہے نکلو!! کہ تم پر حرکت کرنا آسان ہے یا بوجھل' ایک قول کے مطابق یہ آیت اس فرمان باری تعالیٰ لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَی الْمَرْضٰی سے منسوخ ہے اور ایک قول کے مطابق جس کا ناسخ یہ فرمان الٰہی: فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ محکم ہے منسوخ نہیں اور اس فرمان الٰہی کے ذریعہ اندھا اور لنگڑا اس حکم سے نکل جاتے ہیں: لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ اور بیمار کمزور اس آیت سے نکل گئے: لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَی الْمَرْضٰی ۔ یہ تخصیص کے ذریعہ شامل ہیں جو یہ ہے: خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ۔ اور ظاہر یہ ہے کہ وہ عموم کے تحت داخل اور شامل ہی نہیں۔

وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ''اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنی مال و جان سے جہاد کرو۔'' اس میں مال اور جان لے کر جہاد کرنے کا حکم ہے اور بندوں پر اس حکم کو قبول کرنا لازم ہے۔ پس محتاج اپنی جانیں لے کر جہاد کریں اور مال دار اپنے اموال اور جانیں لے کر جہاد کریں۔

جہاد اسلام کے تاکیدی اور اہم ترین فرائض میں سے ہے اور یہ فرض کفایہ ہے جبکہ کچھ لوگ دشمن سے جہاد یا دفاع میں مصروف ہوں اگر تمام مسلمانوں کے بغیر یہ فریضہ ادا نہ ہو رہا ہو کسی ایک محاذ یا کئی محاذوں پر تو تمام مسلمانوں پر لازم ہو جاتا ہے اور یہ فرض عین بن جاتا ہے۔

مضمون نمبر:۱۲

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (۴۴)

"اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان و یقین رکھنے والے تو مالی اور جانی جہاد سے پیچھے رہنے کی کبھی بھی تجھ سے اجازت طلب نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔"

اس کا معنی وہی ہے جس کا ظاہری الفاظ تقاضہ کر رہے ہیں کہ مومن جہاد میں جانے کی اجازت نہیں لیا کرتے، بلکہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ بغیر توقف کے اس میں جلدی کرتے ہیں اور نہ وہ آپ کی طرف سے اجازت کا انتظار کرتے ہیں چہ جائیکہ وہ آپ سے پیچھے رہنے کی اجازت مانگیں۔

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ ۔ "یہ اجازت تو تجھ سے وہی طلب کرتے ہیں" یعنی جہاد سے بیٹھ رہنے اور پیچھے رہ جانے کی۔ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ جنہیں نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے نہ آخرت کے دن پر یقین ہے۔ یہ منافق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دو مقامات پر پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان پھر روز قیامت پر یقین کو ذکر کیا' کیونکہ یہی دونوں باتیں جہاد پر ابھارنے والی ہیں۔"

مضمون نمبر:۱۳

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ ۔(۶۰) "صدقات صرف۔"

انما قصر کے صیغوں میں سے ہے' صدقات کا تعارف ان جنسوں کے لئے ہے، یعنی ان صدقات کی جنس مندرجہ ذیل اقسام میں محدود ہیں ان سے تجاوز نہیں کرسکتیں۔ بلکہ یہ صدقہ انہی لوگوں کے لئے ان کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں۔

اہل علم کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ کیا ان آٹھ اقسام میں صدقہ کو برابر تقسیم کیا جائے گا یا امام کی رائے یا صدقہ کرنے والے کی رائے کے مطابق۔ کچھ چھوڑ کر دوسروں میں استعمال کیا جا سکتا ہے، پہلی بات کے قائل امام شافعی اور اہل علم کی ایک جماعت ہے اور دوسری بات کے قائل امام مالک اور ابو حنیفہ رحمہما اللہ ہیں، یہی بات سیدنا عمر' سیدنا حذیفہ، سیدنا ابن عباس رضوان اللہ علیہم' ابو العالیہ' سعید بن جبیر اور میمون بن مہران نے کہی ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں یہی اکثر اہل علم کا قول ہے۔

پہلے لوگوں نے آیت میں مذکورہ قصر کو اور اس حدیث کو جو زیاد بن حارث الصدادی کی روایت ابوداؤد اور دارقطنی میں ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا میں نے آپ ﷺ سے بیعت کی تو ایک آدمی نے آ کر کہا مجھے صدقہ میں سے دیجئے، آپ ﷺ نے اسے کہا کہ ان صدقات کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نبی اکرم کے فیصلہ یا اس کے علاوہ کسی کے فیصلے پر راضی نہیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس بارہ میں فیصلہ کر دیا اور اس کی آٹھ اقسام بنائیں اگر تو ان میں سے کسی قسم میں شمار ہوتا ہے تو میں تجھے دیتا ہوں۔

دوسروں نے جواب دیا کہ آیت میں قصر تو صرف خرچ کرنے اور مقامات خرچ کے بارہ میں ہے، نہ کہ ان اقسام میں حصر کو لازم کرنے کے لئے' دوسری بات یہ ہے کہ حدیث کی سند میں عبدالرحمٰن بن زیاد الانعم الافریقی راوی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ دوسروں کے موقف کی تائید اس آیت کریمہ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ سے بھی ہوتی ہے۔ صدقہ کا اطلاق جیسے استحباب پر ہوتا ہے اسی طرح وجوب پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا کہ میں تمہارے مال داروں سے صدقہ لوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دوں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے تو دوسرے قول پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں صحابہ کا اجماع مراد ہوگا کیونکہ ان میں اس بات کا کوئی بھی مخالف نہیں ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ۔ "فقیروں کے لئے اور مسکینوں کے لئے۔" انہیں سب سے پہلے لائے کیونکہ اپنی فاقہ کشی اور ضروریات کی زیادتی کی وجہ سے یہ عام طور پر باقی لوگوں کی نسبت زیادہ محتاج ہوتے ہیں۔

اہل علم نے فقیر اور مسکین کے فرق کے بارہ میں اختلاف کیا ہے، ان کے کئی اقوال ہیں: یعقوب' بن السکیت قتیبی اور یونس بن حبیب کہتے ہیں فقیر اپنی حالت کے اعتبار سے مسکین سے اچھا ہوتا ہے' اس لئے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ ضروریات زندگی موجود ہوں جو اسے کافی ہوں اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو' اس موقف کو فقہاء کی ایک جماعت نے اپنایا ہے ان میں ابوحنیفہ بھی ہیں' دوسروں کا موقف اس کے برعکس ہے، انہوں نے مسکین کو فقیر سے اچھی حالت والا قرار دیا ہے انہوں نے فرمان الٰہی اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ سے دلیل لی ہے' اللہ تعالیٰ نے بتلایا کہ ان کی سمندری کشتی تھی بعض اوقات وہ تمام

مال سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے فقر سے پناہ مانگی ہے باوجود اس کے آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ: اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا۔ ''اے اللہ! مجھے مسکین ہی زندہ رکھنا اور مسکین ہی فوت کرنا۔'' اس موقف کے اہل لغت میں سے اصمعی وغیرہ بھی قائل ہیں، یہ طحاوی نے اہل کوفہ سے نقل کیا ہے اور یہ امام شافعی کا ایک قول ہے یہی موقف ابن القاسم اور امام مالک کے تمام ساتھیوں کا ہے اور یہی بات ابو یوسف نے کہی۔

ایک قوم کا کہنا ہے فقیر اس محتاج کو کہتے ہیں جو سوال سے بچ کر رہے اور اس کو مسکین کہتے ہیں جو سوال کرے، یہ بات الازہری نے کہی اور ابن شعبان نے اسے پسند کیا اور یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایک اقوال ہیں ان سب کو ذکر کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہوگا۔

سب سے عمدہ وضاحت مسکین کی وہ صفات ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے بخاری اور مسلم وغیرہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ مسکین ایسا نہیں جو لوگوں پر گھومے، اسے ایک یا دو لقمے اور ایک یا دو کھجوریں واپس لوٹا دیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا اے اللہ کے رسول تو پھر مسکین کون ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جو بقدر کفایت نہ پائے، نہ وہ محتاج و مسکین معلوم ہوتا ہے کہ اسے صدقہ دیا جائے اور نہ وہ خود لوگوں سے سوال کرتا ہے۔

وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا۔ ''اور ان کے وصول کرنے والوں کے لئے'' یعنی وہ کام کرنے والے جنہیں امام زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر کرے، وہ بھی انصاف کے ساتھ اس کے حق دار ہیں۔ اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ کتنی مقدار لے سکتے ہیں؟ ایک قول کے مطابق قیمت لے سکتے ہیں یہ بات مجاہد اور شافعی سے مروی ہے، ایک قول کے مطابق ان کے کام کے مطابق انہیں اجرت دی جائے گی یہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ساتھیوں سے مروی ہے' ایک قول کے مطابق بیت المال سے ان کی اجرت کے مطابق انہیں دیا جائے گا' یہ امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ ان کا بھی صدقہ میں سے حصہ ہے تو کیسے یہ ان سے روکا جا سکتا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے انہیں دیا جائے گا؟ اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ زکوٰۃ اکٹھی کرنے والا ہاشمی ہو یا نہ ہو؟ ایک قوم نے منع کیا ہے اور دوسروں نے جائز قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسے صدقہ کے علاوہ اجرت دی جائے گی۔

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُھُمْ۔ ''اور ان کے تالیف قلب کے لئے۔'' اس سے مراد

ایسے لوگ ہیں، جو نئے نئے اسلام میں آئے ہوں۔ ایک قول کے مطابق ایسے کافر جن سے رسول اللہ ﷺ تالیف قلب کیا کرتے تھے تاکہ وہ اسلام لے آئیں اور وہ لوگ اسلام میں دہشت اور تلوار سے داخل نہ ہوئے بلکہ آپ ﷺ کے تحائف سے داخل ہوئے۔ ایک قول کے مطابق یہ وہ لوگ تھے جو ظاہر میں تو اسلام لے آئے مگر ان کا اسلام ابھی تک عمدہ نہ ہوا' آپ ﷺ انہیں تحائف دے کر ان سے محبت کیا کرتے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد وہ ہیں جو یہود ونصاریٰ میں سے اسلام لائے تھے۔ ایک قول کے مطابق یہ بڑے بڑے مشرک تھے کہ جن کے پیروکار ہوتے تھے تو انہیں نبی ﷺ نے کچھ مال دیا تاکہ ان کے پیروکار بھی اسلام کے قریب آ جائیں۔ اور نبی اکرم ﷺ نے اس جماعت کو بھی دیا جو ظاہری طور پر اسلام لائے تھے، مثلاً ابوسفیان بن حرب' حارث بن ہشام' سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبدالعزیٰ' ان میں سے ہر ایک کو آپ ﷺ نے سو سو اونٹ دیئے تاکہ وہ اسلام سے قریب آ جائیں اور دوسروں کو آپ نے اس سے تھوڑا دیا۔

اہل علم کا اختلاف ہے کہ آیا اسلام غالب آ جانے کے بعد یہ تالیف قلب والا حصہ باقی ہے یا نہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، حسن اور شعبی کہتے ہیں یہ قسم اسلام کے غلبہ اور معزز ہو جانے کے بعد ختم ہوگئی' یہی امام مالک کا مشہور مذہب اور اصحاب الرائے کا موقف ہے۔ بعض احناف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے ان کا حصہ باقی ہے کیونکہ امام وقت بعض اوقات ضرورت محسوس کرتا ہے کہ کسی کو اسلام کے قریب کیا جائے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اس لئے ختم کیا تھا جب انہوں نے دیکھا کہ دین معزز اور غالب آ چکا تھا۔ ماوردی نے احکام السلطانیہ میں بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔ یونس کہتے ہیں میں نے زہری سے ان کے بارہ میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میں اس کے منسوخ ہونے کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پہلے قول کے مطابق ان کا حصہ بقیہ اقسام کی طرف لوٹا کر ان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

وَفِي الرِّقَابِ۔ ''گردن چھڑانے میں'' یعنی انہیں آزاد کرنے میں اس طرح کہ کسی قیدی کو خرید کر پھر اسے آزاد کر دیا جائے۔ یہ سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے یہی بات امام مالک' ابن حنبل' اسحٰق اور ابوعبید رحمہم اللہ نے کہی۔

حسن بصری' مقاتل بن حیان' عمر بن عبدالعزیز' سعید بن جبیر' نخعی' زہری اور ابن زید رحمہم اللہ کہتے ہیں اس سے مراد مکاتب ہیں کہ ان کی صدقہ کے مال سے کتابت کی رقم کی ادائیگی میں

معاونت کی جائے، یہ امام شافعی اور اصحاب الرائے کا قول ہے اور یہ امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ سب سے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں مذکورہ حکم کو دونوں اقوال پر محمول کیا جائے اس لئے کہ 'رقـــاب' کا لفظ غلام کی خریداری' آزادی اور مکاتب کی کتابت والے مال میں معاونت پر صادق آتا ہے۔

وَ الْغٰرِمِیْنَ۔ ''چٹی (جرمانہ) پڑ جانے والوں کے لئے۔'' اس سے ایسے لوگ مراد ہیں جن پر قرض سوار ہو جائے اور ان کے پاس ادائیگی کی کوئی سبیل نہ ہو' اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں مگر جس پر بیوقوفی سے قرض آ جائے تو اسے اس مال یا اس کے علاوہ کسی مال سے نہ دیا جائے جب تک کہ وہ اپنی اس بیوقوفی سے باز نہ آ جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ میں سے ایسے شخص کی اعانت کی جس نے قرض اپنے ذمہ لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اس مال میں سے اعانت کروائی۔

وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ ''اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں۔'' اس سے مراد جنگ لڑنے والے اور سرحدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں کہ انہیں صدقہ میں سے دیا جائے گا جو وہ اپنی جنگی اور سرحدوں کی حفاظت میں خرچ کریں گے اگرچہ وہ مالدار ہی کیوں نہ ہوں، یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں وہ حاجی اور عمرہ کرنے والے ہیں۔ احمد اور اسحٰق رحمہما اللہ سے مروی ہے کہ وہ حج کو سبیل اللہ میں شمار کرتے تھے۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ جنگ کرنے والے کو صرف اسی صورت میں دیا جائے گا جبکہ وہ محتاج ہو جو کہ اس جنگ کی وجہ سے ہر چیز سے الگ ہو چکا ہے۔

وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ ''اور مسافر کے لئے۔'' اس سے مراد مسافر ہے' سبیل کہتے ہیں راستہ کو اور اسے مسافر کی طرف منسوب کر دیا کیونکہ وہ ہمیشہ راستہ پر ہی رہتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سفر میں اپنے مال اسباب اپنے شہر اور گھر سے الگ ہو چکا ہے تو اسے اس مال میں سے دیا جائے گا اگرچہ وہ اپنے شہر میں مالدار ہی کیوں نہ ہو اور اگرچہ کوئی ایسا شخص موجود ہو جو اسے ادھار دے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب اسے ادھار دینے والا موجود ہے تو اسے صدقہ نہیں دیا جائے گا۔

فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ ''یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض ہے۔'' یعنی صدقہ کا ان اقسام میں محدود ہو جانا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازمی حکم اور فرض ہے اس کے بندوں کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس حد کو تجاوز کرنے اور بھلا نگنے سے منع کیا ہے۔

مضمون نمبر:۱۴

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ۔(۷۳)

''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد جاری رکھو۔''

یہ جہاد کا حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی امت کو آپ کے بعد حکم دیا' کفار سے جہاد کی صورت یہ ہے کہ ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک کہ وہ مطیع و فرمانبردار نہ ہو جائیں اور منافقوں سے جہاد کی صورت یہ ہے کہ ان پر دلیل قائم کی جائے حتیٰ کہ وہ نفاق سے نکل کر اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئیں۔ حسن فرماتے ہیں منافقوں سے جہاد کا معنی یہ ہے کہ ان پر حدود قائم کی جائیں، قتادہ نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ اس کی توجیہ میں یہ کہا گیا کہ اکثر منافق ہی ایسے جرائم کرتے ہیں جو حدود کو لازم کریں، ابن عربی کہتے ہیں اس دعویٰ کی دلیل کوئی نہیں اور نافرمان منافق نہیں ہوتا، منافق تو وہ ہوتا ہے جس کے دل میں نفاق ہو جسے وہ اعضاء کی حرکات و سکنات سے ظاہر نہ ہو۔

جن پر حدود نافذ ہوئیں تو ان واقعات کا سیاق و سباق گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ منافق نہ تھے۔

وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۔''تو ان پر سختی کر۔'' الغلظ نرمی اور شفقت کی نقیض اور عکس کو کہتے ہیں۔ اس کا معنی دل کی سختی اور پہلو کی سختی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ آیت ہر قسم کے عفو و درگذر اور صبر وغیرہ ہر چیز کو منسوخ کرتی ہے' سورہ تحریم میں بھی یہ حکم اسی طرح ہے۔

مضمون نمبر:۱۵

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ۔(۸۳) ''پس اگر اللہ تعالیٰ تجھے لوٹائے۔''

رجع رد کی طرح متعدی ہے اور رجوع لازم ہے اور فاء اس لیے آئی ہے کہ اس کا مابعد ماقبل پر متفرع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ ۔''ان کی کسی جماعت کی طرف'' کیونکہ وہ تمام لوگ جو مدینہ میں رہ گئے تھے وہ منافق نہ تھے بلکہ ان میں سے کچھ مومن بھی تھے، جن کے صحیح عذر تھے اور ان میں ایسے مومن بھی تھے جن کے پاس کوئی عذر نہ تھا پھر انہیں رسول اللہ ﷺ نے معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ مثلاً وہ تین لوگ جن کا فیصلہ پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ایک گروہ کے لیے صرف یہ کہا، کیونکہ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے پیچھے رہنے پر افسوس کرتے ہوئے نفاق سے توبہ کی تھی۔

فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ ۔پھر یہ آپ سے میدان جنگ میں نکلنے کی اجازت طلب کریں گے۔ تیرے ساتھ اس جنگ کے بعد کسی دوسری جنگ میں جانے کی۔ فَقُلْ "تو آپ کہہ دیجئے۔ "لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا۔ "تم میرے ساتھ ہرگز چل نہیں سکتے اور نہ میرے ساتھ دشمنوں سے لڑائی کر سکتے ہو"یعنی یہ بات ان سے بطور سزا کے کہو اور اس لئے بھی کہ ان کا آپ کے ساتھ جانا اور کئی خرابیاں لئے ہوئے ہے۔ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۔"تم نے پہلی مرتبہ ہی بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا۔" یہ علت اور وجہ ہے یعنی تم میرے ساتھ ہرگز نہ نکلو اور اسی طرح جنگ میں بھی شریک نہ ہونا کیونکہ تم بیٹھ رہنے پر راضی ہو گئے اور پہلی مرتبہ پیچھے رہنے پر راضی ہوئے، یہ واقعہ جنگ تبوک کا ہے۔

فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۔"پس تم پیچھے رہ جانے والوں میں ہی بیٹھے رہو۔" یہ خالف کی جمع ہے، اس کا معنی ہے جنگ کے لئے نکلنے سے پیچھے رہ جانا۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے فساد کرنے والوں کے ساتھ مل کر بیٹھے رہو۔ عربوں کا مقولہ ہے فُلَانٌ خَالَفَ اَهْلَ بَيْتِهٖ۔ "جبکہ وہ ان میں فساد اور جھگڑا پیدا کرے"۔ یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ گھر میں فساد برپا کرنے کا عادی ہو۔

مضمون نمبر:۱۶

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا۔(۸۴)

"ان میں سے کوئی مر جائے تو آپ ان کے جنازہ کی ہرگز نماز نہ پڑھیں۔"

مَاتَ اَحَدًا کی صفت ہے اور اَبَدًا ظرف ہے نفی کی تائید کے لئے۔ زجاج کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں" کا معنی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی میت کو دفن کرتے تو اس کی قبر پر کھڑے ہو کر اس کے لئے دعا کرتے' پس اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کام سے روک دیا۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے اس کی قبر درست کرنے کے کاموں میں آپ کھڑے نہ ہوں۔ اور اِنَّهُمْ كَفَرُوْا سے آخر تک کا جملہ اس نہی کی علت ہے جو کہ ان کی نماز جنازہ ادا کرنے اور ان منافقوں کی قبروں پر کھڑے ہونے پر مشتمل ہے۔

مضمون نمبر:۱۷

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ۔(۹۱) "کمزوروں پر کوئی حرج نہیں۔"

اس سے مستقل کوڑھ والے بوڑھے اور لنگڑے وغیرہ مراد ہیں، پھر عارضی عذر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى۔ ''اور نہ بیماروں پر'' مرض سے مراد ہر وہ بیماری ہے جس پر لغوی یا شرعی اعتبار سے بیماری کا لفظ بولا جا سکے۔ ایک قول کے مطابق بیماری میں اندھا پن اور لنگڑا پن وغیرہ آ جاتے ہیں، پھر اس عذر کی طرف آئے جو کہ بدن نہیں بلکہ حال کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لفظ یہ ہیں: وَ لَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ ''اور ان پر جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ بھی نہیں'' یعنی ان کے پاس اتنا مال نہیں کہ اسے خرچ کر کے جہاد کی تیاری کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان سے گناہ کی نفی کی ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ان عذر کی موجودگی میں ان لوگوں سے جہاد ساقط ہو جائے گا ان پر واجب نہ ہوگا مگر اس صورت میں جبکہ وہ مخلص ہوں گے، یعنی عمل میں خالص ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص یہ ہے کہ اس پر ایمان لائے جائے اور اس کے قوانین شریعت پر عمل کیا جائے اور اس کے مخالف تمام باتوں کو چھوڑ دیا جائے وہ جو بھی ہوں۔ اس کے تحت اس میں سب سے پہلے اس کے بندوں سے خیر خواہی آتی ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ سے محبت شامل ہے اور جہادی معاملات میں ان سے خیر خواہی کرنا اور کسی اعتبار سے بھی ان کے دشمنوں کا تعاون چھوڑ دینا اور اللہ کے رسول ﷺ سے خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی نبوت کی اور جو وہ لائے ہیں اس کی تصدیق کرنا اور ان کے ہر حکم اور ہر جس کام سے وہ روک دیں، آپ کی بات ماننا اور جس سے آپ ﷺ دوستی کریں اس سے دوستی کرنا اور جس سے دشمنی کریں اس سے دشمنی کرنا، ان سے محبت کرنا، ان کی سنت کی تعظیم کرنا اور سنت کے فوت ہو جانے کے بعد اسے زندہ کرنا جہاں تک اس کے بس میں ہو۔

حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: دین خیر خواہی کا نام ہے، آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ بات فرمائی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کس کے لئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے لئے، اس کی کتابوں کے لئے، اس کے رسولوں کے لئے اور مسلمانوں کے حکام اور عام مسلمانوں کے لئے۔''

مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ۔ ''ایسے نیک کاروں پر الزام کا کوئی راستہ نہیں۔'' یہ گزشتہ مضمون سے پیوستہ ہے، یعنی ایسے معذور جو مخلوص اور خیر خواہ ہیں ان پر سزا یا مؤاخذہ کا کوئی راستہ نہیں۔ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ''اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت ورحمت والا ہے اور اس آیت کے معنی

میں یہ آیات بھی ہیں: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ۔

جن افراد کو اللہ تعالیٰ نے معذور رکھا ہے ان کو جہاد کے حکم کا مکلف نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنگ کا ثواب ان کو نہیں ملے گا، حالانکہ یہ لوگ اس جہاد میں رغبت وشوق بھی رکھتے ہیں، اگر انہیں عذر مانع نہ ہوتا۔ اسی معنی میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ابوداؤد اور مسند احمد میں جو کہ دراصل صحیحین میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑی ہے کہ تم نے جو بھی سفر کیا جس قدر خرچ کیا اور جس وادی اور منزل کو عبور کیا تو وہ لوگ تمہارے ساتھ تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا وہ ہمارے ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ وہ مدینہ میں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں عذر نے روکا ہے۔ اسے امام احمد اور امام مسلم رحمہما اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جملہ عذر کا ذکر کر کے ان کا ذکر کیا جو اس فرمان الٰہی میں شامل ہیں: وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ۔ ہاں ان پر بھی کوئی حرج نہیں جو آپ کے پاس آتے ہیں کہ آپ انہیں سواری مہیا کر دیں، جس پر سوار ہو کر وہ جنگ میں شریک ہو سکیں۔ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ ''تو آپ جواب دیتے ہیں کہ میں تو تمہاری سواری کے لئے کچھ بھی نہیں پاتا، تو وہ رنج وغم سے اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں'' یعنی اس حال میں کہ وہ غمگین ہو کر رو رہے ہوتے ہیں۔ یہ مصدر یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ کہ ان کے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ بھی میسر نہیں، یعنی خود ان کے پاس اور نہ تیرے پاس کچھ ہے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ۔ ''صرف ان پر راہ الزام ہے۔'' یعنی سزا اور پکڑ کی راہ نکلتی ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ۔ ''ان لوگوں پر جو اجازت طلب کرتے ہیں۔ جنگ سے پیچھے رہنے کی اس حال میں کہ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ''وہ دولت مند ہیں'' یعنی ان کے پاس سواری بھی ہے اور تیاری کے لئے سامان اور وسعت بھی رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ''یہ خانہ نشین عورتوں کا ساتھ دینے پر خوش ہیں اور ان کے دلوں پر مہر الٰہی لگ چکی ہے، یعنی دولت مند ہونے کے باوجود اجازت لینے کے دو اسباب ہیں، ایک یہ کہ: گھٹیا سودے پر راضی ہونا اور وہ ہے کہ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنا' دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ان کے دلوں پر مہر لگا دینا۔ فَهُمْ "پس وہ" اس مہر کی وجہ سے لَا يَعْلَمُونَ "محض بے علم ہو گئے۔" اس بات سے کہ جو اس جہاد میں فائدہ ہے، حتیٰ کہ انہوں نے اس چیز کو پسند کر لیا جس میں نقصان ہی نقصان تھا۔

مضمون نمبر: ۱۸

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً۔ (۱۰۳)

"آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لے لیجئے۔"

اہل علم کا اس صدقہ کے بارہ میں اختلاف ہے جس کا یہاں حکم ہوا۔ ایک قول کے مطابق یہ صدقہ فرض ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ اس گروہ سے مخصوص ہے جو اپنے گناہوں کا اعتراف کریں کیونکہ انہوں نے توبہ کے بعد اپنے اموال رسول اللہ ﷺ پر پیش کئے، تو یہ آیت اتری' دونوں تفسیروں کی بنا پر مِنْ تبعیض کے لئے ہوگا۔ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کے اموال میں سے ایک تہائی لیا جائے گا اور اسے بطور کفارہ صدقہ کر دیا جائے گا' پس اب جو بھی گنہگار ہوگا اس کے لئے یہی طریقہ ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ صدقہ کرے۔

آیت مطلق ہے جو کہ سنت مطہرہ کے ساتھ واضح ہے' صدقہ صدق سے لیا گیا ہے، اس معنی میں صدقہ نکالنا ایمان کی تصدیق کی دلیل ہوگا۔

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ "جس کے ذریعہ آپ ان کو پاک صاف کر دیں۔" ان دونوں افعال میں ضمیریں نبی ﷺ کی طرف لوٹتی ہیں۔ ایک قول کے مطابق صدقہ کی طرف لوٹتی ہیں، یعنی یہ صدقہ جو ان سے لیا گیا ہے یہ انہیں پاک کر دے، پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

پاکیزگی کا معنی ہے گناہ کے متعلقہ اثرات کو زائل کرنا اور تزکیہ کا معنی پاکیزگی میں مبالغہ ہے۔ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ "اور ان کے لئے دعا کیجئے" یعنی ان کے اموال میں سے صدقہ لینے کے بعد ان کے لئے دعا کریں۔ نحاس کہتے ہیں: ہمارے علم کے مطابق تمام اہل زبان سے منقول ہے کہ کلام عرب میں صلاۃ کا معنی دعا ہوتا ہے۔ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ "بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان ہے" یعنی جس سے دل سکون حاصل کرے اور مطمئن ہو جائے۔

مضمون نمبر: ۱۹

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ

كَانُوْٓا اُولِىْ قُرْبٰى ـ (۱۱۳)

"نبی کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں اگر چہ وہ رشتہ دار ہی ہوں۔"

اہل تفسیر بیان کرتے ہیں کہ 'مَا كَانَ' قرآن میں دوصورتوں میں آتا ہے' پہلی صورت نفی کے لئے آتا ہے مثلاً مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اس میں 'ما کان' نفی کے معنی میں ہے، تو معنی یہ ہوا کہ کسی نفس کو یہ لائق نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت بغیر مرے۔ اور دوسری صورت نہی کے لئے آتا ہے مثلاً مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ـ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ اور ان میں 'ما کان' نہی کے معنی میں ہے۔

اس طرح کے احکام میں قرابت داری کا کوئی اثر نہیں ہوا کرتا' یہ آیت کفار سے دوستی توڑنے پر مشتمل ہے اور ان کے لئے استغفار و بخشش مانگنے اور ان کے لئے ناجائز دعا کی حرمت ہے' یہ موقف اس واقعہ کے منافی نہیں جو کہ آپ ﷺ کے متعلق صحیح میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے احد کے دن جبکہ مشرکوں نے آپ ﷺ کے سامنے والے دانت توڑے اور آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کو زخمی کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا' اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما یہ لوگ نہیں جانتے تو ممکن ہے کہ یہ واقعہ مشرکوں سے استغفار کی حرمت سے پہلے کا ہو۔ فرض کریں کہ یہ حکم پہلے سے پہنچ چکا تھا جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ احد کے دن سے کافی عرصہ پہلے کی بات ہے، تو آپ ﷺ کا اپنی قوم کے لئے یہ استغفار کرنا صرف اسی طرح تھا جیسا کہ آپ ﷺ سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے کہا تھا۔

جیسا کہ صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: گویا کہ میں نبی اکرم ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ کسی نبی کے بارہ میں بیان کر رہے تھے کہ انہیں ان کی قوم نے مارا اور وہ اپنے چہرہ سے خون صاف کرتے ہوئے فرما رہے تھے: "اے میرے رب! میری قوم کو بخش دے کیونکہ یہ نہیں جانتے۔" بخاری میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی ﷺ اپنے سے پہلے کسی نبی کا ذکر کر رہے تھے جنہیں ان کی قوم نے زخمی کیا تھا تو آپ ﷺ ان کے بارہ میں بتا رہے تھے کہ وہ نبی یوں دعا کرتے تھے: "اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما یہ لوگ نہیں جانتے۔"

مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ـ

اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں۔" یہ جملہ استغفار سے روکنے کی

علت اپنے اندر لئے ہوئے ہے تو معنی یہ ہوا کہ یہ وضاحت ان لوگوں سے جو اس قسم کے ہوں، دوستی ختم کرنے کو لازم کرتی ہے اور قرابت داروں سے دشمنی نہ کرنے کو ضروری قرار دیتی ہیں کیونکہ وہ شرک پر فوت ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ۔ ''تو ان کے لئے بخشش مانگنا اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور وعیدوں کے حکم کی مخالفت کرنا ہے۔''

مضمون نمبر: ۲۰

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً۔ (۱۲۲)

''اور مسلمانوں کو یہ نہ چاہیے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔''

احکام کا بقیہ حصہ ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے زوردار الفاظ میں جہاد کا حکم اور جہاد کی آواز پر حاضر ہو جانے کا حکم دیا تو مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب رسول اللہ ﷺ کافروں کی طرف کسی لشکر میں بھیجتے تو سارے مسلمان چلے جاتے اور مدینہ کو خالی چھوڑ دیتے' تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ یہ ان کے لئے جائز نہیں، یعنی یہ درست اور مناسب طریقہ یہ نہیں کہ سارے کے سارے یہ لوگ چلے جائیں۔

فَلَوْلَا، لولا، هَلَّا کے معنی میں ہے۔ یہ مطلوبہ معنی پر ابھارنے کے لئے ہے۔ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ۔ ''کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے۔'' اس جانے والے گروہ سے کچھ باقی رہ جائیں۔ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ۔ ''تاکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں۔'' اس میں ضمیر باقی رہنے والے گروہ کی طرف لوٹتی ہے۔

معنی یہ ہوا کہ اس جماعت میں سے ایک گروہ جنگ کے لئے جائے اور ان میں سے جو باقی رہ جائیں وہ علم حاصل کرنے کے لئے ٹھہریں اور جنگ میں شریک لوگ جب ان کی طرف واپس جنگ سے آئیں تو یہ انہیں تعلیم دیں۔ یا یہ لوگ علم حاصل کرنے اس جگہ پر جائیں جہاں وہ لوگ ہیں جو علم حاصل کر رہے ہیں تاکہ ان سے دین کی فقہ حاصل کر لیں۔

وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ ''اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس آئیں ڈرائیں'' یہ معطوف ہے علت پر، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ علم حاصل کرنے والے کی غرض، استقامت اختیار کرنے حاصل کرنے کے لیے اور شریعت کی تبلیغ کرنے کی ہونی چاہیے نہ کہ بندوں پر برتری اور شہروں میں علم کی شہرت۔

دوسرے کچھ لوگوں کا موقف ہے کہ یہ جہاد کے باقی احکام میں سے نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل

حکم ہے کہ علم کے حصول کے لئے نکلنا اور دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنا شرعی احکام میں سے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے جہاد کے لئے نکلنے کے وجوب کے ساتھ ملا دیا ہے' پس سفر دو طرح کے ہوئے: (۱) جہاد کے لئے سفر۔ (۲) حصول علم کے لئے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حصول علم کے لئے نکلنا اس وقت واجب ہو جائے گا جبکہ طالب علم کو حضر میں کوئی پڑھانے والے نہ ملے۔ اور فقہ بھی شرعی احکام کو جاننے کا نام ہے اور وہ علوم جن کے ذریعہ ان تک رسائی ممکن ہے مثلاً: لغت' نحو' صرف بیان اور اصول کا علم بھی اسی طرح حاصل کرنا لازم اور ضروری ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان علوم کے حصول کی غرض دین میں تفقہ حاصل کرنا قرار دی ہے اور جو اس میں سمجھ حاصل نہیں کرتا اسے ڈرایا ہے۔ لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دو نیک مقاصد اور صحیح مطلوب کو آپس میں جمع کر دیا ہے اور وہ یہ ہیں کہ: علم حاصل کرنا اور اسے سکھانا، تو جس کی غرض حصول علم سے ان کے علاوہ ہوئی تو وہ دنیاوی غرض سے سیکھتا ہے، نہ کہ دینی غرض سے۔

مضمون نمبر: ۲۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَ لْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً۔ (۱۲۳)

''اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہیے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا کہ وہ ان کافروں سے جنگ کی کوشش کریں جو ان کے گھر ملک یا نسب میں قریبی ہیں اور یہ کہ ان کے ساتھ جنگ میں غصہ اور سختی ہونی چاہیے۔ جہاد تمام کفار سے لازم ہے اگرچہ ابتدا ان کفار سے کی جائے گی جو مجاہدین کے قریب اور زیادہ اہم ہیں، پھر ان کے بعد جو زیادہ قریبی ہیں پھر ان کے بعد **الاقرب فالاقرب** کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

تفسیر سورۃ ہود

حسن عکرمہ عطاء رحمہ اللہ اور جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ کے قول کے مطابق یہ سورۃ مکی ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ کے بقول سوائے ایک آیت کے اور وہ ہے وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ۔ اس کی آیات (۱۲۳) ایک سو تئیس ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ سورہ ہود جمعہ کے روز پڑھا کرو۔ اسے دارمی اور ابوداؤد رحمہما اللہ نے اپنی مراسیل میں اور ابوالشیخ ابن مردویہ ابن عساکر بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الایمان میں سیدنا کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

مضمون نمبر: ۱

وَ لَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ (۱۱۳)

''دیکھو ظالموں کی طرف ہرگز نہ جھکنا۔''

ائمہ نے لغوی اعتبار سے الـرکـون کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ صرف جھکنا اور ٹھہرنا ہے بغیر کسی قید کے جو صاحب الکشاف نے یہ کہتے ہوئے قید لگائی کہ الـرکـون تھوڑا سا جھکنا ہے اسی طرح کئی ایک مفسرین نے یہ تفسیر کی کہ صرف جھکنا اور ٹھہرنا ہے بغیر کسی قسم کی قید کے سوائے ان کے جو وہی قید لگاتے ہیں جو صاحب الکشاف نے لگائی۔

کچھ مفسرین ایسے بھی ہیں جنہوں نے الـرکـون کی تفسیر میں ایسی ایسی قیود کا ذکر کیا جنہیں لغت کے ائمہ نے ذکر نہیں کیا تھا۔

امام قرطبی اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں: الـرکـون کا معنی ہے کہ صحیح معنوں میں ٹیک لگانا اعتماد کرنا کسی چیز کی طرف ٹھہر جانا اور اس پر راضی ہو جانا۔ تابعین میں سے کچھ ائمہ نے الـرکـون کی تفسیر میں اس کے لغوی معنی میں سے کچھ کو ذکر کیا' تو قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ اس کا معنی ہے تم ان سے دوستی نہ کرو اور نہ ان کی اطاعت کرو۔ عبدالرحمن بن زید' اسلم اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: الرکون کا یہاں معنی ہے نرم گفتگو کرنا اس طرح کہ ان پر ان کے کفر یہ کاموں کا انکار نہ کرنا۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ تم ان کے کاموں سے خوش نہ ہونا۔

مفسرین ائمہ نے اس آیت کی تفسیر میں بھی اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ مشرکوں کے ساتھ خاص

ہے؟اور کیا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا سے یہی لوگ مراد ہیں؟ یہ موقف سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ایک قول کے مطابق یہ تمام ظالموں کے متعلق عام ہے اس میں کافر و مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں' یہی بات آیت سے ظاہر ہو رہی ہے اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اس کا شان نزول مشرکوں کے بارہ میں ہے تو اس حکم کا اعتبار لفظ کے عموم پر ہو گا نہ کہ خاص سبب پر۔

اگر آپ یہ کہیں کہ ایسے صحیح دلائل موجود ہیں جو تواتر کی حد کو پہنچتے ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں اور وہ کسی بھی ایسے شخص پر پوشیدہ نہیں جو معمولی سی سنت مطہرہ کے ساتھ تعلق و تمسک رکھتا ہو کہ ائمہ حکام و امراء کی اطاعت واجب ہے حتیٰ کہ صحیح کے بعض الفاظ میں اس طرح آتا ہے کہ حاکم کی اطاعت کرو اگر چہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، اور اس کا سر منقی جیسا ہو۔ان حکام کی اطاعت پر وجوب منقول ہے جو نمازوں کو قائم کرائیں اور جب تک ان سے واضح کفر سر زد نہ ہو اور جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ اگر چہ ظلم کے انتہائی اونچے مرتبہ پر پہنچ جائیں اور اس ظلم کی سب سے بڑی اقسام کے مرتکب کیوں نہ ہوں جس سے وہ واضح کفر کی طرف چلے جائیں تو اس وقت تک ان کی اطاعت واجب ہے، جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں۔ان میں سے جن کاموں کا وہ حکم دیں ان کے کام پورے کریں جس سے وہ دینی مرتبہ میں داخل ہوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں داخل نہ ہوں۔اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ ان کا حکم جہاد کرنے کا ہو اور رعایا سے لازمی حقوق کی وصولی کرنا اور جھگڑنے والوں میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا اور جس پر حد لگتی ہو اس پر حد قائم کرنا۔

مختصر یہ کہ ان کی اطاعت ہر اس شخص پر واجب ہے جو ان کے امر و نہی میں تابع ہو، لہٰذا جو بھی وہ حکم دیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو، تو اس بات کو ماننا لازم و ضروری ہے' اس قسم کے حالات میں ان کے ساتھ گھل مل کا رہنا اور ان کے پاس آنا جانا مناسب ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔جو ہم نے ذکر کیا مذکورہ قیود کے ساتھ ان کی اطاعت کے واجب ہونے سے بھاگنے کی کوئی راہ نہیں اس لئے کہ دلائل اس کے متعلق تواتر سے منقول ہیں بلکہ اس بارہ میں کتاب اللہ میں اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ منقول ہے بلکہ یہ بات بھی منقول ہے کہ عوام ان کی اطاعت کریں اس ذمہ داری کو ادا کریں اگر چہ حکام کے ذمہ رعایا کے جو حقوق وہ ادا نہ کرتے ہوں، جیسا کہ بعض صحیح احادیث میں مروی ہے:انہیں وہ حقوق دو جو ان کے تمہارے

ذمہ ہیں اور جو تمہارے حقوق ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ بلکہ حاکم کی اطاعت کرنے کے بارہ میں حکم منقول ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اس بارہ میں مبالغہ کرتے ہوئے یہاں تک فرمادیا کہ: اگرچہ وہ تیرا مال چھین لے اور تیری پشت پر (کوڑے) مارے۔

اگر ہم صرف جھکاؤ اور ٹھہرنا ہی معتبر سمجھیں تو صرف یہ اطاعت جس کا حکم دیا گیا یہ مراد ہوگی اس کے ساتھ وہ بھی جس کے ساتھ اس جھکاؤ اور ٹھہراؤ کی وجہ سے ملنا ضروری ہو اور اگر ہم جھکاؤ اور ٹھہراؤ کو ظاہری اور باطنی لحاظ سے معتبر سمجھیں' تو اس آیت میں یہ نہی ظاہری اعتبار سے اس حکم میں جس کا وہ شرعی لحاظ سے تقاضہ کرتا ہے۔ان کے مال کو شامل نہیں مثلاً اطاعت کرنا یا حفاظت اور عوام کی تکلیف کے خوف سے یا عوامی مصالح کے لئے یا کسی خاص مصلحت کے لئے یا کسی عام وخاص نقصان دور کرنے کے لئے جبکہ یہ ان کی طرف نہ جھکے باطنی طور پر اور نہ ان سے محبت رکھے اور نہ ان کے کاموں پر راضی اور خوش ہو۔

میں کہتا ہوں: بالعموم ہر قسم کی اطاعت کرنا جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو تو وہ فرض ہے، اس پر الرکون کا نام لیا جاسکے گا اور یہ اس عام نہی کو خاص کردے گا اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ تو ہر وہ شخص جس کو انہوں نے پہلے یہ کہا کہ وہ ان اعمال میں داخل ہو جائے، جن کا اس نے انہیں حکم دیا، یعنی جو کام اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں، مثلاً دینی امور وغیرہ، تو جب اس کا دل اس پورا کرنے پر مضبوط ہو جائے جس کا اسے ذمہ دار بنایا گیا ہے، تو یہ اس پر واجب ہو جائے گا کجا یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہ اس کے لئے جائز ہے۔

البتہ جو اس حکومت میں داخل ہونے کے بارہ میں نہی منقول ہے، تو یہ اس بات کے ساتھ مقید ہے کہ ایسے شخص کا حکم نہ آئے جس کی اطاعت واجب ہے ائمہ حکام اور امراء میں سے' یہ تمام دلائل کے درمیان جمع کرنے کا طریقہ ہے یا جس کا اسے حکم دیا گیا اس کی بجا آوری میں کمزوری ہے جیسا کہ اس حکومت میں داخل ہونے کے بارہ میں بعض صحیح احادیث میں نہی کی علت موجود ہے۔

البتہ ان سے ملنا اور ان کے پاس جانا کسی عام خاص مصلحت کے لئے یا کسی عام یا خاص برائی کو دور کرنے کے لئے باوجود ان کے ظلم کو ناپسند کرتے ہوئے اور دل کو ان کی طرف جھکائے اور ان سے محبت کئے بغیر اور ان کے ساتھ ملنے کو ناپسند کرنے کے ساتھ اگر یہ مصلحت نہ ہوتی یا اس سے برائی کو دور کرنا نہ ہوتا لازماً اس پر الرکون کا نام صادق آتا' تو یہاں دلائل سے خاص ہوگا جو کہ عوامی فائدہ اور برائی کے دور کرنے پر جائز ہونے کے لئے دلیل ہے اور اعمال کا دارومدار نیتوں

پر ہے اور ہر ایک کے لئے وہ ہے جو اس نے نیت کی اور تم اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتے۔

مختصر یہ کہ جو اس جو ظالم کے ساتھ مل کر اس آزمائش میں مبتلا ہو گیا تو اس پر لازم ہے کہ اس کے اقوال وافعال اور جو کام وہ کرتا ہے اور جو چھوڑتا ہے انہیں شریعت کے ترازو میں رکھ کر وزن کرے، تو اگر وہ اس سے مائل ہو جائے تو خود اس پر وہ گناہ لازم آئے گا، جو ان سے بھاگنے کی طاقت رکھتا ہو، اس سے پہلے کہ کسی اعتبار سے ان کی طرف سے حکم آئے جس کی اطاعت اس پر واجب ہوگی تو یہ اس کے لئے زیادہ مناسب اور زیادہ لائق ہے۔

اے جزا کے دن کے مالک! ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں' ہمیں اپنے ان نیک بندوں میں شامل فرما جو نیکی کا حکم کرتے ہوں اور برائی سے روکتے ہیں' جو کہ تیرے بارہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے اور ہمیں اس پر مضبوط کر دے اور یہ کام ہمارے لئے آسان کر دے اور اس کی ادائیگی پر ہماری مدد فرما۔

قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مجبوری کی حالت میں کسی ظالم کے ساتھ رہنا، یہ اس نہی سے مستثنیٰ ہے۔

نیشاپوری اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں: محققین کا کہنا ہے وہ جھکاؤ جس سے روکا گیا ہے وہ ہے ظلم پر راضی ہونا اور اپنے غیروں کے راستہ کو اچھا کہنا اور خوبصورت قرار دینا اور ان کے اس طرح کے کسی کام میں شریک ہونا ہے۔ البتہ ان کے ساتھ کسی تکلیف کو دور کرنے یا عوامی مصالح کے عارضی کاموں میں شمولیت اختیار کرنا یہ الرکون میں داخل نہیں۔ مزید فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ یہ گنجائش اور رخصت کے طریقہ پر اجازت ہے، ورنہ تقویٰ کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ان سے پوری طرح اجتناب کیا جائے، "الیس اللہ بکاف عبدہ" یعنی کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں؟

فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ "ورنہ تمہیں بھی آگ لگ جائے گی" یعنی ان کی طرف جھکنے کی وجہ سے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ظلم کرنے والے آگ والے ہیں یا آگ کی طرح ہیں اور آگ کے پاس رہنا لازمی طور پر آگ لگانے کے مترادف ہے۔

تفسیر سورۃ النحل

حسن، عکرمہ، عطاء رحمہم اللہ اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے بقول یہ پوری سورۃ مکی ہے۔

سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابی الزبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ سوائے آخری تین آیات کے مکہ میں نازل ہوئی، وہ مکہ اور مدینہ کے درمیان جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم احد کی طرف گئے تو نازل ہوئیں۔ اس کی آیات ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) ہیں۔ اس سورہ کا نام سورۃ النعم بھی ہے اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کا ذکر کیا۔

مضمون نمبر:۱

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا۔ (٦٧)

"اور کھجور اور انگور کے درختوں کے پھلوں سے تم شراب بنا لیتے ہو اور عمدہ روزی بھی۔"

سکرا سے مراد ہے جو شراب نشہ آور ہو، اس سے مراد وہ تمام اشیاء ہیں جو ان دونوں درختوں سے کھائی جاتی ہیں مثلاً کھجور منقہ (منقیٰ) اور سرکہ، یہ آیت شراب کی حرمت سے پہلے نازل ہوئی۔

ایک قول کے مطابق "السکر" سے مراد حبشی زبان میں سرکہ ہے اور اچھے رزق سے مراد ان دو درختوں کا کھانا ہے۔ ایک قول کے مطابق السکر سے مراد نچوڑا ہوا میٹھا حلال شربت ہے۔ اس کا نام سکر اس لئے رکھا گیا کہ جب یہ کچھ عرصہ پڑا رہے تو بعض اوقات یہ نشہ آور بھی ہو جاتا ہے اور جب یہ نشہ کی حد تک پہنچ جائے تو حرام ہو جائے گا۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور یہی جمہور کا موقف ہے۔

اہل لغت نے وضاحت کی ہے کہ سکر شراب کا نام ہے، سوائے ابوعبیدہ کے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی، ان کا کہنا ہے سکر کھانے کو کہتے ہیں۔ جمہور کے قول کی دلیل وَبِئْسَ الشُّرْبُ شُرْبُهُمْ۔ اِذَا جَرٰى مِنْهُمُ اللَّغْوُ وَالسَّكَرُ۔ یعنی ساتھی برے ہیں اور ان کا پینا بھی برا ہے، جب ان سے بکواس اور نشہ چل پڑا۔ ابوعبید کے قول کی دلیل وہ شعر ہے جو انہوں نے خود کہا ع

جَعَلْتَ عَيْبَ الْاَكْرَمِيْنَ سَكَرًا

یعنی تو نے ان کی مذمت ان کے کھانے پر کر دی۔

اسے ابن جریر نے راجح قرار دیا ہے انہوں نے کہا: سکر یہ ہے کہ جو کھانے کے طور پر کھایا جائے اور اس کا پینا کھجور اور انگور کے پھلوں سے حلال ہو اور یہی عمدہ رزق اور روزی ہے۔ صرف لفظ مختلف ہیں معنی ایک ہی ہے مثلاً اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ زجاج کہتے ہیں کہ ابوعبیدہ کا یہ قول معروف نہیں اور تفسیر والے بھی اس کے ساتھ اختلاف کرتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے جو شعر کہا اس میں اس کے لئے کوئی دلیل نہیں کیونکہ اس کے علاوہ دوسروں کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ وہ یہ بیان کر رہا ہے کہ لوگوں کے عیوب کے ساتھ وہ نشہ آور ہو جاتی ہے۔

احناف کی ایک جماعت نے السکر کو اس پر محمول کیا ہے کہ جو نبیذ نشہ میں مبتلا کر دے اور اس پر محمول کیا ہے جس کا دو تہائی حصہ پکانے سے ختم ہو جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان کے لئے کسی چیز کو حلال قرار دے کر احسان کرتے ہیں نہ کہ کسی چیز کو ان پر حرام قرار دے کر، تو ان کی یہ بات صحیح اور متواتر احادیث سے رد کر دی گئی ہے، اس شرط پر کہ فرض کیا جائے کہ یہ آیت تحریم خمر کے عہد نازل ہوئی۔ آیت کو شراب کی حرمت کے بعد قرار دیتے ہیں۔

مضمون نمبر: ۲

وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ۔ (۹۴)

''اور تم اپنی قسموں کو آپس کی دغا بازی کا بہانہ نہ بناؤ۔''

یہ بیعت کی اقسام ہیں، واحدی کے قول کے مطابق: مفسرین کا کہنا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو روکا ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ اسلام سے کئے گئے معاہدے نہ توڑیں گے اور دین کی مدد کریں گے۔ انہوں نے اس تخصیص پر ان آیات سے دلیل لی ہے: فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ کیونکہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عہد توڑا تو دوسرے لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکنے لگے، اس بات کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ یہ قسم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھی اور یہی آیت کا شان نزول بھی ہے، لہٰذا اعتبار لفظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص سبب کا۔

مفسرین کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ گذشتہ بات کو دوبارہ ذکر کیا گیا ہے تاکہ مزید تاکید پیدا ہو جائے اور بات دہرائی جائے میری مراد اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ وَ لَا

تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ سے ہے۔ تاکید سے مراد سختی شدت اور پختگی پیدا کرنا ہے' یہاں یہ مراد نہیں کہ نہی کو بدعہدی کے ساتھ خاص کیا ہے ان معاہدوں میں جو مضبوطی سے طے پا چکے ہیں اور نہ ان کے علاوہ کسی کے ساتھ جو اتنے مضبوطی سے طے نہیں ہوئے' یقیناً بدعہدی کی حرمت تمام کو شامل ہے لیکن تاکیدی عہد کو توڑنے کا گناہ اس گناہ سے بڑا ہے جو کہ تاکیدی معاہدہ نہ ہو۔

یہ عام حکم ان احادیث سے خاص ہو جاتا ہے جو صحیح سند سے آپ ﷺ سے مروی ہیں کہ: جس نے کسی بات پر قسم اٹھائی اور اس نے اس کے علاوہ کسی چیز کو اس سے بہتر دیکھا تو وہ اس بہتر کو اپنائے اور اپنی قسم کا کفارہ دے۔ حتیٰ کہ اس بات میں آپ ﷺ نے مبالغہ کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا: اللہ کی قسم! میں جو قسم بھی اٹھاتا ہوں تو اگر اس سے بہتر کوئی چیز دیکھوں تو میں اس بہتر کام کو اپنا لیتا ہوں اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتا ہوں۔ یہ الفاظ صحیح بخاری وغیرہ میں ثابت ہیں۔

اس عام حکم سے لغو قسم بھی اس فرمان الٰہی لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ کی وجہ سے خاص ہو جاتی ہے ممکن ہے یہ قید یہاں تاکید کے لئے ہو تاکہ لغو قسم کو اس حکم سے خارج کر دیا جائے۔

قسم کے بارہ میں تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے۔ ایک قول کے مطابق تاکیدی قسم یہ ہے کہ آدمی ایک چیز پر کئی مرتبہ قسم اٹھائے' قرطبی' سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں: تاکیدی قسم یہ ہے کہ آدمی دو مرتبہ قسم اٹھائے اگر وہ ایک مرتبہ ہی قسم اٹھاتا ہے تو اس پر کفارہ نہیں۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں: جو کام بھی درست نہ ہو وہ دغا بازی ہے۔ ایک قول کے مطابق دخل کہتے ہیں جب کسی چیز میں اس کی بربادی کے وقت داخل ہوں۔ زجاج کہتے ہیں اس سے مراد دھوکا ہے۔

مضمون نمبر: ۳

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ۔ (۹۸)

"جب آپ قرآن پڑھیں۔"

یہاں فاء عمل صالح شروع کرنے کے لئے استعاذہ کی ترتیب کے لئے آیا ہے' ایک قول کے مطابق یہ آیت اس فرمان الٰہی: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ سے متصل ہے۔ اس کی تقدیر اس طرح ہوگی: "فاذا اخذت فی قرأته فاستعذ بالله" یعنی جب تو اس کو

پڑھنے کے لئے پکڑے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ۔ زجاج وغیرہ لغت کے امام کہتے ہیں: اس کا معنی ہے "اذا اردت ان تقرأ القرآن فاستعذ" یعنی جب تو قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے تو پناہ مانگ' اس کا معنی یہ نہیں کہ قرآن پڑھنے کے بعد تو پناہ مانگ۔ اسی طرح یہ بات ہے کہ جب تو کھانا کھانے لگے تو بسم اللہ کہہ لے۔ واحدی کہتے ہیں اس پر اجماع ہے کہ استعاذہ پڑھنے سے پہلے ہے، سوائے اس روایت کے جو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ' ابن سیرین' داؤد مالک اور حمزہ رحمہم اللہ جیسے قراء سے مروی ہے' ان کا کہنا ہے کہ استعاذہ قراءۃ کے بعد ہے انہوں نے آیت کے ظاہری حکم کے مطابق موقف اپنایا ہے۔

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ۔ کا معنی ہے' اس سے سوال کر، وہ پاک ہے کہ وہ تجھے پناہ دے مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ "راندے ہوئے شیطان سے" یعنی اس کے وسوسوں سے' بقیہ نیک اعمال کی نسبت قرآن پڑھنے سے پہلے استعاذہ کو خاص کرنے کا مقصد تنبیہ کرنا ہے کہ یہ بھی باقی تمام نیک اعمال کی طرح ہے جبکہ لوگ ان کاموں کے کرنے کا ارادہ کریں، اس لئے کہ جب قرآن پڑھنے سے پہلے اس کا حکم موجود ہے کہ جس کے آگے پیچھے سے کوئی باطل مداخلت نہیں کرسکتا تو کسی دوسرے کام کے کرتے وقت یہ بات زیادہ مناسب ہے کہ پوری کی جائے۔

اسی طرح جو خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا گیا ہے تو اس کی توجیہ اس طرح کی جائے گی کہ اس سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو بھی یہ استعاذہ کرنا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شیطان کے وساوس سے دور کرنے کا حکم دیا گیا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا ذمہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود لیا ہے تو باقی امت کا کیا حال ہوگا؟ جمہور کا موقف ہے کہ آیت میں حکم استحباب کے لئے ہے۔ عطاء اس کے واجب ہونے کے بارہ میں اس کے ظاہری حکم کو لیتے ہوئے۔

مضمون نمبر: ۴

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔
"جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ تعالیٰ سے کفر کرے سوائے اس کے کہ جس پر جبر کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو۔"

قرطبی فرماتے ہیں: اہل علم کا اجماع ہے کہ جس کفر پر اس حد تک مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی جان

کے قتل ہونے سے ڈر رہا ہوتو اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا اگر چہ اس نے کفر کرلیا اور اس کا دل ایمان پر قائم اور مطمئن ہو اور اس کی بیوی اس سے علیحدہ نہ ہوگی اور نہ اس پر کفار والے احکام لاگو ہوں گے۔ محمد بن الحسن سے منقول ہے کہ اگر اس نے کفر کا اظہار کیا تو وہ ظاہری طور پر مرتد شمار ہوگا اور جو معاملہ اس کا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے تو اس کے وہ مطابق اسلام پر ہوگا۔ اس کی بیوی کو علیحدہ کردیا جائے گا اگر وہ اسی حالت میں فوت ہوجائے تو اس پر نماز نہ پڑھی جائے گی اور اس کا باپ اگر اسلام کی حالت میں فوت ہوا تو یہ اس کا وارث نہ ہوگا۔ یہ قول اپنے کہنے والے پر مردود ہے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اس کی تردید کرتی ہیں۔

حسن بصری، اوزاعی، شافعی اور سحنون کا موقف ہے کہ یہ رخصت ایسی ہے کہ جسے کسی کو غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس آیت کے ظاہری اسلوب سے بھی ان کی بات کا رد ہوتا ہے کہ یہ عام ہے جسے بھی مجبور کیا جائے اور یہاں قول وفعل میں کوئی فرق نہیں، اور جو آیت کو صرف قول پر محدود کرتے ہیں، تو ان لوگوں کے پاس ایسی کوئی دلیل بھی نہیں۔ لفظ عام ہوتے ہوئے کسی خاص سبب کی کوئی حیثیت نہیں جیسا کہ کئی مرتبہ علم الاصول میں یہ بات گذر چکی ہے۔

وَلٰـكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا۔ ”مگر جو لوگ کھلے دل سے کفر کریں۔“

یعنی اس کفر کو وہ پسند کرے اور اس کا دل اس پر خوش ہو۔ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ”تو ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔“ اس قدر بڑی وعید کے بعد اور کوئی سزا باقی نہیں رہ جاتی یعنی مرتدین اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی بڑی سزا کے اس فرمان الٰہی وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ سے مستحق ہوئے ”اور انہی کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔“

مضمون نمبر: ۵

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ۔(۱۱۶)

”کسی چیز کو اپنی زبان سے جھوٹ موٹ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔“

کسائی اور زجاج کہتے ہیں 'ما' یہاں مصدریہ ہے اور 'کذب' کو 'لا تقولوا' سے منصوب پڑھنا دراصل اس طرح ہے کہ لا تقولوا الکذب "لأجل وصف السنتکم" یعنی تم جھوٹ نہ کہو کیونکہ یہ تمہاری زبان کی عادت ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تم حلال اور حرام کو قرار نہ دو اپنی باتوں سے جو تمہاری زبانیں بغیر دلیل کے کہہ ڈالتی ہیں۔

جائز ہے کہ 'ما' کو موصولہ پڑھا جائے تصف کی وجہ سے منصوب پڑھتے ہوئے **لاتقولوا للذی تصف السنتکم الکذب فیہ ھذا حلال وھذا احرام** یعنی تم اس کے متعلق ایسی بات نہ کہو جو تمہاری زبانیں کہتی ہیں جھوٹ موٹ کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام' اس میں لفظ 'فیہ'' کو حذف کردیا کیونکہ یہ معلوم تھا، تو جملہ اس طرح ہوا: "**ھذا حلال وھذا حرام**" یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے لفظ کــذب کی بجائے۔ کلام میں قول کو محذوف ماننا بھی جائز ہے تو عبارت یہ ہوگی "**ولاتقولوا للذی تصف السنتکم فتقول ھذا حلال وھذا حرام**" یعنی تم ایسی باتیں اپنی زبان سے نہ کہو کہ تم کہو یہ حلال ہے اور یہ حرام اور وہ زبان یوں کہے کہ یہ حرام اور یہ حلال ہے۔

ما مصدر یہ قرار دے کر **تصف** سے بھی کذب کو منصوب کیا جاسکتا ہے "**لاتقولوا ھذا حلال وھذا احرام لوصف النستکم الکذب**" یعنی تم یہ نہ کہو کہ یہ حلال اور یہ حرام ہے، اس لئے کہ تمہاری زبانیں جھوٹ کی عادی ہیں۔

لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ '' کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بہتان باندھ لو۔''

اس میں لام انجام کے لئے ہے نہ کہ غرض کے لئے، یعنی پھر نتیجتاً یہ تمہارا یہ حلال اور حرام بنانا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ ہوگا اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی حالانکہ یہ بات اس کی طرف سے نہیں ہے۔

ابن ابی حاتم' ابونضرہ سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے سورۃ النحل کی یہ آیت وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ پڑھی تو پھر آج تک میں فتویٰ دینے سے خوف زدہ رہا۔ فتح القدیر میں فرماتے ہیں میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے انہوں نے سچ کہا کیونکہ یہ آیت اپنے لفظ کے عموم سے ان لوگوں کو شامل ہے جو ہم میں سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں جیسا کہ بہت سے رائے کو ترجیح دینے والے، لوگ رائے کو روایت پر مقدم کرتے ہیں یا کتاب وسنت کے علم سے نابلد مقلدین کی طرح' لازمی طور پر ان کے اور ان کے فتاویٰ کے درمیان رکاوٹ ڈالنی چاہیے اور ان کی جہالت کی وجہ سے انہیں روکنا چاہیے کیونکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر فتویٰ دیتے ہیں، یہ خود بھی گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں' لہٰذا وہ اور جو ان سے فتویٰ پوچھے وہ اس طرح ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ع

كَـبَـهِيْمَـةٍ عَمْيَـاءَ قَادَ زِمَامُهَا ۔۔۔ أَعْمٰى عَلٰى عَوْجِ الطَّرِيْقِ الْمَائِرِ

یعنی اندھے جانور کی طرح کی جس کی لگام بھی اندھے آدمی نے تھام رکھی ہے تو بتایئے کہ بہت زیادہ ٹیڑھے راستہ پر بہتری کیسے ہوگی۔

طبرانی سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: قریب ہے کہ آدمی کہے اللہ تعالیٰ نے اس طرح حکم دیا اور اس سے روکا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اسے فرمائیں کہ تو جھوٹا ہے! یا وہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا، اور اسے حلال کیا تو اللہ تعالیٰ اسے فرمائیں تو جھوٹا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں: مفتی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ گواہی دے کہ انہوں نے اسے حلال کیا یا حرام کیا ہے یا انہوں نے یہ کام لازم قرار دیا اور اسے ناپسند کیا، سوائے اس کے کہ اس بارہ میں جو حکم ہے اس کا علم حاصل کرے۔ اسی طرح حکم ہے کہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کسی چیز کے جائز اور ناجائز یا پسند اور ناپسند کے بارہ میں فرمائیں تو ان میں احتیاط کرنا ضروری ہے، البتہ مفتی جو باتیں ان کتب میں دیکھیں جو اسے ان لوگوں سے حاصل ہوئیں جو مقلدین ہیں' تو بھی اس کے لئے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر گواہی دے لوگوں نے اسے بدل دیا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا علم نہیں۔ اسلاف میں سے کئی ایک کا کہنا ہے: تم میں سے ہر کوئی ایسی بات کہنے سے ڈر جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال کیا اور اسے حرام' تو اللہ تعالیٰ کہہ دیں کہ تو جھوٹا ہے جس نے اسے حلال نہیں کیا اور نہ اسے حرام کیا ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تو قلعہ کا محاصرہ کرے اور وہ لوگ تجھ سے یہ سوال کریں کہ تو انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اتار' اگر تو نہیں جانتا کہ ان کے بارہ میں تو اللہ تعالیٰ کے حکم کو پہنچ جائے گا یا نہیں' تو ایسی صورت میں انہیں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حکم پر اتار۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے سنا انہوں نے فرمایا: میں کچھ قاضیوں وغیرہ کی مجلس میں تھا کہ وہاں ایک فیصلہ سنایا گیا جس میں کسی نے زفر کے قول کے مطابق فیصلہ سنایا' میں نے اسے پوچھا یہ کیسا فیصلہ ہے؟ اس نے جواباً کہا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم! میں نے اسے کہا کہ زفر کا قول اللہ تعالیٰ کا حکم بن گیا ہے۔ جس کے مطابق زفر نے فیصلہ کیا اور امت پر اس پر عمل کرنا لازم قرار دیا' (ارے اللہ کے بندے) تم اس طرح کہو کہ یہ زفر کا فیصلہ اور اس کا قول ہے اور یہ یا ایسی ہی کوئی دوسری بات نہ کہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

مضمون نمبر:٦

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ۔(۱۲۴)

''اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو بلایئے۔''

مفعول کو عام ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا، اس لئے کہ آپ ﷺ کو تمام انسانیت کی طرف بھیجا گیا تھا' اللہ تعالیٰ کے راستہ سے مراد اسلام ہے۔ بِالْحِكْمَةِ ''حکمت کے ساتھ'' یعنی درست اور مضبوط جملے اور باتوں سے' ایک قول کے مطابق اس سے مراد ہے مضبوط دلائل جن سے پختہ یقین حاصل ہو۔ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ' اور بہترین نصیحت کے ساتھ'' اس سے مراد ایسی گفتگو جو اچھے اور عمدہ وعظ پر مشتمل ہو جسے سننے والا اچھا محسوس کرے اور وہ سننے والے کے فائدہ کے اعتبار سے اس کے دل کو بھی بھلی معلوم ہو۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ظنی دلائل ہیں جو تسلی اور تشفی کے لئے ہوتے ہیں اور بقیہ گفتگو کی نہایت پسندیدہ اضافہ کے ساتھ تصدیق کا موجب بنتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق دعوت وتبلیغ کے لئے ان دو راستوں کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں لیکن داعی اور مبلغ بعض اوقات سخت جھگڑے کی بھی ضرورت محسوس کرتا ہے کسی مناظرہ یا بحث وغیرہ کے وقت، تو اسی لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ یعنی اس طریقہ سے جھگڑا کرنا ہے جو نہایت اچھا ہو۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اچھے انداز میں جھگڑنے کا حکم دیا ہے' کیونکہ داعی سچا اور اس کی غرض وغایت درست ہے اور اس کا مدمقابل جھوٹا اور اس کی غرض وغایت بے کار ہے۔

مضمون نمبر:٧

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ۔(۱۲۶)

''اور اگر بدلہ لو بھی تو بالکل اتنا ہی جتنا صدمہ تمہیں پہنچایا گیا ہو۔''

یعنی صرف اتنا بدلہ لے سکتے ہو جتنا کہ تمہارے ساتھ ظلم وزیادتی وغیرہ کی گئی ہے، اس سے زائد نہیں لے سکتے۔ ابن جریر فرماتے ہیں: یہ آیت مظلوم کے بارہ میں نازل ہوئی کہ جب ظالم تک پہنچ جائے تو جس قدر اس پر ظلم ہوا اتنا ہی اس سے بدلہ لے، اس سے زائد کسی دوسرے پر زیادتی نہ کرے، یہی بات درست ہے کیونکہ اگرچہ یہ کہا جائے کہ یہ آیت خاص سبب کے لئے ہے تو اعتبار لفظ کے عموم کا ہوگا اور اس کا عموم یہی معنی ادا کرتا ہے جو انہوں نے ذکر کیا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس فعل کو پہلے ذکر کیا جو کہ اس برائی کی سزا کے طور پر رونما ہونا تھا' باوجود اس کے کہ سزا کا فعل دوسرا ہونا چاہیے۔ یہ مجازی مشاکلہ ہے اور یہ بڑا وسیع باب ہے جو کہ کتاب اللہ کی کافی آیات میں موجود ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے معافی پر ابھارا' وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ''اور اگر صبر کر لو تو بے شک صابروں کے لئے یہی بہتر ہے''یعنی اگر تم برابر برابر بدلہ لینے پر بھی صبر کر لو تو صبر کرنا تمہارے لئے انتقام لینے سے بہتر ہوگا' ضمیر کی بجائے صابرین کو اسم ظاہر کر کے لکھا' اس وجہ سے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی تعریف تھی کہ وہ سختیوں پر صبر کرتے ہیں۔ جمہور کا موقف ہے کہ یہ آیت محکم ہے کیونکہ یہ بدلہ لینے سے صبر کرنے کے بارہ میں آئی ہے اور بالعموم صبر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ جنگ والی آیت سے منسوخ ہے' جب کہ اس دلیل کی کوئی دلیل نہیں۔

تفسیر سورۃ الاسراء

اس کی آیات ایک سو گیارہ (۱۱۱) ہیں اور یہ مکی ہے: سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور انہی کی طرح ابن زبیر کہتے ہیں سوائے تین آیات کے ① وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ثقیف کے وفد کے پاس آئے اور یہود نے کہا تھا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی سرزمین نہیں۔ ② رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ۔ ③ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ۔ اور مقاتل نے یہ آیت بھی بیان کی ہے ④ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ۔

مضمون نمبر:۱

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ۔ (۲۸)

"اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے۔"

یہ نہی ہر ذمہ دار اور مکلف شخص کو شامل ہے اس میں مخاطب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے کیا گیا تا کہ امت کو معلوم ہو جائے اور ان کی تعلیم کے لئے، اگر چہ یہ خطاب ہر اس شخص کے لئے ہے، جس کو مکلف لوگوں میں شامل کرنا درست ہے۔ اس نہی سے مراد ہے کہ انسان اس قدر ہاتھ روک لے کہ خود اپنے اوپر اور اپنے گھر والوں پر تنگی ڈال دے اور اسی طرح اس قدر وسعت بھی نہ دے کہ بغیر ضرورت کے خرچ کرے اور وہ اسراف میں شامل ہو جائے یہ نہی افراط و تفریط دونوں طرف سے روکنے کے لئے ہے۔ اس سے درمیانی راستہ کے جواز کا پتہ چلا اور وہ ہے عدل میانہ روی، جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مستحب قرار دیا ہے۔

وَلَا تَكُ فِيْهَا مُفْرِطًا اَوْ مُفَرِّطًا　　كِلَا طَرَفَيْ قَصْدِ الْاُمُوْرِ ذَمِيْمُ

یعنی تو اس میں زیادتی یا کمی کرنے والا نہ بن جا، میانہ روی کی دونوں اطراف قابل مذمت ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت میں بخیل کی مثال اس کے ساتھ دی ہے جس کا ہاتھ اپنی گردن سے لگا ہوا ہے، اس اعتبار سے کہ وہ اس کو استعمال نہیں کر سکتا اور اس کی مثال جو حدود پار کر جاتا ہے تصرفات میں اس کے ساتھ دی ہے کہ جو اپنے ہاتھ پھیلا دے کہ کوئی چیز اس کے لئے

رکاوٹ نہ بن سکے کہ جس سے اس کے ہاتھ واپس بند ہو جائیں۔ اس تصور میں بہت زیادہ مبالغہ ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دونوں طریقے جن سے منع کیا گیا ہے ان کا مقصد بیان کر دیا فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا، پھر تو ملامت کیا ہوا بیٹھ جائے'' لوگوں کے سامنے اس لئے کہ تجھ میں بخل کی بیماری ہے۔ مَحْسُوْرًا ''درماندہ ہوا'' اس وجہ سے جو تو نے حد سے زیادہ خرچ کیا' یعنی اپنے فقر کی وجہ سے اپنے تمام مقاصد سے منقطع اور الگ ہو جائے۔

المحسور کا اصلی معنی ہے راستہ سے کٹ جانے والا' ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے اپنے کئے ہوئے کاموں پر افسوس کرنے والا۔

مضمون نمبر:۲

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا۔

''اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں مار ڈالا جائے۔''

یعنی ایسی کوئی وجہ نہ پائی جائے جو کہ شرعی اعتبار سے قتل کے جواز کے لئے ہیں۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا ''ہم نے اس کے وارث کو طاقت دے رکھی ہے'' یعنی اس کے ورثا میں سے جو اس کے معاملہ کا ذمہ دار ہوگا اگر وارث موجود ہوں گے، تو وگرنہ جس کا ذمہ دار حاکم ہوگا، حاکم قاتل پر مسلط ہوگا چاہے تو قتل کر دے اور چاہے تو معاف کر دے اور اگر چاہے تو دیت لے لے۔

فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ۔ ''تو اسے چاہیے کہ مار ڈالنے میں زیادتی نہ کرے'' یعنی جس قدر اللہ تعالیٰ نے جائز رکھا ہے اس حد سے آگے نہ بڑھے کہ بدلہ میں ایک کی بجائے دو یا تین قتل کر دے یا قتل کر کے میت کا مثلہ کر دے یا اسے عذاب دے۔ اِنَّهٗ۔ ''بے شک وہ'' یعنی وہ وارث كَانَ مَنْصُوْرًا۔ ''مدد کیا گیا ہے'' یعنی اس کی مدد اور معاونت کی گئی ہے' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قصاص ان کے حق میں رکھ کر ان کی مدد کی ہے جو کہ دلائل و براہین سے واضح ہے' اللہ تعالیٰ نے علاقہ کے ذمہ داران کو حکم دیا ہے کہ اس کی مدد کریں اور اس کا پورا پورا حق دلوائیں۔ ایک قول کے مطابق قرآن میں قتل کے بارہ میں نازل ہونے والی آیات میں سے یہ سب سے پہلی ہے، کیونکہ یہ آیت مکی ہے۔

مضمون نمبر: ۳۰

وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ (۳۶)

''جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ۔''

یعنی ایسی بات کے پیچھے نہ لگو جس کا آپ کو علم نہیں' اسی معنی میں عرب کا یہ محاورہ ہے فقفوت فلانا یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ آپ اس کے نقش قدم پر چلیں اسی معنی میں شعر کا قافیہ ہے' اس لئے کہ وہ بھی ہر شعر کے بعد آتا ہے، اسی سے مشہور قبیلہ قافہ نامی ہے کیونکہ وہ لوگوں کے قدموں کے نشانات کے پیچھے چلتے اور تلاش کرتے ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اس بات سے روکا گیا ہے کہ انسان کوئی ایسی بات کہے جسے وہ نہیں جانتا یا وہ ایسا کام کرے جس کا اسے علم نہیں۔ یہ قضیہ کلیہ ہے' مفسرین کی ایک جماعت نے اسے چند امور کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے تم ایسی بات پر کسی کی مذمت نہ کرو۔ جس کا تمہیں علم نہ ہو' ایک قول کے مطابق یہ جھوٹی قسم کے بارے میں ہے' ایک قول کے مطابق یہ قافیہ کے بارہ میں ہے۔

قتیبی کہتے ہیں تو وہم اور گمان کی پیروی نہ کر، یہی درست ہے، کیونکہ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ علم ہے۔ ایک قول کے مطابق یہاں علم سے مراد ایسا راجح موقف ہے جو کسی پختہ اور مستند ذریعہ سے حاصل ہو وہ ذریعہ قطعی ہو یا ظنی ہو، ابوالسعو د اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس معنی میں استعمال کرنا اس کی بقیہ فروعات سے انکار نہیں ہے۔ شوکانی رحمہ اللہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ جس چیز کا علم نہیں اس پر عمل کرنا جائز نہیں' لیکن یہ عام ہے، جو ان دلائل سے خاص ہو جاتی ہے جو ظنی علم پر عمل کرنے کے جواز پر مبنی ہیں جیسا کہ کسی عام حکم پر خبر واحد پر اور گواہی پر عمل کرنا اور قبلہ کی سمت کے بارہ میں اجتہاد کرنا اور شکار کا بدلہ دینے کے بارہ میں وغیرہ وغیرہ۔ تو اس کے عموم سے یہ نہیں نکلتا اور نہ اس عام حکم سے کہ گمان حق کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا سوائے اس کے جس پر عمل کرنے کے جواز پر کوئی دلیل موجود ہو۔

شرعی مسائل میں رائے پر عمل کرنا اگر کتاب وسنت میں دلیل موجود نہ ہو' اس بارہ میں نبی ﷺ نے رخصت دی ہے جیسا کہ آپ ﷺ کے اس فرمان میں موجود ہے جبکہ آپ نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی جانب قاضی بنا کر بھیجا تھا اور فرمایا تھا: تو کیسے فیصلہ کرے گا؟ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کی کتاب سے، آپ ﷺ نے فرمایا اگر تو نہ پائے؟ تو انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ کی

سنت سے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تو اس میں نہ پائے؟ تو انہوں نے کہا پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ یہ حدیث صحیح ہے اور دلیل بنانے کے قابل ہے جیسا کہ ہم نے ایک مستقل بحث میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے۔

البتہ کتاب وسنت میں دلیل کے ہوتے ہوئے رائے پر قائم رہنا' ایسا کرنے والے صاحب الرائے بحث میں کمزوری دکھاتے ہیں ایسے موقع پر جو اپنی رائے کو پیش کرے گا وہ سب سے پہلے اس نہی میں داخل ہوگا کیونکہ وہ رائے ہے اللہ تعالیٰ کی شریعت اور قانون کے اور دوسرے مقابلے میں لوگ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے اس سے بے پرواہ ہیں اور اس کے لئے کوئی ایسی ضرورت بھی پیش نہیں آسکتی کیونکہ رائے کو استعمال کرنے کی رخصت تو دلیل کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہے اور وہ بھی صرف مجتہد کے لئے اور اسی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پر عمل کرے، اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے اس کے مطابق عمل کرنا جائز ہو اور اسے شرعی مسائل کے مرتبہ پر رکھے۔

اس سے آپ کے لئے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی اور آپ کے لئے پوری طرح یہ بات ظاہر ہوگئی کہ جو آراء فروعی مسائل کی قسمیں لکھی ہوئی ہیں، ان کی حیثیت شرع میں کوئی نہیں اور ان پر عمل کرنے والا آگ کے گڑھے کے کنارہ پر ہے، تو وہ مجتہد جو زیادہ تر اپنی رائے پر عمل کرتا ہو بعض اوقات وہ کسی بات میں ایسی چیز کی پیروی کرتا ہے کہ جس کا اسے علم بھی نہیں ہوتا اور مقلد تو مسکین ہے، جو اس مجتہد کی رائے پر عمل کرتا ہے، بعض اوقات وہ بغیر علم کے عمل کرتا ہے اور وہ شخص بھی جس کی اس نے تقلید کی ہے' یہ دونوں ظلمات میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔''

ایک قول کے مطابق یہ آیت عقیدہ کے ساتھ خاص ہے، جبکہ اس کی بنیادی طور پر کوئی دلیل نہیں، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس نہی کی علت وہ عمل قرار دیا ہے، جو علم کے بغیر ہو اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان: إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ ہے۔'' کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے۔'' اس میں تین اعضاء کی طرف اشارہ ہے اور اس کا حکم تمام ذی عقل پر جاری ہوگا اس لئے کہ اسے اس کے حالات کے بارہ میں پوچھا جائے گا جو اپنے ساتھ رہنے والوں پر گواہ ہیں۔ زجاج کہتے ہیں: عرب لوگ عاقل وغیر عاقل سب کے لئے اولئك کا لفظ بولتے ہیں۔ ابن جریر نے اس کے ناجائز ہونے پر ایک شاعر کا قول کہا ہے ؏

ذم المنازل بعد منزلة اللوی والعیش بعد اولئك الایام

اللوی کے مرتبہ کے بعد دوسری منازل کی برائی بیان کر، اور ان دونوں کے بعد زندگی کے دنوں کی بھی۔

ان پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہاں لفظ اولئك کے بعد الاقوام ہے، نہ کہ الایام، اس پر ان کے علاوہ دوسروں نے بھی تائید کی جیسا کہ صاحب کشاف ہیں۔ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا "پوچھ گچھ کی جانے والی ہے" یہاں کان کی ضمیر کل کی طرف لوٹتی ہے اور اسی طرح عنہ کی ضمیر بھی اسی طرف لوٹتی ہے۔ ان اعضاء سے سوال کرنے کا مطلب ہے کہ ان اعضاء کے مالک سے سوال ہوگا کہ انہیں کہاں استعمال کیا کیونکہ یہ اس کے آلات تھے اور استعمال کرنے والی انسان کی روح ہے، اگر اس نے اچھے کاموں میں استعمال کیے تو اجر و ثواب کی مستحق ٹھہرے گی اور اگر برائی میں استعمال کیے تو سزا کی حق دار ہوگی۔ ایک قول کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان اعضاء کو بولنے کی طاقت دے گا جب ان سے پوچھا جائے گا ان کاموں کی تو یہ خبر دیں گے، جو ان کا مالک کرتا رہا۔

مضمون نمبر: ۴

وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا۔ (۳۷)

"اور زمین میں اکڑ کر نہ چل۔"

المرح کا معنی ایک قول کے مطابق انتہائی خوشی ہے۔ ایک قول کے مطابق چلنے میں تکبر کرنا ہے۔ ایک قول کے مطابق انسان کا اپنی حیثیت سے آگے بڑھنا ہے۔ ایک قول کے مطابق چلنے میں اکڑنا ہے۔ ایک قول کے مطابق ٹھکرانا اور سب سے زیادہ شریر ہونا ہے۔ ایک قول کے مطابق خوشی و چالاکی ہے۔ ظاہری طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معنی اکڑنا اور فخر کرنا ہے: زجاج اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: تو زمین میں اکڑ کر اور فخر کرتے ہوئے نہ چل۔ ساتھ ہی زمین کا تذکرہ کیا اس لئے کہ چلنا تو زمین پر ہی ہوتا ہے یا اس پر جس کی بنیاد اور تعلق اس زمین پر ہے۔ جسے سواری ہے، تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تاکید اور تقریر کے لیے ہے۔ اس نے بہت عمدہ بات کہی جس نے یہ کہا ؏

ولا تمش فوق الارض الا تواضعا   فكم تحتها قوم هم منك ارفع

وان كنت في عز وحرز ومنعة   فكم مات من قوم هم منك امنع

"تو زمین پر عاجزی سے ہی چل، کتنے ہی لوگ جو تجھ سے بہت بلند تھے اس کے نیچے

جا چکے ہیں۔ اگر تو عزت بچاؤ اور حفاظت کے حصار میں ہے' تو کتنے ہی ایسے لوگ فوت ہو چکے اور یہ جو تجھ سے زیادہ حفاظت والے تھے۔''

المرح: مصدر ہے حال واقع ہوا ہے' یعنی اکڑ والا۔ مصدر بناتے ہوئے اسے صفت کی جگہ لائے اور یہ تاکید کی ایک قسم ہے' جمہور اسے فَرَحًا پڑھتے ہیں۔ یعقوب نے ایک جماعت سے راء کا کسرہ نقل کیا ہے اس لئے کہ یہ اسم فاعل ہے

مضمون نمبر: ۵

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ۔ (۷۸)

''نماز کو قائم کریں آفتاب کے ڈھلنے سے۔''

علماء نے اس آیت میں دلوك کے معنی میں اختلاف کیا ہے جو دو اقوال پر مشتمل ہے۔ (۱) اس سے مراد ہے نصف النہار سے سورج کا ڈھل جانا' یہ قول سیدنا عمر' سیدنا ابن عمر' سیدنا ابو ہریرہ' سیدنا ابو برزہ' سیدنا ابن عباس رضوان اللہ علیہم' حسن' شعبی' عطاء' مجاہد' قتادہ' ضحاک اور ابو جعفر کا ہے اور اسے ابن جریر نے پسند کیا ہے۔ (۲) اس سے مراد سورج کا غروب ہونا ہے۔ یہ قول سیدنا علی' سیدنا ابن مسعود' سیدنا ابی بن کعب رضوان اللہ علیہم اور ابو عبید رحمہ اللہ کا ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔

فراء نے کہا ہے: سورج کا ڈھلنا زوال سے لے کر اس کے غروب تک ہے۔ الازہری فرماتے ہیں: عرب کی کلام میں دلوك کا معنی زوال ہے' اسی لئے جب سورج نصف النہار سے زائل ہوتا ہے تو اسے دالکہ کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ دونوں حالتوں میں زائل ہونے والا ہے۔ الازہری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ اس سے نصف النہار کے وقت اس کا زائل ہونا مراد ہے اس لئے کہ آیت پانچوں نمازوں کو جمع کرنے والی ہے' تو معنی یہ ہو کہ نماز قائم کرو سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک تو اس میں ظہر' عصر' مغرب اور عشاء سب داخل ہوں گی اور فجر کا قرآن پڑھنا' یہ صبح کی نماز ہے پس یہ پانچ نمازیں ہوئیں۔

اِلٰي غَسَقِ الَّيْلِ۔ ''رات کی تاریکی تک۔'' اس سے مراد اندھیرے کا چھا جانا ہے' فراء اور زجاج کہتے ہیں: غسق اللیل اور اغسق اس وقت بولا جاتا ہے جب اندھیرا آ جائے۔ ابو عبید کہتے ہیں الغسق سے مراد سیاہ رات ہے' اصل میں یہ کلمہ السیلان بہنے سے آیا ہے' مقولہ ہے

اغسقت جبکہ کوئی چیز بہہ جائے۔ جولوگ ظہر کی نماز کا وقت زوال سے شروع کر کے مغرب تک لے جاتے ہیں، وہ یہاں "الی غسق اللیل" سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ بات اوزاعی اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے اور اسے امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ نے ضرورت کے وقت جائز قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے احادیث صحیحہ اور متواترہ نماز کے اوقات کے بارہ میں منقول ہیں ضروری ہے کہ اس آیت کو اس پر محمول کرنا چاہیے جو سنت سے واضح ہو جائے، ہم اس بات کو طوالت نہیں دینا چاہتے۔

وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۔''اور فجر کا قرآن پڑھنا۔'' مفسرین کا کہنا ہے اس سے مراد صبح کی نماز ہے، زجاج کہتے ہیں اس میں ایک بہت بڑا فائدہ ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ قراءۃ کے بغیر نماز نہیں ہوتی یہاں تک کہ نماز کو ہی قرآن کہہ دیا گیا اور صحیح احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سورہ فاتحہ پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی، بعض احادیث میں تو جو کہ حسن درجہ تک ضرور پہنچتی ہیں یہ بات ہے کہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا ضروری ہے۔ ایسی احادیث بھی منقول ہیں جو دلیل ہیں کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنا لازم ہے اگرچہ امام کے پیچھے ہوں، اسی پر اکثر اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد والوں کا عمل ہے اور یہی بات درست ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر اپنی کتب میں بہت عمدہ وضاحت کی ہے، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے مقامات پر لکھا ہے۔

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ''یقیناً فجر کے وقت کا قرآن پڑھنا حاضر کیا گیا ہے۔'' یعنی اس وقت دن اور رات کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں جیسا کہ یہ بات صحیح احادیث میں منقول ہے اور یہی قول جمہور مفسرین کا ہے۔

مضمون نمبر:٦

وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا ۔(١١٠)

''نہ تو تو اپنی نماز بہت بلند آواز سے پڑھ اور نہ بالکل ہی آہستہ آواز میں۔''

یعنی نماز کی قراءۃ زیادہ بلند آواز میں نہ کریں اور نہ ہی اتنی آہستہ آواز میں کہ مقتدیوں کو سنائی نہ دے۔ معلوم ہونے کی وجہ سے یہاں صلوٰۃ سے پہلے مضاف (قرأت) محذوف ہے کیونکہ اظہار اور پوشیدگی خاموشی کی صفات ہیں نہ کہ بذات خود نماز کی تو یہاں ساری نماز کا لفظ

بول کر اس کا ایک حصہ مراد لیا گیا ہے، مقولہ ہے خفت صوته خفوتا جبکہ وہ سلسلہ کلام روک دے کمزور ہو اور کچھ دیر ٹھہر جائے اور خفت الزرع اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ کھیتی مرجھا جائے' خافت الرجل بقراء ته جبکہ وہ اپنی آواز بلند نہ کرے' ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے نہ تو تو اپنی ساری نماز کو بلند آواز سے پڑھ اور نہ بالکل ہی اسے پوشیدہ کر دے۔ پہلا معنی زیادہ درست ہے۔

وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ۔ ''اس کے درمیان تلاش کر'' یعنی اظہار اور پوشیدگی کے درمیان درمیان جس پر مذکورہ دونوں فعل دلالت کرتے ہیں۔ سَبِيْلًا ''راستہ'' یعنی ایسا راستہ جو ان دونوں احکامات کے درمیان ہو جو نہ زیادہ بلند ہو اور نہ پوشیدہ۔ دوسری تفسیر کی بنا پر اس نہی کا معنی ہوگا کہ پوری نماز کی قراء کو بلند آواز سے پڑھنا منع ہے اور ساری نماز میں قراءۃ پوشیدہ پڑھنا منع ہے۔ حکم کچھ نمازوں کو بلند آواز سے پڑھنے کا ہے، وہ ہے رات کی نماز اور کچھ کو پوشیدہ پڑھنے کا ہے اور وہ ہیں دن کی نمازیں۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ آیت اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً سے منسوخ ہے۔

مضمون نمبر: ۷

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا۔

''کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں جو اولاد نہیں رکھتا۔''

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حکم دیا کہ اسے یاد کرنے اور پکارنے کے لئے اس کے اچھے اچھے ناموں سے پکارا جائے، تو اس کی تعریف کی کیفیت بیان کی اور یہ ارشاد فرمایا: قل الحمدلله الذی لم يتخذولدا۔ اے محمد ﷺ کہہ دیجیے کہ تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے (اپنے لیے) اولاد پیدا نہیں کی۔ جیسا کہ یہودی اور عیسائی کہتے ہیں اور مشرکوں میں سے بھی کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں' تعالیٰ الله عن ذالك علوا كبيرا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے۔

وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ''وہ اپنی بادشاہت میں کسی کو شریک اور ساجھی نہیں رکھتا'' یعنی کوئی بھی اس کا شریک نہیں کہ جو اس کی بادشاہت یا اس کی ربوبیت میں شریک ہو جائے جیسا کہ ثنویہ وغیرہ فرقوں کا خیال ہے جو کئی معبودوں کے قائل ہیں۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ۔ ''اور نہ وہ کمزور ہے کہ اسے کسی حمایتی کی ضرورت

ہو۔" یعنی اللہ تعالیٰ کو کسی کی نیابت کی ضرورت نہیں کسی بھی کمزوری کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کو لگی ہو وہ تو ہر قسم کے دوست اور مددگار سے غنی و بے پرواہ ہے۔ زجاج کہتے ہیں، یعنی وہ اس چیز کا محتاج نہیں کہ وہ کسی کے بغیر کسی دوسرے کی مدد کرے۔ تعریف کے دوران ان بزرگ صفات کا ذکر کرنا یہ اعلان ہے کہ اس تعریف کا مستحق وہی ہے جو ان صفات کا حامل ہو، وہ کسی کو بھی نئے سرے سے بنانے اور نعمتوں کے بڑھانے پر بھی قدرت رکھتا ہے کیونکہ اولاد بخل اور بزدلی کا سبب ہوتی ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے اس کا باپ ہونا لازم آتا ہے کیونکہ وہ کسی ایسے حصہ سے پیدا ہوا جو کئی اجزاء میں سے ہے اور نئے سرے سے پیدا ہونے والا نعمتوں کو مکمل کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔

بادشاہت میں شراکت سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز پر قائم و دائم رہنے پر قادر نہیں' جو استقلال پر قادر نہ ہو وہ عاجز ہوگا چہ جائیکہ وہ اس سارے کام کی نگرانی کرے جو اس کے متعلق ہیں کجا یہ کہ وہ اپنے ذمہ حقوق و فرائض کو ضائع کرے۔ یہ بھی کہ شراکت دو شریکوں کے درمیان جھگڑے کا سبب ہوتی ہے' ایک شریک اپنے ساتھی کی طرف خیر نہیں پہنچنے دیتا اس تک نقصان ہی پہنچاتا ہے، اگر اس جہاں میں اللہ وحدہٗ کے علاوہ بھی کوئی الٰہ ہوتا تو فساد ہو جاتا۔ وہ محتاج کمزور ہوگا جو کسی دوست کی ضرورت محسوس کرے جو اس سے کمزوری دور کرے اور جو اسے کمزور کرنا چاہے اس کے خلاف اس کی مدد کرے یہ محتاج اس چیز کی طاقت نہ رکھتا ہو، جس کی یہ طاقت رکھتا ہے جو کہ خود اپنے آپ سے بے پرواہ ہے۔

وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا "اور تو اس کی پوری پوری بڑائی بیان کرتا رہ۔"

یعنی اس کی بھرپور تعظیم بیان کرو اور یہ بیان کرو کہ وہ ہر چیز سے عظمت والا ہے۔ ابن جریر قتادہ سے بیان کرتے ہیں کہ ہمیں یہ بیان کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الخ چھوٹے اور بڑے سب لوگوں کو یہ آیت سکھایا کرتے تھے۔ عبدالرزاق نے مصنف میں عبدالکریم بن ابی امیہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ بنو ہاشم کے غلام (بچہ) کو جب وہ پوری طرح بولنے کے قابل ہوتا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا یہ آیت سکھاتے کہ اسے سات مرتبہ پڑھنا ہے۔ آخر سورۃ تک یہ آیت سکھاتے کہ اسے سات مرتبہ پڑھنا ہے۔

امام احمد' طبرانی رحمہما اللہ نے معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بزرگی والی آیت یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔

تفسیر سورۃ طٰہٰ

یہ سورۃ مکی ہے' اس کی آیات ایک سو پینتیس ہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام لوگوں کے قول کے مطابق، اس کا شان نزول سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام تھا' ان کا واقعہ سیرت کی کتب میں معروف ہے۔

مضمون نمبر:۱

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ۔ (۱۳۱)

''اور اپنی نگاہیں ہرگز ان چیزوں کی طرف نہ دوڑانا۔''

نظر دوڑانے کا معنی ہے اسے پھیلانا جسے دیکھ رہا ہے اسے اچھا سمجھتے ہوئے اور اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہو قریب نہیں کہ اسے واپس لوٹائے۔ اس کے متعلق ایک بات یہ ہے کہ مسلسل نہ دیکھنا قابل معافی ہے اور یہ اس طرح کہ جس طرح اچانک کسی چیز پر نظر پڑ جائے، پھر اس سے نظر کو پھیر لے۔ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖ۔ ''جو ہم نے دے رکھا ہے'' یعنی تو دنیاوی آرائشوں سے، اس میں رغبت کرتے ہوئے، اس کی آرزو کرتے ہوئے اپنی نظر کو لالچی نہ بنا اور نہ اس کی طرف اپنی نظر کو لگادے۔ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ۔ ''انہیں مختلف اشیاء۔'' یہ مَتَّعْنَا کا مفعول ہے۔ الازواج کہتے ہیں مختلف اقسام کو، یہ بات ابن قتیبہ نے کہی۔ جوہری کہتے ہیں ازواج کا معنی ہے ساتھی۔ واحدی کہتے ہیں: کسی کا اپنی آنکھوں کو کسی چیز کی طرف مسلسل دیکھے جانا جب نظر کی چیز کو لگا تار دیکھ رہی ہو' نظر کو کسی چیز کو مسلسل دیکھنا اس کی خوبصورتی پر دلالت کرتا ہے۔ بعض نے کہا آیت کا معنی ہے تو کسی پر حسد نہ کر اس بات پر جو اسے دنیاوی گئی اور یہ کام چھوڑ دے کیونکہ حسد سے مطلق طور پر روک دیا گیا ہے۔

زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ''دنیاوی آرائش سے'' یعنی نباتات اور فصلوں کے ذریعہ اس کی زینت اور خوبصورتی مراد ہے۔

تفسیر سورۃ الحج

یہ سورۂ مکی ہے یا مدنی، جمہور کہتے ہیں یہ ملی جلی ہے کچھ حصہ مکی ہے اور کچھ مدنی، اس کی ستاسی (۸۷) آیات ہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں یہی بات درست ہے۔ عزری کہتے ہیں یہ عجیب ترین سورتوں میں سے ہے یہ دن اور رات میں سفر اور حضر میں مکہ اور مدینہ میں جنگ اور امن میں بطور ناسخ اور منسوخ کے محکم اور متشابہ آیات کی صورت میں نازل ہوئی۔ اس کی فضیلت کے بارہ میں کئی احادیث منقول ہیں۔

مضمون نمبر:۱

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ۔ (۵)

"لوگو! اگر تمہیں مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے۔"

یعنی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر تو اپنی ابتدائی پیدائش دیکھو۔ فَإِنَّا خَلَقْنَٰكُمْ۔ "تو سوچو ہم نے تمہیں پیدا کیا" تمہارے والد آدم علیہ السلام کی پیدائش کے ضمن میں تم سب آ گئے۔ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ۔ مٹی سے، پھر نطفہ سے" یعنی منی سے اسے نطفہ اس لئے کہا گیا کہ یہ معمولی سا ہوتا ہے اور نطفہ تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں: بعض اوقات اسی قسم کے زیادہ پانی پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، قطرے کو نطفہ کہتے ہیں۔ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ۔ "پھر خون" یعنی جمے ہوئے خون سے علق تازہ خون کو کہتے ہیں، یعنی تازہ جما ہوا خون' ایک قول کے مطابق سخت سرخ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا خون جو منی سے تیار ہوتا ہے۔

ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ۔ پھر گوشت کے لوتھڑے سے' اس سے مراد گوشت کا اتنا بڑا ٹکڑا جسے چبانے والا چبا سکے اور یہ گوشت کا لوتھڑا علقہ جمے ہوئے خون سے تیار ہوتا ہے۔ مُّخَلَّقَةٍ۔ "جو صورت دیا گیا تھا" اسے مجرور پڑھا جائے گا جو کہ مضغة کی صفت ہے، یعنی اس کی پیدائش واضح اور اس کی صورت ظاہر ہو چکی ہو۔ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ 'اور بے نقشہ تھا' یعنی نہ اس کی پیدائش ابھی واضح ہوئی اور نہ صورت ظاہر ہوئی۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں مُخَلَّقَةٍ سے مراد ہے اس کی ابتدائی پیدائش اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ سے مراد جس کی ابھی تصویر نہ بنی ہو۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے جس کی روح پھونکنے کے بعد اس کی پیدائش مکمل ہو جائے، وہ تو مخلقہ ہے اور یہی ہے جو مکمل بچہ کی

صورت میں جنم لیتا ہے اور جو حمل کی صورت میں گر جائے تو وہ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ ہے، یعنی وہ مکمل تخلیق کے ساتھ زندہ نہیں ہوتا۔ فراء کہتے ہیں: مخلقة پوری پیدائش والے کو کہتے ہیں اور غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ حمل گرنے کو کہتے ہیں اسی معنی میں شاعر کا یہ جملہ ہے ؏

اَخِي غَيْرِ الْمُخَلَّقَةِ الْبُكَاءُ فَأَيْنَ الْحَزْمُ وَيْحَكَ وَالْحَيَاءُ

یعنی کیا غیر مخلقہ پر روتا ہے، حزم وحیا کہاں ہے تو مر جائے گا۔

تو معنی یہ ہوا کہ ہم نے تمہیں اس نئی صورت میں پیدا کیا لِنُبَيِّنَ لَكُمْ۔ "یہ ہم تم پر ظاہر کر دیتے ہیں" جو اور جس طرح ہم چاہیں اپنی قدرت کا کمال دکھاتے اور ظاہر کرتے ہیں جیسے مردوں کو زندہ کرنا اور دوبارہ لوٹانا، لہٰذا تم اس پر ایمان لاؤ اور یقین کر لو۔ یہ آیت موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے دلائل میں سے ہے۔

مضمون نمبر:۲

هَٰذَانِ خَصْمَانِ۔(۱۹)

"یہ دو اختلاف کرنے والے ہیں۔"

ان دو میں سے ایک گروپ تمام گروہوں سے زیادہ گندا اور پلید ہے، یہ یہودی عیسائی بے دین اور مجوسی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے شرک کیا اور دوسرا گروہ مسلمانوں کا ہے، یہ دونوں گروہ آپس میں جھگڑے۔ یہ بات فراء وغیرہ نے کہی۔ ایک قول کے مطابق خصمین سے مراد جنت اور جہنم ہے۔ جنت کہے گی مجھے رحمت کے لئے پیدا کیا ہے اور آگ کہے گی مجھے سزا کے لئے پیدا کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق خصمین سے مراد وہ لوگ ہیں، جو بدر کے دن مومنین کی طرف سے باہر نکلے اور وہ سیدنا حمزہؓ سیدنا علی اور سیدنا ابوعبیدہ رضوان اللہ علیہم تھے' کافروں کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ تھے۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ تو قسم اٹھایا کرتے تھے کہ یہ آیت ان کے بارہ میں نازل ہوئی ہے' اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے، دو مقابل گروہوں اور وہ دوسروں کی نسبت شان نزول سے زیادہ واقف ہیں۔

صحیح میں یہ بات ثابت ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت ہمارے بارہ میں نازل ہوئی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ اخْتَصَمُوا' وہ جھگڑے' اور یہ نہیں کہا کہ وہ دو جھگڑے۔ فراء کہتے ہیں اس لئے کہ وہ مبارزت کرنے والے جمع، یعنی دو سے زیادہ تھے' اگر اللہ

تعالیٰ اِختَصَمَا فرماتے تو باقی معانی جائز ہوتے۔ فِی رَبِّهِم "اپنے رب کے بارہ میں" یعنی اپنے رب کے لئے، اس کے، دین اس کی ذات، اس کی صفات اور اس کی شریعت جو اس کے بندوں کے لئے ہے یا یہ تمام معانی اکٹھے ہی مراد لیے جائیں۔

مضمون نمبر: ۳

اِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ يَصُدُّونَ۔ (۲۵) "جن لوگوں نے کفر کیا وہ روکنے لگے۔"

یہاں "یصدون" روکنے کا معنی ہے کسی کام پر ہیشگی کرنا' نہ کہ صرف سامنے آنا اس بات کی وضاحت ماضی پر عطف ڈال کر کی ہے اور جائز ہے کہ یصدون سے پہلے والی واؤ حالیہ ہو، یعنی انہوں نے کفر کیا اس حال میں کہ وہ الصد سے مراد روکنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکتے ہیں۔

عَنْ سَبِيلِ اللهِ۔ "اللہ تعالیٰ کے راستہ سے۔" یعنی اس کے دین سے، معنی یہ ہوا وہ روکتے ہیں اس شخص کو جو اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہونا چاہے۔ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ "اور حرمت والی مسجد سے" اس کا عطف سبیل اللہ پر ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے صرف وہی مسجد مراد ہے جیسا کہ قرآنی اسلوب سے واضح ہے اور ایک قول کے مطابق سارا حرم مراد ہے کیونکہ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حدیبیہ کے دن اس سے روکا تھا۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد مکہ ہے ان کی دلیل یہ فرمان الٰہی: الَّذِي جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ہے۔ "جسے ہم نے تمام لوگوں کے لئے مساوی کر دیا ہے" یعنی اسے ہم نے عام لوگوں کے لئے بنایا کہ وہ اس میں نماز پڑھیں، اس میں طواف کریں' وہ مقیم ہوں یا مسافر، سب برابر ہیں فیہ الْعَاكِفُ "وہیں کے رہنے والے ہوں" جو ہمیشہ سے وہاں رہنے والے ہیں۔ وَ الْبَادِ "یا باہر کے ہوں" یعنی جو دوسرے علاقوں سے یہاں پہنچے ہیں۔

اس سے مراد مسافر ہے کہ اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ کسی دیہات سے آئے یا اس کے علاوہ کسی جگہ سے۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس پر تو اجماع ہے کہ مسجد احرام سب کے لئے برابر ہے۔ اور مکہ کے بارہ میں اختلاف ہے: مجاہد اور امام مالک رحمہ اللہ کا موقف ہے کہ مکہ کے گھر اور اس کے مسافر خانے مقیم اور مسافر کے لئے برابر ہیں۔ سیدنا عمر بن خطاب اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ایک جماعت کا موقف ہے کہ آنے والا شخص جہاں جگہ پائے ٹھہر جائے اور گھر والے پر ضروری ہے کہ وہ اسے جگہ دے وہ چاہے انکار کرے یا اس کی خواہش کرے۔ جمہور کا موقف یہی ہے کہ مکہ کے گھر اور مسافر خانے مسجد حرام کے حکم کی طرح نہیں ہیں اور یہاں کے رہائشیوں کے لئے

جائز ہے کہ مسافر کو اپنے گھروں میں ٹھہرنے سے روکیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اب تک کی گفتگو دو باتوں کی طرف لوٹتی ہے۔

(۱) کیا اس آیت میں مذکور مسجد سے مراد بذات خود وہ ہے یا سارا حرم یا خاص طور پر مکہ؟

(۲) کیا مکہ صلح سے فتح ہوا یا زبردستی، اگر فرض کریں کہ یہ زبردستی فتح ہوا' تو کیا نبی ﷺ نے اسے اس کے باسیوں کے ہاتھوں میں خاص طور پر چھوڑ دیا یا اسے ان تمام لوگوں کے لئے باقی رکھا جو بھی یہاں آئے؟

اس بات کی وضاحت امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی شرح نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار میں اس طرح کر دی ہی اس کا مطالعہ کرنے والا مزید کسی کتاب کا محتاج نہ ہوگا۔

مضمون نمبر:۴

وَ الْبُدْنَ۔(۳۶) ''قربانی کے اونٹ۔''

ابن ابی اسحٰق سے وَالْبُدُنَ پڑھتے ہیں اور باقی وَالْبُدْنَ پڑھتے ہیں۔ یہ دونوں لغات ہیں۔ یہ نام اونٹ کے ساتھ خاص ہے۔اس کا نام بدنۃ اس لئے رکھا گیا کہ یہ بڑے بدن والا ہوتا ہے اور بدانۃ موٹے کو کہتے ہیں۔ ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اونٹ کے علاوہ بھی بولا جاتا ہے۔ پہلا معنی ان اوصاف کی وجہ سے ہے جو اونٹ میں ظاہر ہوتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ لغت کی کتب اس نام کو اونٹ کے ساتھ ہی خاص بتاتی ہیں۔ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ علماء نے گائے پر بدن کا لفظ بولنے کے بارہ میں دو اقوال پر اختلاف کیا ہے۔ان میں سے صحیح اور زیادہ درست یہ ہے کہ یہ لفظ شرعی طور پر لفظ اونٹ پر ہی بولا جائے جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے۔

جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ ''ہم نے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں مقرر کر دی ہیں۔'' یعنی اس کے دین کی علامات لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ''ان میں تمہیں نفع ہے،یعنی دینی اور دنیاوی فوائد ہیں۔فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا ''ان پر اللہ تعالیٰ کا نام لو'' یعنی ان کے نحر (ذبح) کے وقت۔ صَوَآفَّ۔ ''کھڑا کر کے'' یعنی تین ٹانگوں پر کھڑا ہو کیونکہ اسے نحر کرتے وقت اس کو کھڑا کر کے ایک گھٹنہ باندھ دیا جاتا ہے، دراصل یہ گھوڑے کی صفت ہے ایک محاورہ ہے۔ صفن الفرس فھو صافن، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ تین قدم پر کھڑا اور چوتھے کو اس نے موڑ رکھا ہو۔

حسن' اعرج' مجاہد' زید بن اسلم اور سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے صَوَافِيَ پڑھتے ہیں، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے لئے خالص ہے اس کے نحر کے وقت وہ کسی دوسرے نام کو شریک نہیں کرتے۔

صواف کی واحد صافۃ ہے یہ جمہور کی قراۃ ہے اور صوافی کی واحد صافیہ ہے۔ سیدنا ابن مسعود، سیدنا ابن عمر، سیدنا ابن عباس رضوان اللہ علیہم، ابو جعفر اور محمد بن علی صوافن جمع صافنۃ پڑھتے ہیں، اس کا معنی ہے کہ جسے گھٹنہ باندھ کر اس کا ایک پاؤں اٹھا دیا جائے تاکہ وہ پھڑ کنے نہ پائے اور اسی معنی میں یہ فرمان الٰہی وَالصَّافِنَاتُ الْجِيَادِ ہے۔

فَإِذَا وَجَبَتْ ۔ جب زمین پر لگ جائے" لگنے سے مراد ہے گرنا، یعنی جب نحر کرنے کے بعد وہ گر جائے جُنُوبُهَا ۔ "اس کے پہلو" اور یہ بات اس وقت ہوگی جب اس کی روح نکل جائے۔ فَكُلُوا مِنْهَا ۔ "تو اسے کھاؤ" جمہور کا موقف ہے کہ یہ حکم استحباب کے لئے ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ بھی ہے۔ "اور مسکین سوال سے رکنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ" یہی بات مجاہد، نخعی، ابن جریر اور ابن شریح رحمہ اللہ نے کہی۔ امام شافعی اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ وجوب کے لئے ہے اور قانع کے بارہ میں اختلاف ہے کہ یہ کون ہے؟ ایک قول کے مطابق سوال کرنے والا اور ایک قول کے مطابق سوال سے بچنے والا اور جو مل جائے اسی پر قناعت کرنے والا۔ یہ معنی خلیل نے ذکر کیا اور پہلا معنی زید بن اسلم ان کے بیٹے سعید بن جبیر اور حسن نے بیان کیا ہے۔ اور یہی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور دوسرا معنی عکرمہ اور قتادہ نے بیان کیا۔

الْمُعْتَرَّ ۔ محمد بن کعب القرظی، مجاہد، ابراہیم کلبی اور حسن کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ہے جو سوال کے بغیر ہی پیش آئے۔ ایک قول کے مطابق وہ ہے جو سامنے آئے اور سوال کرے۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں سب سے عمدہ بات جو میں نے سنی وہ یہ ہے کہ قانع فقیر کو اور معتر زیارت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قانع اور معتر یہ دونوں وہ ہیں، جو سوال نہ کریں لیکن قانع وہ ہے۔ جو اس کے پاس ہو اس پر راضی ہو جائے اور سوال نہ کرے اور معتر وہ ہے جو تمہارے سامنے تو آئے مگر سوال نہ کرے۔

كَذٰلِكَ ۔ "اسی طرح" یعنی اس انوکھی تسخیر کی طرح۔ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ "ان چوپایوں کو تمہارے ماتحت کر دیا" وہ تمہارے مطیع ہو گئے، نحر کی جگہ تم انہیں نحر کر کے ان سے فائدہ حاصل کرتے ہو، اس کے بعد کہ وہ تمہارے ماتحت تھے جب تم ان پر سامان لادتے اور ان کی کمر پر سوار ہوتے اور ان کا دودھ دوہتے ہو، وغیرہ۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ "تاکہ تم شکر گزاری کرو" اس نعمت پر جو اللہ تعالیٰ نے ہر اس شکل میں انعام کی ہے۔

تفسیر سورۃ النور

اس کی چھیالیس آیات ہیں۔ ابن مردویہ ابن عباس اور ابن زبیر سے بیان کرتے ہیں کہ سورۂ نور مدینہ میں نازل ہوئی۔

مضمون نمبر: ۱

اَلزَّانِيَةُ۔(۲)

"بدکار عورت۔"

زنا کہتے ہیں، بغیر نکاح اور بغیر شبہ نکاح کے آدمی کا عورت کی شرمگاہ میں صحبت کرنا۔ ایک قول کے مطابق طبعی طور پر قابل شہوت شرمگاہ میں ذکر کو داخل کرنا جو کہ شرعی طور پر حرام ہو۔ بدکار عورت، اسے کہتے ہیں جو زنا کی طرف مائل کرے اور اسے ممکن بنائے جیسا کہ یہ معنی مذکورہ صیغہ بیان کر رہا ہے نہ کہ وہ عورت جس سے زبردستی کی جائے۔ اسی طرح اَلزَّانِیْ "بدکار مرد" کا بھی حکم ہے۔

فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا۔ "ان میں سے ہر ایک کو کوڑے لگاؤ۔" اَلْجَلْدُ مارنے کو کہتے ہیں، مقولہ ہے جَلَدَهٗ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی کسی کی جلد پر مارے، اسی طرح ہے بطنہ جبکہ اس کے پیٹ پر مارے اسی طرح راسہ ہے جبکہ اس کے سر پر مارے۔

مِائَةَ جَلْدَةٍ "سو کوڑے" یہ زنا کار کی حد (سزا) ہے جو آزاد بالغ اور کنوارہ خواہ مرد ہو یا عورت۔ سنت میں اس کوڑے کی سزا پر ایک سال کی جلاوطنی بھی ثابت ہے۔ یہی قول امام شافعی کا ہے۔ امام مالک نے جلاوطنی کی سزا عورت کو چھوڑ کر مرد کے لئے خاص کی ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے قاضی وقت یا امام کے اختیار پر چھوڑا ہے۔

البتہ غلام مرد یا عورت ان میں سے ہر ایک کو پچاس پچاس کوڑے لگائے جائیں گے۔

فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔

یہ لونڈیوں کے بارہ میں واضح نص ہے اور ان کے ساتھ غلاموں کو ملایا گیا اس لئے کہ حکم الگ الگ نہیں، البتہ جو شادی شدہ آزاد لوگوں میں سے ہو تو اس کی سزا رجم، یعنی سنگسار کرنا ہے، یہ بات سنت صحیحہ متواترہ اور اہل علم کے اجماع سے ثابت ہے، قرآن حکیم میں اس حکم کے الفاظ منسوخ ہو چکے ہیں مگر اس کا حکم باقی ہے وہ لفظ یہ تھے: اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا

اَلْــبَـتَّــةَ ۔ ''شادی شدہ مرد اور عورت جب زنا کریں تو انہیں لازمی سنگسار کر دو۔'' اہل علم کی ایک جماعت نے رجم کے ساتھ سو کوڑوں کا اضافہ کیا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس بارہ میں جو حق اور درست بات ہے اسے اپنی کتاب نیل الاوطار منتقی کی شرح میں پوری طرح واضح کیا ہے۔ یہ روک رکھنے والی آیت اور ''واللذان یأتیانها منکم'' الخ جو کہ سورۂ نساء میں ہیں، ان کیلئے ناسخ ہے۔

بدکار عورت کا ذکر بدکار مرد سے پہلے آنے کی وجہ یہ ہے کہ: اس زمانہ میں زنا کاری عورتوں میں زیادہ عام تھی حتیٰ کہ انہوں نے اپنے دروازوں پر جھنڈے لگا رکھے تھے تاکہ جوان سے بے حیائی اور بدکاری کرنا چاہے تو اسے معلوم ہو جائے، ایک قول کے مطابق پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عورت ہی بنیاد ہوا کرتی ہے اس کام میں۔ ایک قول کے مطابق اس لئے کہ عورت میں شہوت زیادہ ہوتی ہے اور اس پر اس کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق ان میں اس پر عار زیادہ ہوتی ہے جبکہ ان کا موضوع پردہ اور حفاظت ہو تو اس کے ذکر کو سختی اور اہتمام کی وجہ سے مقدم کیا۔

اس آیت میں خطاب امام اور حاکم کو ہے یا جو ان کے قائم مقام ہو۔ ایک قول کے مطابق تمام مسلمانوں سے ہے کیونکہ حدود کا قیام ان تمام کے ذمہ ہے اور امام ان کی طرف سے نائب ہوتا ہے جبکہ ان کا اسے قائم کرنے پر اجماع ممکن نہ ہو۔ وَلَا تَــاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَــةٌ ۔ ''ان کے متعلق ہرگز ترس نہیں کھانا چاہیے'' اس کا معنی ہے ترس اور رحمت و شفقت' ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے رحمت سے زیادہ نرمی۔ فِــيْ دِيْنِ اللّٰهِ ''اللہ تعالیٰ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے'' اس کا معنی ہے کہ اس کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہوئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: مَا كَانَ لِيَـاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ۔

پھر جنہیں حکم دیا گیا تھا انہیں ثابت قدم رکھنے اور انہیں ابھارنے کے لئے مزید فرمایا: اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ''اگر تمہیں اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان ہو۔''
جیسے کوئی شخص دوسرے کو کسی کام پر ابھارنے کے لئے کہتا ہے کہ اگر تو مرد ہے تو ایسا کام کر، یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور آخرت کو دوبارہ جی اٹھنے کے وقت تمام کاموں کے بدلہ کی تصدیق کرتے ہو تو حدود کے نفاذ اور قیام کو معطل نہ کرو۔

وَلْــيَـشْــهَـدْ عَذَابَــهُمَا طَـآئِفَــةٌ مِّنَ الْمُؤْمِــنِيْنَ ''ان کی سزا کے وقت

مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے" یعنی اس وقت حاضر ہوں تا کہ ان کی رسوائی میں اضافہ اوران کے عار و بے عزتی ہو اوران کی رسوائی پھیلے۔ طائفہ اس گروہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو طواف کی شکل میں گھیرے ہوئے ہو، طائفہ کا لفظ کم از کم تین پر بولا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق دو بھی طائفہ ہیں۔ ایک قول کے مطابق ایک بھی طائفہ ہے۔ ایک قول کے مطابق چار اور ایک قول کے مطابق دس طائفہ ہیں۔

مضمون نمبر:۲

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ۔(۴)

"جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں۔"

زنا جیسی بے حیائی کی گالی دینے سے استعارہ کیا ہے اس لئے کہ یہ زبانی جرم ہے، اس گالی کو اس بے حیائی کے ساتھ ادا کرنے کو قذف (تہمت) کہتے ہیں۔ پاکدامن سے مراد عورتیں ہیں بالخصوص ان کا ذکر کیا کیونکہ ان پر تہمت لگانا زیادہ برا فعل ہے اوران میں عار بھی زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ اس حکم میں مرد بھی شامل ہیں اس پر اس امت کے علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ہمارے استاذ شوکانی رحمہ اللہ کے شیخ نے اس بارہ میں ایک رسالہ ترتیب دیا ہے جس میں گیارھویں صدی ہجری کے ان علماء کا رد کیا ہے جنہوں نے اس بارہ میں جھگڑا کیا تھا۔

ایک قول کے مطابق آیت مردوں عورتوں کو عام ہے اور تقدیر یوں ہوگئی کہ: الا نفس المحصنات۔ اس بات کی تائید دوسری آیت میں مذکور فرمان الٰہی وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ سے ہوتی ہے۔ یہاں عورتوں کی وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ لفظ محصنات میں عورتوں کے علاوہ بھی شامل ہوتے ہیں ورنہ پھر "من النساء" کا کوئی معنیٰ نہیں بنتا۔ ایک قول کے مطابق محصنات سے مراد شرمگاہیں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا "پس آیت مرد اور عورت سب کو تغلیباً شامل ہوگی اوراس میں ایک یہ بات بھی ہے کہ عورتوں کو مردوں پر تغلیباً ذکر کرنا عربی زبان میں معروف نہیں۔

یہاں محصنات سے مراد پاکدامن ہیں۔ سورۂ نساء میں احصان کا معنی اوراس کے احتمال کا ذکر گذر چکا ہے۔ علماء کی معتبر شرائط جو تہمت لگانے والے اور جس پر تہمت لگائی گئی ان کے بارہ میں لمبی لمبی مباحث ہیں جو کہ فقہ کی کتب میں لکھی ہوئی ہیں ان میں کچھ دلائل کی روشنی

میں ہیں اور کچھ صرف بے کار رائے کی بنیاد پر۔

جمہور علماء کا موقف ہے کہ حد قذف کافر مرد و عورت پر نہیں ہے۔ جبکہ زہری، سعید بن مسیب اور ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ اس پر حد واجب ہے، اسی طرح ان کا موقف ہے کہ غلام کو چالیس کوڑے لگائے جائیں گے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز اور قبیصہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اسے اسی کوڑے لگائے جائیں گے۔ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ آزاد آدمی کو غلام کی وجہ سے تہمت کی بنا پر کوڑے نہیں لگائے جائیں گے، اس لئے کہ ان کا آپس میں مرتبہ کا فرق ہے۔ صحیح میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جس نے کسی لونڈی پر زنا کی تہمت لگائی، تو اس پر قیامت کے روز حد جاری کی جائے گی ہاں یہ اور بات ہے کہ بات اسی طرح ہو جیسے اس نے کہی ہے۔ (تو پھر نہیں)۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ پاکدامن عورتوں پر تہمت کی حد قائم کرنے کی شرائط ذکر کرتے ہیں کہ: ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ "پھر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکیں۔" جو ان کے خلاف گواہی دیں کہ اس نے زنا کیا ہے۔ ثم کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تہمت والی مجلس کے علاوہ دوسری مجلس میں گواہی پیش کرنا جائز ہے، یہی جمہور کا قول ہے جبکہ امام مالک نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گواہی کا اکٹھا ہونا یا الگ ہونا دونوں جائز ہیں، اس بارہ میں حسن اور امام مالک رحمہما اللہ نے اختلاف کیا ہے جبکہ چار گواہ پورے نہ ہوں اور وہ اس تہمت کا انکار کریں تو ان گواہوں پر تہمت کی حد لگائی جائے گی۔ حسن اور شعبی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ گواہ اور جس کے خلاف گواہی دی گئی کسی پر کوئی حد نہیں یہی قول احمد، ابو حنیفہ اور محمد بن حسن رحمہم اللہ کا ہے۔

اس بات کا رد اس واقعہ سے ہوتا ہے جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوا کہ تین لوگوں کو حد لگائی گئی جنہوں نے مغیرہ پر زنا کی تہمت لگائی تھی اور اس بارہ میں کسی صحابی نے اختلاف نہیں کیا۔

فَاجْلِدُوهُمْ ثَمٰنِينَ جَلْدَةً "تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ۔" اَلْجَلْدُ کسی کے جسم پر مارنے کو کہتے ہیں جیسا کہ گذر چکا، المجالدۃ کہتے ہیں ایک دوسرے کو کوڑے لگانا یا ایک دوسرے کو کوڑے کے ساتھ مارنا، پھر اس لفظ کو عاریۃ لکڑی اور تلوار وغیرہ سے مارنے پر بولا جانے لگا۔

وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا "اور کبھی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔" یعنی ان کے بارہ میں دونوں حکم جمع کر دو کہ انہیں کوڑے بھی لگاؤ اور ان کی گواہی قبول کرنی بھی چھوڑ دو کیونکہ یہ لوگ تہمت لگا کر عادل نہیں رہے بلکہ فاسق ہو چکے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر حکم

لگایا ہے کہ: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ "یہ فاسق لوگ ہیں" یہ جملہ مستانفہ ہے جو گذشتہ کی دوہرائی کے لئے ہے۔ فسق اطاعت اور فرمانبرداری سے نکلنے اور نافرمانی کرکے حد بندی سے پار گذرنے کو کہتے ہیں۔

مضمون نمبر: ۳۰

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ۔(٦)

"جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور ان کا کوئی گواہ نہ ہو۔"

جوانہوں نے ان زنا کی تہمت لگائی ہے اس کی گواہی پیش کریں۔ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ ۔"اپنی ذات کے علاوہ تو ایسے لوگوں میں سے ہر ایک کا ثبوت یہ ہے" جو ثبوت ان سے تہمت کی حد کو دور کردے۔ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ "کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم اٹھا کر کہے کہ وہ سچوں میں سے ہے۔" جو اس نے اس عورت پر زنا کی تہمت لگائی ہے۔ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ "اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اس بات میں اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔" وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ "اس عورت سے سزا اس طرح دور ہوسکتی ہے" دنیاوی سزا۔" یعنی حد۔ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ "کہ وہ چار مرتبہ اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہے کہ یقیناً اس کا مرد" یعنی اس کا خاوند لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ "جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے اور پانچویں دفعہ کہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہو اگر وہ" یعنی اس کا خاوند مِنَ الصّٰدِقِيْنَ "سچوں میں سے ہو" اس الزام میں جو اس نے اس پر زنا کا لگایا ہے۔

'غضب' کو عورت کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا کہ اس پر سختی کی جائے کیونکہ وہ گناہ کی اور اس کا مادہ ہے اور اس لئے کہ عورتیں لعن طعن بہت زیادہ کرتی ہیں، اور اس لعن وطعن نہ کرنے کی وجہ سے غضب کے برعکس ان کے دلوں میں اس کی خاص اہمیت نہ ہوگی۔ لعان بارہ میں بہت سی احادیث منقول ہیں۔ عبدالرزاق نے سیدنا عمر بن خطاب' سیدنا علی اور سیدنا مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا آپس میں لعان کرنے والے کبھی دو اکٹھے نہیں ہوسکتے۔ ہم نے اس موضوع پر اپنی بلوغ المرام کی شرح مسک الختام میں مکمل کر بات ہے اسے دیکھنا چاہیے۔

مضمون نمبر:۴۰

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ۔(۲۷)

"اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ، دوسروں کے گھروں میں نہ جاؤ۔"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گھروں میں بغیر اجازت داخلے پر ڈانٹا ہے اس لئے کہ اس طرح مرد اور عورتوں کا اختلاط ہوسکتا ہے' بعض اوقات یہ زنا یا تہمت زنا تک لے جاتا ہے کیونکہ انسان اپنے گھر میں علیحدگی اور خلوت کی جگہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ ناپسند کرتا ہے کہ اسے اس حال میں کوئی دوسرا دیکھے' پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دوسروں کے گھروں میں اس وقت تک داخلہ سے روک دیا حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا "جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔" استیناس کہتے ہیں کسی دوسرے کو معلوم کروانا اور خبر دینا، یعنی اس وقت تک جب تک کہ جو گھر میں ہے اسے معلوم نہ کروا دو، معنی یہ ہوا حتیٰ کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ گھر والے کو تمہارا علم ہو چکا ہے اور تمہیں یہ بھی پتہ چل جائے کہ اس نے تمہارے داخلہ کی اجازت بھی دی ہے جب تمہیں اس بات کا علم ہو جائے تو پھر داخل ہو جاؤ۔ ایک قول کے مطابق استیناس کا معنی ہے اجازت لینا۔

وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا "اور وہاں کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو" اس کی وضاحت آپ ﷺ نے یوں فرمائی کہ وہ کہے: (السلام علیکم) کیا میں داخل ہوسکتا ہوں؟ ایک مرتبہ یا تین مرتبہ یوں کہے۔ علماء نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ اجازت پہلے ہو یا سلام یا اس کے برعکس؟ تو ایک قول کے مطابق اجازت پہلے لے' یوں کہے: کیا میں داخل ہو جاؤں السلام علیکم۔ اس لئے کہ آیت میں اجازت سلام سے مقدم ہے۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ سلام اجازت پر مقدم کرے اور یوں کہے: السلام علیکم کیا میں داخل ہو جاؤں؟ یہی بات درست ہے کیونکہ آپ ﷺ کی طرف سے اس آیت کی وضاحت اسی طرح ہے۔

ایک قول کے مطابق اگر آدمی پر نظر پڑ جائے تو سلام پہلے کہے وگرنہ اجازت پہلے لے۔

ذٰلِكُمْ "یہی تمہارے لئے" یعنی اجازت لینا اور سلام کرنا، یعنی یہ دونوں کام کر کے داخل ہونا۔

خَيْرٌ لَّكُمْ "سراسر بہتر ہے" اچانک داخل ہونے سے۔ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ "تاکہ تم نصیحت حاصل کرو" یعنی اجازت لینا ہی تمہارے لئے بہتر ہے۔

مضمون نمبر: ۵

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳۰)

''مسلمان مردوں سے کہو۔''

اللہ تعالیٰ نے نظر بازی کی حرمت میں مومنوں کو دوسروں کو چھوڑ کر خاص کیا ہے کیونکہ زنا کے لازمی اسباب میں سے ایک سبب نظر بازی ہے، تو اس سبب کو ختم کرنے کے یہ لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ حق دار ہیں اور دوسروں کے علاوہ نظروں کی حفاظت کے زیادہ مناسب ہیں۔

ایک قول کے مطابق آیت میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ کافر لوگ شرعی احکامات کے مخاطب نہیں جیسا کہ بعض اہل علم کا کہنا ہے۔ **يَغُضُّوا** ''نیچی رکھیں'' نگاہ جھکانے کا معنی ہے: پلک کو آنکھ کے اوپر اس طرح رکھنا کہ دیکھنے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ **مِنْ اَبْصَارِهِمْ** ''اپنی نگاہیں'' مِن تبعیض کے لئے ہے' اور یہی اکثر کا موقف ہے، انہوں نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ نگاہ جھکانے کا حکم اس کے متعلق ہے جو حرام ہے اور جو حلال ہے، تو اس کو دیکھنے پر اکتفا کیا جائے۔ ایک قول کے مطابق تبعیض کی وجہ یہ ہے کہ دیکھنے والے کو بغیر ارادہ کے پہلی نظر معاف ہے' اس کے علاوہ بھی کئی ایک اقوال ہیں۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ جن کی طرف دیکھنا جائز نہیں ان کی طرف دیکھنا حرام ہے۔

وَيَحْفَظُوا فُرُوْجَهُمْ ''اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت رکھیں'' کا معنی ہے کہ ان حرام کردہ چیزوں سے حفاظت کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ ایک قول کے مطابق اپنی شرمگاہوں کو چھپانا مراد ہے کہ جس کے لئے اس سے اس کا دیکھا جائز نہ ہو۔ یہاں دونوں معانی مراد لینے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں' کیونکہ یہ باتیں شرمگاہ کی حفاظت میں شامل ہیں۔ ایک قول کے مطابق مِنْ صرف نظروں کے لئے آیا ہے، شرمگاہوں کے لئے نہیں، کیونکہ دیکھنے میں وسعت ہوتی ہے اور اس میں صرف وہی حرام ہے جو مستثنیٰ کر دیا گیا، یہ شرمگاہ کی حفاظت میں اس طرح نہیں اس میں سختی زیادہ ہے کہ اس میں سے صرف وہی شرمگاہ حلال و جائز ہے جو مستثنیٰ ہوگی۔

ایک قول کے مطابق پوری آنکھ بند کرنا کہ قابل عذر ہے لیکن شرمگاہ کی حفاظت اس سے مختلف ہے اس میں اس حکم پر عمل کرنا ممکن ہے۔ **ذٰلِكَ** ''یہی'' کا اشارہ اغض بصر، اور حفظ، فرج کی طرف ہے۔ یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر: **اَزْكٰى لَهُمْ** ہے ''ان کے لئے پاکیزگی ہے'' یعنی

شک کی گندگی سے ان کے پاکیزہ رہنے کا سب سے بہترین سبب ہے اور یہ گھٹیا کام میں گھل مل جانے سے صفائی کا باعث ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ "لوگ جو کچھ کریں اللہ تعالیٰ سب سے خبردار ہے۔" اللہ تعالیٰ پر ان کے کاموں میں سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں، اس میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو نظروں کو نہیں جھکاتے اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت نہیں کرتے۔

مضمون نمبر: ۶

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ۔ (۳۱)

"مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت میں فرق نہ آنے دیں۔"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس خطاب میں عورتوں کو تاکید کی وجہ سے خاص کیا باوجود اس کے کہ یہ مومنین کے خطاب میں تغلیباً شامل تھیں جیسا کہ تمام قرآنی خطاب میں ہے۔ یغضضن میں فلك ادغام ہے جو کہ یغضوا میں نہیں کیونکہ فعل کا لام کلمہ پہلے میں متحرک اور دوسرے میں ساکن ہے حالانکہ دونوں جگہ جواب امر کے طور پر جزم کی جگہ آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نظر نیچی رکھنے کا ذکر پہلے کیا اور شرمگاہ کی حفاظت کا ذکر بعد میں رکھا کیونکہ شرمگاہ کی عدم حفاظت کا سبب نگاہ ہوتی ہے اور سبب مسبب الیہ سے پہلے آنا چاہیے۔ یغضضن کا معنی یغضوا کی طرح ہے، اس سے عورتوں کی نظر بازی کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے کہ وہ حرام کردہ نظر نہ اٹھائیں، اسی طرح ان پر اپنی شرمگاہوں کی حفاظت بھی ضروری ہے جس طرح کہ مردوں کی شرمگاہوں کی حفاظت میں گذر چکا۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ "اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں" یعنی جو انہوں نے زیورات وغیرہ سے خوبصورتی اپنائی ہے۔ زینت کو ظاہر کرنے سے روکنے کا معنی ہے کہ اپنے بدن سے ان مقامات زینت کو ظاہر کرنے سے بالاولی روکا گیا ہے، پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس نہی سے: اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے مستثنیٰ کر دیا۔ "سوائے اس کے جو ظاہر ہے" لوگوں نے زینت کے ظاہر ہونے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کیا ہو؟ ابن مسعود اور سعید بن جبیر نے کہا: اس سے مراد کپڑے ہیں اور سعید نے چہرہ کا اضافہ کیا ہے۔ عطاء اور اوزاعی کہتے ہیں چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں مراد ہیں۔ سیدنا ابن عباس، قتادہ اور مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ ظاہر ہونے والی زینت سرمہ لگانا، مسواک کرنا

اور آدھی پنڈلی تک خضاب وغیرہ لگاتا ہے پس عورت کے لئے جائز ہے کہ اسے ظاہر کر لے۔ ابن عطیہ کہتے ہیں عورت اپنی زینت سے کچھ بھی ظاہر نہ کرے اور ساری زینت چھپا کر رکھے اور جو کسی ضرورت کی وجہ سے ظاہر ہوا تو اس کے بارہ میں استثناء موجود ہے۔

یہ بات آپ پر پوشیدہ نہیں کہ قرآن کا ظاہری اسلوب یہ ہے کہ زینت کو ظاہر کرنے سے روکا ہے مگر جو کہ خود بخود ظاہر ہو جائے مثلاً چادر اور دوپٹہ وغیرہ، ہتھیلی اور پاؤں میں جو زیورات وغیرہ ہوں، اگر زینت سے مراد زینت کی جگہ ہو تو استثناء ایسی چیز کی طرف لوٹے گا جو کہ عورت پر مشقت کا باعث ہوگا مثلاً دونوں ہتھیلیاں اور دونوں قدم وغیرہ کا چھپانا، اسی طرح جو حکم زینت کو ظاہر کرنے سے روکنے کا ہے، تو انداز خطابت کے اعتبار سے اس کے مقامات ظاہر نہ کرنے کو لازم آتا ہے کیونکہ استثناء کو ہمارے دو ذکر کردہ مقامات پر محمول کیا جائے گا۔ البتہ جب زینت اس کے مقامات کو بھی شامل ہوگی اور جس سے عورتیں زینت حاصل کرتی ہیں، تو حکم واضح ہوگا اور ان تمام سے استثناء کیا جائے گا۔

قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ زینت دو قسموں کی ہوتی ہیں' پیدائشی اور حاصل کی گئی۔ پیدائشی میں چہرہ ہے اور یہی زینت کی اصل ہے اور جبکہ حاصل کی گئی زینت وہ ہے جسے عورت تخلیق کو خوبصورت بنانے کے لئے استعمال کرتی ہے مثلاً کپڑے زیورات سرمہ اور خضاب ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔

اور شاعر کا قول بھی ہے:

یَأْخُذْنَ زِیْنَتَهُنَّ اَحْسَنَ مَا تَرٰی   وَاِذَا عَطَلْنَ فَهُنَّ خَیْرُ عَوَاطِلٍ

وہ زینت حاصل کرتی ہیں جو تو دیکھتا ہے بہت اچھی ہے اور جب وہ زینت اتار دیتی ہیں تو زینت اتارنے والیوں میں سے بہتر ہیں۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ "اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں" الخمر خمار کی جمع ہے اور خمار یہ ہے، جس سے عورت اپنا سر ڈھانپے۔ الجیوب جیب کی جمع ہے اور وہ ہے قمیص اور کرتا کاٹنے کی جگہ یہ لفظ جوب سے لیا گیا ہے اس کا معنیٰ ہوتا ہے کاٹنا۔

مفسرین کہتے ہیں جاہلیت میں عورتیں اپنی اوڑھنیاں اپنے پیچھے لٹکاتی تھیں اور ان کے گریبان سامنے سے کھلے رہتے اور اس طرح ان کی گردن اور ان کے ہار کھلے رہتے تو انہیں حکم دیا

گیا کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالیں تا کہ جو ظاہر ہو رہا ہے وہ چھپ جائے۔ ضرب کا لفظ بولنے میں مبالغہ ہے، جس کا معنی ہے چمٹا لینا۔ جمہور علماء نے جیوب کی یہی تفسیر بیان کی ہے جو ہم ذکر کر آئے ہیں اور یہی حقیقی معنی ہے۔ مقاتل کہتے ہیں عَلٰی جُیُوبِهِنَّ کا معنی ہے اپنی سینوں پر تو آیت میں مضاف محذوف ہوگا یعنی اپنے گریبانوں کے مقامات پر۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ''اور اپنی آرائش کو اپنے خاندوں کے علاوہ کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں'' البعل عربی زبان میں خاوند اور سردار کو کہتے ہیں، سب سے پہلے خاوند کا تذکرہ کیا اس لئے کہ یہی زینت کے اظہار کا اصل مقصد ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ بیوی اور لونڈی کا سارا بدن اس کے لئے جائز ہے۔ اسی معنی میں یہ فرمان باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ۔

اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ ۔ ''یا اپنے والد کے یا اپنے خسر کے یا اپنے لڑکوں کے یا اپنے خاوند کے لڑکوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے۔'' عورتوں کے لئے ان لوگوں کے سامنے آپس میں زیادہ تر ملنے اور فتنہ کا ڈر نہ ہونے کی وجہ سے زینت ظاہر کرنے کو جائز قرار دے دیا، اس لئے کہ طبیعت میں قریبی لوگوں سے اسی اعتبار سے نفرت ہوتی ہے کہ اقرباء سے یہ کارروائی کی جائے۔

سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب وہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے پاس جاتے تو ان کی طرف نہ دیکھتے اس وجہ سے کہ جو آیت نبی اکرم ﷺ کی بیویوں کے بارہ میں نازل ہوئی ان کے خیال میں اس میں خاوندوں کے بیٹوں کے بارہ میں ذکر نہیں، وہ آیت: لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ ہے، تو یہاں خاوندوں کے بیٹوں سے خاوند کی مذکر اولاد مراد ہے اور فرمان الٰہی او ابنائهن میں اولاد کی اولاد بھی شامل ہے اور بیٹیوں کی اولاد بھی نیچے تک اسی طرح اس کا باپ یا ساس کا باپ اوپر تک اور اسی طرح خاوندوں کے بیٹے نیچے تک، اسی طرح بھائی اور بہنیں ہیں۔

جمہور کا موقف ہے کہ چچا اور ماموں بقیہ تمام محارم کی طرح ہیں کہ ان کے لئے دیکھنا جائز ہے جہاں تک انہیں اجازت ہے۔ آیت میں رضاعت کا ذکر نہیں اور وہ نسبت کی طرح ہے۔

شعبی اور عکرمہ رحمہما اللہ کہتے ہیں: چچا اور ماموں محارم میں سے نہیں ہیں۔

اَوْ نِسَآئِهِنَّ ''یا اپنے میل جول کی عورتوں کے'' اس سے ملنے جلنے والی خاص عورتیں مراد ہیں جو کام کاج یا کسی دوسری وجہ سے پاس رہتی ہوں' اس میں لونڈیاں بھی شامل ہیں' اس میں کافروں کی عورتیں وہ ذمی ہوں یا ان کے علاوہ دوسری عورتیں وہ تمام شامل نہیں' تو ان کے لئے جائز نہیں کہ ان کے سامنے اپنی زینت کا اظہار کریں' کیونکہ وہ ان کے اوصاف اپنے خاوندوں کے سامنے بیان کرنے سے باز نہ آئیں گی۔ اس مسئلہ میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔

نساء کی اضافت هُنَّ کی طرف یہ دلیل ہے کہ اس سے مومن عورتیں خاص طور پر مراد ہیں۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ''یا غلاموں کے'' آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں غلام اور لونڈیاں شامل ہیں اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ مسلمان ہوں یا کافر' یہی بات اہل علم کی ایک جماعت نے کہی' یہی موقف عائشہ' ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ' اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم اور امام مالک رحمہ اللہ کا ہے' سعید بن مسیب رحمہ اللہ کہتے ہیں: تمہیں یہ آیت اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ دھوکہ میں مبتلا نہ کر دے اس سے مراد لونڈیاں ہیں غلام مراد نہیں۔ شعبی ناپسند کرتے تھے کہ غلام اپنی مالکہ کے بال دیکھے۔ یہ عطاء' مجاہد' حسن اور ابن سیرین رحمہم اللہ کا قول ہے اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے' یہی قول ابوحنیفہ اور ابن جریج رحمہما اللہ کا ہے۔

اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ''یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں'' ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیچھے ہوں وہ انہیں کھانا وغیرہ پیش کرتے ہوں اس کے سوا کچھ کرنے کی طاقت وہمت نہ رکھتے ہوں اور نہ انہیں عورتوں میں کوئی دل چسپی ہو۔ یہ بات مجاہد' عکرمہ اور شعبی رحمہم اللہ نے کہی۔ الاربة الارب اور المماربة کا اصلی معنی ہے: ضرورتِ خواہش، اس کی جمع مارب آتی ہے۔ ایک قول کے مطابق غیر اولی الاربة سے مراد ایسے احمق اور بیوقوف لوگ مراد ہیں جنہیں عورتوں کی کوئی خواہش نہ ہو۔ ایک قول کے مطابق بے عقل لوگ ایک قول کے مطابق نامرد' ایک قول کے مطابق خصی لوگ ایک کے مطابق مخنث اور ایک کے مطابق بوڑھا شخص۔ ان خصائص کی کوئی دلیل نہیں بلکہ آیت کا مفہوم اس سے ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ جو گھر والوں کے کام کرے اور اسے عورتوں میں کوئی خواہش نہ ہو اور اس سے کسی حالت میں بھی کوئی جرم سرزد نہ ہو سکتا ہو' اس میں ہر شخص داخل ہے جس میں یہ صفت موجود ہو اور ان کے علاوہ تمام خارج ہیں۔

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ "یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کی پردہ کی باتوں سے مطلع نہیں" طفل کا لفظ ایک دو اور اس سے زیادہ پر بولا جاتا ہے' یہاں اس سے مراد جنس ہے جو جمع کے قائم مقام ہے، اس کی دلیل ہے کہ اس کی صفت جمع آئی ہے۔ اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اَوِ الْاَطْفَالِ "جمع کی صورت میں ہے، انسان کو بھی طفل کہا جاتا ہے جبکہ وہ سمجھداری کے قریب نہ ہو۔ لَمْ یَظْهَرُوْا کا معنی ہے کہ انہیں ابھی اطلاع نہیں، ظہور بمعنی اطلاع کے ہے، اسی طرح قتیبہ نے کہا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے کہ وہ شہوت کی حد کو نہیں پہنچے، یہ قول فراء اور زجاج کا ہے۔

علماء نے کہ اس بارہ میں اختلاف کیا ہے۔ بچوں سے ہاتھوں اور چہرہ کے سوا کس چیز کو چھپانا ضروری ہے؟ ایک قول کے مطابق کچھ بھی لازم نہیں اس لئے کہ وہ ابھی کسی چیز کا مکلف نہیں اور یہی بات درست ہے ایک قول کے مطابق لازم ہے کیونکہ وہ بھی کبھی عورت کی خواہش کرتا ہے۔ اسی طرح بوڑھے آدمی کی شرمگاہ جس کی شہوت ختم ہو چکی ہو۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ حرمت اپنی اصل کی طرح باقی رہے' تو اس کی شرمگاہ یا پردہ والی جگہ کو دیکھنا جائز نہیں اور اس کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ اسے کھولے۔

علماء نے پردہ کی حدود کے بارہ میں بھی اختلاف کیا ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں مسلمانوں کا اجماع ہے کہ مرد اور عورت کی دونوں شرمگاہیں پردہ ہیں اور عورت ساری پردہ ہے سوائے اس کے چہرہ اور ہاتھوں کے' اور اس بارہ اختلاف بھی ہے، اکثر کہتے ہیں کہ مرد کا پردہ اس کی ناف سے گھٹنوں تک ہے۔

وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ "اور اس طرح زور زور سے پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہو جائے" یعنی عورت چلتے وقت اپنے پاؤں نہ مارے تاکہ اس کے پازیب کی آواز مردوں میں سے کوئی سن لے اور اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے پازیب پہن رکھے ہیں۔ زجاج کہتے ہیں: اس زینت کو سننا شہوت کو ابتدائی طور پر بھڑکانے میں سب سے زیادہ ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو گناہوں سے توبہ و معافی کی طرف راہنمائی کی: وَتُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ "اے مسلمانو! تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرو۔" اس میں توبہ کرنے کا حکم ہے' اس کے واجب ہونے کے بارہ میں

مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور یہ دینی فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "تا کہ تم نجات پاؤ"یعنی تم دنیااور آخرت کی بھلائیوں کو لے کر کامیاب ہو جاؤ، ایک قول کے مطابق توبہ سے مراد یہ ہے کہ جو کام جاہلیت میں کیا کرتے تھے ان سے باز آجاؤ۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ سنت میں یہ بات موجود ہے کہ اسلام گذشتہ جرائم کو ختم کر دیتا ہے۔

مضمون نمبر:۷

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ۔(۳۲)

"تم میں سے جو مرد، عورت بے نکاح (غیر شادی شدہ) ہوں ان کا نکاح کر دو۔"

الایم کہتے ہیں جس کا جوڑا ساتھی نہ ہو وہ غیر شادی شدہ ہو یا طلاق وغیرہ والا ہو۔ الایم یاء پر شد پڑھتے ہیں اور یہ مرد وعورت دونوں کو شامل ہوتا ہے۔

ابوعبیدہ کہتے ہیں عربی کا مقولہ ہے رَجُلٌ اَيِّمٌ اور امْرَاَةٌ اَيِّمٌ اس مقولہ کا مقصد یہ ہے کہ لفظ ایم مذکر و مؤنث دونوں کے لیے یکساں ہے "اکثر یہ عورتوں کے بارہ میں استعمال ہوتا ہے، گویا کہ یہ مردوں میں ادھار اور عاریتاً ہی آتا ہے۔ آیت میں خطاب ذمہ داروں سے ہے۔ ایک قول کے مطابق خاوندوں سے ہے، جبکہ پہلی بات زیادہ راجح ہے۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی' جبکہ اس میں ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مخالفت کی ہے۔ اہل علم نے نکاح کے بارہ میں اختلاف کیا ہے کیا یہ جائز ہے؟ مستحب ہے؟ یا واجب ہے؟

پہلا موقف امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے دوسرا امام مالک اور ابوحنیفہ رحمہما اللہ کا ہے تیسرا بعض اہل علم کا ہے، ہر ایک کے موقف کی تفصیل الگ الگ ہے۔ لیکن وہ سب یہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی کو گناہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو تو اس پر واجب ہے وگرنہ نہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ جواز اور استحباب کے قائل لوگ اس خوف کی موجودگی میں اس کے وجوب کے مخالف نہیں، تو خلاصہ یہ ہے کہ اس کے واجب نہ ہونے کے باوجود یہ سنت موکدہ ضرور ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ کا فرمان صحیح حدیث میں موجود ہے نکاح کی ترغیب دلانے کے بعد کہ جو میری سنت سے مونہہ موڑے گا وہ مجھ سے نہیں لیکن یہ حکم مال اور نکاح کی قوت ہوتے ہوئے ہے۔ الایامی سے یہاں مراد آزاد مرد اور عورتیں ہیں اور غلاموں کے بارہ میں اس کے بعد وضاحت کر دی ہے کہ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ

عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ''اور اپنے نیک بخت غلام لونڈیوں کا بھی'' نیک بختی ایمان ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نیک بختی کا ذکر غلاموں کے بارہ میں کیا ہے، آزاد کے بارہ میں نہیں کیونکہ غلاموں کے مقابلہ میں آزاد لوگ اکثر نیک بخت ہی ہوا کرتے ہیں' اس میں یہ دلیل ہے کہ غلام خود اپنی شادی نہیں کر سکتا صرف اس کا مالک ہی اس کا نکاح کروا سکتا ہے۔ جمہور کا موقف ہے کہ مالک کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے غلام یا لونڈی کا زبردستی نکاح کرائے اور امام مالک رحمہ اللہ بھی کہتے ہیں کہ جائز نہیں۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ گفتگو کو آزاد لوگوں کی طرف موڑتے ہیں: اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ''اگر وہ مفلس بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی بنا دے گا۔'' یعنی آزاد لوگوں کو نکاح کرنے سے اس وجہ سے نہ روکو کہ مرد یا عورت کوئی بھی محتاج و تنگدست ہے کیونکہ اگر یہ محتاج ہوں گے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں غنی کر دے گا اور ان پر اپنا فضل اتارے گا۔ زجاج کہتے ہیں: ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نکاح کی ترغیب دلائی اور یہ بھی بتایا کہ یہ فقیری کو ختم کرنے والا عمل ہے اور یہ لازم نہیں کہ یہ ہر محتاج کو حاصل ہو جائے جبکہ وہ نکاح کرے، یہ بات تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اور کئی مقامات میں اکثر فقراء ایسے بھی دیکھے گئے ہیں، جو شادی کے بعد بھی غنی نہ ہوئے۔

ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ اسے خود سے غنی کر دے گا۔ ایک قول کے مطابق اگر وہ نکاح کے محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے حلال ذریعہ سے غنی کر دے گا تاکہ وہ بدکاری سے بچے رہیں۔ پہلی توجیہ زیادہ مناسب ہے اور اس کی دلیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان: وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ہے۔ یہاں سے مطلق کو وہاں مقید پر محمول کیا جائے گا۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ ''اللہ تعالیٰ کشادگی والا'' یہ جملہ ما قبل کی تاکید اور اسے ثابت کرنے والا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ وسعتوں والے ہیں ان کی بادشاہت میں کوئی کمی نہیں جو اس کے بندوں کو غنی کر دے۔ عَلِيْمٌ ''اور علم والا ہے'' اپنی مخلوق کی مصلحتوں کو جسے چاہے غنی کر دے اور جسے چاہے محتاج کر دے۔

مضمون نمبر: ۸

وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ (۳۳)

"تمہارے غلاموں میں سے جو کوئی کچھ تمہیں دے کر آزادی کی تحریر کرانا چاہے۔"

شرع میں مکاتبت اس چیز کو کہتے ہیں کہ آدمی اپنے غلام سے، طے مال پر تحریر ہے کہ وہ اس کو قسط وار ادا کر کے وہ آزاد جائے گا۔ فَكَاتِبُوهُمْ "تو تم انہیں ایسی تحریر کر دو۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلام جب اپنے سردار سے مکاتبت کرنا چاہے تو اس مالک پر لازم ہے کہ وہ اس کے ساتھ مکاتبت کرے بعد میں مذکورہ شرط کے ساتھ کہ: إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا "اگر تم کو ان میں کوئی بھلائی نظر آتی ہو" بھلائی کہتے ہیں: اس طاقت کو جو طے شدہ رقم کی ادائیگی کے لئے ہو اگرچہ اس کے پاس مال نہ ہو' ایک قول کے مطابق اس سے مراد صرف مال ہے۔ جیسا کہ مجاہد' حسن' عطاء ضحاک' طاؤس اور مقاتل کا موقف ہے۔ پہلا موقف' سیدنا ابن عمر اور ابن زید کا ہے اسے امام مالک' شافعی' فراء اور زجاج رحمہم اللہ نے پسند کیا ہے۔

فراء کہتے ہیں اگر تمہیں ان سے اس معاہدہ کی تکمیل اور مال کی ادائیگی کی امید ہو تو یہ معاہدہ کرو۔ زجاج کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے فیھم کہا تو اس سے کمائی کرنے وفاداری کرنے اور امانت کی ادائیگی کا معنی پوری طرح ظاہر ہوتا ہے۔ نخعی کہتے ہیں خیر یہ ہے کہ دین اور امانت کا لحاظ اسی طرح کا ایک قول حسن سے بھی مروی ہے۔ عبیدہ سلمانی کہتے ہیں اس سے نماز پڑھنا مراد ہے۔ طحاوی کہتے ہیں، جس نے اس سے مراد مال لیا ہے وہ ہمارے نزدیک درست نہیں کیونکہ غلام بذات خود اپنے مالک کا مال ہے، تو وہ اس کا مال کیسے ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس کا معنی یہ کہ اگر تم ان میں بھلائی یعنی دین اور سچائی دیکھو۔ ابو عمرو بن عبدالبر کہتے ہیں، جو خیر سے مراد یہاں مال نہیں کہتا، تو اس نے اس بات کا انکار کیا کہ کہا جائے ان علمتم فیھم مالا۔ کیونکہ یہی کہا جاتا ہے: علمت فیہ الخیر والصلاح والامانة علیہ' یہ نہیں کہا جاتا کہ علمت فیہ المال ۔ یہ اس اختلاف کا خلاصہ ہے جو اہل علم کے درمیان آیت میں مذکور خیر کے بارہ میں ہے۔

جب تمہیں یہ معلوم ہو گیا تو جان لو کہ مذکورہ حکم جس وجوب کا تقاضہ کرتا ہے اس کے ظاہر کے مطابق عکرمہ' عطاء' مسروق' عمرو بن دینار' ضحاک اور اہل ظاہر کا موقف ہے، وہ کہتے ہیں: مالک پر لازم ہے کہ وہ اپنے غلام سے معاہدہ کر لے جب وہ اس سے مطالبہ کرے اور یہ مالک اس میں خیر و بھلائی دیکھے۔ جمہور اہل علم کہتے ہیں یہ اس پر لازم نہیں انہوں نے اجماع بطور دلیل لیا ہے اس طرح کہ اگر غلام اپنے مالک سے مطالبہ کرے کہ وہ اسے کسی دوسرے کو فروخت کر دے تو یہ اس پر

لازم نہیں اور نہ اس کام پر مجبور ہے' اسی طرح کتابت کا معاملہ ہے کیونکہ یہ معاوضہ ہے۔ آپ پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی اور یہ کمزور دلیل اور بے کار تشبیہ ہے' درست بات وہی ہے جو پہلے لوگوں نے کہی، یہی قول سیدنا عمرو بن خطاب اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے' اسے ابن جریر نے بھی پسند کیا ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ مالکوں کو مکاتبت کرنے والوں کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیتے ہیں: وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ ''اور اللہ تعالیٰ نے جو مال تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے انہیں بھی دو'' اس میں مالکوں کو حکم دیا کہ مکاتبت کرنے والوں کو کتابت کے مال کے سلسلہ میں اعانت کرو: یا تو انہیں کچھ مال دو یا جو مقرر کیا گیا ہے، اس میں سے کچھ کم کر دو۔ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مال کی مقدار معین نہیں۔ ایک قول کے مطابق ایک تہائی۔ دوسرے قول کے مطابق چوتھائی مزید اور ایک قول کے مطابق دسواں حصہ۔ شاید اس حکم کو مالکوں سے خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ گفتگو ان کے بارہ میں ہو رہی ہے اور کلام کا سیاق ان کے ساتھ ہے کیونکہ انہی لوگوں کو کتابت کا حکم دیا گیا ہے۔ حسن' نخعی اور بریدہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَاٰتُوْهُمْ میں تمام لوگوں سے خطاب ہے۔ زید بن اسلم کہتے ہیں کہ خطاب حکمرانوں سے ہے کہ وہ مکاتب غلاموں کو صدقہ کے مال سے ان کا حصہ دیں جیسا کہ فرمان الٰہی ہے وَفِی الرِّقَابِ مکاتب کے احکام معروف ہیں جبکہ وہ طے شدہ مال میں سے کچھ ادا کر دے۔

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مالکوں کو حکم دیا کہ نیک بخت غلاموں کا نکاح کرا دیں، تو پھر مسلمانوں کو اس کام سے روک دیا جو جاہلیت میں کیا کرتے تھے کہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کرتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ ''اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔'' یہاں فتیات سے مراد لونڈیاں ہیں اگرچہ الفتی اور الفتیات آزاد پر بھی بولے گئے ہیں دوسری جگہ پر البغاء کا معنی ہے: زنا کرنا یہ مصدر ہے بغت المراۃ تبغی بغاء۔ جب کہ عورت بدکاری کرے اور یہ لفظ عورتوں کے زنا کے ساتھ خاص ہے، یہ مردوں کے زنا پر نہیں بولا جائے گا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس نہی کے ساتھ شرط ذکر کی کہ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ''جو پاکدامن رہنا چاہتی ہیں'' کیونکہ مجبوری کا تصور اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ پاکدامن رہنا چاہیں، اگر کوئی پاکدامن رہنا ہی نہیں چاہتی تو اس کے متعلق یہ کہنا درست نہیں کہ اسے زنا پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

یہاں التحصن سے مراد ہے: بدکاری سے بچنا اور نکاح کرنا۔ ایک قول کے مطابق یہ قید الایامی کی طرف جاتی ہے' کلام میں تقدیم وتاخیر ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ شرط زائد ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ شرط اس اعتبار سے ہے کہ جبکہ وہ پاکدامن رہنا چاہتیں، یہ نہی ان کے پاکدامن رہنے کے ارادہ کے ساتھ خاص نہیں۔ وہ لوگ لونڈیوں کو اس فعل بد پر مجبور کیا کرتے تھے۔ ایک قول کے مطابق یہ شرط اکثر کے لحاظ پر لگائی گئی کیونکہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ مجبوری پاکدامن رہنے کی صورت میں ہی ہوتی ہے' اس سے اس صورت میں مجبور کرنے کا جواز نہیں نکلتا جبکہ وہ خود پاکدامن رہنا نہ چاہیں، تو یہ توجیہ تمام توجیہات سے زیادہ مضبوط ترین ہے کیونکہ بعض اوقات لونڈی حلال وحرام کسی کا بھی ارادہ نہیں رکھتی' جیسا کہ وہ جو کہ نکاح کی رغبت ہی نہیں رکھتی اور جو چھوٹی بچی ہو تو اس کے بارہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پاکدامن رہنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ ہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں تحصن سے مراد صرف بدکاری سے بچنا ہے' یہ اس پر صادق نہیں آتا جو نکاح کا ارادہ رکھتی ہو کہ وہ پاکدامن رہنا چاہتی ہے یہ تو بہت بعید ہے' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہاں پاکدامنی سے مراد بدکاری سے بچنا اور نکاح کرنا ہے' ان کے اس قول کی دوسروں نے بھی پیروی کی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس نہی کی وجہ بیان فرمائی: لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ ''انہیں دنیا کی زندگی کے فائدہ کی غرض سے مجبور نہ کرو۔'' وہ فائدہ یہ ہے کہ لونڈی اپنی شرمگاہ (کی بدکاری) کے ذریعہ جو کمائی کرے، یہ علت اکثر وقوع پذیر ہونے کے اعتبار سے ہے، تو معنی یہ ہوا کہ عموماً یہ فائدہ وہ ہے کہ جو مالکوں کا اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرنے سے حاصل ہوا' کیونکہ آدمی کا اپنی لونڈی کو بغیر کسی فائدہ کے مجبور کرنا ایسا تو کسی عقل مند سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ کام صرف اس وقت جائز نہیں کہ جب وہ اسے مجبور کرے جبکہ وہ اس کی مجبوری کے ذریعہ دنیا کے مال کا ارادہ نہ کرتا ہو۔

ایک قول کے مطابق مجبور کرنے کی یہ علت اس لحاظ سے ہے کہ ان کی عادت ایسی ہی تھی' نہ کہ اس نہی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ انہیں مجبور کیا کرتے تھے' یہ پہلے معنی کے مناسب ہے اور اس کے مخالف بھی نہیں۔

وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ''اور جو انہیں مجبور کر دے تو اللہ تعالیٰ ان پر جبر کے بعد بخش دینے والا اور مہربانی کرنے والا ہے۔''

یہ گذشتہ کی دوہرائی اور اس کی تاکید کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوا کہ مجبوری کی سزا مجبور کرنے والے کو ملے گی نہ کہ مجبور ہونے والی عورت کو جیسا کہ اس پر سیدنا ابن مسعود' سیدنا جابر بن عبداللہ' اور سیدنا سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کی قراءۃ دلیل ہے: "فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" لَهُنَّ ایک قول کے مطابق اس تفسیر میں بُعد ہے کیونکہ مجبور کی گئی عورت زنا کی وجہ سے گنہگار نہیں؟ اس کا جواب اس طرح دیا گیا کہ اگرچہ اسے مجبور کیا گیا ہے ممکن ہے وہ عورت زنا کے وقت اس کی خواہش شائبہ سے محفوظ نہ رہے یا تو بشری تقاضوں کی وجہ سے یا تھوڑا بہت مجبور کرنے کی وجہ سے کرے جو اس حد تک نہ ہو کہ اس کے اختیار کو ختم کر دے۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے مجبور کرنے کے بعد، ان مجبور کرنے والوں کو یا تو مطلق طور پر یا توبہ کی شرط کے ساتھ، بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مضمون نمبر:۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔(۵۸)

"ایمان والو!"

یہ خطاب مومنوں سے ہے اور تغلیباً اس میں مومن عورتیں بھی شامل ہیں جیسا کہ دوسرے خطابات میں ہوتا ہے۔ علماء کہتے ہیں یہ آیت کچھ اوقات کے ساتھ خاص ہے' انہوں نے لِيَسْتَاْذِنْكُمُ "تم سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے" کے مفہوم کے بارہ میں اختلاف کیا ہے جو کئی اقوال پر مشتمل ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے یہ قول سعید بن میتب کا ہے' سعید بن جبیر کہتے ہیں یہ حکم استحباب کے لئے ہے نہ کہ وجوب کے لئے ایک قول کے مطابق یہ اس وقت ضروری تھا جب ان کے ہاں دروازے نہیں ہوا کرتے تھے' اگر وہ حالات دوبارہ آ جائیں تو اس کے وجوب کا حکم دوبارہ آ جائے گا' یہ قول مہدوی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ حکم یہاں تو وجوب کے لئے ہے اور آیت بھی محکم ہے منسوخ نہیں اور اس کا حکم مردوں عورتوں پر ثابت ہے۔ شعبی سے کسی نے اس کے بارہ میں سوال کیا کہ کیا یہ منسوخ ہے؟ تو وہ کہنے لگے نہیں اللہ کی قسم! سوال کرنے والے نے دوبارہ پوچھا تو وہ کیا لوگ اس حکم کو نہیں جانتے؟ انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ ہی مددگار ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ اکثر علماء کا قول ہے' ابوعبدالرحمٰن السلمی کہتے ہیں یہ عورتوں کے ساتھ خاص ہے' سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے

کہ یہ عورتوں کے علاوہ صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے۔

اَلَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ''جو تمہاری ملکیت کے غلام ہیں'' غلام اور لونڈیاں وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ''اور انہیں بھی جو تم میں سے بلوغت کو نہ پہنچے ہوں'' یعنی آزاد لوگوں میں سے۔ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ''تین اوقات میں'' اس کا معنی ہے دن رات کے تین اوقات۔ یہاں مرات کو اوقات سے تعبیر کیا جائے گا کیونکہ اجازت کے وجوب کا دراصل سبب ان اوقات کا اجازت لینے والوں سے مخاطب کے ساتھ ملنا ہے نہ کہ بذات خود اوقات سبب ہیں۔ ثلاث کو ظرف زماں ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے، یعنی تین اوقات میں یا یہ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی تین اجازتیں' اسے ابوحیان نے راجح قرار دیا ہے' وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان 'ثلاث مرات' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تین اجازتیں ہیں کیونکہ جب آپ کہیں گے کہ ضربتك ثلاث مرات تو اس کا معنی یہ نہ سمجھا جائے گا کہ تین ضربیں لگائیں۔ یہاں ظاہر معنی کا رد کیا گیا ہے اسے تین اوقات کی تفسیر کے اشارہ سے چھوڑا گیا ہے۔

مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ''نماز فجر سے پہلے'' یہ اس لئے کہ یہ بستر سے اٹھنے، نیند کے لباس اتارنے اور بیداری کے لباس، اوڑھنے کا وقت ہوتا ہے، بعض اوقات انسان رات ننگے گذارتا ہے یا ایسی حالت میں کہ وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کے علاوہ اسے کوئی دیکھے۔ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ ''اور ظہر کے وقت جبکہ تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو۔'' مِّنَ الظَّهِيْرَةِ میں مِنْ بیان کے لئے ہے یا فِيْ کے معنی میں ہے یا لام کے معنی میں، تو معنی یہ ہوا کہ جب تم اپنے وہ کپڑے اتارتے ہو جو تم نے دن کے وقت ظہر کی گرمی کی شدت کی وجہ سے پہنے تھے: یہ نصف النہار کا وقت ہے کیونکہ قیلولہ کرنے کے لئے وہ لوگ کپڑے اتار دیا کرتے تھے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تیسرا وقت ذکر کیا: وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ''اور عشاء کی نماز کے بعد'' یہ اس لئے کہ یہ بھی کپڑے اتارنے اور گھر والوں سے علیحدگی کا وقت ہوتا ہے۔ پھر اس تفصیل کے بعد کیا عمدہ انداز میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان اوقات کا ذکر کیا: ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ ''یہ تین اوقات پردہ کے ہیں۔'' لَّكُمْ ''تمہارے لئے'' یہ جملہ مستانفہ ہے جو اجازت کے واجب ہونے کی علت بیان کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ ''تم پر کوئی نہیں'' اے گھر والو! وَلَا عَلَيْهِمْ ''اور نہ ان پر'' یعنی غلاموں اور بچوں پر جُنَاحٌ ''کوئی گناہ'' یعنی بغیر اجازت کے داخل ہو جانے پر کوئی گناہ نہیں حکم کی مخالفت اور پردہ والی باتوں کو جاننے کے

متعلق واجبی حکم کی تعمیل نہ کرنے پر۔ بَعْدَهُنَّ ''ان اوقات کے بعد'' ان میں سے ہر ایک پردہ والے وقت کے بعد' یہ وہ خالی اوقات ہیں جو ان میں سے دو کے درمیان آئیں، یہ جملہ مستأنفہ ہے جو ان خاص حالات میں اجازت کے حکم کو مقرر کرتا ہے۔

طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ ''تم آپس میں بکثرت آنے والے ہو'' یہ جملہ مستأنفہ ہے جو اس عذر کی اجازت نہ لینے کی رخصت پر مبنی ہے۔ فراء کہتے ہیں یہ تمہاری اس بات کی طرح ہے: وہ تمہارے خادم ہیں تمہارے پاس آنے جانے والے ہیں یعنی وہ تمہارے خادم ہیں تو کوئی حرج نہیں کہ وہ تمہارے پاس آئیں۔ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ''تم آپس میں ہی ہو'' یعنی تم جاتے ہو یا کوئی کسی کے پاس جاتا رہتا ہے، معنی یہ ہے کہ تم میں سے ہر کوئی اپنے ساتھی دوست کے پاس، غلام مالک کے پاس اور مالک غلام کے پاس جاتا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان تین اوقات کے علاوہ بغیر اجازت جانے کو جائز رکھا ہے کیونکہ ان کی عادت تھی کہ وہ ان اوقات کے علاوہ اپنے پردہ کو کھولا نہیں کرتے تھے۔ كَذٰلِكَ ''اسی طرح'' اس سے اپنے بعد آنے والے فعل کے مصدر کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ کتاب عزیز کے تمام مقامات میں آتا ہے، یعنی اس وضاحت کی طرح يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ''اللہ تعالیٰ کھول کھول کر تم سے اپنے احکام بیان فرما رہا ہے'' یہ اس پر دلالت کرتے ہیں جو احکام اللہ تعالیٰ نے قانون بنا کر مقرر کیے ہیں۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ''اللہ تعالیٰ پورے علم'' بہت زیادہ معلومات کا علم رکھنے والے۔ حَكِيْمٌ ''کامل حکمت والا ہے'' یعنی اپنے کاموں میں بہت زیادہ حکمتوں والا ہے۔

مضمون نمبر: ۱۰

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا۔ (۶۰)

''بڑی بوڑھی عورتیں جنہیں نکاح کی خواہش اور امید نہ رہی ہو۔''

یعنی ایسی بوڑھی عورتیں جو حیض اور بچے کی پیدائش اور بڑھاپہ کی وجہ سے بیٹھ جائیں' اس کی واحد قاعد هاء کے بغیر آتی ہے اور هاء کا حذف کرنا دلیل ہے کہ یہ بیٹھنا بڑھاپہ کی وجہ سے ہے۔ فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ ''وہ اپنے کپڑے اتار رکھیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں'' وہ کپڑے جو ظاہری بدن پر ہیں مثلاً اوڑھنیاں وغیرہ نہ کہ وہ کپڑے جو خاص پردہ والے مقامات پر ہیں۔ یہ صرف ان کے لئے جائز ہے اس لئے کہ ان سے دل اور ذہن پھر گئے

ہیں جبکہ مردوں کے لئے ان میں کوئی رغبت باقی نہیں رہی' تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے لئے وہ جائز کر دیا جو دوسروں کے لئے جائز نہ تھا۔

پھر عام حالات میں سے ایک حالت کو مستثنیٰ قرار دیا اور فرمایا: غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ "بشرطیکہ وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر کرنے والیاں نہ ہوں" یعنی اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں جس کا وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ کے الفاظ میں حکم دیا گیا ہے، معنی یہ ہوا کہ چادر والی جگہ کو ظاہر کرنے سے ان کا ارادہ اپنی زینت کا اظہار نہ ہو اور نہ ہی وہ زیب وزینت اپنائیں کہ مرد حضرات ان کی طرف دیکھیں۔ التبرج کھولنے اور آنکھوں کے لئے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ "تاہم اگر ان سے بھی احتیاط رکھیں" یعنی مطلق طور پر کپڑے اتارنے سے۔ خَيْرٌ لَّهُنَّ "تو ان کے لئے بہت افضل ہے" اتارنے سے۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ "اور اللہ تعالیٰ سنتا جانتا ہے" یعنی بہت سننے والا اور بہت علم والا ہے یا ان دونوں میں مبالغہ رکھنے والا ہے۔

مضمون نمبر: ۱۱

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ۔ (۶۱)

"اندھے پر لنگڑے پر بیمار پر کوئی حرج نہیں۔"

اہل علم نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ محکم ہے یا منسوخ؟ پہلی بات علماء کی ایک جماعت نے کہی اور دوسری بات بھی ایک جماعت نے کہی۔ ایک قول کے مطابق جب مسلمان جنگ کے لئے جاتے تو اپنے پیچھے کچھ اپاہج چھوڑ جاتے، انہیں اپنے دروازوں کی چابیاں دے جاتے اور ان سے کہتے کہ "ہم نے تمہارے لئے جائز رکھا ہے کہ جو ہمارے گھروں میں ہے اس میں سے کھاؤ، جب کہ وہ لوگ اس میں حرج محسوس کرتے اور کہتے کہ ہم ان گھروں میں ان کی غیر موجودگی میں داخل نہ ہوں گے" تو یہ آیت ان کی رخصت کے لئے نازل ہوئی۔ آیت کا معنی ہے اپاہج لوگوں پر کوئی حرج نہیں اور اپنے قریبی لوگوں کے گھروں سے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں اور ان گھروں سے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں جو جنگ میں جاتے ہوئے انہیں چابیاں دے جاتے ہیں۔ نحاس کہتے ہیں: یہ قول سب سے بڑا ہے جو اس آیت کے بارہ میں منقول ہے، اس لئے کہ اس میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اور تابعین رحمہم اللہ کی طرف سے توقف آیا ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ مذکورہ لوگ صحت مند لوگوں کے ساتھ اس ڈر سے کھانے میں حرج محسوس کرتے تھے کہ وہ انہیں برا سمجھیں گے اور اس خوف سے کہ ان کے کاموں سے وہ تکلیف محسوس کریں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان تکلیفی امور میں جن میں دیکھنا شرط ہے، نابینا سے حرج ختم کر دیا اور لنگڑے سے ان تکلیفی امور میں جن میں چلنے کی پوری طاقت سے امور ادا کرنے میں حرج ہوتا ہو گناہ ختم کر دیا اور بیمار سے بھی جبکہ اس کے ادا کرنے کی صورت میں بیماری بڑھنے کا خدشہ ہو۔ ایک قول کے مطابق یہ جو حرج ختم کیا گیا ان لوگوں سے یہ جنگ میں شمولیت کا حرج ہے، یعنی ان پر کوئی حرج نہیں جبکہ یہ جنگ سے پیچھے رہیں۔ ایک قول کے مطابق جب آدمی کسی زامن (اپاہج) کو گھر میں داخل کرتا تو اس میں کچھ بھی موجود نہ ہوتا کہ اسے کھلائے چنانچہ وہ اسے اپنے کسی قریبی رشتہ داروں کے گھروں میں لے جاتا وہ اور اس میں حرج محسوس کرتا تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ''اور خود تم پر بھی'' یعنی تم پر کوئی حرج نہیں اور نہ تمہارے جیسے باقی مومنوں پر۔ اَنْ تَاْكُلُوْا ''کہ تم کھالو'' تم اور جو تمہارے ساتھ ہوں، خلاصہ یہ ہے کہ اندھے لنگڑے اور بیمار پر گناہ نہیں اگر وہ تندرست کے ساتھ کھانے کے اعتبار سے ہو یا گھروں میں جانے سے ہو، تو یہ خود تمہارے اوپر کوئی گناہ نہ ہوگا، یہ گذشتہ سے متصل ہے' اگر گناہ ان سے ختم ہوا ان ذمہ داریوں کے اعتبار سے جن میں دیکھنے اور لنگڑا پن اور بیماری کی عدم موجودگی شرط ہے تو آگے یہ فرمان ہے 'ولا علیٰ انفسکم' اور نہ خود تم پر کوئی گناہ ہے یہ کلام کی ابتداء ہے ماقبل سے ملی ہوئی نہیں۔ مِنْ بُیُوْتِكُمْ ''تم اپنے گھروں سے'' وہ گھر جس میں ان کا سامان اور ان کے گھر والے ہیں، اس میں اولاد کے گھر بھی شامل ہیں، مفسرین نے اسی طرح کہا ہے کیونکہ وہ ان کے گھروں میں شامل ہیں اس لئے کہ آدمی کے بیٹے کا گھر اس کا گھر ہے، اسی لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اولاد کے گھروں کا ذکر نہیں کیا اور ان کے علاوہ دوسروں کا ذکر کیا ہے۔

اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِكُمْ۔

''یا اپنے باپوں کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا

اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے۔"

نحاس کہتے ہیں اس کا بعض علماء نے معارضہ کیا ہے، انہوں نے کہا کہ یہ کتاب اللہ پر تحکم ہے بلکہ ظاہری اعتبار سے یہی زیادہ مناسب ہے کہ بیٹا ان سب سے مختلف ہو؟ اس معارضہ کا جواب یہ دیا گیا کہ اولاد کا رتبہ باپ کی طرف نسبت کرتے ہوئے کم نہیں ہوتا، باپ کے رتبہ سے اولاد کی طرف نسبت کرتے ہوئے، بلکہ باپ کے لئے اولاد کے مال میں اس حدیث کی وجہ سے زائد خصوصیت ہے کہ: تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے اور دوسری حدیث میں ہے کہ آدمی کی اولاد اس کی کمائی میں سے ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہاں بھائی اور بہنوں کے گھروں کا ذکر کیا بلکہ ماموؤں اور خالاؤں کا بلکہ چچا اور پھوپھیوں کا، تو کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے گھروں سے کھانے پر گناہ نہ ہونے کا ذکر کریں اور اولاد کے گھروں سے کھانے پر گناہ کی نفی نہ کریں؟ بعض لوگوں نے ان تمام کے گھروں سے کھانے کے لئے ان کی اجازت کی قید لگائی ہے۔

دوسروں کا کہنا ہے کہ اجازت شرط نہیں۔ ایک قول کے مطابق جبکہ کھانا کھلا پڑا ہو اور اگر حفاظت سے رکھا ہو تو پھر ان کا کھانا جائز نہیں۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ "یا ان گھروں سے جن کی چابیوں کے تم مالک ہو" یعنی وہ گھر جن میں ان کے مالکوں کی اجازت سے تصرف کا اختیار تمہارے پاس ہے۔ یہاں وکیل ذمہ دار اور غلام اور خزانچی جیسے لوگ مراد ہیں۔ یہ لوگ گھروں میں تصرف کا اختیار رکھتے ہیں جنہیں ان گھروں میں داخلہ کی اجازت ہو اور انہیں ان کی چابیاں بھی دی گئی ہوں۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد غلاموں کے گھر ہیں۔ مفاتح مفتح کی جمع ہے۔

اَوْ صَدِيْقِكُمْ "یا اپنے دوستوں کے گھروں سے" اگرچہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی قرابت نہ بھی ہو کیونکہ دوست عموماً دوسرے دوست کے لئے اس طرح سخاوت کرتا ہے اور اس کا دل خوش وراضی ہوتا ہے۔ صدیق کا لفظ ایک اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا۔ "تم پر اس میں بھی کوئی گناہ نہیں کہ تم سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ یا الگ الگ۔" اشتات شت کی جمع ہے، اس کا معنی ہے علیحدگی مقولہ ہے شت القوم یعنی وہ بٹ گئے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو ایک دوسرے

حکم پر مشتمل ہے جو گذشتہ کی جنس سے ہے یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اکٹھے ہو کر یا الگ الگ ہو کر کھاؤ۔ بعض عرب اکیلا کھانے میں حرج محسوس کرتے یہاں تک کہ کسی ہم نوالہ کو تلاش کرتے تا کہ وہ ان کے ساتھ کھائے اور بعض عرب مہمان کے بغیر نہیں کھاتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا ''تو جب تم گھروں میں جانے لگو۔'' یعنی ان گھروں کے علاوہ جن کا ذکر ہو چکا ہے' یہ دوسرا ادب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سکھایا۔ فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ ''تو اپنے گھر والوں کو سلام کر لیا کرو'' یعنی گھر والوں کو جو تمہارے ہی مرتبہ پر ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد پہلے مذکورہ گھر ہی ہیں۔ پہلے قول کے مطابق حسن اور نخعی کہتے ہیں: اس سے مراد مساجد ہیں اور سَلِّمُوْا سے مراد ہے کہ جو ان میں تمہاری قسم سے ہیں۔ تو جب مسجد میں کوئی نہ ہو تو ایک قول کے مطابق وہ کہے: السلام علی رسول اللہ۔ اور ایک قول کے مطابق فرشتوں کے ارادہ سے السلام علیکم کہے اور ایک قول کے مطابق السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین کہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق میری مراد یہ قول ہے کہ اس سے مراد گذشتہ مذکورہ گھر ہیں صحابہ رضوان اللہ علیہم اور تابعین ﷭ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق یہاں گھروں سے مراد تمام گھر ہیں جو رہائشی ہیں یا نہیں تو آباد گھروں میں سلام کہو اور غیر آباد گھروں میں خود اپنے اوپر سلام کہو۔ ابن عربی کہتے ہیں گھروں کے بارہ میں عموم قول ہی درست ہے۔

تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً ''دعائے خیر ہے جو بابرکت اور پاکیزہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔'' یعنی اس سے سننے والا خوش ہوتا ہے۔ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ''ایسے ہی اللہ تعالیٰ کھول کھول کر تم سے اپنے احکام بیان فرما رہا ہے تا کہ تم سمجھ لو'' یہ اس وضاحت کی علت ہے، اس امید پر کہ تم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی آیات کو سمجھو اور اس کی معانی کا فہم حاصل کرو۔

مضمون نمبر: ۱۲

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ۔ (۶۲)

''پس جب ایسے لوگ آپ سے اجازت طلب کریں۔''

یعنی مومن کہیں اے اللہ کے رسول ﷺ! لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ ''اپنے کسی کام کے لئے'' یعنی

ان کاموں کے لئے جوان کے اہم ترین امور ہیں۔ فَأْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ "تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیں" اور جسے چاہیں روک دیں اس اعتبار سے کہ جس مصلحت کو آپ مناسب سمجھیں، پھر اللہ سبحانہ نے ان کے لئے بخشش کی راہنمائی کی ان الفاظ میں: وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ "اوران کے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا مانگیں" اس میں اجازت کی طرف اشارہ ہے اگرچہ وہ کسی آسان کام پر ہو، تو بھی وہ اجازت دنیا کے کام کو آخرت پر ترجیح دینے کے شائبہ سے خالی نہ ہوگی۔

إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ "بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے" یعنی بہت زیادہ رحمت اور معافی والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اس حد تک مبالغہ کیا کہ جس حد سے آگے کوئی انتہا نہ تھی۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے دن ممبر پر چڑھتے اور کوئی آدمی اگر کسی عذر یا ضرورت کی وجہ سے مسجد سے نکلنا چاہتا تو نہ نکلتا حتیٰ کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے کھڑا ہوتا جہاں سے آپ ﷺ اسے دیکھ لیتے تو آپ پہچان لیتے کہ یہ اجازت چاہتا ہے تو ان میں سے جسے چاہتے اجازت دے دیتے۔ مجاہد کہتے ہیں: جمعہ کے دن امام کی طرف سے اجازت یہ ہے کہ ہاتھ سے اشارہ کر دے۔ زجاج کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ مومن نبی اکرم ﷺ کے پاس ایسی اجتماعی ضرورت کے لئے جب جمع ہوں تو وہ اس وقت تک نہ جائیں حتیٰ کہ وہ اجازت لیں، اسی طرح اگر وہ امام کے ساتھ ہوں تو اس کے حکم کی مخالفت نہ کریں اور نہ ان کے اجتماعی کام سے اس کی اجازت کے واپس نہ جائیں' امام کو یہ حق ہے کہ وہ اجازت دے یا نہ دے، جیسے مناسب سمجھے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: فَأْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ کی وجہ سے اسے اختیار ہے۔ علماء کہتے ہیں ہر وہ کام جس میں مسلمان اپنے کام کے ساتھ اکٹھے ہوں تو نہ اس کے حکم کی مخالفت کریں اور نہ وہاں سے اس کی اجازت کے بغیر واپس جائیں۔

تفسیر سورۃ الفرقان

اس کی آیات ۷۷ ہیں' جمہور کے قول کے مطابق یہ پوری سورۃ مکی ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ کا کہنا ہے سوائے ان تین آیات کے جو مدینہ میں نازل ہوئیں: وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۔ الآیات

مضمون نمبر:۱

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۔ (۴۸)

''اور ہم آسمان سے پاک پانی برساتے ہیں۔''

یعنی ماء طہور وہ پانی ہے، جس سے پاکیزگی حاصل کی جاتی ہے جیسا کہ ''وضو'' کہا جاتا ہے۔ جس سے ''وضو'' کیا جائے۔ ازہری کہتے ہیں لغت میں 'طہور' بمعنی 'طاہر و مطہر' ہے، جو خود پاک ہو اور پاک کرنے والا ہو۔ ابن الانباری کہتے ہیں، طہورُ مصدر ہے، نام ہے اور اسی طرح صفت بھی اور طہورُ مصدر ہے، اور یہی لغت میں معروف ہے۔ جمہور کا موقف ہے طہور وہ ہے جو خود پاک ہو اور پاک کرنے والا ہو اس بات کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ اس کی بنیاد مبالغہ پر ہے۔ ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ: طہورُ وہ ہے جو پاک کرنے والی ہو اس کے لئے انہوں نے اس فرمان الٰہی وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ہے، دلیل لی ہے، طہور بمعنی طاہر ہے۔ اسی معنی میں شاعر کا یہ قول ہے ؏

خلیلی هل فی نظرة بعد توبة او ادی بها قلبی علی فجور

الی رجح الاکفال غید من الظبا عذاب الثنایا ریقهن طهور

میرے خلیل کیا توبہ کے بعد مہلت ہے یا اس کی وجہ سے میرے فجور والے دل نے مجھے راجح اعضاء کی طرف پہنچا دیا، کھیل مستی کرتی ہوئی ہرنیوں سے کہ ان کے دانت بڑے میٹھے اور ان کا تھوک پاک ہے۔

یہاں ریق کی صفت طہور آئی ہے جو کہ پاک کرنے والا نہیں۔ ثعلب نے پہلے قول کو راجح قرار دیا ہے جو ازہری سے منقول ہے اس لئے کہ وہ لغوی تھے۔ البتہ شاعر کے قول کو راجح قرار دیا ہے جو ازہری سے منقول ہے اس لئے کہ وہ لغوی تھے۔ باقی رہا شاعر کا ریق کے لئے الطہور کو صفت لانا، تو یہ مبالغہ کی صورت میں ہے۔ بہر حال شرع میں یہ بات منقول ہے کہ پانی بذات خود

پاک ہے اور دوسروں کو پاک کرنے والا ہے۔فرمان باری تعالیٰ ہے: وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے پانی کو پاک پیدا کیا ہے۔

مضمون نمبر: ۲

وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ۔ (۶۴) ''اور جو راتیں گذار دیتے ہیں۔''

بیتوتہ کا معنی ہے، کہ تجھ رات پہ آئے تو سویا ہوا ہو یا نہ۔ زجاج کہتے ہیں: جسے رات پالے تو اس نے رات گذار دی وہ سوئے یا نہ سوئے جیسا کہ کہا جاتا ہے فلاں نے رات پریشانی میں گذار دی۔ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا ''اپنے رب کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے'' یعنی اپنے چہروں کے بل۔ وَقِيَامًا ''اور قیام کرتے ہوئے'' یعنی اپنے قدموں پر کھڑے۔ اسی معنی امرؤ القیس کا یہ قول ہے ؏

فَبِتْنَا قِيَامًا عِنْدَ رَأْسِ جَوَادِنَا ... يُزَاوِلُنَا عَنْ نَفْسِهِ وَنُزَاوِلُهُ

ہم نے اپنے گھوڑے کے سر کے پاس رات کھڑے ہو کر گذری، وہ ہمیں اپنے نفس سے زائل کرتا تھا اور ہم اس کو زائل کرتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان کی صفت ہے کہ وہ پوری رات یا رات کا اکثر حصہ بیدار رہتے ہیں۔

مضمون نمبر: ۳

وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا۔ (۶۷)

''اور جو خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ بخیلی۔''

یہ قَتَرَ يَقْتُرُ یا أَقْتَرَ يُقْتِرُ۔ دونوں ابواب سے ہو سکتا ہے، ان سب کا معنی یہی ہے کہ خرچ کرنے میں تنگی کرنا۔ نحاس کہتے ہیں آیت کے معنی میں سب سے عمدہ بات جو کہی گئی وہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سے نکل کر خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے رک جائے تو وہ اقتار ہے اور اور جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرے وہ قوام ہے۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں: یہ وہ شخص ہے جو نہ بھوکا رہے اور نہ ننگا ہو اور کوئی ایسا خرچ بھی نہ کرے کہ جسے لوگ اسراف کہیں۔ یزید بن حبیب کہتے ہیں: اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں، وہ لوگ نعمتوں کے اظہار اور لذت کے لئے کھانا نہ کھاتے تھے اور نہ کپڑے خوبصورتی کے لئے پہنا

کرتے' لیکن وہ لوگ کھانا صرف اس قدر کھاتے کہ جو ان سے بھوک مٹادے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے طاقتور کردے اور لباس بھی اس لئے پہنتے کہ جو شرمگاہ چھپادے اور گرمی سردی سے بچائے۔

ابوعبیدہ کہتے ہیں: معروف اور عام طریقہ سے نہ زیادہ خرچ کرتے اور نہ اس میں بخل کرتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ لَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ۔ وَ كَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا یعنی ان کا خرچ کرنا افراط و تفریط کے درمیان ہے اور وہ ''معتدل طریقہ پر خرچ کرتے ہیں۔'' قاف پر زیر پڑھیں تو معنی یہ ہوتا ہے جس پر کوئی ہمیشگی کرے اور برقرار رہے۔ اور زبر پڑھیں تو میانہ روی اور استقامت مراد ہوگی، یہ معنی ثعلب نے بیان کیا۔ ایک قول کے مطابق زبر پڑھیں تو دو چیزوں کے درمیان انصاف مراد ہے اور زیر پڑھیں تو جو چیز اپنی جگہ قائم ہو نہ اس سے زائد اور نہ تھوڑی' ایک قول کے مطابق زیر پڑھنے سے معنی ہوگا درستی اور صحیح جگہ پہنچنا۔

مضمون نمبر:۴

وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا۔ (۷۴)

''اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔''

یعنی قائد بنا تاکہ لوگ خیر و بھلائی کے کاموں میں ہم سے راہنمائی لیں، یہاں لفظ امام لائے ہیں، ائمہ نہیں، کیونکہ اس سے مراد جنس ہے جیسا کہ یہ آیت ہے: ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا۔ ایک قول کے مطابق یہ کلام مقلوب ہے، معنی یہ ہوا کہ متقین کو ہمارا امام بنا دے' یہی مجاہد کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ دعا ان کی طرف سے اپنے طور پر وقوع پذیر ہوئی اور یہ ہر ایک کی طرف سے تعبیر کی جاسکتی ہے کہ مجھے متقین کا امام بنادے لیکن یہ ہر ایک کی عبارت اختصار کی وجہ جمع متکلم کے صیغہ سے منقول ہے۔

اخفش نے کہا: امام آم کی جمع ہے اَمَّ یَؤُمُّ باب سے یہ فعال کے وزن پر جمع ہے جس طرح صاحب، صحاب، قائم اور قیام ہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ قیام اور صیام کی طرح مصدر ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ نیساپوری کہتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ دینی عہدے ان میں سے ہیں کہ جنہیں طلب کرنا ضروری ہیں اور ان میں رغبت رکھنی چاہیے۔ سب سے قریب معنی یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ انہیں اطاعت کے اس مرتبہ پر پہنچادے کہ جس پر ان کی طرف اشارہ کیا جائے اور ان کی اقتداء و پیروی کی جائے۔

تفسیر سورۃ القصص

اس کی ۸۸ یا ۸۷ آیات ہیں۔ حسن، عکرمہ اور عطاء رحمہم اللہ کے قول کے مطابق یہ پوری سورۃ مکی ہے۔

مضمون نمبر: ۱

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْکِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ۔ (۲۷)

"اس بزرگ نے کہا میں اپنی دونوں لڑکیوں میں سے ایک کو آپ کے نکاح میں دینا چاہتا ہوں۔"

اس سے اس بات کا جواز نکلتا ہے کہ عورت کا ولی اسے مرد پر پیش کر سکتا ہے اور یہ اسلام میں بھی ثابت شدہ سنت ہے جیسا کہ یہ ثابت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی سیدنا ابوبکر و سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما پر پیش کی، یہ واقعہ معروف ہے وغیرہ وغیرہ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں ایسے واقعات ہوئے۔ اور اسی طرح عورت کا خود اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پیش کرنا بھی سیرت میں موجود ہے۔ عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ۔ "اس مہر پر کہ آپ آٹھ سال تک میرا کام کاج کریں" یعنی آپ میرے آٹھ سال تک مزدور رہیں، میرے جانور چرایا کریں۔ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ "ہاں اگر آپ دس سال پورے کریں تو یہ آپ کی طرف سے بطور احسان کے ہے" یعنی یہ آپ کی طرف سے زائد ہوگا یہ میری طرف سے تم پر لازم نہیں ہے۔ تو انہوں نے آٹھ پر جو دس پورا کرنے کا اضافہ کیا، یہ مروت کی طرف منسوب کیا گیا۔

وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ "میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ کو کسی مشقت میں ڈالوں۔" تجھ پر پورے دس سال لازم کرنے سے۔ مشقت شق سے نکلی ہے یعنی پیٹ کو دو حصوں میں کاٹ دیا۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے میں طاقت رکھتا ہوں اور بعض اوقات کہا جاتا ہے میں طاقت نہیں رکھتا۔ پھر اس مزدوری کو قبول کرنے کی طرف رغبت دلائی فرمایا:

سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ "اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو مجھے تعلق اور وفاداری میں، آگے چل کر آپ مجھے بھلا آدمی پائیں گے" ایک قول کے مطابق بالعموم اصلاح کا ارادہ کیا پس معاملات کی اصلاح مزدوری میں سب سے پہلے اس آیت میں داخل ہے اور اپنی بابرہ میں معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی معاونت کے سپرد کرتے ہوئے، مشیت الٰہی کی قید لگادی۔

تفسیر سورۃ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس کا نام سورۃ القتال اور الذین کفروا بھی ہے' اس کی آیات ۳۹ ہیں۔ ایک قول کے مطابق ۳۸ ہیں، یہ سورۂ مدنی ہے۔ ماوردی کہتے ہیں کہ تمام اقوال کے مطابق یہی ہے۔ سوائے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سوائے ایک آیت کے جو حجۃ الوداع کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے اور غم کی حالت میں بیت اللہ کی طرف دیکھ کر رو رہے تھے تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ ثعلبی کہتے ہیں یہ مکی ہے' جبکہ یہ قول غلط ہے لہٰذا یہ سورۂ مدنی ہے جیسا کہ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں۔

مضمون نمبر: ۱

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴)

"تو ان کو خوب قید و بند سے گرفتار کر لو"

الوثاق میں الوِثاق بھی آتا ہے یہ اس چیز کا نام ہے، جس کے ساتھ کسی کو باندھ دیا جائے جیسا کہ بابطا ہے معنی یہ ہوا جب تم ان کو قتل کرنے میں انتہا کر دو تو انہیں قید کر لو اور باندھ کر ان کی حفاظت کرو فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً "(پھر اختیار ہے) کہ خواہ احسان رکھ کے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر" یعنی قید کرنے کے بعد یا تو تم ان پر احسان کر دو یا فدیہ لے لو من کا اطلاق ہوتا ہے جو بغیر معاوضہ کے احسان ہو اور فدیہ کہتے ہیں کہ حقیقی خود اپنی قید کا فدیہ دے یہاں قتل کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہ پہلے گذر چکا ہے اور احسان کو فدیہ سے پہلے اس لئے ذکر کیا کہ وہ اعلیٰ اخلاق کی علامت ہے اور اسی بناء پر عرب آپس میں فخر کیا کرتے ہیں۔

وَلَا نَقْتُلُ الْأَسْرَىٰ وَلَكِنْ نَفُكُّهُمْ إِذَا أَثْقَلَ الْأَعْنَاقَ حَمْلُ الْمَغَارِمِ

ہم قیدیوں کو قتل نہیں کرتے بلکہ ہم انہیں آزاد کر دیتے ہیں، جب تاوان کا بوجھ گردنوں کو بھاری کر دیتا ہے۔

پھر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس کی انتہا ذکر کی، فرمایا: حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا "یا وقتیکہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے" لڑائی کے ہتھیار یہ وہ آلات ہیں کہ جن کے بغیر لڑائی نہیں ہوتی، یعنی اسلحہ اور گھوڑے' (یعنی وضع) رکھنے کی نسبت ہتھیاروں کی طرف کی گئی اس لئے کہ

مجازی طور پر وہی رکھے جاتے ہیں' معنی یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ان معاملات میں انتہا درجہ کا اختیار ہے کہ جب کفار سے جنگ نہ کرنا ہو۔ مجاہد کہتے ہیں معنی یہ ہے کہ جب تک دین اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین باقی نہ رہے' یہی قول حسن اور کلبی کا ہے۔ کسائی کہتے ہیں: حتیٰ کہ ساری انسانیت مطیع وفرمانبردار ہو جائے۔ فراء کہتے ہیں: حتیٰ کہ وہ سارے ایمان لے آئیں اور کفر ختم ہو جائے۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے حتیٰ کہ جنگی دشمن اپنے اوزار یعنی ہتھیار شکست یا صلح کی وجہ سے رکھ دیں۔

حسن اور عطا رحمہما اللہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں آیت میں تقدیم وتاخیر ہے' معنی یہ ہوا کہ گردنیں اڑاؤ حتیٰ کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے اور جب اچھی طرح ان کا خون بہالو تو پھر انہیں باندھ لو۔ علماء نے اس آیت کے بارہ میں اختلاف کیا ہے: کہ یہ محکم ہے یا منسوخ؟ ایک قول کے مطابق یہ منسوخ ہے اور یہ آیت بتوں کے پجاریوں کے بارہ میں نازل ہوئی اور اب ان سے فدیہ لینا یا احسان کرنا جائز نہیں، اس کا ناسخ فرمان الٰہی: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ اور فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ اور قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً ہے، یہی بات قتادہ' ضحاک' سدی' ابن جریج اور بہت سارے اہل کوفہ نے کہی، وہ کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ وہ آخری سورۃ ہے جو نازل ہوئی، لہٰذا واجب ہے کہ ہر مشرک کو قتل کر دیا جائے سوائے اس بات کے کہ جن کو چھوڑنے کی دلیل موجود ہو مثلاً عورتیں بچے اور جن سے جذیہ لیا جاتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا معروف مذہب ہے۔

ایک قول کے مطابق یہ آیت: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ کی ناسخ ہے۔ یہ بات عطاء وغیرہ سے مروی ہے۔ اکثر علماء کا کہنا ہے: یہ آیت محکم ہے اور حاکم وقت یا امام کو اختیار ہے کہ وہ قتل کر دے یا قید کر لے اور قید کرنے کے بعد احسان کر کے چھوڑ دے یا فدیہ لے' یہی بات امام شافعی' مالک' ثوری' اوزاعی اور ابوعبید رحمہم اللہ وغیرہ نے کہی۔ یہی قول راجح ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے ایسا ہی کیا۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں قید کرنا اور فدیہ لینا یہ اچھی طرح خون بہانے اور تلوار سے قتل کے بعد ہوگا اس لئے کہ فرمان باری تعالیٰ ہے: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ۔ جب اس کے بعد قید ہو جائیں تو امام اپنی رائے سے قتل کرنے کا یا اس کے علاوہ کوئی اور فیصلہ کرے۔

مضمون نمبر:۲

فَلَا تَهِنُوْا۔(۳۵)

''تم کمزوری نہ دکھاؤ۔''

یعنی جنگ سے کمزوری نہ دکھاؤ' الوھن کمزوری کو کہتے ہیں ہوَتَدْعُوْٓا ''اور تم درخواست کرو'' یعنی کفار سے۔اِلَى السَّلْمِ ''صلح کی۔'' یعنی تم پہل کرتے ہوئے کفار کو صلح کی دعوت نہ دو کیونکہ یہ بھی کمزوری ہے۔زجاج کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں' مومنوں کو اس بات سے منع کیا ہے کہ وہ کفار کو صلح کی دعوت دیں بلکہ انہیں حکم دیا کہ ان سے جنگ جاری رکھیں حتیٰ کہ وہ مطیع ہو جائیں۔

اس آیت میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ محکم ہے یا منسوخ؟ ایک قول کے مطابق یہ محکم ہے اور وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا کے لیے ناسخ ہے۔'' ایک قول کے مطابق اسی آیت سے منسوخ ہے، یہ بات آپ پر پوشیدہ نہیں کہ اس کے نسخ والی بات کا یہاں کوئی تقاضہ نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو اس آیت میں روکا ہے کہ وہ شروع میں صلح کی دعوت نہ دیں اور جب مشرک ان کی طرف جھکیں تو صلح کی دعوت قبول کرنے سے نہیں روکا، تو لہٰذا دونوں آیات محکم ہیں اور یہ ایک ہی مسئلہ کے بارہ میں نازل نہیں ہوئیں کہ اس بات کی ضرورت پیش آئے کہ ایک کو منسوخ یا خاص کہیں۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ''جبکہ تم ہی بلند و غالب رہو گے'' یہ گذشتہ نہی کو ثابت کرتی ہے، یعنی تم ہی دلیل اور تلوار سے غالب رہو گے۔ کلبی فرماتے ہیں، یعنی آخر کار فیصلہ تمہارے حق میں ہوگا اگرچہ بعض اوقات وہ تم پر غالب بھی آجائیں۔ اسی طرح آگے فرمایا: وَاللّٰهُ مَعَكُمْ ''اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے'' یعنی مدد اور معاونت کے اعتبار سے ان کے خلاف۔

تفسیر سورۃ الفتح

اس کی ۲۹ آیات ہیں' یہ سورۂ مدنی ہے اس پر اجماع ہے' یہ بات قرطبی رحمہ اللہ نے کہی۔ مروان اور مسور بن مخرمہ کہتے ہیں یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان حدیبیہ کے بارہ میں نازل ہوئی۔ یہ بات اجماع کے منافی نہیں کیونکہ مدنی سورتوں سے مراد وہ ہیں جو مکہ سے ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔

مضمون نمبر ۱

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ

"اور اگر ایسے (بہت سے) مسلمان مرد اور (بہت سی) مسلمان عورتیں نہ ہوتیں۔"

یعنی وہ کمزور لوگ جو مکہ میں ایمان لائے تھے۔ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ "جن کی تم کو خبر نہ تھی" یعنی تم انہیں پہچانتے نہ تھے۔ ایک قول کے مطابق کہ تم انہیں جانتے نہ تھے کہ وہ مومن ہیں۔ أَنْ تَطَئُوهُمْ یعنی تم ان کو قتل کرتے اور ان کو زمین پر گرا دیتے کی وجہ سے روندنے والے ہوتے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَطِئْتُ الْقَوْمَ یعنی جب ان پر حملہ ہو جائے۔ یہاں اس لئے کہا کہ اگر وہ مکہ میں دشمنی کرتے ہوئے تلوار اٹھا لیتے تو کفار میں مومنوں میں امتیاز نہ کر سکتے۔ اس صورت میں یہ ممکن تھا کہ وہ مومنوں کو قتل کر دیں تو ان پر کفارہ لازم آتا اور برا بھلا انہیں سننا پڑتا۔ یہی اس لفظ کا معنی ہے کہ: فَتُصِيبَكُمْ مِنْهُمْ "جو تمہیں بھی پہنچتا ان سے" یعنی ان کی طرف سے مَعَرَّةٌ یعنی حیثیت یعنی ایسی مشقت جو انہیں کفارہ یا عیب کے لحاظ سے قتل کرنے کی صورت میں لگتی۔ المعرۃ یعنی وہ مشقت جو تم پر ان کے قتل کی وجہ سے لازم ہوگی یعنی کفارہ اور حقیقی معنی عیب ہے جو المعرۃ سے لیا گیا ہے اور وہ جگہ ہے۔ اس طرح کہ مشرکین تعجب کرتے کہ مسلمان اپنے دین پر چلنے والوں کو قتل کر دیں گے۔ عرب کے لوگ کہتے ہیں معرۃ کا معنی گناہ ہے۔ یہ جوہری نے کہا اور ابن زید نے بھی یہی کہا کلبی اور مقاتل وغیرہ نے بھی کہا: المعرة كفارة قتل خطاء یعنی معرہ قتل خطا کے کفارہ کو کہا جاتا ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں: المعرۃ سے مکہ جرمانے کو کہتے ہیں۔

قطرب کہتے ہیں المعرۃ کا معنی شدت اور سختی ہے ایک قول کے کے مطابق اس کا معنی غم ہے۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ "لاعلمی میں" اور یہ أَنْ تَطَئُوهُمْ کے متعلق ہے یعنی وہ جانتے نہ ہوں۔ اور لولا کا جواب محذوف ہے اور وہ یہ ہے "لاذن الله عزوجل لكم" یا "لما كف ايديكم عنهم" یعنی اللہ تعالیٰ کی اجازت دینے کی وجہ سے یا اس لئے کہ اس نے تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے ہیں۔

تفسیر سورۃ الحجرات

اس کی ۱۸ آیات ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے قرطبی فرماتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے۔

مضمون نمبر:۱

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا۔(۶)

"اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔"

یہ لفظ تبیین سے ہے۔ حمزہ اور کسائی نے فتثبتوا پڑھا ہے۔ یہ تثبیت سے لیا گیا ہے اور تبیین سے مراد ہے تعارف و تفتیش کرنا اور تثبیت کا معنی ہے بردباری، جلد بازی سے باز رہنا اور کسی واقعہ اور موصولہ خبر پر صبر کرنا حتیٰ کہ وہ واضح اور ظاہر ہو جائے۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو اس کے بارہ ناپسند کرتے ہوئے، میں نازل ہوئی۔

اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ "ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو" یا اس لئے کہ کہیں تم نہ پہنچ جاؤ کیونکہ غلطی اس وقت ہوتی ہے جب کوئی معاملہ واضح نہ ہو اور درست بات پوری طرح ثابت نہ ہو جائے اور یہی جہالت ہے کیونکہ یہ کام معلومات کی روشنی میں نہیں ہوتا تو معنی ہوا کہ تم ان کے حالات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اختلاط کا شکار ہو جاؤ گے۔

فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ "پھر تم اپنے کیے پر" ان کے ساتھ جو تم غلطی سے کر گذرے نٰدِمِیْنَ "پشیمانی اٹھاؤ" اس پر اور پریشان ہو کر۔

مضمون نمبر:۲

وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا۔(۹)

"اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں۔"

دونوں گروہوں کے افراد جھگڑیں۔ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا "تو ان میں میل ملاپ کرا دیا کرو" یعنی جب مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کے درمیان صلح کروانے کی کوشش کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف بلائیں۔ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ ۔ ”پھر اگر ان دونوں میں سے ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو تم سب اس گروہ سے جو زیادتی کرتا ہے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے اور اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرا دو۔“

یعنی اس کے بعد اگر دونوں میں سے ایک گروہ کی طرف سے سرکشی ہو، اور دوسرا گروہ صلح پر نہ آئے اور اس میں شامل نہ تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس سرکش گروہ سے جنگ کریں حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلہ کی طرف پلٹ آئے، اگر وہ سرکش گروہ اپنی بغاوت وسرکشی سے واپس آ جائے اور کتاب اللہ اور اس کے فیصلہ کی دعوت قبول کر لے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ دونوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیں اور اس درستگی کی کوشش کریں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہے اور ظلم کرنے والے کا ہاتھ پکڑیں حتیٰ کہ وہ ظلم سے باز آ جائے اور جو اس پر دوسرے کے حق میں واجبات تھے وہ ادا کرے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس خاص دو جھگڑنے والے گروہوں کے مابین انصاف کا حکم دینے کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے تمام معاملات میں انصاف کرو فرمایا: وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ”اور عدل کرو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے“ یعنی عدل اور انصاف کرو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے اور اس کی ان سے محبت ان کو اچھا بدلہ دینے کا مستحق ٹھہرائے گی۔ اس موقع پر جو بات حق اور درست ہے وہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے منتقی کی شرح نیل الاوطار میں پوری طرح واضح کی ہے اور ہم نے سرکش فرد اور جماعت کے احکام اپنی شرح مسک الختام شرح بلوغ المرام میں پوری طرح کھول کر بیان کی ہے، ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

تفسیر سورۃ النجم

اس کی آیات ۶۱ اور ایک قول کے مطابق ۶۲ ہیں۔ جمہور کے قول کے مطابق یہ پوری سورۃ مکی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سوائے ایک آیت: اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ۔ الایہ کے۔

مضمون نمبر: ۱

وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (۳۹)

"اور یہ کہ ہر انسان کے لئے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی۔"

یعنی اس کو صرف اسی کی محنتوں کا اجر اور اسی کے اعمال کا بدلہ ملے گا، اور کوئی بھی دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل نہ کر سکے گا، یہ عموم اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ خاص ہو جائے گا۔" اور اس طرح کے واقعات سے جو انبیاء علیہم السلام اور فرشتوں کی سفارش اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لئے ہوگی کے متعلق آتے ہیں اور مرنے والوں کے لئے زندہ آدمی دعا کا جواز اور ان کی طرف سے صدقہ دینا اس قسم کی چیزیں اس عموم کو خاص کرتی ہیں۔ جس نے یہ بات کہی کہ اس قسم کے امور سے یہ آیت منسوخ ہے۔ اس نے درست نہیں کہا کیونکہ خاص عام کو منسوخ نہیں کرتا بلکہ اس کو خاص کر سکتا ہے تو ہر وہ کام جس کے لئے دلیل موجود ہے کہ انسان کو اس کی کوشش اور محنت کے بغیر اس کا فائدہ ہوتا ہے وہ اس آیت کے عمومی مسئلہ سے خاص ہوگا۔

تفسیر سورۃ الواقعہ

اس کی ۹۶ یا ۹۷ آیات ہیں۔ یہ سارتی مکی ہے۔ علماء کی ایک جماعت مثلاً حسن، عکرمہ، جابر اور عطاء کے قول کے مطابق۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سوائے ایک آیت وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ کے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔

مضمون نمبر:۱

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ (۷۹)

''جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔''

واحدی کہتے ہیں اکثر مفسرین کا موقف ہے کہ ضمیر کتاب مکنون کی طرف لوٹتی ہے اور پاک لوگوں سے مراد فرشتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق وہ فرشتے اور اولاد آدم میں سے رسول مراد ہیں۔ لَا يَمَسُّهٗ کا معنی حقیقی چھونا ہے ایک قول کے مطابق اسے پاک لوگ ہی لے کر اترتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد کتاب مکنون سے قرآن ہی مراد لیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ اسے ہاتھ نہ لگائیں جو نجاست اور بے وضو ہونے کے بعد ابھی پاک ہونے والے ہیں۔ اسی طرح قتادہ وغیرہ نے کہا کلبی کہتے ہیں کہ شرک سے پاک لوگ۔ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ گناہوں اور غلطیوں سے پاک لوگ۔ محمد بن الفضل وغیرہ کہتے ہیں آیت کا معنی ہے اسے موحدوں کے علاوہ کوئی نہ پڑھے۔ ابو العالیہ کہتے ہیں پاک لوگوں کے علاوہ کوئی دوسرا اس کا فائدہ اور برکت کو حاصل نہیں کر سکتا۔ یعنی مومنوں کے علاوہ۔ حسین بن فضل کہتے ہیں: اس کی تفسیر و تاویل وہی جانتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شرک اور منافقت سے پاک کر دیا ہو۔

جمہور کا موقف ہے کہ بے وضو شخص مصحف کو ہاتھ نہ لگائے، یہی قول سیدنا علی، سیدنا ابن سیدنا مسعود، سیدنا سعد بن ابی وقاص، اور سیدنا ابن زید رضوان اللہ علیہم، عطاء، زہری، نخعی، حکم، حماد اور فقہاء کی ایک جماعت جن میں امام مالک اور شافعی بھی ہیں ان کا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ، شعبی اور ایک جماعت جن میں ابو حنیفہ بھی شامل ہیں سے مروی ہے کہ بے وضو کے لئے ہاتھ لگانا جائز ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے درست موقف منتقی کی شرح میں واضح کیا ہے اس کی طرف لوٹنا

تفسیر سورۃ الحدید

اس کی ۲۹ آیات ہیں قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام علماء کے قول کے مطابق یہ سورت ساری مدنی ہے۔

مضمون نمبر:

وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً (۲۷)

"اوران کے ماننے والوں کے دلوں میں شفقت پیدا کردی۔"

ان کے پیروکار حواری تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت پیدا کردی۔ وَرَحْمَةً اور رحم پیدا کردیا جس سے وہ آپس میں رحم کرتے تھے۔ یہودیوں کے برخلاف کہ وہ ایسے نہیں۔ رَأْفَةً دراصل نرمی ہے اور الرحمة کا معنی شفقت کرنا ہے۔ ایک قول کے مطابق رأفت، رحمت سے زیادہ سخت ہے۔ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا "ہاں رہبانیت تو ان لوگوں نے از خود ایجاد کر لی تھی" یعنی انہوں نے رہبانیت ایجاد کی۔ ابوعلی الفارسی نے ما قبل پر عطف کو راجح قرار دیا ہے۔

رہبانیت کا معنی ہے خوب بیر رھب سے لیا گیا ہے اور رھبانیت یہ رھبان درویش قسم کے لوگوں کی طرف منسوب ہے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے عبادت میں غلو کیا اور خود پر کھانے پینے اور نکاح شادی سے باز رہنے کی صورت میں مشقتیں ڈال لیں۔ غاروں اور گرجوں میں ہی الگ گئے کیونکہ ان کے بادشاہوں نے دین کو تبدیل کر دیا تھا مگر ان میں بہت تھوڑے لوگ ایسا کیا تھا، رہ گئے تو انہوں نے رہبانیت اختیار کر لی اور لوگوں سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ معنی قتادہ، ضحاک وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

مَا كَتَبْنَاهَا "ہم نے ان پر اسے واجب نہ کیا تھا۔" "الا ابتغآء" یہ استثنا منقطع ہے، عبارت اس طرح ہوگی "فا کتبناھا علیھم را سالکن ابتداعوھا ابتغاء رضوان اللہ فمارعوھا۔" یعنی ہم نے ان پر بنیادی طور پر بھی فرض نہ کیا تھا لیکن انہوں نے خود ایجاد کر لیا پھر انہوں نے اس رہبانیت کی پاسداری نہ کی۔ حَقَّ رِعَايَتِهَا، بلکہ اسے ضائع کر دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کے دین کے ساتھ کفر کیا اور ان بادشاہوں کے دین میں چلے گئے جو انہوں نے اصل دین کا حلیہ

بگاڑا تھا اور اس رہبانیت کو چھوڑ گئے اور عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر صرف چند لوگوں کے علاوہ کوئی نہ رہا، یہی لوگ اس فرمان الٰہی میں مراد ہیں:

فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ''پھر ہم نے ان میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے انہیں ان کا اجر دیا'' یعنی جس اجر کے وہ ایمان کے بدلہ میں مستحق تھے' یہ اس وجہ سے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور ان کے دین پر ثابت قدم رہے، حتیٰ کہ محمد ﷺ پر بھی ایمان لے آئے جب آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ''اور ان میں زیادہ تر لوگ نافرمان ہیں'' یعنی وہ اس ایمان سے خارج ہیں جس کے بارہ میں انہیں حکم تھا کہ اسے قبول کریں۔

تفسیر سورۃ المجادلہ

اس کی ۲۲ آیات ہیں' قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تمام لوگوں کے قول کے مطابق یہ سورۂ مدنی ہے' سوائے عطاء کی ایک روایت کے کہ صرف اس کی پہلی دس آیات مدنی ہیں۔

مضمون نمبر:۱

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآءِ هِمْ۔(۳)

''جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں۔''

یعنی خاوند اپنی بیوی سے کہے تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے' اسی طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ معنی یہ ہوا کہ وہ لوگ جو یہ منکر اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا۔ ''پھر اپنی کہی ہوئی بات سے رجوع کر لیں'' اس کا تدارک اور تلافی کر کے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖ یعنی اسی جیسا کام کرو۔ اخفش کہتے ہیں: لِمَا قَالُوْا اور اِلٰى مَا قَالُوْا یہ ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدَانَا لِهٰذَا اور فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ دوسری جگہ فرمایا: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا اور وَاُوْحِىَ اِلٰى نُوْحٍ۔ فراء کہتے ہیں لام بمعنی ثم ہے کہ پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات کی طرف لوٹتے اور صحبت کرنا چاہتے ہیں۔ زجاج کہتے ہیں: ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ کا معنی ہے جماع کا ارادہ کرتے ہیں اس وجہ سے جو انہوں نے کہا۔ اخفش نے بھی کہا ہے کہ آیت میں تقدیم وتاخیر ہے' تو معنی یہ ہوا کہ وہ لوگ جو اپنی عورتوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اسی حالت میں یعنی جماع کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس پر پہلے تھے۔

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ''تو ایک غلام آزاد کرنا ہے'' یعنی ان کے ذمہ ایک گردن آزاد کرنا لازم ہے اس وجہ سے جو انہوں نے کہا تھا۔ اہل علم نے مذکورہ لوٹنے کی تفسیر میں کئی اقوال کی صورت میں اختلاف کیا ہے:

(۱) صحبت کا پختہ ارادہ کرنا یہ قول اہل عراق ابو حنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا ہے اور امام مالک سے بھی یہی مروی ہے۔ ایک قول کے مطابق صحبت کرنا مراد ہے' یہ بات حسن نے کہی۔ امام مالک سے جو مروی ہے وہ یہ کہ آدمی اپنی بیوی کو طلاق کی قدرت رکھنے کے باوجود ظہار کرنے کے بعد

روک لے' یہی قول امام شافعی کا ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ کفارہ ہے' تو معنی یہ ہوا کہ اس کے ساتھ صحبت کرنا جائز نہیں مگر کفارہ ادا کر کے' یہی قول لیث بن سعد کا ہے اور ابو حنیفہ سے بھی یہی مروی ہے۔ ایک قول کے مطابق لفظ ظہار کا تکرار ہے' یہ قول اہل ظاہر کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گردن بھی ہو وہ کفایت کر جائے گی۔ ایک قول کے مطابق وہ گردن مومن ہو جیسا کہ قتل کے کفارہ میں مومنہ گردن آزاد کی جاتی ہے۔ پہلا قول ابو حنیفہ اور ان کے ساتھیوں کا ہے اور دوسرا قول امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ کا ہے' انہوں نے اس کا ہر عیب سے صحیح سالم ہونے کی شرط رکھی ہے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا "آپس میں ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے۔" ہاتھ لگانے سے یہاں جماع کرنا مراد ہے' یہ جمہور کا قول ہے' ظہار کرنے والے کے لئے جائز نہیں کہ کفارہ ادا کئے بغیر صحبت کرے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے کہ جماع کرنے یا ہاتھ لگانے یا شرمگاہ کی طرف شہوت سے دیکھنے کی حد تک فائدہ اٹھانا' یہ قول امام مالک رحمہ اللہ کا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے دو میں سے ایک قول ہے۔ ذٰلِكُمْ "یہ تمہیں" اس سے مذکورہ حکم کی جانب اشارہ ہے اور وہ مبتدا ہے اس کی خبر تُوْعَظُوْنَ ہے۔ "نصیحت کی جاتی ہے۔" یعنی ظہار جیسے کام کرنے پر تمہیں حکم دیا جا رہا ہے یا اس طرح تمہیں ڈانٹا جا رہا ہے۔ اس چیز کی' اس میں وضاحت موجود ہے' جو شرعی کفارہ سے ذاتی مقصود ہے۔ زجاج کہتے ہیں: ذٰلِكُمْ کا معنی ہے کفارہ میں سختی کی تمہیں نصیحت کی جاتی ہے یعنی کفارہ میں سختی کر کے تمہیں نصیحت کی جاتی ہے حتیٰ کہ تم ظہار کرنا چھوڑ دو۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ "اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔" یعنی اس پر تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں اور وہ ان پر تجاوز کر جاتا ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کا ذکر کیا جو کفارہ دینے سے عاجز ہیں۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا "ہاں جو شخص (یہ کفارہ) نہ پائے اس کے ذمہ دو مہینوں کے لگاتار روزے ہیں اس سے پہلے کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔" یعنی جو اپنی ملکیت میں کوئی غلام نہیں رکھتا اور نہ اس کی قیمت کی طاقت رکھتا ہے تو اس پر دو ماہ متواتر روزے رکھنا لازم ہے کہ ان میں کوئی روزہ نہ چھوڑے' اگر چھوڑ دیا تو پھر نئے سرے سے شروع کرے گا اگر بغیر عذر کے چھوڑا ہے اور اگر کسی عذر یعنی سفر یا بیماری کی وجہ سے چھوڑا ہے تو سعید بن مسیب' حسن' عطاء بن ابی رباح' عمرو بن دینار' شعبی' شافعی اور امام

مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسی پر بنیاد رکھ لے اور نئے سرے سے شروع نہ کرے' ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں دوبارہ نئے سرے سے شروع کرے اور یہ امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ پس اگر اس نے دن یا رات کو جان بوجھ کر یا غلطی سے جماع کر لیا تو نئے سرے سے شروع کرے گا یہی قول ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب جماع رات کو کرے تو نئے سرے سے شروع نہیں کرے گا کیونکہ یہ روزہ کا وقت نہیں ہے۔ پہلی بات زیادہ درست ہے۔

فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ''اور جس شخص کو یہ طاقت بھی نہ ہو تو اس پر ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا ہے' ہر مسکین کو دو مد' یہ دو مد آدھا صاع ہے۔'' یہی قول ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ساتھیوں کا ہے' امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہر مسکین کو ایک مد دیا جائے۔ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس قدر کھانا کھلائیں کہ ایک مرتبہ سیر ہو جائیں یا ان کی طرف اتنا کھانا بھیج دیں جس سے وہ سیر ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ انہیں ایک ہی مرتبہ جمع کیا جائے بلکہ جائز ہے کہ اس تعداد میں سے کچھ کو ایک دن اور کچھ کو پھر کسی دن کھانا کھلایا جائے۔

ذٰلِكَ ''یہ اس لئے'' اس سے گذشتہ احکام کی طرف اشارہ ہے' یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر یعنی ذٰلِكَ وَاقِعٌ پوشیدہ ہے۔

لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ''کہ تم اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی حکم برداری کرو' یعنی تاکہ تم تصدیق کرو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے اور اس نے یہ قانون بنایا ہے یا اس لئے کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم اور منہیات کی بات مانو اور اس کے قوانین کی حدود پر رک جاؤ ان سے آگے نہ بڑھو اور نہ زیادتی کرتے ہوئے ظہار کرو جو کہ ناپسندیدہ کام اور جھوٹی بات ہے۔ تِلْكَ ''یہ'' اس سے مذکورہ احکام کی طرف اشارہ ہے' یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر: حُدُوْدُ اللّٰهِ ہے۔ ''اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں'' تم ان حدود کو نہ پھلانگو جو اس نے تمہارے لئے مقرر کر دی ہیں' اس نے تمہارے لئے واضح کر دیا ہے کہ ظہار کرنا نافرمانی ہے اور اس کا مذکورہ کفارہ معافی اور بخشش کا سبب ہے۔ وَلِلْكٰفِرِيْنَ ''اور کفار کے لئے'' جو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود پر نہیں ٹھہرتے اور نہ ان قوانین پر عمل کرتے ہیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کئے ہیں ان کا نام اللہ تعالیٰ نے سختی اور غصہ کی وجہ سے کافر رکھا ہے۔ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ''دردناک عذاب ہے'' اور وہ عذاب جہنم کا ہے۔

تفسیر سورۃ الحشر

قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تمام کے قول کے مطابق یہ سورۂ مدنی ہے۔

مضمون نمبر:۱

مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ (۵)

’’تم نے کھجوروں کے جو درخت کاٹ ڈالے یا جنہیں تم نے ان کی جڑوں پر باقی رہنے دیا یہ سب اللہ تعالیٰ کے فرمان سے تھا اور اس لئے بھی کہ فاسقوں کو اللہ تعالیٰ رسوا کرے گا۔‘‘

مجاہد کہتے ہیں: بعض مہاجروں نے کھجور کے درخت کاٹے اور کچھ لوگوں نے انہیں روکا اور کہا کہ یہ مسلمانوں کی غنیمت ہے تو جنہوں نے درخت کاٹے وہ کہنے لگے یہ دشمن سے سخت غصہ کا اظہار ہے اور قرآن ان کی تصدیق کے لئے نازل ہوا جو درخت کاٹنے سے روکتے تھے اور جنہوں نے اس کے کاٹنے کو گناہ سمجھا ان کے جواز کے لئے۔ مفسرین نے لینہ کی تفسیر کے بارہ میں اختلاف کیا ہے؟ زہری، مالک، سعید بن جبیر، عکرمہ اور خلیل رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ لینہ عجوہ کے علاوہ ہر کھجور کے درخت کو کہتے ہیں۔ ثوری کہتے ہیں کہ یہ اعلیٰ قسم کا درخت ہے۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ سوائے عجوہ اور برنی کے، یہ کھجور کی تمام اقسام کو شامل ہے۔ جعفر بن محمد کہتے ہیں یہ خاص عجوہ ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ کھجور کے درخت کی ایک مثال ہے۔ اصمعی کہتے ہیں کہ یہ دقل کھجور کی ایک قسم ہے۔

لینہ کا اصل لونہ ہے تو واؤ کو یاء میں بدل دیا اس لئے کہ اس کا ماقبل مکسور ہے۔ لینہ کی جمع لین اور ایک قول کے مطابق لیان آتی ہے۔ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کفار کے قلعے، ان کے گھر گرا دینے، جلا دینے اور منجنیقوں سے تباہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اسی طرح ان کے درخت وغیرہ کاٹنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح اجتہاد کے جائز ہونے کی دلیل بھی ملتی ہے اور یہ دلیل بھی کہ مجتہد درست فیصلہ کرتا ہے۔ یہ بحث اصول کی کتب میں پوری طرح مندرج ہے۔

مضمون نمبر:۲

وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ۔ (۶)

’’اور ان کا جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ہاتھ لگایا ہے

یعنی کفار کا جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف بھیجا' ضمیر بنی نضیر کی طرف جاتی ہے۔
فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ "جس پر نہ تو تم نے اپنے گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ۔" مقولہ ہے: وَجَفَ الْبَعِيْرُ' يجف و جفا سے' اس کا معنی ہوتا ہے تیز چلنا' او جفه صاحبه یہ اس وقت ہیں، کہتے جب تیز چلنے پر ابھارا جائے' اور الركاب کہتے ہیں بالخصوص جن اونٹوں پر سواری کی جائے تو معنی یہ ہوا کہ تم اس کے حصول کے لئے گھوڑوں اور نہ اونٹوں پر سوار ہوئے اور نہ تم نے مشقت برداشت کی اور نہ تم نے جنگ کی' وہ بستی مدینہ سے صرف دو میل کے فاصلہ پر تھی' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے وہ خاص رسول اللہ ﷺ کو عطا فرما دی۔ یقیناً اسے صلح کر کے فتح کیا تھا اور ان کے مال پر قبضہ کر لیا تھا اور مسلمان آپ ﷺ سے سوال کر رہے تھے کہ یہ مال ان میں تقسیم کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ "بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو جس پر چاہے غالب کر دیتا ہے" اس کے دشمنوں سے، اس میں یہ وضاحت ہے کہ یہ مال آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اپنے گھوڑے اور نہ اونٹ لے کر ان پر حملہ کیا بلکہ پیدل چل کر گئے اور انہوں نے اس سلسلہ میں جنگی تکلیف ومصائب بھی برداشت نہیں کیں۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔" جسے چاہے جس پر چاہے مسلط کر دے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے جو وہ کرتا ہے، اس سے نہیں پوچھا جا سکتا اور ان لوگوں سے پوچھا جائے گا۔

مضمون نمبر: ۳۰

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ۔ (۷)

"اللہ تعالیٰ جو مال اپنے رسول کے ہاتھ لگائے۔"

یہ مال فئے کے مصارف کا بیان ہے اس بیان کے بعد کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص ہے یہ تکرار تاکید اور خبر دینے کے لئے ہے۔ اَهْلِ الْقُرٰى "بستیوں والوں کا" یہ بات سمجھانے کے لئے ہے کہ یہ حکم بنو نضیر کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ ہر اس بستی کے بارہ میں حکم ہے، جسے رسول اللہ ﷺ صلح کے ذریعہ فتح کر لیں اور اس پر مسلمانوں کے گھوڑے اور اونٹ نہ دوڑیں، بستیوں سے مراد بنو نضیر' بنو قریظہ اور فدک وخیبر وغیرہ ہیں۔

اہل علم نے اس آیت اور گذشتہ آیت کے بارہ میں گفتگو کی ہے کہ آیا ان دونوں کا معنی ایک

ہی ہے یا الگ الگ؟ ایک قول کے مطابق ان کا معنی ایک ہی ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور ایک قول کے مطابق مختلف ہے۔ اس بارہ میں اہل علم کی گفتگو بہت طویل ہے۔

ابن عربی فرماتے ہیں: اس بات میں کوئی اشکال نہیں کہ تین معانی تین آیات میں ہیں، پہلی آیت "مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ منهم" تو یہ خالصتاً اور خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے، اس سے بنو نضیر اور اس جیسے اموال مراد ہیں۔ دوسری آیت "ما افآء الله علی رسوله من اهل القریٰ" ہے۔ یہ ابتدائی کلام ہے جو پہلے سے مختلف ہے اور اس کا اس سے مختلف ہونا ہی زیادہ مناسب ہے، اگر یہ اور پہلی آیت مشترک ہو جائیں اس بات میں کہ ان میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو مال فئے دیا، تو پہلی آیت کا تقاضہ ہوگا کہ وہ مال بغیر جنگ کے حاصل ہوا ہے اور انفال کی آیت وہ جو کہ تیسری آیت ہے تقاضہ کرتی ہے کہ یہ مال جنگ سے حاصل ہوا ہے، تو اس صورت میں دوسری آیت دونوں باتوں کے ذکر سے خالی ہے اور وہ آیت: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی ہے کہ یہ مال جنگ کے ذریعہ حاصل ہوا یا بغیر جنگ کے تو یہاں سے اختلاف پیدا ہو گیا۔

ایک جماعت کہتی ہے یہ پہلی آیت سے ملحق ہوئی ہے اور وہ صلح کے مال کے بارہ میں ہے اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ تیسری آیت سے ملحق ہے جو کہ انفال والی آیت ہے اور جو لوگ اسے انفال کی آیت سے ملاتے ہیں، تو وہ پھر اختلاف کرتے ہیں کہ آیا یہ محکم ہے یا منسوخ؟ یہ ان کا اصل کلام ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سورۃ کی پہلی آیت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے اور دوسری آیت بنو قریظہ کے بارہ میں ہے، یعنی ان دونوں کا معنی انفال والی آیت کی طرف جاتا ہے۔ امام شافعی کا موقف ہے فئے کے پانچویں حصہ کا حکم غنیمت کے پانچویں حصہ کے حکم کی طرح ہے اور اس کے بقیہ چار حصے بھی نبی ﷺ کے لئے اور پھر مسلمانوں کے عام فائدہ کے لئے ہیں۔

فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ

"وہ اللہ تعالیٰ کا ہے اور رسول کا اور قرابت والوں کا اور یتیموں اور مسکینوں کا اور مسافروں کا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے لئے ہونے کا مطلب ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں وہیں خرچ ہو اور رسول کے لئے کا مطلب ہے کہ وہ اس کے مالک ہیں اور قرابت والوں سے بنو ہاشم اور بنو مطلب مراد ہیں، اس لئے کہ ان کے لیے صدقہ ممنوع ہے تو فئے میں ان کا حق رکھ دیا۔ ایک قول کے مطابق

اس مال کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ پانچ میں سے چار حصے رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص ہیں اور پھر پانچویں حصہ کو پانچ پر تقسیم کیا جائے گا، ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کا اور مذکورہ چار اقسام میں سے ہر ایک کا ایک حصہ ہوگا۔ ایک قول کے مطابق چھ پر تقسیم کیا جائے گا چھٹا حصہ اللہ تعالیٰ کا، اسے اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والے کاموں مثلاً مساجد وغیرہ کی تعمیر میں صرف کرنا ہوگا۔

كَیْ لَا یَكُوْنَ "تا کہ نہ ہو" یعنی مال فئے دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ "تا کہ تمہارے دولت مندوں کے ہاتھوں میں ہی یہ مال نہ رہے" محتاج لوگوں کے علاوہ۔ الدولة اس چیز کا نام ہے جو لوگوں کے درمیان آپس میں ہی گھومتی رہے، وہ ایک بار ایک کے ہاتھ میں تو دوسری بار دوسرے کے ہاتھ میں۔ مقاتل کہتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ غنی لوگ فقراء پر غالب آکر یہ مال آپس میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس مال کے مصرف بیان فرمادیئے تو انہیں حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کریں اور فرمایا: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ "اور تمہیں جو کچھ رسول دے" یعنی جو مال غنیمت میں سے دے۔ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ "لے لو اور جس سے روکے" یعنی اسے لینے سے فَانْتَهُوْا "تو رک جاؤ" اس سے اور اسے نہ پکڑو۔ حسن اور سدی کہتے ہیں کہ جو تمہیں وہ مال فئے میں سے دیں اسے قبول کر لو اور جو روکیں اس کا مطالبہ نہ کرو۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ جو تمہیں میری فرمانبرداری دے وہ کرو اور جس نافرمانی سے روکے اس سے باز آجاؤ۔

حق بات یہ ہے کہ یہ آیت ہر اس چیز کے بارہ میں عام ہے جو بھی رسول اللہ ﷺ حکم دیں منع کریں کوئی بات کریں یا کوئی کام کریں اگرچہ اس کا کوئی خاص سبب ہو، تو اعتبار لفظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص سبب کا۔ ہر وہ چیز جو آپ شریعت میں سے لائے ہیں وہ آپ ﷺ نے ہی ہمیں دی ہے اور وہ آپ سے ہی ہم تک پہنچی ہے۔ یہ آیت سب سے زیادہ نفع مند اور بے شمار فوائد لئے ہوئے ہے۔ پھر جب انہیں یہ حکم دے دیا اس چیز کے لینے کا جو رسول اللہ ﷺ انہیں دیں اور جس سے روک دیں اس سے رکنے کا تو پھر اس سے ڈرنے اور اس کی سخت سزا سے خوف زدہ رہنے کا حکم دیا اور فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ "اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو یقیناً اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے" اور اللہ تعالیٰ اس شخص کو سزا دے گا جو رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی چیز (یا حکم) کو نہیں لے گا اور اس شخص کو بھی سزا دے گا جو آپ کے منع کردہ کاموں سے نہیں رکے گا"۔

تفسیر سورۃ الممتحنہ

اس کی تیرہ آیات ہیں، قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام کے اقوال کے مطابق یہ مدنی ہے۔

مضمون نمبر:۱

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ۔

''جن لوگوں نے تم سے دین کے بارہ میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا ان سے سلوک واحسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا۔''

اسم موصول سے بدل اشتمال ہے۔وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ''اور منصفانہ برتاؤ سے'' مقولہ ہے اقسطت الی الرجل جب آپ کسی سے انصاف کریں۔زجاج کہتے ہیں: معنی یہ ہے کہ تم اپنے اوران کے درمیان عہد پورا کرکے انصاف کرو۔اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ''بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے'' یعنی عدل کرنے والے سے۔

آیت کا معنی یہ ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے ساتھ نیکی کرنے سے نہیں روکتے جن کفار سے مومنوں نے جنگ نہ کرنے پر معاہدہ کررکھا ہے اوراس بات پر کہ وہ کفار کی ان کے خلاف مدد بھی نہیں کریں گے اوران کے ساتھ عدل والا معاملہ کرنے سے نہیں روکا۔ابن زید کہتے ہیں کہ یہ بات ابتدائے اسلام میں تھی جب صلح کا وقت اور جنگ چھوڑے رکھنے کا حکم تھا، پھر یہ منسوخ ہوگیا۔قتادہ فرماتے ہیں کہ اسے اس آیت: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ نے منسوخ کردیا۔ایک قول کے مطابق نبی اور قریش کے درمیان صلح کے بارہ میں یہ حکم ثابت ہے اور جب فتح مکہ سے صلح ختم ہوگئی تو یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا۔

ایک قول کے مطابق یہ نبی اکرم ﷺ کے خلفاء کے ساتھ خاص ہے اوران کے اور جن کے درمیان معاہدہ تھا ان کے ساتھ خاص ہے' یہ بات حسن نے کہی کلبی کہتے ہیں کہ یہ خزاعہ اور بنو حارث بن عبد مناۃ ہیں۔مجاہد کہتے ہیں کہ یہ ان کے ساتھ خاص ہے جو ایمان لائے اور ہجرت نہیں کی۔ایک قول کے مطابق یہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ خاص ہے۔قرطبی رحمہ اللہ نے اکثر مفسرین سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کا تذکرہ کیا کہ جن کے ساتھ سلوک واحسان کرنا جائز نہیں اور نہ ہی ان کے ساتھ معاملہ میں انصاف کرنا ٹھیک ہے، فرمایا: لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ۔ ''اللہ تعالیٰ تمہیں صرف ان لوگوں کی محبت سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارہ میں لڑائیاں لڑیں اور تمہیں دیس سے نکال دیا۔'' یہ قریشی کفار میں سے سردار ہیں۔ وَظٰهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ ''اور دیس نکالا دینے والوں کی مدد کی'' یعنی انہوں نے ان لوگوں کی مدد کی جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور انہوں نے تمہیں اسی وجہ سے نکال دیا یہ تمام مکہ والے ہیں اور جو ان کے ساتھ ان کے معاہدے میں شریک ہیں۔ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ''جو لوگ ایسے کفار سے محبت کریں، تو وہ قطعاً ظالم ہیں'' یعنی وہ لوگ پورے ظالم ہیں، اس لئے کہ انہوں نے ان سے دوستی کی جن سے دشمنی کرنا چاہیے تھی، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس کے رسول اور اس کی کتب کے دشمن ہیں اور انہوں نے ان کو دوست بنالیا ہے۔

مضمون نمبر:۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ۔

''اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں۔''

کفار کے پاس سے' یہ اس طرح ہوا کہ نبی ﷺ نے جب حدیبیہ کے مقام پر قریش کے ساتھ صلح کی اس بات پر کہ جو مسلمان ہو کر ان کے پاس مدینہ آئے گا تو یہ اس کو واپس لوٹا دیں گے' تو لیکن جب آپ کی طرف عورتوں نے ہجرت کی تو اللہ تعالیٰ نے انکار کر دیا کہ انہیں مشرکوں کی طرف واپس لوٹایا جائے اور ان کے امتحان کا حکم دیا فرمایا:

فَامْتَحِنُوْهُنَّ ''تو تم ان کا امتحان لو'' اس بات میں اختلاف ہے کہ کس بارہ میں امتحان لیا جائے؟ ایک قول کے مطابق وہ اس بات پر قسم اٹھایا کرتیں کہ وہ اپنے خاوند سے بغض کی وجہ سے نہیں آئیں اور نہ کسی دوسرے علاقہ کی طرف جانے کی رغبت سے آئی ہیں اور نہ ہی دنیا کے مال و دولت کی حرص میں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی وجہ اور اس کے دین کی رغبت وشوق میں آئی ہیں۔ جب وہ عورت یہ حلف اٹھاتی تو نبی ﷺ اس کے خاوند کو اس کا مہر ادا کر دیتے اور جو بھی اس عورت پر اس نے خرچ کیا وہ لوٹا دیتے اور یہ عورت واپس نہ کرتے۔

ایک قول کے مطابق امتحان یہ ہے کہ وہ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ ایک قول کے مطابق ان کا امتحان یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان پر یہ آیت پڑھتے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ۔ الخ

اہل علم کا اختلاف ہے کہ آیا عورتیں اس معاہدہ میں شامل تھیں یا نہیں؟ یہ اختلاف دو اقوال پر مبنی ہے: شامل کرنے والے قول کے مطابق یہ آیت اس معاہدہ کو خاص کرے گی، یہی اکثر کا قول ہے اور شامل نہ کرنے والوں کے قول کے مطابق نہ نسخ ہے اور نہ خاص ہے۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ "دراصل ان کے ایمان کو بخوبی جاننے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے" یہ جملہ معترضہ ہے اس وضاحت کے لئے کہ ان کی حقیقتِ حال اللہ سبحانہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، تمہیں اس بات کا پابند نہیں کیا، بلکہ تمہیں صرف ان کے امتحان لینے کا پابند کیا ہے تا کہ اسلام میں ان کی رغبت کے دعویٰ کی سچائی کی دلیل تم پر ظاہر ہو جائے فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ "لیکن اگر وہ تمہیں ایمان دار معلوم ہوں" یعنی تمہیں یہ پتہ چل جائے ظاہری حالات کے مطابق اس امتحان لینے کے بعد جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ "تو اب تم انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو" یعنی ان کے کافر خاوندوں کی طرف۔ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ "یہ (عورتیں) ان کے لئے حلال نہیں اور نہ وہ (کافر خاوند) ان کے لئے حلال ہیں۔" یہ انہیں نہ لوٹانے کی علت اور وجہ ہے اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ مومنہ عورت کافر مرد کے لئے حلال نہیں اور یہ کہ عورت کا اسلام قبول کرنا اس کا اس کے خاوند سے جدائی کو لازم کرتا ہے، نہ کہ صرف ہجرت ہی اور یہ تکرار حرمت کی تاکید کے لئے ہے یا پہلا حکم گذشتہ نکاح کو ختم کرنے کے لئے ہے اور دوسرا نئے نکاح سے روکنے کے لئے ہے۔

وَاٰتُوْهُمْ "اور ان کفار کو دو" یعنی ان ہجرت کرنے والی اور اسلام قبول کرنے والی عورتوں کے خاوندوں کو ادا کرو۔ مِثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا "جو ان کا خرچ ہوا" ان عورتوں پر مہر کی صورت میں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب خاوند کے علاوہ کوئی دوسرا اقربی عزیز اس کا مطالبہ کرے تو اسے بغیر کسی معاوضہ کے روک لیا جائے گا۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ "ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں" کیونکہ وہ تمہارے دین میں شامل ہو گئی ہیں۔

اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ "جب ان عورتوں کو ان کے مہر دو" یہ کام ان کی عدت پوری ہونے کے بعد ہو سکے گا جیسا کہ اس پر عدت کے وجوب کے دلائل دلالت کرتے ہیں۔

وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ''اور کفار عورتوں کی ناموس اپنے قبضہ میں نہ رکھو۔''
جمہور نے امساک کے باب سے تخفیف سے پڑھا ہے۔ اس قراءۃ کو ابو عبید نے فرمان باری تعالیٰ: فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ کی وجہ سے پسند کیا ہے۔ حسن ابوالعالیہ اور ابوعمرو تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ التمسك کے باب سے۔ العصم عصمة کی جمع ہے، اس کا معنی ہے جس چیز کے ساتھ مضبوط پکڑتے ہیں، اور یہاں عصمت سے مراد عقد نکاح ہے اور معنی یہ ہے کہ اگر اس کی بیوی کافرہ ہو تو وہ اس کی بیوی نہیں کیونکہ دین کے اختلاف کی وجہ سے ان میں عصمت منقطع ہو چکی ہے۔ نخعی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ مسلمان عورت ہے جو دار الحرب میں چلی جائے اور کافر ہو جائے۔ کافر مسلمانوں سے اور مسلمان مشرک عورتوں سے شادیاں کر لیا کرتے، پھر یہ کام اس آیت سے منسوخ ہو گیا اور یہ مشرک کافروں کے ساتھ خاص ہے اہل کتاب کافروں سے نہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ تمام کافر عورتوں کے بارہ میں عام ہے جو کہ ان میں سے اہل کتاب عورتوں کو نکال کر خاص کر دیا۔ جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ جب بت پرست یا اہل کتاب میں سے کوئی اسلام قبول کر لے تو عدت پوری ہونے سے پہلے ان کے درمیان جدائی کروادی جائے گی صرف خاوند کے اسلام قبول کرنے سے اور یہ اس وقت ہوگا جب عورت سے دخول کیا گیا ہو، البتہ اگر اس سے دخول نہیں ہوا تو اس بارہ میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ ان کے درمیان اسلام اس عصمت ختم ہو جاتی ہے جبکہ اس پر عدت نہیں ہوگی۔

وَاسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنْفَقُوا ''اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہو مانگ لو اور جو کچھ ان کافروں نے خرچ کیا ہو وہ بھی مانگ لیں'' یعنی تم اپنی بیویوں کے مہر طلب کرو جو کافروں سے مل گئی ہیں۔ مفسرین کا کہنا ہے جو مسلمان عورتیں مرتد ہو کر معاہدہ والے کافروں سے جا ملیں تو کافروں سے کہا جائے گا ان کا مہر ادا کرو اور جب کافروں کی عورت اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے پاس آجائے مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ ان کا مہر ان کے کافر خاوند کو ادا کریں۔ ذَٰلِكُمْ ''یہ'' یعنی مذکورہ دونوں طرف مہر لوٹانے کا معاملہ حُكْمُ اللَّهِ ''اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے'' اور اس کے رسول ﷺ کا۔ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ''جو تمہارے درمیان کر رہا ہے اللہ تعالیٰ بڑے علم اور حکمت والا ہے۔''

قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اس دور کے ساتھ خاص تھا بالخصوص اس واقعہ کے ساتھ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے، جب پہلی آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے حکم پر

راضی ہو گئے اور انہوں نے مشرکوں کی طرف لکھ بھیجا اور انہوں نے روک لیا۔ تو یہ فرمان الٰہی نازل ہو: وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ "اور اگر کوئی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے" یعنی ان میں سے جن کا تم نے مہر دیا ہے۔ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ "تمہاری کوئی بیوی" یعنی تمہاری مسلمان عورتوں کا مہر' ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی چلی جائے۔ اِلَى الْكُفَّارِ۔ "کافروں کے پاس۔" مسلمان عورت مرتد ہو جائے۔ فَعَاقَبْتُمْ "پھر تمہیں اس کے بدلہ کا وقت مل جائے۔" واحدی کہتے ہیں: مفسرین کا کہنا ہے، یعنی تم غنیمت حاصل کرو۔ زجاج کہتے ہیں اس کی تاویل وتفسیر یہ ہے کہ یہ انجام تمہارے لئے ہے، یعنی یہ غنیمت ہے جو تم نے حاصل کر لی۔

فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا "تو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں، انہیں ان کے اخراجات کے برابر ادا کر دو" یعنی ان مہاجر عورتوں کا مہر جن سے تم نکاح کرتے ہو اور وہ مہر کافروں کو ادا کرو یہ اس کے کافر خاوند کو نہ دو۔ قتادہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ یہ حکم ان لوگوں کو دیا گیا ہے کہ جن کی بیویاں چلی گئیں ہیں، ان کو اس قدر دیدیں کہ جو انہوں نے فیئے اور غنیمت میں خرچ کیا۔ یہ آیت منسوخ ہے اس کا حکم فتح مکہ کے بعد ختم ہو گیا۔ ایک قوم کا کہنا ہے بلکہ یہ محکم ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ "اور اس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔" یعنی ڈرو اس بات سے کہ تم کوئی ایسا کام کر بیٹھو جو تمہاری سزا کا موجب ہو کیونکہ جس ایمان سے تم متصف ہو وہ اپنے ماننے والے پر یہ ڈر اور خوف لازم کرتا ہے۔

مضمون نمبر: ۳۰

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ۔ (۱۲)

"اے نبی ﷺ! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں۔"

یعنی آپ کے پاس اسلام پر بیعت کرنے آئیں۔ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا "کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی' وہ کوئی بھی چیز ہو" یہ فتح مکہ کے دن تھا کیونکہ اہل مکہ کی عورتیں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیعت کرنے آئیں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے یہ عہد لیں کہ وہ شرک نہ کریں گی۔ وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ "چوری نہ کریں گی، زنا کاری نہ کریں گی اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی۔" یہ وہی

ہیں، جو جاہلیت میں لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ ''اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں''، یعنی اپنے خاوندوں کے ذمہ وہ اولاد نہ لگائیں جو ان سے نہیں۔

فراء کہتے ہیں عورت کسی نومولود کو اٹھاتی اور اپنے خاوند سے کہتی یہ میرا بیٹا تجھ سے ہے، تو یہ بہتان تھا جو اس نے اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑا اور یہ کہ جب ماں بچہ جنتی ہے وہ تو اس کے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان سے گرتا ہے' اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ اپنے زنا کے بچے کو اپنے خاوند کی طرف منسوب کرتی ہے کیونکہ یہ بات زنا سے نہی کے ضمن میں داخل ہے۔

وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ۔ ''اور کسی نیک کام میں تیری نافرمانی نہ کریں گی'' یعنی ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو۔ عطاء کہتے ہیں ہر نیکی اور پرہیز گاری کے کام میں۔ مقاتل کہتے ہیں: معروف سے مراد نوحہ کرنے' کپڑے پھاڑنے' شعر پڑھنے، گریبان چاک کرنے' چہرہ پیٹنے اور ہلاکت کی بددعائیں کرنے سے روکا گیا ہے۔ اسی طرح قتادہ' سعید بن مسیب محمد بن السائب اور زید بن اسلم نے کہا۔ جو انہوں نے کہا تو قرآن کا معنی اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ ایک قول کے مطابق معروف کی قید کی توجیہ حالانکہ آپ ﷺ اس کے سوا کوئی حکم نہ کرتے اور یہاں ذکر تنبیہ کرنے کے لیے کیا ہے اور تنبیہ اس بات پر کہ خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

فَبَايِعْهُنَّ تو آپ ان سے بیعت کرلیا کریں۔'' یہ اذا کا جواب ہے اور معنی یہ ہوا کہ جب وہ آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنا چاہیں تو آپ بیعت کرلیا کریں۔ ان کی بیعت میں نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج کا تذکرہ نہیں کیا، اس لئے کہ یہ اور ان جیسے دوسرے کام واضح ہیں کہ یہ دین کے ارکان اور اسلام کے شعائر ہیں' صرف مذکورہ امور کو اس لئے خاص کیا کہ عورتیں اکثر ان کا ارتکاب کرتی ہیں۔ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ''اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں'' یعنی آپ اللہ تعالیٰ سے ان عورتوں کے لئے اس بیعت کے بعد جو انہوں نے آپ سے کی ہے، ان کے لئے معافی کی دعا کریں۔ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ 'بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا معاف کرنے والا ہے''، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انتہائی رحمت کرنے والا اور بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔

تفسیر سورۃ الجمعہ

اس کی گیارہ آیات ہیں، قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تمام علماء کے اقوال کے مطابق یہ سورۃ مدنی ہے۔

مضمون نمبر ۱:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ۔ (۹)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب نماز کی اذان دی جائے۔''

یعنی نماز کے لئے پکار اس سے مراد اذان ہے جبکہ امام جمعہ کے دن ممبر پر بیٹھ جائے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کے سوا دوسری اذان نہیں ہوتی تھی۔ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ۔ ''جمعہ کے دن'' یہ اذا کی وضاحت اور اس کی تفسیر ہے۔ ابوالبقاء کہتے ہیں مِنْ بمعنی فِي ہے۔ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ۔ عطاء نے کہا ہے کہ سعی کا معنی ہے نماز کی طرف جانا، چلنا، فراء نے کہا ہے کہ ''معنی، سعی، اور ذہاب'' یہ تمام ایک ہی معنی کے حامل ہیں۔ سیدنا عمر اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی قرأت ''فامضوا الی ذکر اللہ'' بمعنی چلنا اس پر دلالت کرتی ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ارادہ کرنا ہے۔ حسن بصری نے کہا کہ اللہ کی قسم یہ سعی علی الاقدام یعنی دوڑنا نہیں بلکہ اس سے دلوں کا ارادہ اور نیت مراد ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ عمل ہے جیسا کہ ان آیات میں ہے: مَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ اور إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى۔ اور وان لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى۔ قرطبی فرماتے ہیں یہ جمہور کا قول ہے۔

وَذَرُوا الْبَيْعَ ''اور خرید و فروخت چھوڑ دو'' یعنی یہ معاملہ کرنا چھوڑ دو۔ اس میں تمام معاملات شامل ہیں۔ حسن کہتے ہیں' جمعہ کے دن جب مؤذن اذان کہہ دے تو خرید و فروخت جائز نہیں اور ذَٰلِكُمْ ''یہ'' اس سے ذکر اللہ کی طرف سعی اور خرید و فروخت چھوڑنے کی طرف اشارہ ہے یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ہے: خَيْرٌ لَكُمْ ''تمہارے حق میں بہت ہی بہتر ہے'' کہ اس میں اجر اور جزاء و بدلہ کس قدر ہے اور ایسا نہ کرنے سے یہ اجر وغیرہ نہ ملیں گے جبکہ یہ کسی سزا کا مستحق نہ کر دیں۔ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ''اگر تم جانتے ہو'' یعنی اگر تمہیں علم ہے کیونکہ یہ تم پر پوشیدہ نہیں کہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے یا تم اسے پسند کر لو۔''

تفسیر سورۃ المنافقین

اس کی ۱۱ آیات ہیں، قرطبی فرماتے ہیں کہ تمام کے اقوال کے مطابق یہ سورۃ مدنی ہے۔

مضمون نمبر:۱

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ۔(۱)

''تیرے پاس جب منافق آتے ہیں۔''

یعنی جب وہ تیرے پاس آئے اور تیری مجلس میں حاضر ہوتے ہیں، قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ''تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' انہوں نے اپنی گواہی کو انّ اور لام کے ساتھ یہ سمجھانے کے لئے تاکیدی بنایا کہ یہ گواہی ان کی پختہ دلی اور خالص اعتقاد کا نتیجہ ہے' منافقین سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔ نشہد کا معنی ہے، ہم حلف اٹھاتے ہیں، یہ قسم کے قائم مقام ہوتا ہے اسی لئے اس پر وہی احکام نافذ ہوتے ہیں، جو قسم کے احکام ہیں۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ''اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔'' یہ جملہ معترضہ ہے گذشتہ مضمون کی دوہرائی کیلئے ہے، وہ یہ کہ انہوں نے اپنی گواہی کا اظہار کیا اگرچہ ان کے دلوں میں اس کے خلاف کچھ اور ہی تھا۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ''اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعاً جھوٹے ہیں'' یعنی اس گواہی میں جس میں انہوں نے یہ گمان کیا کہ یہ دلی پختگی اور خالص اعتقاد سے گواہی دے رہے ہیں نہ کہ صرف زبانی ایک جملہ ہے اور یہ رسالت کی گواہی تھی کیونکہ یہ حق ہے' معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ان کے جھوٹا ہونے کی گواہی دیتا ہے اس میں تاکیداً اپنے ضمن میں وہ دلیل لئے ہوئے ہے کہ اس کی گواہی خالص اعتقاد، اطمینان قلب، ظہور پذیر ہونی چاہیے اور ظاہر اور باطن کی آپس میں موافقت کے ساتھ۔

تفسیر سورۃ الطلاق

اس کی ۱۱ یا ۱۲ آیات ہیں' قرطبی فرماتے ہیں کہ تمام کے اقوال کے مطابق یہ سورۂ مدنی ہے۔

مضمون نمبر:۱

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ ۔(۱)

''اے نبی (اپنی امت سے کہو کہ) جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینا چاہو۔''

پہلے نبی اکرم ﷺ کی وجہ سے پکارا پھر آپ کے ساتھ ساری امت کو پکارا یا یہ خطاب آپ کے لئے خاص تھا اور جمع کا صیغہ تعظیم اور عزت کے لئے لائے اور امت کے لئے اس میں نمونہ ہے۔ معنی یہ ہوا کہ جب تم ارادہ کرلو ان کو طلاق دینے کا اور اس کا پختہ عزم کرلو، فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ''تو ان کی عدت (کے دنوں کے آغاز) میں انہیں طلاق دو۔''

یعنی جب وہ عدت کی طرف جارہی ہوں یا عدت سے پہلے ہی یا ان کی عدت شروع ہونے سے پہلے یا عدت کے وقت میں، یعنی (حیض سے) پاکی کی حالت میں۔ اس سے مراد ہے کہ انہیں طہر کی حالت میں طلاق دو جس میں جماع نہ کیا ہو، پھر انہیں چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ ان کی عدت گذر جائے' اور جب تم اس طرح انہیں طلاق دو گے تو گویا تم نے ان کی عدت میں طلاق دی ہے۔

وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ ''اور عدت کا حساب رکھو۔'' یعنی اس کا حساب رکھو اور اس وقت کا حساب رکھو جس وقت طلاق دی ہے حتیٰ کہ عدت جو تین قروء ہیں پوری ہو جائے۔ یہ خطاب خاوندوں سے ہے۔ ایک قول کے مطابق بیویوں سے ہے۔ ایک قول کے مطابق عام مسلمانوں سے ہے، جبکہ پہلی بات زیادہ مناسب ہے کیونکہ ضمیریں ساری ہی ان خاوندوں کی طرف جاتی ہیں۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ ''اور اللہ تعالیٰ سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرتے رہو'' اس نے جو تمہیں حکم دیا ہے اس میں نافرمانی نہ کرو اور نہ انہیں تکلیف دو۔ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ ''نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو۔'' یعنی وہ گھر جن میں وہ طلاق کے وقت تھیں جب تک وہ عدت میں ہیں گھروں کی نسبت ان کی طرف کی حالانکہ یہ ان کے خاوندوں کے

ہیں۔ یہاں نہی کی تاکید کے لیے گھروں کی نسبت ان کی طرف کی گئی حالانکہ یہ گھر تو ان خاوندوں کے ہیں، اور یہاں یہ بیان کہ مقصود ہے کہ دوران عدت ان کو اس گھر میں رہنے کا حق حاصل ہے۔ اس کی طرح یہ آیات بھی ہیں وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ۔ اور وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ پھر جب خاوندوں کو ان کے گھروں سے نکالنے سے منع کیا جن گھروں میں طلاق ہوئی اور وہ ان میں تھیں، تو ساتھ ہی بیویوں کو بھی منع کیا کہ وہ یہاں سے باہر نہ جائیں، فرمایا: وَلَا يَخْرُجْنَ ''اور نہ وہ خود نکلیں''، یعنی ان گھروں سے جب تک عدت میں ہیں مگر کسی ضروری کام سے۔ ایک قول کے مطابق وہ خود نہ نکلیں مگر اپنے خاوند کی اجازت سے کوئی حرج نہیں جبکہ پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ''ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ کھلی برائی کر بیٹھیں۔'' یہ استثناء پہلے جملہ سے ہے، یعنی تم انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو، نہ کہ دوسرے جملہ سے۔ واحدی کہتے ہیں کہ اکثر مفسرین کا موقف ہے کہ فحاشی سے مراد یہاں بدکاری ہے اور یہ کہ وہ جب بدکاری کرے گی تو اس پر حد قائم کرنے کے لئے نکالا جائے گا۔ امام شافعی وغیرہ فرماتے ہیں: اس سے بدزبانی وغیرہ مراد ہے ان سے جو ان کے ساتھ اس گھر میں رہتے ہیں۔ اس کی تائید عکرمہ کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یہ الفاظ تھے: اِلَّآ اَنْ يَّفْحِشْنَ عَلَيْكُمْ۔

ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے کہ وہ سرکشی کرتی ہوئی نکلے کیونکہ اس طرح اس کا نکلنا فحاشی ہے اور یہ معنی بعید ہے۔ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ''یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں''، یعنی یہ احکام جو اس نے اپنے بندوں کے لئے بیان فرمائے ہیں یہ اس کی حدود ہیں جنہیں اس نے ان پر مقرر کیا ہے، تو کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان حدود کو تجاوز کرے۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ ''اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھ جائے''، یعنی ان کو تجاوز کر جائے اور ان میں سے کسی چیز کو حلال جان لے۔ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ تو ''اس نے یقیناً اپنے اوپر ظلم کیا۔'' تباہی کی جگہ پہنچ کر اور نقصان والی مقام میں داخل ہو کر اللہ تعالیٰ کی سزا کا مستحق ہو کر جو اسے اللہ تعالیٰ کی حدود پامال کرنے اور اس کے احکامات سے سرکشی کرنے کے نتیجہ میں ملے گی۔

لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ''تم نہیں جانتے شاید اس کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی نئی بات پیدا کر دے۔'' قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تمام مفسرین کا کہنا ہے یہاں اَ

اَمْرًا سے مراد رجوع کرنے میں رغبت دلانا ہے، تو معنی یہ ہوا کہ ایک طلاق دینے پر ابھارنا اور تین سے منع کرنا کیونکہ جب تین طلاقیں دے گا تو علیحدگی پر پشیمانی سے خود کو تکلیف میں مبتلا کرے گا اور رجوع کی رغبت رکھے گا لیکن رجوع کا راستہ باقی نہ ہوگا۔

مقاتل کہتے ہیں: بَعْدَ ذٰلِكَ سے مراد ہے ایک یا دو طلاقیں اور اَمْرًا سے مراد رجوع ہے۔ واحدی کہتے ہیں: اَمْرًا سے مراد جو ایک یا دو طلاقوں کے بعد آدمی کے دل میں رجوع کی محبت پیدا ہوتی ہے وہ ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ جب ایک وقت میں ہی تین طلاقیں دے تو پھر اس فرمان الٰہی لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا کا کوئی معنی نہیں رہتا۔

مضمون نمبر:۲

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ۔(۲)

''پس جب یہ عورتیں اپنی عدت پوری کرلیں۔''

یعنی ان کی عدت پوری ہونے کو ہو فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ''تو انہیں یا تو قاعدہ کے مطابق اپنے نکاح میں رہنے دو'' یعنی اچھے طریقہ سے ان سے رجوع کرلو، ان میں رغبت رکھتے ہوئے، ان کو نقصان اور تکلیف دینے کے ارادے سے نہیں۔ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ''یا دستور کے مطابق انہیں الگ کردو۔'' یعنی انہیں چھوڑ رکھو حتیٰ کہ ان کی عدت گذر جائے تو وہ خود اپنی مالک بن جائیں اس کے ساتھ ساتھ ان کے وہ حقوق بھی باقی ہوں گے جو تمہارے ذمہ ہیں اور انہیں تکلیف نہ دو۔ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ''اور آپس میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ کرلو'' اس رجوع پر، ایک قول کے مطابق طلاق پر اور ایک قول کے مطابق جھگڑا ختم کرنے اور جھگڑے کا باعث بننے والی ان دونوں جڑوں کو ختم کرنے کے لئے۔

یہ حکم استحباب کے لئے ہے جیسا کہ فرمان الٰہی: وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ میں ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ وجوب کے لئے ہے، یہی موقف امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رجوع کے لئے گواہی ضروری ہے اور علیحدگی کے لئے مستحب ہے۔ یہی موقف احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ہے' امام شافعی کے مزید ایک قول کے مطابق رجوع گواہی کا محتاج نہیں جیسا کہ باقی سارے حقوق ہیں اور اس جیسا ہی موقف ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ سے بھی مروی ہے۔

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ''اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے ٹھیک گواہی

دو۔ "یہ گواہی کے لئے حکم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے گواہی دیں۔ ایک قول کے مطابق یہ حکم خاوند اور بیوی کو ہے کہ وہ رجوع کرتے وقت گواہ بنالیں اس صورت میں یہ فرمان الٰہی: وَاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ، بذات خود گواہی کا حکم ہے اور یہ فرمان وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ، اس بات کا حکم ہے کہ وہ خالص اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے ہو۔ ذٰلِكُمْ "یہ" یعنی گواہی دینے اور اس پر گواہ بنانے کا جو حکم گذرا ہے۔ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ "جس کی نصیحت اسے کی جاتی ہے جو ایمان رکھتا ہو" یہاں مومن کو خاص کر دیا۔ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ "اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر" کیونکہ اسی سے فائدہ حاصل ہوگا کسی دوسری چیز سے نہیں۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا "اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے چھٹکارہ کی کوئی شکل نکال دیتا ہے" اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو، یعنی ایسے مقامات سے جس کا کھٹکا بھی اس کے دل میں نہیں ہوا اور نہ اس کا کبھی حساب اور اندازہ لگایا۔ شعبی اور ضحاک کہتے ہیں کہ یہ طلاق کے بارہ میں خاص کر ہے، یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق طلاق دی، تو اس کے لئے دوران عدت ہی رجوع کی صورت پیدا ہو جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عدت گذرنے کے بعد وہ بھی منگنی کا پیغام بھیجنے والوں میں سے ایک ہو۔ کلبی کہتے ہیں کہ جو مصیبت کے وقت صبر کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جہنم سے جنت کی طرف راستہ بنا دیں گے۔ حسن کہتے ہیں کہ اس چیز سے نکلنے کا راستہ بنائیں گے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

ابو العالیہ کہتے ہیں کہ ہر اس چیز سے نکلنے کا راستہ جس میں لوگ تنگ ہوتے ہیں۔ حسین بن الفضل کہتے ہیں کہ جو فرائض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے سزا سے نکلنے کا راستہ بنائیں گے اور اسے ایسی جگہ سے اجر و ثواب ملے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو یعنی جو اسے دیا ہے اس میں برکت کر دی جائے گی۔ سہل بن عبد اللہ کہتے ہیں: جو سنت کی پیروی کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا، تو اسے اہل بدعت کی سزا سے نکلنے کا راستہ ملے گا اور اسے ایسے طریقہ سے جنت ملے گی کہ جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو۔ ان کے علاوہ بھی بہت اقوال ہیں۔

آیت سے عموم ہی ظاہر ہو رہا ہے کسی خاص قسم کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی دلیل اور وجہ نہیں۔ اس میں سب سے پہلے تو جو سیاق سے معلوم ہو رہا ہے وہ شامل ہے۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى

اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ''اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہوگا۔'' یعنی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوطی سے جڑ گیا اور اپنی ہر ضرورت اور ہر وہ کام جو اسے پیش آیا، تو اس میں اللہ تعالیٰ کافی ہوگا۔ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ ''اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر کے ہی رہے گا'' یعنی جو وہ چاہتا ہے اس کام کو پورا کرے گا، اس سے کوئی چیز نہ رہے گی اور نہ ہی وہ اپنے مطلوبہ مقاصد میں عاجز ہوگا یا جس کام کو وہ نافذ کرے اس پر واپس پلٹایا نہیں جائے گا۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے'' یعنی اس کے وقت مقدار اور فیصلہ کر رکھا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر سختی کی ایک مقررہ مدت رکھی ہے جہاں جا کر وہ ختم ہو جائے گی اور نرمی کی بھی ایک انتہاء رکھی ہے، جہاں پہنچ کر وہ ختم ہو جائے گی، سدی کہتے ہیں یہ حیض اور عدت کی مقدار ہے۔

مضمون نمبر: ۳

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ۔ (۴)

''تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں حیض سے ناامید ہو گئی ہوں۔''

ان بوڑھی عورتوں سے جن کا حیض منقطع ہو گیا اور وہ حیض سے مایوس ہو گئیں۔ اِنِ ارْتَبْتُمْ ''اگر تمہیں شبہ ہو۔'' یعنی تم شک کرو اور تمہیں ان کی عدت کا علم نہ ہو سکے۔ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ''تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو'' چھوٹی ہونے کی وجہ سے اور حیض کی عمر کو نہ پہنچنے کی وجہ سے، یعنی پھر ان کی عدت بھی تین ماہ ہے۔ یہاں اسے حذف کر دیا اس لئے کہ گذشتہ مسئلہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ ''اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کا وضع حمل ہے'' یعنی ان کی عدت کی انتہا بچے کی پیدائش ہے۔ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے گو وہ طلاق شدہ ہوں یا بیوہ ہوں۔

اس بارہ میں کافی وشافی بات سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے، ہم نے اس آیت اور دوسری آیت کے بارہ میں پوری تحقیق کے ساتھ: وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِھِنَّ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّعَشْرًا میں بحث کر دی ہے۔ ایک قول کے مطابق اِنِ ارْتَبْتُمْ کا معنی ہے اگر تم یقین کر لو۔ ابن جریر نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ شک کے

معنی میں ہے اور یہی بات زیادہ ظاہر ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ اگر تم اس کے حیض کے بارہ میں شک کرو کہ وہ اس عورت سے ختم ہو چکا ہے اور اس جیسی دوسری عورتوں کو ابھی تک حیض آتا ہے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ اگر تمہیں شک ہے، یعنی تمہیں مایوس ہونے والی عورت کی عدت معلوم نہیں اور جسے ابھی حیض آیا ہی نہیں تو ان کی عدت یہ ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے اگر تم اس خون میں شک کرو جو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیا وہ حیض ہے یا نہیں؟ بلکہ استحاضہ ہے تو اس کی عدت تین ماہ ہے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا۔

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا۔''

یعنی وہ ڈرے اس کے احکام کو بجالانے میں اور اس کی منہیات سے باز رہنے میں تو اس پر دنیا وآخرت کے معاملات آسان کر دے گا۔ ضحاک کہتے ہیں: جس نے اللہ تعالیٰ سے ڈر کے سنت کے مطابق طلاق دی، تو اللہ تعالیٰ اس کے کام، یعنی رجوع میں آسانی پیدا کرے گا۔ مقاتل کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچتے ہوئے، اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا، تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق سے اطاعت وفرمانبرداری سے اس کے کام آسان کر دے گا۔

مضمون نمبر: ۴

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ۔ (٦)

''جہاں تم رہتے ہو وہاں ان طلاق والی عورتوں کو رکھو۔''

یہاں اس رہائش کی وضاحت ہے جو عورتوں کو دینا ضروری ہے اور من تبعیض کے لئے ہے، یعنی تمہاری رہائشوں سے کچھ جگہ' ایک قول کے مطابق من زائد ہے۔ مِّنْ وُّجْدِكُمْ ''اپنی طاقت کے مطابق''، یعنی اپنی وسعت وطاقت کے مطابق۔ وجد کہتے ہیں: قدرت کو۔ فراء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس پر لازم ہے جو پائے' اگر وہ وسعت والا ہے تو اس پر جگہ اور خرچ وسیع کر دے اور اگر محتاج ہے تو اس کے مطابق دے۔ قتادہ فرماتے ہیں کہ اگر تو گھر کے ایک کونہ کے علاوہ کچھ نہیں رکھتا تو بھی اس میں ہی جگہ دے۔ اہل علم نے اس عورت کے بارہ میں اختلاف کیا ہے جسے تین طلاقیں دی جائیں کیا اس کے لئے رہائش اور خرچ ہے یا نہیں؟ امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ

کہتے ہیں کہ اس کے لئے رہائش ہے خرچ نہیں۔ ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ اس کے لئے رہائش اور خرچ دونوں ہیں، امام احمد، اسحق اور ابوثور رحمہم اللہ کا موقف ہے کہ نہ اسے رہائش ملے گی اور نہ خرچ ملے گا اور یہی بات درست ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے منتقی کی شرح میں اس بارہ میں وہ کچھ لکھ دیا ہے کہ دیکھنے والے کو اس کے علاوہ کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ''اور انہیں تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ پہنچاؤ'' رہائش اور خرچ میں۔ مجاہد کہتے ہیں رہائش میں۔ مقاتل کہتے ہیں خرچ میں۔ ابوالضحی کہتے ہیں کہ وہ لوگ اپنی بیوی کو طلاق دیتے اور جب عدت پوری ہونے کو دو دن باقی رہ جاتے تو رجوع کرتے پھر طلاق دے دیتے۔ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ''اور اگر وہ حمل سے ہوں تو جب تک بچہ پیدا ہو لے انہیں خرچ دیتے رہا کرو'' یعنی بچے کی پیدائش تک خرچ دو۔ علماء کے درمیان حاملہ طلاق والی کے لئے رہائش اور خرچ کے واجب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ ایسی حاملہ کہ جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو، اس کے بارہ میں سیدنا علی، سیدنا ابن عمر اور سیدنا ابن مسعود رضوان اللہ علیہم شریح، نخعی، شعبی، حماد، ابن ابی لیلی، سفیان اور ان کے ساتھی رحمہم اللہ فرماتے ہیں: کہ اس پر سارے مال سے خرچ کرے حتیٰ کہ وہ بچہ پیدا ہو جائے، سیدنا ابن عباس، سیدنا ابن زبیر، جابر بن عبدالملک، امام مالک، شافعی، ابو حنیفہ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ اس پر میراث میں سے اس کا جو حصہ بنتا ہے، صرف وہی اس پر خرچ کرے گا، اور یہی بات درست ہے ان دلائل کی روشنی میں جو اس بارہ میں سنت سے منقول ہیں۔

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ ''پھر اگر تمہارے کہنے سے وہی دودھ پلائیں۔'' اس کے بعد تمہاری اولاد کو فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ''تو تم انہیں ان کی اجرت دے دو'' یعنی دودھ پلانے کی اجرت۔ معنی یہ ہوا کہ طلاق والی عورتیں جب خاوندوں کی اولاد کو دودھ پلائیں جن خاوندوں نے انہیں طلاق دی ہے اور وہ اولاد ان کے بطن سے ہے تو اس کی اجرت اس شخص کے ذمہ ہے۔

وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ''اور باہم مناسب طور پر مشورہ کر لیا کرو'' یہ خطاب خاوند اور بیوی دونوں سے ہے، یعنی تم آپس میں معروف طریقہ سے مشورہ کرو غیر مناسب طریقہ نہ ہو اور ایک دوسرے کی اچھی اور عمدہ بات قبول کرو۔ اس کا حقیقی معنی یہ ہے کہ: ایک دوسرے کو وہ بات کہو جو لوگوں میں متعارف ہے نہ کہ جو لوگوں میں ناپسندیدہ ہے۔ مقاتل کہتے ہیں: چاہیے کہ ماں باپ مقررہ اجرت پر راضی ہوں۔ ایک قول کے مطابق خاوند کی طرف سے معروف یہ ہے کہ وہ اس عورت کو وافر مقدار میں

اجرت دے اور عورت کی طرف سے معروف اور اچھا یہ ہے کہ اس خاوند سے ایسا مطالبہ نہ کرے جو اسے باپ ہونے کے اعتبار سے تنگ کرے۔

وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ ''اور اگر تم آپس میں کشمکش کرو'' یعنی دودھ پلوانے کی مزدوری میں' خاوند انکار کرے کہ وہ ماں کو مزدوری دے اور ماں دودھ پلانے سے انکار کر دے، ہاں اگر اس کی مرضی کی مزدوری ملے تو پلائے۔ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ''تو اس کے کہنے سے کوئی اور دودھ پلائے گی۔'' یعنی اجرت پر کسی دوسری دودھ پلانے والی کو حاصل کرلو جو اس کے بچہ کو دودھ پلائے' اس پر ضروری نہیں کہ جو بیوی مطالبہ کرے اور یہ اسے پورا کر دے اور یہ بھی اس کے لئے جائز نہیں کہ اپنی مرضی کی مزدوری پر اسے دودھ پلانے پر مجبور کرے۔ ضحاک کہتے ہیں: اگر ماں دودھ پلانے سے انکار کر دے تو اس بچے کو دوسری عورت مزدوری پر دودھ پلائے اگر دوسری کوئی عورت قبول نہ کرے تو ماں کو مزدوری پر دودھ پلانے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔

لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ ''کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے'' اس میں وسعت والوں کو حکم ہے کہ دودھ پلانے والی اپنی عورتوں پر اپنی وسعت کے مطابق وسعت رکھیں۔ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ ''اور جس پر اس کے رزق کی تنگی کی گئی ہو'' یعنی اس کا رزق گذارے والا یا اس سے بھی تنگ ہے تو وہ وسعت والا نہیں۔ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ''اسے چاہیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے دے رکھا ہے' اسی میں سے دے'' یعنی جو اسے رزق میں سے دیا ہے اس کے علاوہ نہیں۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ''کسی شخص کو اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتا مگر اتنی ہی جتنی کہ اسے طاقت دے رکھی ہے'' یعنی جو اسے رزق دیا ہے تو محتاج اس بات کا مکلف نہیں کہ جو اس کی طاقت میں نہیں وہ خرچ کرے، بلکہ اس پر صرف وہی لازم ہے جو اس کی طاقت میں ہے اور اس کی طاقت کی انتہا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے رزق دے رکھا ہے۔ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ''اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد آسانی و فراغت بھی کر دے گا'' یعنی تنگی اور سختی کے بعد وسعت اور غنی کر دے گا۔

تفسیر سورۃ التحریم

اس کی ۱۲ آیات ہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تمام علماء کے قول کے مطابق یہ سورۃ مدنی ہے' اور اس کا نام سورۃ النبی بھی ہے۔

مضمون نمبر:۱

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ۔

''اے نبی! (ﷺ) جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کر دیا ہے، اسے آپ کیوں حرام کرتے ہیں؟''

اس آیت کے شان نزول میں علماء کا اختلاف کئی اقوال پر مشتمل ہے: پہلا قول اکثر مفسرین کا ہے' واحدی کہتے ہیں کہ مفسرین کا کہنا ہے نبی ﷺ ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے اور وہ اپنے والد کے گھر گئی ہوئی تھیں اور جب واپس آئیں تو ام المؤمنین ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر میں نبی کریم ﷺ کے پاس دیکھا تو وہ ام المؤمنین سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا کے نکلنے تک گھر میں داخل نہ ہوئیں' پھر جبکہ داخل ہوئیں' کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے چہرہ پر غیرت اور پریشانی دیکھی، تو اسے کہا کہ تو عائشہ (رضی اللہ عنہا) کو نہ بتانا اور تیرے لئے مجھ پر یہ لازم ہو گیا کہ میں کبھی بھی اس کے قریب نہ جاؤں گا' تو ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیا، ان دونوں کی آپس میں خالص دوستی تھی' ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا غصہ میں آ گئیں' وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تکرار کرتی رہیں حتیٰ کہ آپ ﷺ نے حلف اٹھایا کہ وہ ام المؤمنین سیدہ ماریہ کے قریب نہ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔ قرطبی فرماتے ہیں' اکثر مفسرین کا موقف ہے کہ یہ آیت ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے بارہ میں نازل ہوئی اور یہ واقعہ بیان کرتے ہیں۔

ایک قول کے مطابق شان نزول یہ ہے کہ نبی ﷺ، ام المؤمنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھ کر شہد نوش فرمایا کرتے تھے، تو ام المؤمنین سیدہ عائشہ اور ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہما نے معاہدہ کیا کہ جب بھی آپ ﷺ ان میں سے کسی کے پاس آئیں تو وہ کہے کہ ہم آپ سے بدبودار بوٹی کی بو محسوس کرتی ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس کا شان نزول وہ عورت ہے جس نے خود کو نبی اکرم ﷺ کے لئے ہبہ کر دیا تھا' اس کی سند ضعیف ہے۔ دونوں واقعات کو جمع کرنا ممکن ہے' شہد والا اور ام المؤمنین سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا والا قصہ دونوں کے بعد نازل ہوا ہے۔

تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ۔

''کیا آپ اپنی بیویوں کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

مرضاۃ اسم مصدر، رضامندی کے معنی میں ہے وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ''اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' جب آپ کی طرف سے حرام کرنے کی زیادتی ہوئی جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کیا تھا۔ایک قول کے مطابق یہ چھوٹے گناہ تھےاس لئے اللہ نے آپ کو اس پر عتاب کیا۔ایک قول کے مطابق جو آپ نے زیادہ اولیٰ اور مناسب کام چھوڑا،اس پر عتاب کیا۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ''تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے قسموں کو کھول ڈالنا مقرر کر دیا ہے'' یعنی تمہارے لئے قانون بنا دیا ہے اور جائز رکھا ہے اور یہ تمہارے لئے واضح کر دیا ہے کہ قسم ایک عقد ہے اور اس کا کفارہ کھولنا ہے کیونکہ قسم اٹھانے والے نے جو خود پر حرام کیا ہے اس کو حلال کرنا ہے۔مقاتل کہتے ہیں اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسموں کا کفارہ سورۂ مائدہ میں بیان کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ دیں اور اپنی لونڈی سے رجوع کریں اور ایک گردن آزاد کریں۔زجاج کہتے ہیں: کسی کے لئے جائز نہیں کہ جو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اسے حرام کر لے۔

میں کہتا ہوں: یہی بات درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ کو حرام کرنا اسے حرام نہیں کرتا اور نہ اس کی حرمت اس کے کرنے والے پر لازم آتی ہے۔کیونکہ حلال اور حرام کا اختیار صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو ہے اس کے علاوہ کسی کو نہیں'اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ کو اس سورۃ میں ڈانٹنا اس بات پر سب سے عمدہ دلیل ہے۔یہ بحث بہت طویل ہے اس میں بہت زیادہ مذاہب ہیں اور اس بارہ میں طویل مضامین لکھے گئے ہیں جن کی تحقیق امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تالیفات میں کی ہے جو کافی وشافی ہے۔

علماء کا اختلاف ہے کہ آیا صرف حرمت کی قسم ہی کفارہ لازم کرتی ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے' آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں جو یہ بتائے کہ وہ قسم تھی کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو ڈانٹا اس بات پر کہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے اسے حرام کیوں کیا؟ پھر فرمایا: قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ اس واقعہ میں منقول جو اکثر مفسرین کا موقف ہے کہ وہ آیت کا شان نزول ہے کہ پہلے تو آپ نے حرام کیا، پھر دوسری مرتبہ حلف اٹھایا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ''اور اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے'' یعنی تمہارا دوست مددگار اور تمہارے معاملات کا نگران ہے۔وَهُوَ الْعَلِيْمُ ''اور وہی پورے علم والا'' کہ کس چیز میں تمہارا فائدہ اور بہتری ہے۔اَلْحَكِيْمُ ''حکمت والا ہے۔'' اپنے اقوال وافعال میں۔''

تفسیر سورۃ نوح

اس کی ۲۸ یا ۲۹ آیات ہیں' یہ سورۃ مکی ہے۔ یہ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا قول ہے ان سے ابن الفریس' نحاس اور ابن مردویہ نے نقل کیا ہے۔

مضمون نمبر:۱

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔(۱۰)

''اور میں نے کہا کہ اپنے رب سے اپنے گناہ بخشواؤ وہ یقیناً بڑا بخشنے والا ہے۔''

یعنی اپنے گذشتہ گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے خالص نیت کے ساتھ معافی مانگو وہ گنہگاروں کو بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ ایک قول کے مطابق اسْتَغْفِرُوْا کا معنی ہے کہ اپنے کفر سے توبہ کرو، وہ توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ''وہ تم پر آسمان کو خوب برستا ہوا چھوڑ دے گا'' آسمان سے مراد بارش ہے اور المدرار الدرور کا معنی ہے موسلا دھار بارش یعنی مسلسل بھیجے گا۔

اس آیت میں دلیل ہے استغفار کرنا، بارش اور مختلف قسم کے رزق کے حصول کے لئے اسی لئے بڑے اسباب میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔ ''اور تمہیں خوب پے در پے مال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہیں باغات دے گا اور تمہارے لئے نہریں نکال دے گا' جو جاری وساری ہوں گی۔''

تفسیر سورۃ المزمل

اس کی ۱۹ یا ۲۰ آیات ہیں' ماوردی کہتے ہیں کہ پوری سورت حسن' عکرمہ اور جابر کے بقول یہ سورۃ مکی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ دو آیات: وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ اور اس کے بعد والی آیت کے علاوہ۔

مضمون نمبر: ۱

قُمِ الَّيْلَ۔ (۲) "رات کے وقت نماز میں کھڑے ہو جاؤ۔"

یعنی رات میں نماز کے لئے کھڑے ہوا کرو۔ اس بارہ میں اختلاف ہے کہ جس قیام کا یہ حکم دیا گیا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا یا نفل؟ اِلَّا قَلِيلًا "مگر کم" یہ رات میں سے استثناء ہے، یعنی ساری رات نماز پڑھ مگر اس رات میں سے تھوڑا وقت چھوڑ دے۔ کسی چیز میں قلیل وہ ہوتی ہے جو آدھی سے کم ہو۔ ایک قول کے مطابق جو چھٹے حصہ سے کم ہو اور ایک قول کے مطابق دسویں حصہ سے کم ہو' مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ قلیل سے مراد یہاں ایک تہائی ہے۔

ہمیں اس اختلاف سے یہ فرمان الٰہی: نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ بے پروا کرتا ہے۔ "آدھی رات یا اس سے کم" یعنی آدھی رات قَلِيلًا "کچھ کم کر لے" ایک تہائی تک۔ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ "یا اس پر بڑھا دے" یعنی دو تہائی سے کچھ کمی کر کے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: دو تہائی یا نصف رات یا ایک ثلث قیام کر۔ ایک قول کے مطابق نصفه بدل ہے قليلا سے، تو معنی ہوگا ساری رات قیام کر مگر آدھی رات یا آدھی رات سے بھی تھوڑا یا آدھی رات سے زیادہ۔

اخفش کہتے ہیں: نِصْفَهُ کا معنی ہے: "او نصفه" یا آدھی رات جیسا کہ کہا جاتا ہے اسے ایک دو تین درہم دے دو۔ اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ یا دو درہم یا تین درہم۔ واحدی کہتے ہیں کہ مفسرین کا کہنا ہے یا آدھی رات سے کچھ کم کر کے ایک تہائی تک کر لو یا زیادہ کر کے دو تہائی تک کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رات کے قیام کی مدت میں وسعت رکھی ہے اور آپ کو ان اوقات میں قیام کرنے کا اختیار دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ایک جماعت آپ کے ساتھ ان اوقات میں قیام کیا کرتے تھے' تو یہ ان پر گراں گذرا اور حالت یہ ہو گئی کہ آدمی کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ کتنی نماز ادا کر لی اور رات کس قدر باقی ہے' تو وہ لوگ ساری رات قیام کرنے لگے حتیٰ کہ اللہ

تعالیٰ نے ان سے تخفیف کر دی۔

ایک قول کے مطابق منه اور علیه میں ضمیر آدھی سے کم کی طرف لوٹتی ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو آدھی رات سے کچھ کم قیام کر یا اس تھوڑے وقت سے بھی کچھ کم کر لے یا اس سے کچھ زیادہ کر لے' یہ بہت بعید ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ نصفہ قلیلا سے بدل ہے اور دونوں ضمیریں نصفہ کی طرف لوٹتی ہیں جو قلیلا سے مبدل ہے۔ اس حکم کے ناسخ کے بارہ میں اختلاف ہے ایک قول کے مطابق: اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ سے آخر سورۃ تک ہے۔ ایک قول کے مطابق: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ کا جملہ ہے۔ ایک قول کے مطابق: اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى۔ ایک قول کے مطابق پانچ نمازوں کی فرضیت سے یہ منسوخ ہے۔ یہی بات مقاتل' شافعی اور ابن کیسان نے کہی۔ ایک قول کے مطابق: فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ کا جملہ ہے۔

حسن اور ابن سیرین کا موقف ہے کہ رات کی نماز ہر مسلمان پر فرض ہے، اگرچہ بکری کے دودھ دوہنے کے برابر ہو۔ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کر'' یعنی اسے ٹھہر کر اور غور کر کے پڑھا کر۔ ضحاک کہتے ہیں ایک ایک حرف کر کے پڑھ۔ زجاج کہتے ہیں کہ تو تمام حروف کو واضح کر کے اور اچھی طرح ان کے حقوق ادا کر کے پڑھ۔ ترتیل کا اصل معنی ہے التنقید اور التنسیق اور عمدہ ترتیب۔ فعل کو مصدر کے ساتھ تاکید کرنا ایسی صورت میں مبالغہ کی دلیل ہے جس میں کچھ حروف آپس میں خلط ملط نہ ہوں اور ادائیگی میں بھی اپنے اصل مخرج سے اپنے معتبر حرکات کی پوری طرح ادائیگی کے ساتھ کوئی حرف رہنے نہ پائے۔

مضمون نمبر: ۲

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ۔ (۲۰)

''آپ کا رب بخوبی جانتا ہے کہ آپ قریب دو تہائی رات کے تہجد پڑھتے ہیں۔''

ادنیٰ کا معنی ہے کم، اس کے لئے ادنی کو عاریتاً لایا گیا: کیونکہ جب دو چیزوں کے درمیان مسافت تھوڑی ہو جو ان کے درمیان ہے تو یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ وَنِصْفَهٗ آدھی رات۔ یہ ادنی پر معطوف ہے وَثُلُثَهٗ ''اور ایک تہائی'' یہ نصف پر معطوف ہے، تو معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس کے رسول ﷺ دو تہائی رات سے بھی تھوڑا قیام کرتے ہیں اور کبھی آدھی رات

تک اور کبھی ایک تہائی تک قیام کرتے ہیں۔ابن کثیر اور اہل کوفہ کی قراءۃ میں منصوب پڑھتے ہیں ،جبکہ جمہور کی قراءۃ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ پر عطف ڈالتے ہوئے ،نصف اور ثلث پر جر پڑھتے ہیں، معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اس کے رسول ﷺ دو تہائی سے تھوڑا قیام کرتے ہیں اور نصف سے تھوڑا اور ایک تہائی سے تھوڑا قیام کرتے ہیں۔ابو عبید اور ابو حاتم نے جمہور کی قراءۃ کو: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ کی وجہ سے پسند کیا ہے،وہ کیسے آدھی رات اور ایک تہائی تک قیام کرتے جبکہ وہ شمار نہ کر سکتے تھے۔فراء کہتے ہیں پہلی قراءۃ درستگی کے زیادہ مشابہ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دو تہائی سے تھوڑا پھر خود تھوڑے کی تفسیر بھی فرمادی۔

وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ''اور آپ کے ساتھ لوگوں کی ایک جماعت۔'' یہ تقوم میں پوشیدہ ضمیر پر معطوف ہے،یعنی اس مقدار میں آپ کے ساتھ آپ کے ساتھیوں کی ایک جماعت قیام کرتی ہے۔وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ''اور رات دن کا پورا اندازہ اللہ تعالیٰ کو ہی ہے''یعنی وہ اس کی پوری حقیقت کے مطابق ان کے اندازے سے واقف ہے یہ مقدار دوسرے کے علاوہ اس کے ساتھ خاص ہے'تم اسے حقیقی معنوں میں نہیں جانتے۔عطاء کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا اس سے ارادہ ہے کہ جو تم کرتے ہو وہ اس کے علم سے غائب نہیں ہوتا،یعنی وہ دن اور رات کے اندازوں سے واقف ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم رات میں کس قدر قیام کرتے ہو۔

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ ''وہ خوب جانتا ہے کہ تم اسے ہرگز نہ نبھا سکو گے''یعنی تم دن رات کے صحیح اندازہ لگانے کی طاقت نہیں رکھتے،ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ تم قیام اللیل کی طاقت ہرگز نہیں رکھتے۔قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلا معنی زیادہ درست ہے کیونکہ پوری رات کا قیام کبھی بھی فرض نہیں ہوا۔مقاتل وغیرہ کہتے ہیں: جب یہ آیات نازل قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ○ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ نازل ہوئیں،تو یہ ان پر شاق گذرا کیونکہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ آدھی رات کب ہوگی ایک تہائی سے تو وہ قیام کرنا صبح تک اس ڈر سے کہ ان سے غلطی سرزد نہ ہو جائے تو ان کے قدم پھول گئے اور رنگ متغیر ہو گئے،چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور ان سے تخفیف کردی اور فرمایا: عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ کیونکہ اگر تم زیادہ قیام کرو گے تو یہ تم پر بوجھ ہوگا اور تم تکلف سے وہ کام کرو گے جو فرض نہیں اور اگر کمی کرو تو بھی تم پر گراں گذرتا ہے۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ ''پس اس نے تم پر مہربانی کی''یعنی تم پر معافی لوٹائی اور قیام چھوڑنے

میں رخصت دی' ایک قول کے مطابق اس نے قیام کی فرضیت سے تمہاری توبہ قبول کی، جب کہ تم عاجز آ چکے تھے۔توبہ کا اصل معنی لوٹنا ہے، تو معنی یہ ہوا کہ اس نے تمہیں بوجھ سے تخفیف کی طرف اور تنگی سے آسانی کی طرف لوٹایا ہے۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ''لہٰذا جتنا قرآن پڑھنا تمہارے لئے آسان ہو اتنا ہی پڑھو'' رات کی نماز میں جو تم پر ہلکا اور تمہیں آسان نظر آئے، اس کے بغیر ہی کہ تم وقت مقرر کرلو۔ حسن کہتے ہیں اس سے مراد وہ ہے جو مغرب اور عشاء میں قراءۃ کی جاتی ہے۔ سدی کہتے ہیں: جو آسان ہو وہ سو آیات ہیں' حسن یہ بھی کہتے ہیں: جو سو آیات پڑھے گا اسے قانتین میں لکھا جائے گا' سعید کہتے ہیں پچاس آیات۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے کہ رات کی نماز میں سے جو تمہیں آسانی ہو وہ پڑھ لو اور نماز کو قرآن کہا گیا جیسا کہ اس آیت میں ہے: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ایک قول کے مطابق یہ آیت پوری رات، آدھی رات، اس سے کچھ کم اور اس سے کچھ زیادہ کے قیام کو منسوخ کرتی ہے۔ احتمال یہ ہوگا کہ آیت کا مضمون دوسرے فرض کے متعلق ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت سے ہوگا کہ آیت کا مضمون دوسرے فرض کے متعلق ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا سے منسوخ ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: دونوں معنوں میں سے ایک کے بارہ میں سنت سے دلیل لینا ضروری ہے تو ہم سنت رسول کو دیکھتے ہیں کہ وہ دلیل پیش کرتی ہے کہ نمازوں میں صرف پانچ واجب ہیں۔ ایک جماعت کا موقف ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ کی امت کے حق میں قیام اللیل منسوخ ہو چکا ہے۔ ایک قول کے مطابق ایک اندازہ صرف منسوخ ہے اور اس کا اصل وجوب باقی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ امت کے حق میں منسوخ ہے اور آپ ﷺ کے حق میں باقی ہے۔ سب سے عمدہ قول وہی ہے کہ قیام اللیل عمومی طور پر منسوخ ہو چکا ہے آپ ﷺ اور آپ کی امت کے حق میں اور آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ ا میں ایسی کوئی دلیل نہیں جو وجوب کا کچھ حصہ باقی چھوڑے کیونکہ اگر اس سے قرآن پڑھنا مراد لیا جائے تو وہ مغرب عشاء اور جو نوافل مؤکدہ وغیرہ ہیں ان میں آ جاتی ہے اور اگر اس سے رات کی نماز مراد لی جائے تو مغرب اور عشاء کو رات کی نماز کہا جا سکتا ہے اور جو ان کے ساتھ نفل پڑھے جاتے ہیں۔

اسی طرح صحیح احادیث جو اس پوچھنے والے کے قول سے واضح صراحت کرتی ہیں، جو اس نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ کیا میرے ذمہ اس کے علاوہ بھی ہے؟ یعنی پانچ نمازوں کے

علاوہ تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں ہاں یہ اور بات ہے کہ تو نفل کے طور پر پڑھے۔ یہ دلیل ہے ان نمازوں کے علاوہ باقی نمازوں کے واجب نہ ہونے کی تو اس سے امت پر قیام اللیل اور رات کی نماز کا وجوب ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ نبی ﷺ سے اس کا وجوب وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ سے ختم ہوا:

تفسیر سورۃ المدثر

اس کی ۲۶ آیات ہیں یہ سورۃ مکی ہے، اس بات میں کوئی اختلاف نہیں۔

مضمون نمبر:۱

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۳)

''اور اپنے رب ہی کی بڑائیاں بیان کر۔''

یعنی اپنے سردار، مالک اور معاملات کو درست کرنے والے کو بڑائی کے لئے خاص کر لے، یہ کبریائی اور عظمت اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی صفت ہے' وہ اس چیز سے بہت بڑا ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو، جیسا کہ کفار کا عقیدہ ہے اور اس سے بھی عظیم تر ہے کہ اس کی بیوی یا اولاد ہو۔ ابن عربی کہتے ہیں اس سے بزرگی کی بڑائی اور اللہ وحدہٗ کے مقابل شریک اور بتوں سے بیزاری اور ایسے کاموں سے صفائی و پاکیزگی مراد ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کو دوست نہ بنائے اور نہ کسی کی عبادت کرے اور ہر کام اسی کے لئے کرے اور ہر نعمت اسی سے حاصل کرے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ''اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کر'' لغوی اعتبار سے اس کا معنی ہے پہننے والے کپڑے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کپڑوں کو پاک رکھنے کا حکم دیا اور انہیں نجاستوں سے محفوظ رکھنے کا حکم دیا اور جو اسے نجاستیں لگ چکی ہیں انہیں دور کرنے کا حکم دیا۔ ایک قول کے مطابق کپڑوں سے مراد دل ہے۔ قتادہ کہتے ہیں: دل مراد ہے۔ ایک قول کے مطابق جسم مراد ہے۔ ایک قول کے مطابق گھر مراد ہے۔ ایک قول کے مطابق دین مراد ہے۔ حسن اور قرطبی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ اخلاق مراد ہے کیونکہ انسان کا اخلاق اس کے تمام احوال پر مشتمل ہوتا ہے حتیٰ کہ کپڑوں کا جسم پر بھی۔ مجاہد اور ابن زید کہتے ہیں، یعنی تیرے کام پس تو ان کی اصلاح کر لے۔ زجاج کہتے ہیں: اس کا معنی ہے وثیابك فقصر کیونکہ کپڑوں کا زمین پر گھسیٹتے وقت' چھوٹا ہونا نجاستوں سے دور کرتا ہے۔ یہی قول طاؤس کا ہے۔ پہلی بات زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہی حقیقی

معنی ہے ثیـاب کا لفظ مجازی طور پر کسی دوسرے معنی میں استعمال نہیں ہوتا کسی بھی تعلق اور قرینہ کے ساتھ جو یہ بتائے کہ اس طرح بولتے وقت یہ مراد ہوگا۔ اس جیسے اصل یعنی بولتے وقت حقیقت پر محمول کرنا اس میں کوئی اختلاف نہیں، اس آیت میں یہ بھی دلیل ہے کہ نماز میں کپڑوں کی پاکیزگی واجب ہے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ''ناپاکی کو چھوڑ دے۔'' الرجز کا لغوی معنی ہے عذاب۔ اس میں دو لغتیں ہیں راء پر ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔ شرک اور بتوں کی عبادت کو بھی رجز کہا جاتا ہے کیونکہ یہ عذاب کا سبب ہوتے ہیں۔ مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ کہتے ہیں: الـرجـز کا معنی بت ہیں جیسا کہ: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ میں ہے، یہی قول ابن زید کا ہے۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں: اس کا معنی گناہ ہے اور ہجر کا معنی اسے چھوڑنا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں: الـرجـز اساف اور نائلہ ہیں جو دو بتوں کے نام ہیں جو کہ بیت اللہ میں تھے۔ ابوالعالیہ ربیع اور کسائی کہتے ہیں: الرجز کا معنی ہے بت، الـرجز کا معنی عذاب ہے۔ سدی کہتے ہیں الـرجز کا معنی وعید ہے اور پہلی بات زیادہ درست ہے۔

تفسیر سورۃ ارایت

اسے سورۃ الماعون، سورۃ الیتیم اور سورۃ الدین بھی کہتے ہیں۔ اس کی سات آیات ہیں عطاء رحمہ اللہ، سیدنا جابر اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک قول کے مطابق یہ مکی ہے۔ قتادہ اور دوسروں کے بقول یہ مدنی ہے۔

مضمون نمبر: ۱

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔ (۷)

''اور برتنے (استعمال) کی چیز روکتے ہیں۔''

اکثر مفسرین کا کہنا ہے یہ اس چیز کا نام ہے جسے لوگ آپس میں استعمال کرتے ہیں جیسے ڈول، کلہاڑا، ہنڈیا اور جنہیں عموماً روکا نہیں جاتا مثلاً پانی اور نمک۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد زکوٰۃ ہے، یعنی وہ اپنے اموال کی زکوٰۃ روکتے ہیں۔ زجاج ابوعبیدہ اور مبرد کہتے ہیں: جاہلیت میں ماعون اسے کہتے ہیں جس چیز میں تھوڑا یا زیادہ فائدہ ہوتا ہو انہوں نے اعشی کا قول ذکر کیا ہے ع

بأجود منه بما عونه اذا ما سماؤهم لم تغم

اپنے نفع کی چیز کو بہت زیادہ سخاوت کرنے والا جب ان کے آسمان پر بادل نہ ہو۔

اَخَلِیْفَۃُ الرَّحْمٰنِ اِنَّا مَعْشَرٌ حُنَفَآءُ نَسْجُدُ بُکْرَۃً وَّ اَصِیْلًا

اے خلیفۂ ورحمان ہم موحدین کی جماعت صبح وشام سجدہ کرتے ہیں۔

عَرَبٌ نَرَی لِلّٰہِ فِیْ اَمْوَالِنَا حَقَّ الزَّکٰوۃِ مُنَزَّلًا تَنْزِیْلًا

ہم عرب لوگ ہیں اپنے اموال میں زکوۃ ادا کرنا ہم اللہ تعالیٰ کا حق سمجھتے ہیں جو آسمان سے اتارا گیا ہے۔

قَوْمٌ عَلَی الْاِسْلَامِ لَمَّا یَمْنَعُوْا مَاعُوْنَہُمْ وَیُضَیِّعُوا التَّہْلِیْلًا

ہم اسلام پر مضبوط اور پختہ قوم ہیں جنہوں نے اپنے ماعون یعنی نفع والی چیز کو نہیں روکا اور تہلیل یعنی لا الہ الا اللہ کو ضائع نہیں کیا۔

فراء کہتے ہیں: میں نے بعض عربوں سے سنا وہ ماعون کا معنی پانی بتاتے ہیں۔ایک قول کے مطابق عمومی طور پر بندہ پر جو حقوق ہیں وہ مراد ہیں۔ایک قول کے مطابق مال کے منافع میں سے کچھ مراد ہے' یہ المعن سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہوتا ہے تھوڑا۔قطرب کہتے ہیں ماعون کا اصل معنی قلت اور المعن تھوڑی چیز کو کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے صدقہ اور زکوۃ جیسی نیکیوں کا نام ماعون رکھا ہے کیونکہ یہ تھوڑی اور زیادہ ہر قسم کی ہوتی ہیں۔

تفسیر سورۃ الکوثر

اس کی تین آیات ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ' کلبی اور مقاتل رحمہم اللہ کے بقول یہ سورۃ مکی ہے' اور حسن' عکرمہ' مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ کے بقول، یہ سورۃ مدنی ہے۔

مضمون نمبر:۱

فَصَلِّ لِرَبِّكَ۔(۲) ''پس تو اپنے رب کے لئے نماز پڑھ۔''

اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرض نماز کی ادائیگی پر ہمیشگی کرنے کا حکم دینا۔ وَانْحَرْ ''اور قربانی کر۔''

اونٹ عربوں میں سب سے عمدہ مال ہوتا ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں: لوگ غیر اللہ کے لئے نماز پڑھا کرتے تھے' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ اس کی نماز اور قربانی صرف اسی اللہ تعالیٰ کے لئے ہونی چاہیے۔

قتادہ' عطاء اور عکرمہ رحمہم اللہ کہتے ہیں: اس سے مراد عید کی نماز اور عید الاضحیٰ کی قربانی ہے۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں: اپنے رب کے لئے صبح کی فرض نماز ادا کر اکٹھے ہو کر اور منیٰ میں اونٹ ذبح کر، ایک قول کے مطابق نماز کے دوران دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر گردن کے قریب رکھنا۔ یہ محمد بن کعب کا قول ہے' ایک قول کے مطابق نماز میں تکبیر کے وقت اپنے ہاتھوں کو گردن تک بلند کرنا۔

ایک قول کے مطابق قربانی کے وقت قبلہ رو ہونا' یہ قول فراء کلبی اور ابن الاحوص کا ہے۔ فراء کہتے ہیں میں نے کچھ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ نتناحر یعنی ہم ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں: اس کا سینہ اس کے سینہ کی طرف، یعنی ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔

ابن الاعرابی کہتے ہیں: اس کا معنی ہے آدمی کا نماز میں محراب کی جانب رخ کرنا ان کے اس قول کی وجہ سے: کہ ان کے مقامات ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ عطاء سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ دو سجدوں کے درمیان اچھی طرح بیٹھیں حتیٰ کہ آپ کی گردن نظر آئے۔ سلیمان التیمی کہتے ہیں اس کا معنی ہے کہ دعا کے لئے اپنے ہاتھوں کو گردن تک بلند کرو۔ آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم مطلقاً نماز اور قربانی کے بارہ میں ہے کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کریں اور دوسروں کے لئے نہیں۔ اس مطلق کے متعلق جو کچھ سنت میں منقول ہے تو وہ خاص قسم ہے اور وہ اس کو مقید کرنے کے حکم میں ہے۔

ابن ابی حاتم' بیہقی اپنی سنن حاکم اور ابن مردویہ نے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت

نقل کی، وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ سورۃ نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے جبرائیل سے پوچھا یہ قربانی کیا ہے جس کا میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے؟ انہوں نے کہا: یہ عام قربانی نہیں لیکن اس نے آپ کو حکم دیا ہے کہ جب تو نماز کے لئے تکبیر تحریمہ کہہ لیں تو دونوں ہاتھ بلند کریں، اسی طرح جب رکوع کریں اور رکوع سے اپنا سر اٹھائیں کیونکہ یہ ہماری اور فرشتوں کی نماز ہے جو سات آسمانوں میں ہیں اور بے شک ہر چیز کی زینت ہوتی ہے اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے وقت دونوں ہاتھوں کا اٹھانا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ رفع الیدین استکانت سے ہے جس کے بارہ میں اللہ نے فرمایا: **فَمَا اسْتَكَانُوا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ** یہ روایت مقاتل بن حیان، عن الاصبغ بن کنانہ عن علی کی سند سے ہے۔

ابن مردویہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارہ میں نقل کیا، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی طرف وحی کی کہ جب آپ نماز کے لیے تکبیر کہیں تو اپنے دونوں ہاتھ گردن تک بلند کریں۔ یہی **النحر** کا معنیٰ ہے۔ ابن ابی شیبہ اور بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، دارقطنی رحمہ اللہ نے افراد میں ابوالشیخ، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سنت میں یہ روایت سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی، **فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ** کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ نماز کے دوران دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی کلائی کے درمیان میں رکھنا، پھر ان دونوں کو سینے پر رکھنا۔ ابوالشیخ اور بیہقی نے اپنی سنن میں بھی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے اس جیسی ایک روایت بیان کی ہے۔

ابن ابی حاتم ابن شاہین اپنی سنت میں ابن مردویہ اور بیہقی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے **فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ** کے بارہ میں روایت نقل کرتے ہیں کہ فرمایا: جب تو نماز پڑھ رہا ہو اور رکوع سے کھڑے ہوتے وقت اپنا سر اٹھائے تو پوری طرح کھڑا ہو۔

ابن جریر اور ابن منذر، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارہ میں نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد فرض نماز اور قربانی کے روز ذبح کرنا۔ بیہقی نے اپنی سنن میں انہی سے **وانحر** کا معنیٰ نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قربانی کے دن ذبح کر، وغیرہ وغیرہ۔ جو کہ مفسرین نے نقل کیا ہے۔ یہ لفظ اگرچہ معنوی اعتبار سے بہت وسیع ہے جو ان تمام معانی کا احتمال رکھتا ہے مگر متعین صرف وہی ہو سکتا ہے جو احادیث و آثار سے ثابت ہو جیسا کہ یہ بات بڑے اور نیک لوگوں میں مسلم ہے۔

اللہ کی توفیق کے ساتھ یہ کتاب ختم کرتا ہوں اور اسی سے صحیح تحقیق تک پہنچنے کی دعا کرتا ہوں۔

ابوبکر ظفر ۲۰۰۷/۵/۴

قال اللہ تعالیٰ ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ النحل ۸۹

مباحث في علوم القرآن (اردو)

مناع القطان

ترجمہ

مولانا عبد اللہ سرور حفظہ اللہ

نظر ثانی و تسہیل

حافظ عبد الخبیر اویسی حفظہ اللہ

ناشر

مکتبہ محمدیہ قذافی سٹریٹ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

MOb:0300- 4826023,042-37114650

مطبوعاتِ مکتبہ محمدیہ

E-mail:maktabah_muhammadia@yahoo.com & maktabah_m@hotmail.com